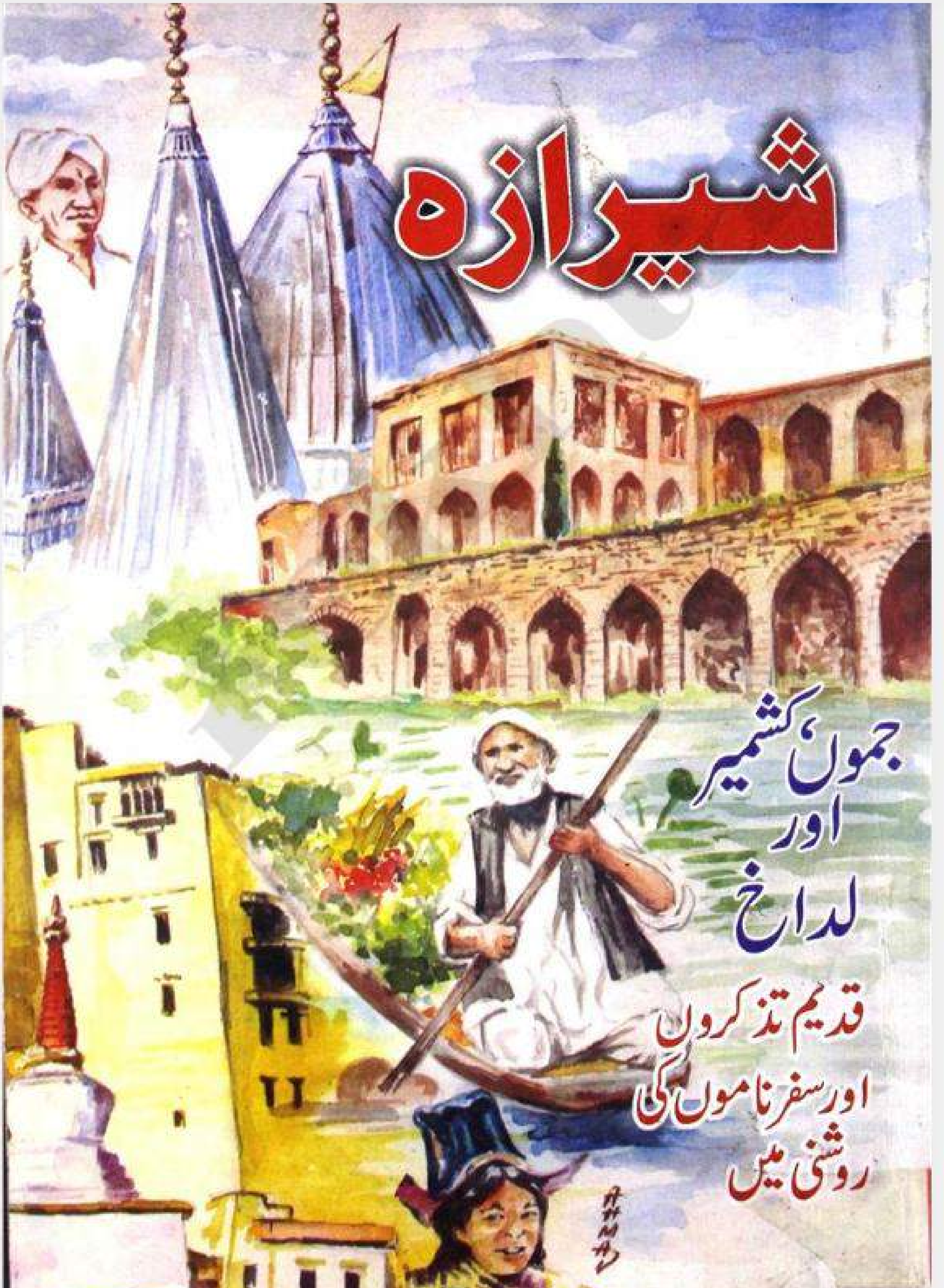


شیرازہ

جموں، کشمیر اور لداخ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد ۴۳ | جموں - کشمیر - لداخ
قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (II) | شمارہ ۶ تا ۱۱

نگراں:

رمیش مہتہ

مدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپوزنگ : سرینگر کمپیوٹرس، مہاراج بازار - سرینگر
مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرس - دہلی۔

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں
اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے
کا کُلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

قیمت :-۱۰۰ روپے (پیپر کور)
۷۵ رُوپے (مُجلّد)

سرورق :- عمل: جی - احمد
بیک ٹائٹل :- اکادمی آرکائیوز سے

☆..... خط و کتابت کا پتہ:
مُحمد اشرف ٹاک
ایڈیٹر "شیرازہ" اُردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سری نگر / جموں

فہرست

☆

حرفِ آغاز

گزشتہ برس اِن ہی دِنوں "جموّں - کشمیر - لداخ - قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں" کی جلد (I) منظرِ عام پر آئی جس میں قدیم سفرناموں اور تذکروں کے حوالوں سے ہماری ثقافتی روایات کا عکس اُتارنے کی سعی کی گئی تھی۔ فاضل محققین اور علم دوست حضرات نے تشنگی اور بعض کوتاہیوں کے باوجود جس طرح "شیرازہ" کی اِس اشاعت خصوصی کی پذیرائی کی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا وہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مختلف طبقہ ہائے فکر نے تجویز پیش کی کہ تشنگی کے احساس کو کم کرنے اور تمام تر ماخذوں تک ممکنہ رسائی حاصل کر کے ہمارے تہذیبی سفر کی نشاندہی کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعی کی جائے۔ چنانچہ ان اصحابِ نقد و نظر کی آراء کا احترام کرتے ہوئے اِس اشاعتِ خصوصی کی دُوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ہمیں بے پایاں مسرّت کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ بعض خدشات بھی لاحق ہیں کہ اِتنی خاصی ضخامت کے باوجود یہ جلد بھی شاید ابھی تک موضوع کا پُورا پُورا احاطہ نہیں کر سکی ہے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہماری کوشش قارئینِ محترم کی توجہ اِس اَمر کی جانب مبذول کرانا ہے کہ اِس خطّے کے حُسن، یہاں کی اعلیٰ اور منفرد ثقافتی روایات اور سیاسی تلاطُم نے اِسے

بڑا سُودمند موضوع بنایا ہے لیکن اِس موضوع سے مقامی طور اُتنا استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے یا اِسے سرسری انداز سے نمٹایا گیا ہے۔ آدمی محوِ حیرت ہوتا ہے کہ ان قابل اعتناء ماخذوں سے ابھی بھرپور استفادہ کیوں نہیں کیا جا سکا ہے اور یوُں ہمارے تہذیبی سفر کے یہ بے بہا سنگِ میل اَبھی تک اِس انتظار میں ہیں کہ اِن پر سے امتدادِ زمانہ کی گرد ہٹا کر انہیں عیاں کیا جائے۔

وادیٔ عشق بسے دُور دَراز اُست وَلے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اِس خصوصی اشاعت کی پہلی جلد میں ہم نے اِس خطّے پر لکھے گئے مختلف تذکروں اور سفرناموں میں معلومات یکجا کرنے کا جو بیڑا اُٹھایا تھا، زیرِنظر جلد میں موضوع کے کینوس کو حتی المقدور وسعت دینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تشنگی کا چُبھتا ہوا احساس کسی قدر کم ہو سکے۔

زیرِنظر اشاعت کی پہلی نگارش ہمیں ساتویں صدی عیسوی میں لے جاتی ہے جب "چچ نامہ" تالیف کیا گیا جو تاریخِ کشمیر کے قدیم مآخذوں میں ایک قدیم اور مستند ماخذ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب محمد بن قاسم عرب کے بے آب و گیاہ تپتے صحراؤں سے آ کر سرزمینِ ہند پر قدم رکھتا ہے اور راجہ داہر کو اَپنی مملکت چھوڑ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ راجہ داہر بے وطنی کے عالم میں محمد بن قاسم کو خط لکھتا ہے کہ دیبل فتح کرنا اس کا کوئی کارنامہ نہیں کیوں کہ یہ شہر تاجر پیشہ اور صنعت کاروں کی بستی ہے اور کسی وجہ سے کشمیر کا بادشاہ اُس کی مدد کو نہیں آ سکا ہے۔ جس کی ڈیوڑھی پر فقط ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ مکراں اور توّراں کے حکمراں بھی خوشی خوشی اُس کی اطاعت کا طوق اَپنے گلے میں ڈالتے ہیں۔ اگر وہ بہادر مقابلے کے لئے آئے تو تمہاری فوج یہاں کا رُخ نہ کرے ...... یہ جستہ جستہ

اِشارے کشمیر کے عظیم فاتح اور حکمراں للتادتیہ مکتا پیڈ کی طرف ہیں، جو ۷۹۶ء میں کشمیر کا راجہ تھا اور جس نے اَپنے قوتِ بازو سے نہ صرف پنجاب اور دہلی بلکہ قنوج کو بھی فتح کر لیا تھا۔ مشرق میں اُس کی سلطنت کی حُدود گورہ دیش (بنگال) اور جنوب میں دریائے شو (بحرِ ہند) تھے۔ شمال میں وسطِ ایشیا بھی اُس کا زیرِ نگین تھا۔ یہ وہی راجہ للتادتیہ ہے جس نے تاریخ کے طلوع سے اَب تک تعمیر کی گئیں بعض اِنتہائی شاندار عمارتوں کا وجود عمل میں لایا۔ ''چچ نامہ'' میں درج ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے دَوران کشمیر کی جغرافیائی حدود بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اِسی دُوران مُسلمان کشمیر پہنچ گئے تھے۔

ایک اور مستند ماخذ ''منتخب التواریخ'' میں مُلا عبدالقادر بدایونی رقم کرتا ہے کہ راجہ داہر کا بیٹا جے پال، محمد بن قاسم سے ہار کے جب کشمیر کے پہاڑوں میں پناہ لیتا ہے تو غیور کشمیری اُس کے لئے ڈھال بن جاتے ہیں اور حملہ آوروں کو ناکوں چنے چبوا کر اُنہیں خالی ہاتھ واپس لوٹ جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اِس کے بعد جب سُلطان محمود غزنوی ہندوستان کی بڑی بڑی مملکتوں کو تاراج کر کے کشمیر کی سَرحدوں پر دستک دیتا ہے تو بارہا کوششوں کے باوجود کشمیریوں نے اُسے اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دیا۔ منتخب التواریخ میں اِس حقیقت کا خلاصہ کیا گیا ہے کہ باہر والے تب تک اِس سرزمین پر قابض نہیں ہو سکے جب تک یہاں کے بعض رہنے والے اُن سے مِل نہیں گئے۔ مذکورہ تواریخ میں پہلی مرتبہ کشمیری شال کا ذکر آیا ہے جس کے مطابق شہنشاہ اکبر کے اُتالیق بیرم خان نے کشمیری شال کا خوبصورت لباس تیار کروا کے ایک اُیسے دَرویش کو دیا جس سے اُسے بے پناہ عقیدت تھی۔

اِس خطّے کی سیاحت کے دَوران یورپی سیاحوں کے مشاہدات اور

تجربات اِس اشاعت کی خاص زینت ہیں، سَر رچرڈ ٹیمپل، میجر ہونبورن، آرتھر نیو، نایٹ، رابرٹ تھورپ، چارلیس ایلیسن بیٹس اور سر جارج ابراہیم گریرسن نے یہاں کی تہذیب وتمدّن، ثقافت وروایات، زبان واَدب، نباتات و جمادات، چرند و پرند، آب وہوا، بشریات اور جغرافیائی حدَ بندیوں پر جس طرح سے قلم اُٹھائے ہیں، اُن پر سید رسول پونپر، پرُوفیسر مشعلؔ سلطانپوری، جناب غلام نبی آتشؔ، ڈاکٹر اَیاز رسول نازکی اور پروفیسر فدا محمد حسنین کے سیر حاصل مضامین قارئینِ محترم کی معلومات میں یقیناً خاطر خواہ اضافہ کریں گے۔

راجوری اور پونچھ کسی زمانے میں خود مختار علاقے تھے اور وہاں کے حکمرانوں نے زَبردست مملکتیں قائم کر رکھی تھیں۔ جناب خوشدیومینی نے کئی دُر ہائے آب دار کھنگال کے صفحۂ قرطاس پر رقم کئے ہیں جو اِس اشاعتِ خصوصی کی زینت ہیں----- علاقہ ڈُگر یعنی جموں کے بعض علاقوں میں ہڑپا اور موہنجو دارو کے دَور کی بعض باقیات دَریافت ہوئی ہیں۔ اِس علاقے کی اَپنی شاندار تواریخی رِوایات ہیں۔ چنانچہ علاقہ ڈُگر کے قدیم باشندوں اور اِس علاقے کی تاریخ کے بعض گم گشتہ اَبواب کی بازیافت قابلِ توجہ بھی ہے اور بحث و مباحثے کے متقاضی بھی۔

زیرِ نظر اشاعت کی پہلی جلد میں ''لداخ...... غیر ملکی سَیاحوں کی نظر میں'' کے عنوان سے جناب عبدالغنی شیخ لداخی صاحب نے اُپنے قلم کو جنبش دی تھی اور اِس جلد کے لئے ''لداخ...... ملکی سَیاحوں کی نظر میں'' کے عنوان سے مضمون سپُرد قلم کر کے اِس گلدستے کو اور زیادہ حسین بنا دیا ہے----- اِسی طرح سر والٹر لارنس کی ''دی ویلی آف کشمیر'' کو بنُیاد بنا کر جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب نے ایک بہت ہی وقیع مضمون عنایت کیا تھا اور ہماری استدعا پر ٹینگ صاحب نے

اِسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی نگارش ''والٹر لارنس اور کشمیر شناسی'' میں حسبِ توقع بعض نئے اُفق تلاش کئے ہیں۔

کشمیر اُردو اَدب کے منظرنامے پر جگہ جگہ اَپنے نقوش ثبت کئے ہے لیکن بعض فاضل اَدیبوں کے ہاتھوں سے مختلف وُجوہات کی بناء پر بُسا اوقات حقیقت کا دامن چھُوٹ گیا اور کئی ایسی باتیں اور واقعات رقم کر گئے ہیں جن سے بعد میں کافی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ جناب غلام نبی خیالؔ صاحب نے ایک فکر انگیز موضوع ''اُردو اَدب میں کشمیر کی غلط تصویر کشی'' پر خامہ فرسائی کی ہے جو یقیناً پسندیدگی کی نظروں دیکھی جائے گی۔

''گلاَب نامہ'' موجودہ ریاستِ جموں وکشمیر کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کی حیات، ریاست میں سکھ راج کے خاتمے اور ڈوگرہ حکومت قائم ہونے کے ضمن کی اُہم دستاویز ہے۔ جناب اُرجن دیو مجبوؔر نے اِس اہم تاریخی دُستاویز کا اَپنے خاص تحقیقی اَنداز میں محاکمہ کیا ہے---- جموں وکشمیر میں تارِ برقی متعارف کرانے اور بعض نادر و نایاب سفرناموں اور مثنویوں میں کشمیر کی تعریف و توصیف کے حوالے سے جناب منظور احمد دایک کا مضمون بعض اہم کڑیوں کو جوڑنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

اِدارہ اِس اِشاعتِ خصوصی کے فاضل مضمون نگاروں اور ترجمہ کار حضرات کا انتہائی ممنون ہے جنہوں نے اپنی گُونا گُوں مصروفیات اور بے پناہ دُشواریوں کے باوجود ہمیں اَپنی نظرِ کرم سے نوازا۔ ساتھ ہی اِس بات کا گِلہ بھی ہے ہمارے بعض محترم قلمکار حضرات نے حسبِ وعدہ اور پیہم تقاضوں کے باوجود اَبھی تک ہمیں جیک ماؤنٹ، جارج فورسٹر، جیمس آر بتھ ناٹ، اُرنی، جارج بہلر، ٹی رسل وڈے اور دیگر یورپی سیاحوں کے سفرناموں اور

یاداشتوں پر مبنی نگارشات ارسال نہیں کیں، جسے بہرحال بدقسمتی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی اُستوار نہیں

ہماری کوششیں بہر صورت جاری ہیں اور اِرادہ بھی ہے کہ آپ کے دستِ تعاون سے اس پروجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

زیرِ نظر جلد کی تکمیل میں جناب رمیش مہتہ سیکرٹری اکیڈیمی کی راہنمائی ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتی رہی اور اُن کا دستِ شفقت ہمارا قابلِ فخر سرمایہ ہے---- اُستاد محمد عباس نے اپنی خداداد صلاحیتیں بروئے کار لاکر اِس اِشاعتِ خصوصی کو جدید کمپیوٹر کمپوزنگ سے آراستہ کیا۔ جناب ناظم الدّین اور جناب غلام نبی میر لائبریرین نے بعض نادر و نایاب کتابیں دستیاب کرا کے ہمارے وَلولوں کی آبیاری کی اور مکرم و محترم جی احمد آرٹسٹ نے سرورق عنایت کیا۔ اِدارہ اِن تمام حضرات کی کاوشوں کو قدر منزلت سے دیکھتے ہوئے انتہائی ممنون ہے کہ اُن کی رہنمائی اور خلوص کی بدولت ہم اپنے آپ کو اِس معطر و مشکبار مٹی کے بعض مخفی گوشوں کو اُجاگر کرنے کے اہل پاتے ہیں۔

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اِشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردُوں کے سِتارے
ناپید تیرے بحرِ تخیّل کے کِنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر، اَثرِ آہِ رسا دیکھ

—— محمد اَشرف ٹاک

پروفیسر محمد ابراہیم

''چچ نامہ'' میں کشمیر کا تذکرہ

تاریخ کشمیر کے پرانے ماخذوں میں جن کتابوں کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے اُن میں ایک ماخذ ''فتح نامہ'' معروف بہ ''چچ نامہ'' قابلِ ذکر ہے۔ ایک انگریز مورخ اِلفنسٹن اِسے ''ہند و سندھ تاریخ'' کا نام دیتا ہے۔ طبقاتِ اکبری میں ملا نظام الدین اِسے منہاج السالکین اور ''چچہ نامہ'' لکھتا ہے، جبکہ یہ تمہید بھی اختتام پر ''فتح نامہ'' ہی کے نام سے ہے۔ نورالحق ''زبدۃ التواریخ'' میں اس کے بار بار حوالے دیتا ہے۔ اِبتدا میں ''چچ نامہ'' بطور ماخذ بہت ہی کم استعمال ہوا ہے۔ البتہ ہند و سندھ تاریخ میں اس کی تواریخی حیثیت اَب مُسلّمہ تسلیم کی جاتی ہے۔

واقعات اور تواریخی شہادتوں کی روشنی میں ظاہر ہوتا ہے کہ ''چچ نامہ'' ابتداء میں عربی زبان ہی میں تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ اصل کتاب کی تصنیف کرنے کی تاریخ کیا رہی ہوگی البتہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی ''چچ نامہ'' تاریخ فتوح البلدان بلازری کتاب کی طرح تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں تالیف کی گئی ہے۔ عربی چچ نامے کا مصنف تواریخی اعتبار سے پس پردہ ہے

اور کوئی بھی مورخ عربی مصنف کی نشاندہی نہیں کرسکا ہے۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ ''چچ نامہ'' عربی سے فارسی زبان میں محمد علی بن حامد ابوبکر کوفی کے ذریعے اُس وقت ترجمہ ہوا ہے جب ہندوستان میں نصیرالدّین قباچہ حکومت کررہا تھا۔ اگرچہ مُصنف مذکور اپنی اہلیت کے اعتبار سے کوفہ شہر کا باشندہ تھا، جو قرون وسطیٰ میں عراق کا ایک مشہور و معروف شہر مانا جاتا تھا، لیکن حالات کی مجبوری کے سبب وہ سندھ کے اُچہ شہر میں آباد ہوا اور وہیں ''چچ نامہ'' اٹھاون برس کی عمر میں ۶۱۳ھ مطابق ۱۲۱۶ء عربی سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اِس حساب سے ترجمہ کار ۵۵۵ھ مطابق ۱۱۶۰ء میں پیدا ہوا۔ ترجمہ کار نے کتاب کے پیشِ لفظ میں ترجمہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ مؤرخوں نے تواریخ قلمبند کئے ہیں اور وہ ان کی رَوش قائم رکھتے ہوئے اپنی باری پر یہ ترجمہ کر رہا ہے۔

''چچ نامہ'' عام طور پر اُس کارنامے یا تواریخ کا نام ہے جس میں چچ فرزند سلائج برہمن کی سلطنت ہڑپ کرنے کا تذکرہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ اِس میں پہلی صدی ہجری میں اُن اسلامی فتوحات کا تفصیلی تذکرہ ہے جو عرب، خاص طور محمد بن قاسم اور اس کی فوج کو راجہ داہر اور اس کے حواریوں پر حاصل ہوا۔ اِس لحاظ سے چچ نامہ کا ایک مشہور نام کتاب ''الفتح'' (فارسی فتح نامہ) بھی ہے۔

واقعات درج کرنے سے قبل چچ نامہ کا مؤلف کتاب کے پیشِ لفظ میں اُن تواریخی وجوہات کی نشاندہی کرتا ہے جن سے سلائج برہمن کے بیٹے چچ اور اُس کی اولادوں کو سندھ صوبے پر بالا دستی حاصل ہوئی تھی۔ چچ نامہ کے مطابق چچ سنسکرت زبان کا بڑے پائے کا عالم اور فاضل تھا۔ خوش کلامی، زبان کی تیزی

اور فصاحت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُپنی شیریں کلامی اور علم ریاضی پر دسترس رکھنے کی وجہ سے ابتداء میں اُلور کے رائے سہسی کے پاس وزیر رام کے میرمنشی کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ چچ کا قابلِ ذکر اور امتیازی وصف اُس کا انتہائی خوش شکیل ہونا تھا جس وجہ سے رائے سہسی کی ملکہ اُس کی خداداد شکل وصورت اور قد وقامت پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ ملکہ جس کا نام سوہندی تھا، بے اولاد تھی، لہذا وہ چچ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا چاہتی تھی۔ البتہ اپنے آقا سے بے ضمیری کرنے کی اُس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد رائے سہسی بیمار ہو کے مرگیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد رانی سوہندی نے اپنی چالاکی سے وہ سارے امیر اور وزیر بیڑیوں میں جکڑوانے کے بعد قتل کرائے جنہوں نے اُس کے خلاف بغاوت یا شورش کرنے کی بات بھی کہی تھی۔ اس کے بعد اُس نے اپنی حکمتِ عملی سے سلطنت کی ذمہ داری چچ کے حوالے کی اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اُسے اپنے اَزدواجی رشتے میں لایا۔ اِن ابتدائی واقعات کے بعد ''چچ نامہ'' اُن حالات کی تفصیل ہے جن سے عرب کے مسلمان، محمد بن قاسم کی سرکردگی میں پہلی صدی ہجری کے آخری حصے میں پے دَر پے فتوحات کے سبب سندھ کے حکمراں بن بیٹھے۔

چچ نامہ اور کشمیر

چچ نامہ اگرچہ مجموعی طور سندھ اور ملحقہ علاقوں خاص طور ساہی وال (پنجاب) اور ملتان کی تواریخ ہے، تاہم اِس سے کشمیر کے بعض سیاسی جغرافیائی حالات کی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ اِس حقیقت کا اندازہ درجِ ذیل عبارت سے ہوتا ہے جسے چچ نامہ سے اخذ کیا گیا ہے۔

''روایت کے مطابق جب چچ سندھ کے شہر اُلور (موجودہ نام اَرور) کا حکمران بن گیا اور رائے سہسی کی بیوہ رانی سوہندی سے اَزدواجی رشتہ قائم کیا، اِس قصے کا پتہ سورگباشی رائے سہسی کے مہرت نامی بھائی کو لگ گیا، جو چتوڑ کا حکمران بھی تھا، اُس کے لئے یہ معاملہ غیرت کا باعث بن گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دُو حکمرانوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ البتہ اُپنی چالاکی سے چچ نے چتوڑ کے حکمران مہرت کا سرمیدانِ جنگ میں قلم کردیا۔ اِس واقعے کے بعد ملتان میں چچ کا مقابلہ ملک بجھراہ سے ہوا۔ البتہ مقابلے کی تاب نہ لاکر بجھرا قلعے میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوگیا وہاں اُس نے کشمیر کے حکمران کو بذریعہَ قاصد یہ پیغام بھجوایا کہ سلائج برہمن کا بیٹا اُلور کا راجہ بن بیٹھا ہے لہذا آپ کشمیر سے فوج اور ساز وسامان بھیجیں۔ لیکن ملک بجھرا کے قاصد کشمیر پہنچنے سے قبل ہی کشمیر کے اُس وقت کے حکمراں نے انتقال کیا تھا اور اِس کی جگہ اُس کا بیٹا تخت نشین کیا گیا تھا۔ بجھراہ کا خط وصول کرنے کے بعد حکومت کے اکابرین نے اُسے جواباً لکھ بھیجا کہ کشمیر کے بادشاہ نے انتقال کیا ہے اور اس کی جگہ اُس کے نابالغ بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا ہے جو کم سِن ہونے وجہ سے ناتجربہ کار بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا ملک اِس وقت بدنظمی اور افراتفری کا شکار ہے۔ ان حالات میں ہم آپ کی کوئی دست گیری نہیں کرسکتے۔ بہتر یہ رہے گا کہ آپ اپنی مدد آپ کریں۔

کشمیر سے ایسا جواب موصول ہوجانے کے بعد ملک بجھرا سخت مایوس ہوا اور ملتان شہر چچ کے قبضے میں دینے کے بعد وہ اپنے جملہ عیال سمیت کشمیر کے پہاڑوں میں کسی نامعلوم جگہ پر پناہ گزیں ہوگیا۔

راجہ اُلور کے سلسلے میں کشمیر کا تذکرہ:

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ہندوسندھ کی راجدھانی اَلور (اَروَر) ایک عظیم شہر تھا۔ یہ اُسی سیحون (دریا) کے کنارے پر آباد تھا جسے مہران کہتے ہیں (قدیم زمانے میں دریائے سندھ کو دَریائے مہران کہتے تھے) اِس شہر کا بادشاہ سہسی رائے کا بیٹا سہس تھا۔ اُس کی سلطنت کی حدود (مشرق میں کشمیر تک، مغرب میں مکران تک، جنوب میں دَریائے شور (بحرِ ہند) اور دیبل (کراچی) تک اور شمال میں کردان کیکان نان کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

چچ کا کشمیر کی سَرحدوں تک پہنچنا:

روایت کے مطابق چچ، ملتان فتح کرنے کے بعد شاکل ہا مقام تک پہنچا جو کشمیر کی سرحد پر واقع تھا۔ چچ اُس جگہ ایک مہینے تک قیام پذیر رہا۔ اُس نے مختلف پودے منگوائے جن میں ایک دیودار اور دوسرا اسفیدے کا تھا۔ یہ دونوں پودے اُس نے کشمیر کی سرحد پر حد بندی کی غرض سے بوئے۔ یہ پودے پنج ماھیات (جہلم) کے کنارے پر بوئے گئے۔ جو کشمیر کے پہاڑوں کے متصل ایک مقام تھا۔ وتستا (جہلم) اِسی ملک کے پہاڑوں میں سے نکلتا ہے۔ اِن دونوں پودوں سے پتیاں پھوٹنے تک چچ شاکل ہا جگہ پر قیام پذیر رہا اور یہ کہہ کر واپس لوٹا کہ کشمیر اور ہمارے درمیان یہی جگہ دو ملکوں کی سرحد ہے[1]۔

پنج ماھیات لفظ کی تحقیق اور مراد:

پنج ماھیات دراصل عربی لفظ ہے نہ کہ فارسی زبان کا۔ معنی اس کے پانچ آب اور ماہیت ہے "میاہ" لفظ کی بگاڑی گئی صورت اور اس کے معنی پانی کے ہیں۔ پنج ماھیات لفظ سے جہلم کے بالائی حصے کا بہاؤ مراد ہے جہاں سے جہلم

[1] شاکل پرانے زمانے کا شاکلہ ہے اور آج کل کا سیالکوٹ، جو اُس وقت کشمیر کا حصہ تھا۔

تنگ وادی سے نکل کھلے میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ سرجنٹ برسوہام ایک انگریزی مورخ اپنی کتاب "ریڈ ٹو دی خیبر" کے صفحہ ۴۳ پر رقمطراز ہے:

"یہ عجیب اِتفاق ہے کہ جب ہم دَریائے جہلم کی پانچ شاخوں سے گزرے، وہاں سے ہمیں ایک چھوٹا پنجاب نظر آیا۔ چچ نامہ میں شاکل ہا بقول کننگھم "شاید کلر کہار مراد، جو پنجاب کے اندر نمک پہاڑی (کھیوڑا) میں ایک جگہ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے اُس وقت شاکل ہا کشمیر کے بادشاہ کی ملکیت تھا"۔

کشمیر کے بادشاہ کا ایک طاقتور حکمران ہونا:

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ و ہند پر حملہ کیا۔ محمد بن قاسم عراق کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کا چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ داماد بھی تھا۔ سندھ کی مہم پر روانہ ہونے کے وقت، بقولِ مؤرخین، محمد بن قاسم کی عمر ۱۷ سال تھی۔ جب محمد بن قاسم ۹۲ھ مطابق ۷۱۱ء میں ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد دیبل (موجودہ کراچی) کو فتح کرتا ہے۔ سندھ کے بادشاہ راجہ داہر نے اُسے نیرون (موجودہ حیدرآباد سندھ) کے مقام سے ایک دھمکی آمیز خط لکھا جس میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کو غیر دانشمندانہ اقدام قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ:

"دیبل فتح کرنا محمد بن قاسم کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں کیونکہ یہ شہر تاجر پیشہ اور صنعت کاروں کی بستی ہے۔ نہ وہاں کوئی مضبوط فصیل ہے اور نہ قلعے کی حفاظت کرنے والی کوئی فوج ہے۔ دیبل کے علاوہ اُس کی سلطنت میں اور بھی کئی مضبوط شہر ہیں جن کا فتح کرنا اُس کے لئے آسان بات نہیں۔ قلعہ بند اور مضبوط شہروں کے علاوہ اُس کے طرفدار کئی راجے ہیں،

جواگر مقابلے پر آتے تو محمد بن قاسم اور اُس کی فوج کی گرد اُڑا دیتے۔ مثلاً راے جے سیہ اس کائنات کے بادشاہوں میں بہت ہی طاقت ور حکمران ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کا بادشاہ بڑے تاج و تخت کا مالک اور جھنڈا بردار حکمراں ہے۔ اس کی ڈیوڑھی پر فقط ہندوستان کے راجے ہی نہیں بلکہ مکران اور توران کے حکمران بھی اس کی اطاعت کا طوق خوشی خوشی اپنے گلے میں ڈالتے ہیں۔ کشمیر کے اِس بادشاہ کے پاس ایک سو ہاتھی ہیں اور خود سفید ہاتھی پر سوار رہتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بھی سوار ٹِک نہیں پاتا اور نہ پیدل چلنے والا۔ اگر وہ بہادر پہلوان مقابلے کی خاطر آئے تو ضرور میری رعایا تمہاری تکلیف سے بچ جاتی اور تمہاری عربی فوج یہاں کا رُخ نہ کرتی''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے نام راجہ داہر کے خط میں کشمیر کے جس راجے کی طرف اِشارہ کیا گیا ہے وہ کون ہو سکتا ہے......؟ ہمارے خیال میں غالباً وہ راجہ للتادتیہ مکتا پیڈ ہونا چاہیے جو ۷۵۴ بکرمی (۶۹۷ء) میں اپنے بھائی راجہ تاراپیڈ کے مرنے کے بعد کشمیر کا راجہ بن گیا۔ مُنصف اور عدل پرور ہونے کے علاوہ راجہ للتادتیہ ملکی نظم و نسق اور دیگر کاموں میں بھی ماہر تھا۔ اُس نے اپنی طاقت ور فوج کے ذریعے نہ صرف پنجاب اور دہلی کو فتح کیا تھا بلکہ قنوج کے راجہ یشودھم کو ایک جنگ میں شکست فاش دی تھی۔ مشرق میں اُس کی سلطنت کی حدود گورہ دیش (بنگال) اور جنوب میں دریائے شور (بحرِ ہند) تک تھیں کشمیر کے شمال میں اُس کے قبضے کے اندر وسطِ ایشیا یعنی توران (ترکستان) شہرِ سمرقند، تاشقند، خوقند، کاشغر، تنگان اور ختن بھی تھے۔ اس قیاس کی بڑی وجہ راجہ داہر اور راجہ للتادتیہ کا ایک ہی زمانہ ظاہر کرتا ہے۔ موُرخ حسن (تاریخِ حسن جلد ۲، صفحہ

۸۲-۸۴) راجہ للتادتیہ کے متعلق رقمطراز ہے (فارسی سے ترجمہ)

''راجہ للتادتیہ۔ جس کا لقب مکتا پیڈ تھا، ۷۵۴ بکرمی (۶۹۷ء) میں بھائی کے مرنے کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اِردگرد کے ممالک جو اُس کے بھائی کے دورِ اقتدار میں ہاتھ سے نکل گئے تھے اُن کو ازسرِ نو قبضے میں لایا۔ سلطنت کا نظم و نسق دُرست کرنے کے بعد ایک عظیم فوج کے ساتھ پنجاب اور دِلی کو فتح کیا۔ اِس کے بعد قنوج کے راجہ یشودھم کو مغلوب اور تباہ کر کے اپنی اطاعت میں لایا اور اس کے وزیر مترشرما کو گرفتار کیا۔ اس فتح مندی کے بعد راجہ للتادتیہ نے کالکا دریا تک گورہ دیش (بنگال) کو اُپنے قبضے میں لایا اور اِسی کے ساتھ ہی بہار پر حملہ کیا اور دریائے شور تک بہت سے شہروں اور علاقوں کو فتح کیا۔ وہاں سے وہ جگن ناتھ جی کی یاترا کے لئے بھی گیا اور وہاں کے برہمنوں کو نذر و نیاز دے کر مالا مال کیا۔ اِس کے بعد وہ دکن کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں کے تمام راجاؤں کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ راجہ للتادتیہ نے جزائر سراندیپ، سنگلدیپ، گجرات اور مالوہ قبضے میں لانے کے بعد دُوارکا اور اُچلین بھی فتح کئے۔ اِس کے بعد کابل اور خراساں فتح کرنے کے اِرادے سے بھی بُخارا شہر پر زبردست حملہ کیا۔ اس شہر کے حکمراں مومن خان کو چار بار زیر کیا اور خراج ادا کرنے کے وعدے پر اُس نے اپنے آپ کو گرفتاری سے چھڑوایا۔ بخارا کے بعد اُس نے سمرقند، تاشقند، خوقند، کاشغر، تنگان اور ختن شہر جنگ اور صلح صفائی سے فتح کئے۔

پُرانے زمانے میں کشمیر کی جغرافیائی حد بندی:

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں کشمیر کا نقشہ ایسا نہ تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ اِس کی حُدود وادی کے باہر وسطی پنجاب تک پھیلی ہوئیں تھیں۔ آج بھی راجوری، پونچھ، بھدرواہ، سیالکوٹ، کنجاہ ضلع گجرات (پاکستان) اور لاہور میں کشمیر قوم کے لوگ کثرت سے آباد ہیں۔ یہ دراصل وہی لوگ ہیں جو کشمیر کے اقتدار کے وقت نوآبادیوں کی حیثیت سے راجہ للتادتیہ کے زمانے میں ان

جگہوں پر آباد ہوئے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر سے رَوانہ ہونے کی تواریخ بھول کر کچھ اور کہنے لگے۔ غالباً ان ہی لوگوں میں علامہ اقبالؔ اور منشی محمد الدّین فوقؔ کے آباء و اجداد[1] بھی رہے ہوں گے اور چچ نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے دَوران کشمیر کی جغرافیائی حدود جالندھر تک پھیلی ہوئیں تھیں۔ چچ نامہ کا مصنف رائے جے سیہ کے متعلق لکھتا ہے:

''جے سیہ نہانے کے بعد کھا پی کر، سلح اور ساز و سامان کے سمیت گھوڑے پر سوار ہو گیا اور راجہ درو ہر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ درو ہر کرتج شہر کا حکمران تھا۔ جے سیہ وہاں سے اجازت لئے بغیر اور پیغام رکھا کہ راجہ درو ہر کو کہنا چاہئے کہ جے سیہ یہاں سے روانہ ہو گیا۔ کرتج شہر سے وہ جالندھر پہنچ گیا جو کشمیر کا ایک حصہ تھا۔ وہاں کا حکمران بلہرا تھا۔ جے سیہ جالندھر میں مہیا رکھے گئے مکانات میں عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت کے وقت تک مقیم رہا''۔

یہ جے سیہ راجہ داہر کا بیٹا تھا جو بہادری اور دانشمندی میں لاثانی تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جالندھر شہر کا بلہرا حاکم کون تھا۔ ہمارے خیال میں یہ کشمیر کے بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا کوئی گورنر تھا جو جالندھر میں نائب حکمراں کی حیثیت میں وہاں نظم و نسق چلا رہا ہوگا۔ کشمیر کی قدیم جغرافیائی حد بندی کے سلسلے میں چچ نامہ کا مصنف (انگریزی ترجمہ ص ۱۹۲) ایک اور جگہ لکھتا ہے:

''محمد بن قاسم نے جب کشتیوں کے ذریعے خزانہ روانہ کیا، اُس نے حکم

---

[1] فاضل مقالہ نگار کا اخذ کردہ نتیجہ تسلیم کرنا گراں گذرتا ہے کیونکہ ڈاکٹر اقبالؔ کے آباء و اجداد للتادتیہ کے بعد بہت عرصہ گزر جانے کے بعد کشمیر چھوڑ کر گئے ہیں اور فوقؔ کے اعزاء و اقرباء ابھی زینہ گیر میں آباد ہیں۔ (ادارہ)

دیا کہ دیبل شہر میں خزانہ جہاز پر لاد کر خلیفے کو بھیجا جائے۔ خود وہ ملتان شہر میں پچاس ہزار منتخب سواروں کے ساتھ مقیم رہا۔ وہاں سے اُس نے ابو حلیم شیبانی دس ہزار سواروں کے ساتھ تبلیغِ اسلام کی خاطر قنوج شہر بھیجے۔ ساتھ ہی حلیم شیبانی کو کہا کہ قنوج کے راجہ کو کہنا چاہئے کہ وہ ہر سال محمد بن قاسم کے سرکاری خزانے میں ایک مخصوص رقم بطورِ خراج داخل کرے۔ اِس کے بعد محمد بن قاسم اپنی فوج کے ساتھ ماھیات کے اُس مقام پر پہنچتا ہے جہاں راجہ داہر کے والد رائے چچ سلائمن نے دیودار اور سفیدے کے بوٹے بو کر کشمیر کے راجہ اور اپنے ملک کے مابین حد بندی کی تھی۔ محمد بن قاسم نے یہ حد بندی اَز سرِ نو قائم کی۔

مُلتان پر کشمیریوں کی حکومت:

چچ نامہ کے صفحہ نمبر ۱۹۰ اور ۱۹۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ملتان شہر کشمیر کے بادشاہ کے قبضے میں تھا۔ اِس سلسلے میں چچ نامہ کے مُصنّف کا بیان یوں ہے:

''محمد بن قاسم نے جب سندھ کے کم و بیش ساٹھ ہزار درم وزنی مالِ غنیمت اسلامی مجاہدوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک سوار کے حصے میں چار، چار سو درم آئے۔ دفعتاً ایک برہمن نمودار ہوا اور کہا کہ جب یہاں کے لوگوں کی حکومت ختم ہو گئی مندروں کی جگہ مسجدوں اور منبروں نے لی، میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے ملتان کے بزرگوں کی زبانی سُنا ہے کہ قدیم زمانے میں ملتان کے اِس شہر میں جسوین نام کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جو کشمیر کے راجاؤں کی اُولادوں میں سے تھا۔ برہمن ہونے کے علاوہ جسوین زاہد اور پرہیزگار بھی تھا۔ اُسے دھرم کی پوری جانکاری حاصل تھی۔ مورتیوں کا پجاری بھی تھا۔ جب اُس کی دولت میں بے اندازہ اضافہ ہوا اُس نے ملتان شہر کے مشرقی حصے میں ایک سو گز مربع رقبے کا ایک حوض تیار کرایا۔ اس کے بیچ میں پچاس گز لمبا اور

پچاس گز چوڑا مندر بنوایا اور مندر کے نیچے تانبے کے بڑے بڑے چالیس مرتبان دفن کرائے۔ اس کے بعد اس جگہ سونے کی ایک مورتی نصب کرائی۔ حوض کے دائیں بائیں کئی پیڑ بوئے۔ برہمن کا یہ بیان سن کر محمد بن قاسم اپنے کئی رفیقوں کے ہمراہ مندر میں چلا گیا۔ وہاں اس نے سونے کی مورتی دیکھی جس کی سُرخ یاقوت کی دو آنکھیں تھیں جن سے وہ مُورت زندہ و جاوید لگ رہی تھی۔ محمد بن قاسم نے فوراً تلوار نکالی اور اس مورتی کی گردن اُڑانی چاہی کہ دفعتاً مندر کا پُجاری چلا اُٹھا کہ اے انصاف پرور بادشاہ، یہ ایک مُورت ہے جو ملتان کے جسور لجہ نے بنوائی ہے۔ اس کے نیچے ایک بڑا خزانہ دفن ہے۔ محمد بن قاسم نے وہ ۲۳۰ من وزنی مُورت فوراً اُٹھوائی اور اس کے نیچے ایک بڑا خزانہ دفن دیکھا اور برہمن کے کہنے کے مطابق چالیس مرتبانوں دفن شدہ خزانہ دیکھا اور ان مرتبانوں میں ۱۳۲۰ من وزنی سونا تھا۔ وہ مورت، سونا اور ملتان میں مالِ غنیمت کے بطور جو ہیرے، جواہرات اُسے دستیاب ہوئے، وہ تمام اُس نے خلیفۂ عرب کی خدمت میں روانہ کر دیئے"۔

بادشاہِ کشمیر کی سخاوت اور حمیم نام کے ایک عرب مسلمان کشمیر آنا:

اکتوبر ۷۱۲ء میں جب جے سیہ کو عرب فوج کی رُوانگی کا پتہ چلا، وہ جے پور کے جنگل علاقے میں پہنچ گیا۔ جے سیہ کی فوج میں عرب کے علاقائی قبیلے کا ایک شخص تھا۔ مذکورہ عرب شخص نے جب جے سیہ کی رفاقت ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اُس نے کشمیر جانے کا فیصلہ جے سیہ کے پاس آشکارا کیا۔ وہاں جے سیہ نے بادشاہِ کشمیر کے نام ایک خط لکھا، جس کی راجدھانی پہاڑوں کے بیچ میں تھی۔ وہ خط جب رائے کشمیر کے سامنے پڑھا گیا، اُس نے فوراً حکم دیا کہ کشمیر کے ماتحت علاقوں میں شاکل ہا، جے سیہ کو دیا جائے۔ کشمیر کے بادشاہ نے جے سیہ کو کچھ اور تحائف اور انعامات بھی بھیجے، جن میں زین سمیت پچاس گھوڑے اور دو

سو شاہی خلعت تھے۔ جے سیہ نے شام کا وہ باشندہ حمیم بن سما، شاکل ہا بھیجا۔ جب جے سیہ دوسری بار کشمیر پہنچا اُس کو بادشاہ کی طرف بہت عزت دی گئی۔ اِس موقعے پر اُسے بادشاہ کشمیر کی طرف سے ایک چھتر اور ایک کرسی بخشی گئی۔ اس وقت شامی شخص حمیم بھی جے سیہ کے ساتھ تھا۔ کچھ وقت کے بعد جے سیہ شاکل ہا میں مر گیا اور سما کا بیٹا حمیم اُس کا جانشین بن گیا۔ وہاں اُس نے مسجد تعمیر کرائی۔ اُس کے اولاد آج بھی (عربی چچ نامہ تصنیف کرنے کے وقت، جو نامعلوم ہے) شاکل ہا شہر میں موجود ہیں۔ اِس حمیم نام کے شامی شخص کی بادشاہِ کشمیر میں تکریم کی جاتی تھی۔

خلاصۂ کلام:

چچ نامہ بنیادی طور پہلی صدی ہجری کے اندر (ساتویں صدی عیسوی) سندھ و ہند، دیبل، ملتان اور ساہیوال کی تواریخ ہے۔ البتہ کہیں کہیں اِس تواریخ سے کشمیر کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کی جانکاری بھی ملتی ہے۔ اِس سے عیاں ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم اور اس کے رفیق نہ صرف پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل کشمیر سے واقف تھے بلکہ بعض عرب باشندے جن میں حمیم بن سما شامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، کشمیر پہنچ چکے تھے اور چچ نامہ اِس بات کی دلالت کرتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کی سلطنت کی سرحد میں جالندھر اور تن کانن کے پہاڑوں یعنی لالہ موسیٰ اور کھیواڑ سے ملتی تھیں۔ اِس لحاظ سے قدیم کشمیر کا تواریخی ماخذ ہونے میں چچ نامہ بلاشُبہ قابلِ قدر تواریخی کتاب ہے۔

............☆............

محبوب اللہ مجیب

سلاطینِ کشمیر اور حکومتی نظم و نسق

ہر ملک کا حکومتی نظم و نسق اور اس کا دستور وہیئت بہت حد تک اس کے جغرافیائی حالات، رسم و رواج اور صورت و سیرت سے مل کر بنتا ہے اور یہ سب اُس مُلک کی ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم کسی مُلک کے نظامِ حکومت کے ذریعہ وہاں کے لوگوں کی صورت و سیرت اور اُن کے خیالات کا بھی بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں بھی مندرجہ بالا اُصولوں کے مطابق ہی سلطنت سے وابستہ نظم و نسق کی تشکیل ہوئی۔ پُرانے ہندو راجاؤں نے کشمیر کو جو آئینی دستور دیا تھا وہ اس کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اسی لئے سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں اُس میں کوئی خاص ردّ و بدل نہ ہوا اور جوں کا توں چلتا رہا۔ زمانہ ہمیشہ تغیر و تبدل کا دِل دادہ رہا ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں اور بہت سے آئین اور دستور حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ ہی ساتھ مفقود بھی ہوتے ہیں اور وجود میں بھی آتے ہیں۔ چنانچہ کشمیر میں سُلطان سکندر شاہ (۱۳۸۹ء) کے دَورِ حکومت میں بہت سے نئے قوانین اور ضوابط وجود میں

آئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کی سلطنت پر تُرکوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا جن کا انتظام سلطنت غزنوی کی حکومت سے مستعار تھا اور پُورے طور سے مکمل تھا سُلطان سکندر اور زین العابدین نے کشمیر کے حکومتی نظم و نسق کو دہلی سلطنت کے انتظامِ حکومت کی طرح بہتر اور مکمل بنانے کے لئے اُپنے مُلک کی اِنتظامی تشکیل میں کچھ ترمیم و اضافہ کئے جس کا ذکر ذیل میں دَرج کیا جا رہا ہے

سُلطان (بادشاہ)

کشمیر میں ہندو راجاؤں اور مُسلمان سلاطین کے زمانے میں اور ملکوں کی ہی طرح بادشاہ کی ذات سارے سیاسی اور اِنتظامی فرائض کا محور سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ شاہی حکومت کا نظریہ بڑا پُرانا نظریہ تھا جس میں مملکت کی تشکیل اور بقاء کے لئے بادشاہ کی ذات بہت ہی ضروری تھی۔ مہا بھارت، منو، اور کوٹلیہ نے بادشاہ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

> وہ لوگ جن کا بادشاہ نہ ہوتا تھا، تباہ ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کو اس طرح نگل جانے کی کوشش کرتے تھے جس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مہا بھارت صفحہ ۲۷)

منو نے اس نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

> ''(بادشاہ نہ ہونے سے) لوگ نشے کے استعمال، طمع، غیض و غضب اور عیاشی جیسی بُرائیوں میں مُبتلا ہو کر بالکل ناکارہ ہو گئے۔ دُنیا میں انتشار پھیل گیا اور ویدوں کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف کا بھی خاتمہ ہو گیا۔'' (منو۔ صفحہ ۴۷)

مُسلم فقہا نے بھی اپنے طور پر بادشاہ کی ضرورت کا اس طرح

اِظہار کیا ہے:۔

"اگر سُلطان (بادشاہ) کا وجود نہ ہوتا تو فتنہ وفساد کے طوفان سے کبھی نجات حاصل نہ ہوتی۔ نہ خُود غرضی ونفس پرستی کا قلعہ قمع ہوتا۔ لا قانونیت اور نفسانیت سے مغلوب ہو کر نوعِ انسانی قصرِ ہلاکت میں گر جاتی۔"

(آئینِ اکبری۔ ابوالفضل۔ صفحہ ۲۹)

اِس طرح بادشاہ کا وجود مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر جہاں دوسرے مُلکوں کے لئے ناگریز تھا وہاں کشمیر اس ضرورت سے کیسے بچ سکتا تھا۔ چنانچہ سُلطان کی ذات ایک ایسے حاکمِ اعلیٰ کی سی تھی جس میں تمام اقتدارِ سلطنت مضمر تھا۔ دستوریہ، انتظامیہ اور عدلیہ سے متعلق ساری طاقت واحد سُلطان کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ وہ دُستور کا نفاذ کرتا تھا۔ انتظامِ حکومت سنبھالتا تھا اور حق وانصاف کی بخشش کرتا تھا۔ اگر بادشاہ اَمن وسلامتی کے زمانے میں رِندی و سرمتی کا سرغنہ ہوتا تھا تو جنگ وجدل کے ایّام میں فوج کا کمانڈر انچیف بھی ہوتا تھا۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جس سے بادشاہ کی ذات اور شخصیت سب سے الگ تھلگ ہو جاتی تھی۔ اَپنی اِس شخصیت کو الگ تھلگ کرنے اور اپنے آپ کو نُمایاں کرنے کے لئے سلاطینِ کشمیر دُوسرے بادشاہوں کی طرح مختلف خطابات اَپنائے ہوئے تھے، جیسے سلطان زین العابدین نے اَپنے لئے نائب امیر المومنین کا خطاب اختیار کیا تھا اور غازی چک نے محمد ہمایوں کا لقب اپنایا تھا۔

یہی نہیں، بلکہ بادشاہ اَپنی ذات کی تشہیر کے لئے اَپنا نام بھی خطبہ میں شامل کرلیا کرتا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے پہلے جُمعہ کی نماز میں ہونے والے خطبہ میں صرف خلیفۂ وقت کا نام شامل ہوتا تھا لیکن تیسری صدی ہجری کے بعد

مسلمان بادشاہوں نے اَپنا نام بھی خطبہ میں شامل کرلیا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے سلطنتِ دہلی کے سلاطین اور مُغل شہنشاہ بھی اَپنا نام خطبہ میں شامل کرتے تھے اور اِسی طرح سلاطینِ کشمیر بھی اَپنا نام خُطبہ میں اسی طرح شامل کرتے تھے۔

سلاطینِ کشمیر اَپنی ذات کو ممتاز کرنے کیلئے سِکوں پر بھی اَپنا نام کندہ کراتے تھے جو اُن کے اقتدارِ اعلیٰ ہونے کی دلالت کرتا تھا۔

تاجِ زرّیں اِس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ سلاطینِ کشمیر اَپنے اقتدارِ اعلیٰ کو امتیازی شان دینے کیلئے تاجِ زرّیں پہنتے تھے۔ تخت سے دَست بردار ہونے کے بعد بادشاہ اَپنے جانشین کو یہ تاج پہناتا تھا۔ یُوسف شاہ (۱۵۷۹ء) کو جس وقت تخت سے دَست بردار ہونا پڑا تو اُس نے اپنا تاجِ زرّیں سیّد مُبارک کو بھیجا اور اُمرا نے اُسے سُلطان منتخب کیا۔

مندرجہ بالا طریق اَپنا کر سُلطان اپنے آپ کو مقتدرِ اعلیٰ کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ سلاطینِ کشمیر اپنا ہاتھ بٹانے کیلئے کچھ مشیر کاروں کو بھی منتخب کرتے تھے۔ ان مشیر کاروں کو کسی حد تک آج کے وزراً کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ مشیر کار، بادشاہ کو ہر اَہم معاملہ میں مدد کرتے تھے اور کسی کام کو کرنے اور اُس سے بچے رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ بادشاہ اُن کی بات ماننے اور اُن سے انکار کرنے کا مکمل مجاز ہوتا تھا۔

مذہب سے متعلق جب کوئی باریک نکتہ درپیش ہوتا تو بادشاہ اپنے مشیروں سے مدد نہ لے کر مذہبی پیشوا سے مدد لیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں سلطان شیخ الاسلام کی رائے طلب کرتا تھا اور اسی طرح

ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں پنڈتوں سے ۔اوراس کے بعد وہ اپنا ذاتی فیصلہ دیتا تھا۔ مذہب کے معاملات میں بادشاہ زیادہ خود رائی نہیں برتتا تھا کیونکہ ایسا کرنے پر ملک میں انتشار اور انقلاب برپا ہو سکتا تھا۔ دیگر طرز ہائے حکومت کی طرح شاہی حکومت بھی بغیر کسی دانش مند کے نہیں چل سکتی۔ سکندر اعظم جیسا غیر معمولی بادشاہ بھی مملکت کے پیچیدہ مسائل کو دانش وروں کی رائے لے کے حل کرتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کو موڑ دینے والے بادشاہ علاؤالدین خلجی اور اکبر بادشاہ بھی بغیر کسی وزیر کی صلاح لئے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

وزیر کی حیثیت اس وقت بادشاہ کے بعد کی ہوتی تھی۔ اس کی ذمہ داریاں اوراس کے اختیارات بہت وسیع اور لامحدود ہوتے تھے۔ چنانچہ وزیر اُسی شخص کو بنایا جاتا تھا جو انتظامِ سلطنت کے بارے میں پوری طور سے واقف ہوتا تھا اور دیگر فنی معلومات پر دسترس رکھتا تھا۔ ''آدابُ الوزارت'' کا مصنّف وزیر کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ''وزیر کی حیثیت مُلک میں دوسرے بادشاہ کی سی ہوتی ہے۔ اس کے فرائض، بادشاہ کے فرائض سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ سلطنت کے استحکام کا سہرا بادشاہ کے سر رہتا ہے اوراس کے انتشار کا ذمہ دار وزیر کو بننا پڑتا ہے۔ اسی لئے وزیر کو ایک فلسفی کی طرح عقل مند، ایک دیہاتی کی طرح سادہ مزاج، ایک تاجر کی طرح خرچ کرنے میں محتاط اور ایک سپاہی کی طرح بہادر ہونا چاہئے''

(بحوالہ ابن حسن: مغل سلطنت کی ہیئت، صفحہ ۱۶۰)

عرب لوگ وزیر کے عہدہ کو بہت اہم قرار دیتے تھے، اُموی اور عباسی

دورِ حکومت میں ایک وزیر کیلئے کیا کیا شرطیں ہوتی تھیں۔ اس کے بارے میں کریمر (KREMER) کی رائے مُلاحظہ ہو:

> ''عرب تو اس کی (وزیر) ذات سے بہت سی باتوں کی توقع رکھتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ شطرنج اور پولو کے کھیل جانتا ہو، ستار بجا سکتا ہو۔ ریاضی، طب، نجوم، شاعری، صرف ونحو اور تاریخ کا ماہر ہو اور نظمیں اور کہانیاں سُنا سکتا ہو۔''

(دی اورنیٹ انڈر دی کیلف: کریمر، صفحہ ۲۲)

ظاہر ہے کہ اتنی خصوصیات کا حامل شخص جب وزیر کے عہدہ پر فائز کیا جاتا تھا تو اُس کی کتنی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ کشمیر میں ہندو راجاؤں کے زمانے میں وزیر کو ''سَرواَدھیکاری'' کہتے تھے۔ سرواَدھیکاری کے مطلب ہی ہوتے ہیں ''اختیارِ کُل رکھنے والا''۔ یعنی وزیر کو سلطنت میں اختیاراتِ کُلی حاصل تھے۔ شاہ میر سلاطین کے اوّلین دور میں ''وزیر'' کیلئے سَرواَدھیکاری کا لفظ ہی استعمال ہوتا تھا لیکن سلطان زین العابدین کے زمانے میں سَرواَدھیکاری کی جگہ وزیر لفظ کا استعمال ہونے لگا۔ وزیر کے ہاتھ میں، جیسا کہ اُوپر عرض کیا جا چکا ہے، مملکت کے سارے انتظامی اُمور تھے۔ وہ بادشاہ کو ہر ہر قدم پر مشورہ دیتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ مُلک کی آبادکاری، فوج کی اسلحہ بندی، ذرائع آمدنی کا تعین سڑکوں کی حفاظت اور عایا کی خوشحالی کے اصول مرتب کرے۔ سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں وزیر کو فوجی اختیارات بھی حاصل ہونے لگے۔ مثال کے طور پر سلطان سکندر (۱۳۸۹ء) کے زمانے میں سوہا بھٹ کو مکمل فوجی اختیارات حاصل تھے۔ آگے چل کر ان وزیروں نے اپنی ذاتی املاک بنائیں اور طاقت ور بن گئے۔ شاہ میر خاندان کے ایام حکومت

میں چک خاندان والے ان کے وزیر ہوتے تھے۔ شاہ میر خاندان کے سلاطین کو جب ان چک خاندان کے وزیروں نے دیکھا کہ وہ کمزور ہو رہے ہیں تو سارے مُلکی اختیارات اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لئے اور آگے چل کر خود بادشاہ بن بیٹھے۔

اِس صورتِ حال کو دیکھ کر فتح شاہ نے وزیر کے کچھ اختیارات کم کر دیئے اور ایک نیا محکمہ۔ ''دیوانِ کُل'' قائم کیا اور وزیر کے ہاتھ سے مال گذاری کے اختیارات لے کر ''دیوانِ کُل'' کو دے دیئے جو محکمۂ مال کا بندوبست کرتا تھا۔

میر بخشی

میر بخشی کو سلطنت کے انتظامی معاملات میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ شاہی فوج کا سردار ہوتا تھا۔ فوج بھرتی کرنا، فوجی دستوں کو اچھی حالت میں برقرار رکھنا، فوج کی آزمائش کرتے رہنا، گھوڑوں اور فوج کے ملازمین کا معائنہ کرنا اور جنگی مُہموں کیلئے انہیں اسلحہ دینا...... یہ سب میر بخشی کے فرائض میں سے تھا۔ دہلی سلطنت کے زمانے میں بلبن نے یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ فوج سے متعلق سارے اُمور کا انچارج ایک الگ آدمی کو بنایا جائے جو وزیر کے اختیارات کا توازن کرتا رہے۔ آگے چل کر مُغل بادشاہوں کے زمانے میں میر بخشی کا عہدہ اور بھی اہم ہوگیا اور دربار میں بادشاہ کا قُرب حاصل ہونے کی وجہ سے اس کا وقار دُونا ہوگیا۔ سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں بھی میر بخشی کے ذمّے وہی کام تھے جو اُوپر درج کئے جا چکے ہیں۔ میر بخشی کا عہدہ سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں سُلطان علی شاہ (۱۴۱۳ء) کے عہد میں قائم ہوا۔

ہر مُلک اپنے نظامِ عدالت پر زیادہ توجہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ

عدل گُستری اور انصاف سے ہی کسی مُلک کی توقیر اور حقارت وابستہ ہوتی ہے۔

سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں ''شیخ الاسلام'' کی حیثیت بڑی مُتبرک ہوتی تھی۔ مُلک کا نظامِ عدالت اُسی کے سُپرد ہوتا تھا وہ بادشاہ کو مذہبی معاملات میں رائے دیتا تھا اور کبھی کبھی تو بادشاہ سیاسی معاملات میں بھی اُس کی رائے لیا کرتا تھا۔ ۱۵۳۲ء میں جب کشمیر پر مرزا حیدر نے حملہ کیا اور اس کو تخت وتاراج کرنے لگا تو شیخ الاسلام نے کشمیری عوام کے نام ایک پروانہ جاری کیا اور انہیں بتایا کہ حملہ آور کا مقابلہ کرنا اور انہیں مار بھگانا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ کشمیری عوام نے شیخ الاسلام کی بات مانی اور مرزا حیدر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آج کے دستور اور اصول کے مطابق جو کام چیف جسٹس کرتا ہے وہی کام اُس زمانے میں شیخ الاسلام کرتا تھا۔ تاج پوشی کے رسم بھی شیخ الاسلام کے ہاتھوں سے اُدا ہوتی تھی۔

شیخ الاسلام کے عہدہ کے ساتھ ہی ساتھ ''قاضی'' کا عہدہ بھی ایک اہم عہدہ بھی ایک اہم عہدہ ہوتا تھا۔ قاضی کی ذات سے انصاف کے سلسلے میں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار قائم کرنے کی اُمید کی جاتی تھی۔ قاضی مقدموں کا فیصلہ فریقین کی شہادتوں اور اُن کو سُن کر کرتا تھا۔ سُلطان سکندر نے سب سے پہلے اپنے عہد میں عدلِ گُستری کے کام کو قاضیوں کے سُپرد کیا اور سرینگر میں اپنے حکم سے ایک قاضی، جس کا نام سید حسن شیرازی تھا، کا تقرر کیا۔ ایک قاضی کا کام عدل گستری کے علاوہ وقف کی دیکھ بھال اور نماز کا پڑھانا بھی تھا۔ مذہبی معاملات کے بارے میں بھی ''قاضی'' کو بادشاہ کو رائے دینی پڑتی تھی۔ قاضی کے ماتحت بہت سے ''مُفتی'' بھی ہوتے تھے جو ''قاضی'' کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

انصاف کی آخری چوکھٹ بہر حال بادشاہ (سلطان) کی ذات ہی ہوتی تھی۔ اگر فریقین مفتی اور قاضی کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوتے تھے تو وہ اپنی اپیل بادشاہ تک لے جاتے تھے اور بادشاہ اس کا فیصلہ دیا کرتا تھا۔ چندر بھان برہمن نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جو یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ شاہِ جہاں کے دَورِ حکومت میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے مقدمے کی اپیل آئی جس میں دو شخص ایک ہی بچّے کو اپنا بیٹا بتاتے تھے، مُفتی اور قاضی نے فریقین کی شہادت اور ان کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ سُنا دیا۔ لیکن ہارنے والا فریق اس پر مُصر رہا کہ وہ بچّہ دراصل اُسی کا ہے یہ مقدمہ بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا۔ بادشاہ نے شہادت کی جانچ پڑتال کی۔ لیکن اُسے برعکس فیصلہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ چنانچہ انہیں آزمانے کیلئے اُس نے کہا کہ اس لڑکے کے دو ٹکڑے کر کے نصف حصہ ایک کو اور باقی حصہ دوسرے شخص کو دے دیا جائے اِس پر وہ شخص تو خاموش رہا جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا مگر دوسرا شخص لرز اُٹھا اور اس نے روتے ہوئے عرض کیا کہ "بچے کے ٹکڑے نہ کئے جائیں، میں اپنے دعویٰ سے باز آتا ہوں۔" اِس سے صداقت ظاہر ہوگئی اور یہ بچّہ اُسی کو دے دیا گیا جو مقدمہ ہارا تھا۔"

("انشا برہمن" چندر بھان برہمن۔ صفحہ ۳۲-۳۳)

مُحتسب

محتسب کے معنی ہی ہوتے ہیں، احتساب کرنے والا۔ مُحتسب کے ذمہ بہت سارے فرائض ہوا کرتے تھے۔ مثلاً لوگوں کو شراب خوری سے روکنا، مسلمانوں کو صوم وصلوٰۃ کا پابند کرانا۔ لوگوں کو گداگری کرنے سے روکنا،

شفاخانوں میں مقرر معالج کے کام کی دیکھ بھال کرنا، طوفانی موسم میں کشتیوں کی دیکھ بھال کرنا اور اُن پر سوار مسافروں کی سلامتی کیلئے تدبیریں کرنا اور شاہراہ و پبلک عمارتوں کی نگرانی کرنا۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مُحتسب کے ذمہ کتنے اہم کام تھے۔ کشمیر میں ہندو راجاؤں کے زمانے میں مندرجہ بالا فرائض "نگرادھیکاری" انجام دیتا تھا۔ لیکن سلاطین کشمیر کے زمانے میں یہی فرائض محتسب انجام دیتا تھا۔ مرزا حیدر دُغلت کے زمانے میں ہر ایک گاؤں اور ہر ایک پرگنہ میں ایک محتسب کا تقرر کیا گیا تھا، جن کا کام تھا کہ وہ مسلمانوں کے دینی عمل اور صوم وصلوٰۃ پر کڑی نظر رکھیں اور نگرانی کریں کہ وہ پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں یا نہیں۔

جاسوسی طریق کار

کسی ملک کا استحکام اور اُس کی پائیداری وہاں کے جاسوسی طریق کار پر منحصر ہے۔ آج کی اس مہذب دُنیا میں سائنس نے ہزار ہا نعمتیں انڈیل کر رکھ دی ہیں۔ ٹیلی فون اور وائرلیس کے ذریعہ مُلک کے گوشہ گوشہ کی خبر حکومت کو پہنچتی رہتی ہے۔ لیکن تصوّر کیجئے اُس زمانے کو اور اُن حکومتوں کو، جن سے پاس نہ تو ٹیلی فون تھا اور نہ وائرلیس۔ مگر انہیں ایک ایک پل کے واقعات کی خبر رکھنی پڑتی تھی کیونکہ حکومت کا استحکام ہی اسی پر منحصر تھا۔

سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں جاسوسی کا کام اتنا ہی مہارت پذیر تھا جتنا دہلی سلطنت کے ایام میں علاالدین خلجی کا۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ حیدر شاہ (۱۴۷۰ء) کا تخت اُلٹنے کیلئے اس کے خزانچی، جس کا نام حسن تھا، اُس نے سارے انتظامات مکمل کرلئے اور قریب تھا کہ وہ اپنے ارادے میں

کامیاب ہو جائے اسی دَوران جاسوسوں نے بادشاہ کو حسن کے ارادے سے باخبر کیا اور بادشاہ نے اُسے گرفتار کرالیا۔

سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں جاسُوسی کا کام کرنے کیلئے طوائفیں بھی مُلازم رکھی جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں طوائفوں کے مکان آج کل کے کلب گھر اور سینما ہاؤس کی سی حیثیت رکھتے تھے جہاں جا کر انسان تفریح کا متمنی ہوتا تھا اور رنج و کدورت پرے ہٹا تا تھا۔ رقص وسرود کی ان محفلوں میں طوائفیں طرح طرح کے انداز دِکھا کر اپنے عاشق کو اس طرح رام کرتی تھیں کہ وہ اپنے سارے منصوبے اس گُل بدن پر وا کر دیا کرتا تھا۔

شاہی اصطبل خانہ

شخصی حکومت کے زمانہ میں شاہی اصطبل خانہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اصطبل خانہ پر بادشاہ کڑی سے کڑی نظر رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیونکہ شاہ زادے اور امیر جب کبھی بھی بغاوت کرتے تھے تو سب سے پہلے شاہی اصطبل کو اپنے قبضہ میں کر لیتے تھے۔ غازی چک نے جب دولت چک کے تخت کو اُلٹنے کا مضبوبہ بنایا تو اُس نے سب سے پہلے دولت چک کے شاہی اصطبل پر اپنا اقتدار اور تسلّط قائم کرلیا تھا۔ چنانچہ سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں شاہی اصطبل پر کڑی نگہداشت رکھی جاتی تھی اور بادشاہ کو شاہی اصطبل سے ہر وقت باخبر رکھا جاتا تھا۔

نائک

نائک کا لفظ آج کل جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں اس نام کا وہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آج کل کے معنوں میں "نائک" فوج کا ایک عہدہ ہے لیکن سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں نائک مُلک کا محافظ سمجھا

جاتا تھا۔ کشمیر کے ہندو راجاؤں کے زمانے میں نائک کو دُوار پتی کہتے تھے، نائک کا کام وادیٔ کشمیر کی حفاظت کرنا تھا۔ ملک میں داخل ہونے کے جتنے راستے تھے، سب پر یہ تعینات کئے جاتے تھے اور ان کے ماتحت فوج کا ایک چھوٹا موٹا سا دستہ بھی تھا جو سرحدی راستوں کی حفاظت کرتا تھا۔ جو لوگ بھی کشمیر میں داخل ہونا چاہتے تھے وہ اُن سے خطِ راہ یا پروانۂ راہ داری حاصل کرتے تھے۔ تب مُلک میں آسکتے تھے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر پر جب کبھی بھی باہری قوموں نے حملہ کیا ہے اُنہوں نے سب سے پہلے نائک کو بڑی بڑی رشوتیں دی ہیں اور دشمنوں سے مِل کر انہیں سرحدی راستوں سے اندر آنے دیا ہے۔

مندرجہ بالا دستور وضوابط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطینِ کشمیر کے زمانے میں وہاں کا مرکزی نظم ونسق بہت ہی پائیدار اور مضبوط تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی حکومت میں بڑا سکون رہا اور عوام خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کشمیر پر حکومت کرنے والے سلاطین اپنے آپ کو عوام کا محافظ اور ان کا باپ تصوّر کرتے تھے۔ ان کی ایک ایک شکایت کو حتمی المقدور رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کے دُکھ سکھ اور ان کے چین و آرام سے باخبر رہتے تھے۔ تاریخ کے حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ء) تو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ اور خلیفہ ہاورن رشید کی طرح رات کو بھیس بدل کر سڑکوں پر گھومنے نکلتا تھا تا کہ لوگوں کی حالت دریافت کر سکے اور ان کی تکالیف کل دور کر سکے!

☆☆☆

ہنس راج پنڈوترا☆

علاقہ ڈُگرّ کے قدیم باشندے

شمال مغربی ہمالیہ کی آغوش میں ''دو پنجابوں'' کے سِرے پر ہلال نما شوالک پہاڑیوں کا خطہ واقع ہے جو عام طور پر ڈُگر کے نام سے معروف ہے۔ یہ روایتی ''ہیز دل آکاش'' کی سُوا لاکھ چوٹیوں سے گھِرا ہوا ہے۔ بہادر ڈوگروں کا وطن یہی ہے۔

ڈُگر کو عام طور پر موجودہ جموں صوبے کے مترادف معنوں میں سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح معنوں میں درست نہیں، کیونکہ یہ ڈُگر کے ایک تہائی علاقے سے زیادہ نہیں۔ البتہ یہ دُرست ہے کہ جموں اس علاقے کا مرکزِ ثقل اور مشہور ترین حصہ ہے۔ لہٰذا زیرِ نظر مقالے میں زیادہ تر اِسی خطے پر بات کی جائے گی۔ گو کہیں کہیں پر ڈُگر کے دوسرے حصوں کے حوالہ جات بھی آ جائیں گے۔

کُل ملا کے علاقہ ڈُگر کا رقبہ پینتیس ہزار مربع میل ہے۔ اس کی آبادی پچاس لاکھ ہے اور یہ ہند کی تین ریاستوں یعنی جموں و کشمیر، پنجاب اور ہماچل پردیش کی حدود میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے اس حصے اور اس کے باشندوں کے متعلق مقابلتاً کم معلومات ملتی ہیں۔ وہ ایک قدیم اور منفرد قوم ہیں۔ تاریخ سے

☆جموی (توی)

ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس خطے میں رہنے والے فوجی ذہنیت رکھنے والے برہمن، بہادر مسلمان، مہم پسند دلیش کھتری اور نہایت ہی شریف، محنت کش مگر پچھڑے ہوئے یہ لوگ کس نسل و تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈُگر ویدوں کے زمانے میں

ڈُگر دیش کی تاریخ کا سراغ ویدک زمانہ سے ہی ملتا ہے۔ اس کا ذکر آریاؤں کی قدیم ترین کتابوں میں بھی آیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب آریہ ٹیکسلا سے وادی گنگا کی طرف بڑھنے لگے تو ڈُگر دیش اُن کی آبادی کا ابتدائی گہوارہ بنا۔ اس خطے کے چھوٹے دَریاؤں اور پہاڑوں مثلاً ''مڑواہ، واڑوَن'' (کشتواڑ) اور ''تریکوٹا'' (کٹڑہ) کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ یا تو آریہ اِن علاقوں میں بَس گئے تھے، یا اِن کا حال جانتے تھے۔

ویدک زمانہ سے پہلے کے لوگ

رِگ وید کے بیان کے مطابق اس پہاڑی علاقے میں پروشنی (موجودہ دریائے راوی) کے بالائی خطے میں ایک مقامی رہنما سامبر نے آریہ مہم بازوں کا چالیس سال تک سخت مقابلہ کیا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کالی چمڑی رکھنے والی کسی نسل سے منسلک تھا جو شیشن (Stone Lingam) کی پرستش کرتے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا موہنجوداڑو اور ہڑپہ تمدن کے لوگوں سے ضرور کوئی ناطہ تھا۔ وِیشی شاتا رِیشی اُنہیں شیشن دیواس (۵/۲۱۱۵) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کم سے کم ایک سو سنگین قلعوں کے مالک تھے جنہیں تباہ کرنے کے لئے ویدک زمانہ کے مذہبی پیشواؤں کو اِندر دیوتا کے قہر کا بار بار طلب گار ہونا پڑا

(۱۴/۴۲/۵، ۵۰/۵) بعض ماہرین علوم ہند جیسے راہول شنکر تیاین (Rahul Sankrityan) کا کہنا ہے کہ یہ لوگ پہاڑی پورانوں کے (Kunindas) تھے (یا ہمارے وقتوں کے کانگرہ اور جموں پہاڑیوں میں رہنے والے Kunets)

آریہ قبائل

رگ وید کی ترتیب کے وقت متذکرہ علاقے اور اس کے گردو پیش میں جو آریہ قبائل بودوباش کرتے تھے اُن میں انوس، سیواس، کریولیس بیاسو (Baiasu) ترتیسوس، توردا شامیں ویکرناس اور پوروس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک چھوٹے قبیلے کو توگریا یا تگُر کہہ کر یاد کیا گیا ہے جو صوتی اعتبار سے ڈگریاس یا ڈگر سے صاف طور پر مشابہت رکھتا ہے۔ اس طرح تاکادانا نامی ایک عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے تاکادانا سلسلے کے لوگوں کا آغاز ہوا ہوگا۔ ان کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ڈوگری زبان کو ٹاکری رسم الخط بخشا ہے۔

گو آریہ لوگ پانچ دریاؤں کی زمین (ست سندھو) میں بہت پہلے مقیم ہوگئے تھے لیکن ان کی بودوباش کے مختلف صوبوں کی حد بندی کا عمل ویدوں کے بعد کے زمانے میں ہی شروع ہوا ہے اور سنسکرت ادب میں سے اس مقصد کے لئے کافی داخلی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں البتہ یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ جس عمومیت اور ابہام کے ساتھ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں اس کی وجہ سے اس وقت کے لوگوں کے علاقے بودوباش اور صوبوں کی حالت کا تعین کرنے والے طالب علم کا کام ذرا کٹھن بن جاتا ہے۔

پورانوں کی شہادت

براہادارانیک (Brahadranyka) اُپنشد میں اور اقوام کے علاوہ مدرا نامی لوگوں کا بھی ذکر ہے۔ اتھروید اسمیتا محض ان کی ایک شاخ اُتر مدرا کا ذکر کرتا ہے۔ اتریا برہمن کے مطابق اتر مدرا ہمادنت سے پرے رہتے تھے۔ حالانکہ زمرا اُنہیں موجودہ جموں و کشمیر کے اندر دریافت کرتا۔ مسپبا اور وایو پران انہیں رِگ وید کے زمانے کے ایک قبیلے انو کی ایک دُور دراز کی شاخ بتاتے ہیں انو لوگ وسطی پنجاب میں پروشنی کے نزدیک رہا کرتے تھے۔ بہت سے مؤرخ مدرا یا مدرکا لوگوں کی اس علاقے پر ہی محدود رکھنے پر مصر ہیں۔

مدرا اور مدرکا لوگوں کو بہت سی جگہوں پر بھدرا کا یا بھدر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسل کے دو مختلف انتہاؤں سے تعلق رکھتے ہوں جیسا کہ بھدرا کی مہابھارتیہ روایت سے پتہ چلتا ہے جس کے ساتھ بچے تھے جن میں چار مدرا تھے اور تین سالوا (م ب ح/S.C/ ۶۵،۹۵/۴۶/۱۲)۔ میرے خیال میں جموں کی موجودہ حدود مدرکاؤں کی مرہونِ منت ہیں۔ مگر بھدرا کا قومیت کے جانشین جموں صوبہ کی بھدرواہ وادی کے باشندے ہیں (Prysylasbi) مدراؤں کو بھدراؤں کا ایک حصہ بتاتا ہے۔ ''راج ترنگنی'' میں وادی کشمیر کے متصل بھدریوا نام کے قصبے کا ذکر (صاف طور پر بھدرواہ کی طرف اشارہ ہے) ہمارے دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے۔

مہابھارت کا بیان

اس رزمیہ میں بھی مدرا لوگوں کا بیان ملتا ہے جو کیکیاؤں سے وابستہ تھے۔ مدری جو پانڈو کی دوسری بیوی تھی اس خطے سے تعلق رکھتی تھی جبکہ یہاں

کے بادشاہ اسواپتی کی رانی مالوا خطے سے آئی تھی اور اس کا نام مالوی تھا۔ ان دو قومیتوں کے اس ناطے سے مسٹر پیریز بلیوسکی کے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ یامالولیس جنہوں نے سکندر اعظم کا مقابلہ کیا تھا، مدر آیامدرکا ہی تھے۔

نیل مت پُوران

تاریخ کشمیر کا ایک اولین ماخذ نیل مت پُوران وادی کے گردو پیش کے علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے جموں کے علاقہ کو مدر دیش میں شامل بتاتا ہے جو اَپنے مقدس مقامات جیسے دیویکا کے کنارے پر پور منڈل (جو سانبہ کے نزدیک واقع ہے) ہونے کی وجہ سے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

پالی اور بُدھ کتابوں کا بیان

مدرا جو اپنے صاحب علم استاد کپیا تخجل کی وجہ سے ویدک زمانے کی کتابوں میں خاص طور پر معرضِ توجہ رہا ہے، کی طرف مشہور گرائمر دان پائینی (۷۰۰ ق م) نے سنسکرت بولنے والے برہمنوں کی زبان والا خطہ کہہ کر راٹ رہ کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ پالی کتابوں کے مصنفین مدرا کے علاقے کو مدّا کے نام سے جانتے تھے۔ مگدھ کے بادشاہ بمبا سارا (۵۱۵-۶۰۳ ق م) کی تیسری بیٹی شہزادی کھیما شائر مہاراجہ مدّا کی بیٹی تھی۔ یہ خطہ اس سڑک پر واقع تھا جو ٹیکسلا اور اودمبروں کی سرزمین (کانگڑہ کانور پور) اور جیویکا کے درمیان جاتی تھی۔

پینسنی کا بیان

ہندوستانی ریاستوں کے ارتقاء اور ان کی حد بندی کا تفصیلی حال پینسنی (لگ بھگ ۷۰۰ ق م) کے استھادیائی میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بیان سے عیاں ہے کہ اس وقت مدرا کی سرحدیں ایک کم تر حصے تک ہی محدود تھیں۔ شمالی

ہندوستان میں اسے ملک واہیکا کے ایک حصے کے طور پر اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اور شاخوں مثلاً پورو مدرا (راوی اور چناب کے درمیان) اور اپرا مدرا (چناب اور جہلم کے درمیان) وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔ اس ملک کے دریاؤں کا حال لکھتے ہوئے وہ دیویکا، اُدھیکا، بدھیا اور ایراوتی کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دریا دیویکا، اُجھ اور بین کے نام سے آج بھی پہچانے جاسکتے ہیں جو دریائے راوی کے معاون ہیں۔ پینسنی کی تصانیف کا مستند مبصر پاتنجلی کا کہنا کہ ان دریاؤں کے کناروں پر چاول کی بہت اچھی فصل ہوتی تھی، آج بھی درست ہے۔ کالیداس اپنی تصنیف ''راگھونش'' میں طغیانی میں آئے ہوئے اُجھ اور بین دریاؤں کو رام اور لکشمن کے شباب سے تشبیہ دیتا ہے۔

متذکرہ علاقے کے چند پہاڑوں اور اس کے جغرافیائی نشانات جن کا پینسنی نے ذکر کیا ہے کا آج بھی اس علاقہ میں سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر ویدک زمانے کا تریکوکات آج کا تریکوٹا ہے تو پینسنی کا متذکرہ کالاکوت یقینی طور پر آج کے جموں کا کوئلہ کانوں والا کالاکوٹ ہے۔ شاید لوہیت گیری (لفظی معنی، لوہا دینے والی چوٹیاں) اور اناجگیری (جست اور باکسائیٹ پیدا کرنے والی چوٹیاں) ریاسی اور کشتواڑ کے وہ پہاڑی سلسلے ہیں جو ان معدنیات کے لئے مشہور ہیں۔ اسی طرح راجوری (قدیم راجاپوری) سے آگے کے کوہستانِ نمک (سندھوں کا ایک سنسکرت گرائمر دان نے حوالہ دیا ہے۔ چابل (ساواس) کلو (کلاٹا) گڈی (گبڈیکا) قدیم چمبہ کا دارالسلطنت بھارپور (برہم پور) پٹھانکوٹ (پٹھانا پرستھا) علاقہ ہوشیارپور (تیلا کھالا) اور منڈی (منڈاماتی) کا ذکر بھی پینسنی کے یہاں موجود ہے۔

اس خطے کے سیاسی اور سماجی حالات کا تذکرہ جو پینسنی اور پاتنجلی کے یہاں ملتا ہے، بڑی تعداد میں سنگھوں کا حال بیان کرتا ہے۔ یہ سنگھ دراصل سندھ اور بیاس کے درمیان چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں۔ یہ لوگ ایودجیون یعنی اپنی روزی اسلحہ کے ذریعہ سے کماتے تھے۔ مدرا کی چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں جو جہلم اور راوی کے اوپری خطے کے درمیان واقع تھیں، پینسنی نے ''تریگارتشاشتھ'' (کانگرہ اور جالندھر) کی چھ جمہوریتوں کا حال درج کیا ہے۔

ایک معنی خیز مفہوم

یہاں پر مدرا کا استعمال بڑا معنی خیز ہے۔ ڈوگری لغت کے مطابق مدرا یا اس کے دوسرے صوتی مترادف ''مندرا'' کے معنی مختصر القامت کے ہیں۔ قد میں پست، جیسے کہ عام ڈوگرے ہوتے ہیں۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ مدرا لفظ یا تو اُن کی جنم بھومی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں ان کی جسمانی ساخت سے متعلق ہے۔ اس کا ایک اور مطلب ایک خاص قسم کی آمیزش سے بھی ہوسکتا ہے جو نمکین اور شیرین ہوسکتی ہے، جب کہ اِسے ڈوگری میں ''ڈ'' پر زور دے کے پڑھا جائے۔ اتفاقاً اس کا پالی روپ ''مدا'' ایک پنجابی صفت ''مدا'' یعنی ہوشیار سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا تعلق اس علاقے کے عوام کی خصوصیاتِ ذہنی و جسمانی سے ہوگا۔ ''مہابھارت'' کے وقت خطۂ مدرا، جہاں برہمن تحصیل علوم کے لئے جایا کرتے تھے اچھے ناموں سے یاد نہیں کیا جاتا اور اسے وحشی کے خطاب سے نوازا جاتا تھا جیسا کہ اس عظیم کتاب ''کرن پراؤ'' سے پتہ چلتا ہے۔ مگر یہ ایک غلط فہمی ہے کہ کیونکہ جس خطے نے مدرا گراشاؤن گایانی اور اودھال اکارونی جیسے عالم پیدا کئے ہوں وہ وحشیوں

کی سطح پر نہیں اُتر سکتا تھا۔

سن عیسوی کے آغاز تک مدرا نام آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا اور اس خطے کو داروابھی سار کہہ کر پکارا جانے لگا۔ شاید اس سرزمین کا یہ نام اس لئے پڑ گیا کیونکہ یہ آریاؤں کے مویشیوں کے چرنے کا ایک میدان بن گیا۔ جبکہ اُن کے ریوڑ میدانوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مارکندیا پران (۵۷-۵۷) کہ پہاڑی جمہوریتوں (پرواِلش ریبناس) میں درداس کا وجود مانتا ہے جو کانگرہ اور جالندھر کی جمہوریتوں کے ساتھ قائم ہیں۔

اگرچہ اِس اُمر کے متعلق کوئی واضح شہادت نہیں ملتی مگر درداس کے اُبھی ساری وہی لوگ ہیں جن کے حکمران کا ذکر قدیم یونانی مورخین ستر ابو (Satrabo) اور (Arriyaus) (۹۶ سے ۱۸۰ ق م) نے ابھی سارِیس، بھیا سارِوس، یا امبھنی سارِیس کے نام سے کیا ہے۔ آخر الذکر راجہ امبھی تھا جس نے سکندر کے حملہ کے وقت ملک و قوم کو دغا دی۔ اِن تحریروں میں درداس کی عدم موجودگی کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ ان پہاڑی لوگوں نے مقدونیہ کے حملہ آوروں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ آرین نے ایک پہاڑی علاقے کے سردار کا ذکر ڈوگسارِیش کے نام سے کیا ہے جس کے ایلچی سکندر سے ٹیکسلا کے مقام پر ملے۔ ڈوگسارِس اُس نام کے بالکل قریب ہے جس سے آج کل یہ علاقہ (ڈگر) مشہور ہے۔ رینل کا خیال ہے کہ امبھی سار کشمیر کے مغرب میں ہیں۔ ٹیفس تھالر ابھی ساریوں کو جمبو (جموں) کے باشندے بتاتا ہے۔ کلہن نے اپنی ''راج ترنگنی'' میں بے درواتی سار کا اکثر ذکر کیا ہے جو کشمیر کی بہ نسبت (راگر) آب و ہوا کا مالک ہے۔ کلہن کے اوقات میں اس کا ذکر ایک آزاد ریاست کے طور پر

کیا جاتا ہے جس میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں شامل تھیں۔

ٹکر اور ان کا وطن

راج ترنگنی میں ابھی سار کے ٹاکا حصے کا تفصیل سے بیان ملتا ہے۔ کشمیر کے نواح میں جو علاقہ راوی اور چناب کے اُوپری کے درمیان واقع تھا ۹۰۰ء میں گورجا بادشاہ لکھان کے توسط سے اس کے مہاراجہ شنکرورمن کے دائرہ اقتدار میں آیا۔ یہ علاقہ جموں کی بالائی پہاڑیوں کا ہے اور راج ترنگنی میں اِسے ٹاکا دیش کہہ کر پکارا گیا ہے۔ داروابھی سار پر کے دوسرے علاقوں پر شنکرورمن کے حملے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ اس کے مقابلے میں ونشرھا (پونچھ) راجاپوری (راجوری) اور کشتوات (کشتواڑ) عام طور پر کشمیری بادشاہوں کے مطیع ہو جاتے تھے۔ ''راج ترنگنی'' ٹاکا دیش کا ذکر کشمیر کے بادشاہ جے سمہا (۵۵-۱۱۰۵ء) کے بیان میں بھی کرتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سنگھیا نامی ایک ٹاکا شہزادے نے اپنے نام پر ایک شیولنگم کی بنیاد کشمیر میں رکھی۔ اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ ٹاکا بادشاہ نے کشمیر کے رائج الوقت معصوم شیومت کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد یہ دھرم ٹاکا دیش میں بھی پھیلا جس کا سراغ جموں کے نشیبی پہاڑی علاقے میں واقع شیوداروں سے بھی ملتا ہے۔

ٹاکر کون تھے؟

ٹاکر جو دریائے راوی اور جہلم کے بالائی پانیوں کے درمیان علاقے صوبہ جموں (کلہن کا ٹاکا دیش) میں بودوباش رکھتے تھے ظاہر طور پر اپنا موجودہ نام ''ٹاکاؤں'' کے قدیم اور طاقتور سلسلے سے اخذ کیے ہوئے تھے۔ اس امر کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ یہ ٹاکر راجستھان کے ٹھاکروں اور جموں کے

راجپوتوں سے بے حد مختلف تھے جن کی ہجرت بعد میں وقوع پذیر ہوئی۔ اس حقیقت کا سراغ اِس اُمر سے بھی ملتا ہے کہ حال حال تک بھی ان لوگوں کو راجپوتوں کے برابر تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹھاکر لوگ جو اَب عام طور پر زراعت سے منسلک ہیں، اُپنے نام کے ساتھ راجپوتی لقب ''سنگھ'' کا اضافہ ضروری نہیں سمجھتے۔ ٹھاکور، جو کہ ٹھاکر سے مختلف ہے، خطاب کرنے کا ایک معزز طریقہ ہے جس سے ایک راجپوت کو اس کے باپ کی موت کے بعد مخاطب کیا جاتا ہے۔

ٹاکا ایک بہت ہی طاقتور قبیلہ تھا' جو شوالک کے علاوہ پنجاب کے ایک بڑے علاقے پر تسلط جمائے ہوئے تھے۔ مہابھارت، کھاسا اور ٹاکاؤں کے ایک حملہ کی روئیداد بتاتی ہے جو انہوں نے متھرا کے سری کرشن پر کیا۔ آخر پر ٹاکاؤں نے نو آمدہ لوگوں یعنی راجپوتوں کے لئے جگہ خالی کی۔ اتفاقاً اس علاقے میں ایک اور کثیر طبقے یعنی گوجروں کی موجودگی اِس اُمر کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ گوجروں کے تسلّط میں بھی رہا ہے جو کہ مغربی مورخین کے مطابق ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں داخل ہوئے اور پہلے پہل شوالک میں آباد ہو گئے۔ ٹاکری جو کہ ڈوگری کا رسم الخط رہا ہے، ٹاکاؤں کا عطیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط ڈوگری پہاڑی بولنے والے علاقوں میں اب بھی رائج ہے۔ مگر اب دیوناگری اس کی جگہ لے گیا ہے۔ اس امر کی کہ ٹاکا ایک الگ بولی کی حیثیت سے موجود تھی، تصدیق راج شیکھر نے اپنی ''کادیا میمانسا (۹۰۰ء) میں کی ہے۔ ٹاکاؤں کے متعلق سب سے پہلے حوالے کا سراغ والمیکی رامائن میں ''تان کان'' نام کے لوگوں کے ذکر سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ٹاکاؤں سے منسوب

ٹاکری رسم الخط ڈوگرہ خطے میں ٹانکری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ چینی سیاحوں کی تصانیف میں بھی تاکادیش کے حوالے ملتے ہیں۔ خاص طور پر ہیون سانگ کے یہاں جس نے بذاتِ خود اِس خطے کی سیر کی۔

''راج ترنگنی'' کے صفحات میں جموں یا ڈُگر دیش کے حوالے کی عدمِ موجودگی کئی لحاظ سے غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے۔ کشمیر کے جنوب مشرق میں واقع چھوٹی سلطنتیں جن کا کلہن نے ذکر کیا ہے۔ کشتوار، چمپہ، بھدرواہ، ولاپور اور ورتولا پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے کشتواڑ، چمپہ، بھدرواہ، بلاور، بیور وغیرہ تو آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ مگر ورتولا کے محلِ وقوع کا کوئی حتمی سراغ نہیں ملتا۔ اغلباً یہ راجوری کے نزدیک بدّھل کا علاقہ ہے جو سلطنتیں کشمیر کے جنوب مغرب میں واقع تھیں وہ راجاپوری (راجوری) پرونشٹھ (پونچھ) اور لوہارا (لوہرکوٹ) پر مشتمل ہیں۔ دونوں گروہ موجودہ صوبہ جموں کا حصہ ہیں، جو نام اس کو شاید بعد میں نصیب ہوا۔

ڈوگرے اور اُن کا ماخذ

لفظ ڈگر یا ڈوگرہ جموں کی بہ نسبت ذرا قدیم سرچشمے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ گو یہ دونوں نام کلہن کے تحریر کردہ عہد میں مستعمل نہیں تھے لیکن جونراج کے صحیفہ ''راج ترنگنی'' میں جموں کا اسی نام سے کئی مرتبہ ذکر آتا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کشمیری مؤرخ نے اس علاقے کو عام طور پر ''درواِبھشیر'' اور تاکادیش کے نام سے یاد کیا ہے۔

ڈوگرہ اور ڈگر کے منبع کی تلاش کے لئے ہمیں کچھ اور ماخذوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ عام نظریہ یہ ہے کہ اس کا ماخذ سنسکرت لفظ ''دوِگرت'' ہے جس کا

معنی دو گھاٹیوں کی سرزمین ہے۔ مگر اِس نظریئے کو تواریخ اور علم البیان کی تائید حاصل نہیں۔ دوسرے نظریوں میں ایک ''راج ترنگنی'' کے مشہور انگریز مترجم سر سٹائن کا یہ نظریہ ہے کہ ڈگر کا منبع ڈرگالا کو ہے جس کے معنی اس ملک کے ہیں جہاں عبور و مرور مشکل ہو۔ وہ اُپنے اِس نظریئے کی بنیاد تا بنے کے اُس کتبے میں درج شدہ ایک حوالے کی بنیاد پر رکھتے ہیں جو ڈاکٹر کلبی ہورن نے چمبہ میں دریافت کیا ہے۔ دوسرا نظریہ یونانی تحریروں کی بنا پر قائم کیا جاسکتا ہے۔ مشہور یونانی منجم پٹولمی (۱۰۵ء) نے اینٹ ماتن کی تشریح کے مطابق اس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ یہ شوالک میں ایک سلطنت ہے جس میں (ڈگر۔ ڈانگر۔ واکھار۔ ڈاگار) نامی لوگ بستے تھے۔ جو ایک وقت میں دردی قبائل میں غائب رہے ہوں گے۔

توگریان نامی قبیلے سے متعلق وید کے حوالے کا بھی اِس اُمر سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ویدوں کے مطابق یہ توگری اس علاقے میں رہتے تھے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔

لفظ ڈوگرہ، اور ''ڈوگری'' سے متعلق غیر مبہم حوالے مغل حکمراں جہانگیر کے عہد میں نظر آتے ہیں جبکہ جموں پر راجہ سنگرام دیو کی حکومت تھی جس کا خاندان حال حال تک حکمرانی کرتا تھا۔ ''تزکِ جہانگیری'' میں اس کا ذکر زمیندار جموں کے طور پر کیا گیا ہے۔ خطے کے پہلے نام جیسے دارواِبھی سار اس وقت تک کلیتاً معدوم ہو چکے تھے۔

جموں کی داغ بیل

عام خیال کے مطابق جموں کی بنیاد بھگوان رام کے خاندان سے تعلق

رکھنے والے کسی جامبولوچن نے ڈالی ہے۔ روایت اور تواریخ کی آمیزش کے غبار میں جموں کے آباد کرنے والے کے سلسلہ نسب کا صحیح سراغ ملنا دشوار ہو گیا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے وزیر اعظم دیوان کرپارام کے ''گلاب نامہ'' کے مطابق رگھوونسی خاندان کا جو سب سے پہلا شہزادہ ریاست میں داخل ہوا وہ کوئی اگنی ورن تھا جو مہاراجہ سدرشن کا بیٹا تھا وہ کہ راگھوؤں کا ۸۷واں وارث تھا۔ اگنی وارن، جو کھنور کے نزدیک آباد ہوا سکندر اعظم کے زمانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بیٹے دیا شرادا نے اپنی سلطنت کو جموں تک وسعت پذیر کیا۔ ''گلاب نامہ'' میں اس کے بعد کی چار پشتوں کا ذکر غائب ہے اور براہ راست اس کے پانچویں سلسلے یعنی اگنی گرہ کا ذکر شروع کرتا ہے جس کے اٹھارہ بیٹے تھے۔ اس کے دو بیٹوں باہوجن اور جامبولوچن نے بالترتیب باہو اور جامبو کے قصبے آباد کیے۔ ان بھائیوں کے پانچ شہزادوں کو اکھنور، سانبہ، مان کوٹ، جسروٹہ اور سجان پور کے سرداروں کی بیٹیوں سے بیاہا گیا۔

ہیچی سن اور دوکل کے نزدیک جموں کا اس قدر قدیم ماخذ قابل اعتبار نہیں۔ وہ اسے ۹۰۰ء کے لگ بھگ تعین کرتے ہیں جب کہ بابور اور ولاپور بڑے بارونق شہر تھے۔ اس کے بعد جموں کی کہانی تواریخ کا ایک حصہ ہے۔ جامبولوچن کی کئی پشتوں کے بعد جموں کو مالدیو کی صورت میں ایک زبردست حکمراں نصیب ہوا جس نے ۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے سے جموں کو بچالیا۔ ایک ڈوگری لوگ گیت کے مطابق مالدیو کے جانشین ہمیر دیو کے وقت میں جموں کے تحت بائیس چھوٹے چھوٹے راجواڑے تھے۔ جموں کی یہ علیٰحدگی اور آزادی اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ یہ مغل بادشاہ جہانگیر کا

باجگذار نہ بنا۔ اس کے باوجود مغل حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ یہاں ڈانواڈول ہی رہا۔ اس سلسلے کا ایک اور قابلِ ذکر مہاراجہ راجہ رنجیت دیو تھا۔ جس نے پچاس برس (۸۰-۱۷۳۰ء) تک حکومت کی اور ڈگر کے علاقوں کو استحکام بخشا۔ شاہ درانی کو اس کے عوض اسے کشمیر میں ایک جاگیر عطا ہوئی۔ اس سے قبل جموں کبھی استحکام اور شوکت کی اس رفعت پر نہیں پہنچا تھا۔

رنجیت دیو کے بعد جموں کا انتشار، سکھوں کی ابھرتی ہوئی نئی قوت کے سامنے اُن کا سرِتسلیم، اور بعد میں مہاراجہ گلاب سنگھ، جو موجودہ ریاست جموں و کشمیر کے بانی ہیں، کے ہاتھوں اس کی بحالی پچھلی صدی کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

سیّدرسول پونپر☆

''کشمیر'': سَررِچرڈ ٹیمپل

سَررِچرڈ ٹیمپل حکومت برطانیہ کے بھارتیہ انتظامیہ کے ایک اعلیٰ منصب دار تھے اور اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے کبھی کبھار مقامی انتظامی اُمور کا موقعہ پر جائزہ لینے کے لئے اپنے زیرِنگین بھارتیہ ریاستوں کا دورہ کیا کرتے تھے اور پھر اپنی اُفتادِطبع کے مطابق تفنن طبع کا سامان بھی کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اوّلیت تو فرائضِ منصبی کو دیتے تا کہ برطانوی نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل جاری رہنے کے ساتھ ساتھ پوری بھی ہوتی رہے۔ جیسا کہ آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا ہی بلکہ اُس سے بدتر بھی ہو رہا ہے۔ امریکہ ایک واحد استعماری طاقت کا روپ دھار کر انسانی حقوق کی آڑ میں اپنے خصوصی سیاسی، اقتصادی اور سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے معدنی دولت سے مالامال عرب مسلمان ممالک میں اُپنے سامراجی پنجے گاڑ کر شرمناک حد تک اِنسانی خون کی ہولی کھیل رہا ہے اور سبھی دعویدار کمزور حلیفوں کی صورت میں سہم سہم کر دُور سے بس تماشہ دیکھ رہے ہیں، اِس بات کا اندازہ کئے بغیر ہی کہ ایسی انتہائی تکنیکی طور ترقی یافتہ سامراجی و نوآبادیاتی قوت کا مقابلہ متحدہ تکنیکی، سائنسی اور عالمکار قوت

☆۵۵ سیکاپ روڈ۔ بج بہاڑہ۔ کشمیر

ہی سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ غیر مربوط مسلح مزاحمت سے جس کے اُلٹے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ کسی بھی ترقی پذیر، پسماندہ تہذیبی اکائی کا انجام بس بقولِ علامہ اقبال یہی ہوتا ہے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

سیاحت، ثقافت، سیاست، مذہب و معاش آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں اکثر صورتوں میں جُدا کرنا آسان نہیں۔ کبھی ایک ہی اکائی مصروفِ عمل ہوتی ہے اور کبھی کبھی انسانی تہذیب کی یہ سبھی بنیادی اکائیاں قانون قدرت کی تعمیل میں بیک وقت ایسی مصروفِ عمل ہوتی ہیں کہ جیسے چشم زدن میں سب کچھ واقع ہوتا ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور ☆ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

سر رچرڈ ٹیمپل پہلی بار ۱۸۵۹ء میں، برطانوی حکومت کے لاہور (پنجاب) کے کمشنر اور دوسری بار، بارہ سال کے وقفہ کے بعد ۱۸۷۱ء میں بھارت سرکار ہی کے سیکرٹری کی حیثیت سے، سرکاری طور ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ کے مہمان کے طور واردِ کشمیر ہوئے۔ اُن کے سفر و سیاحت پر مبنی مجلّہ کی یہ دوسری جلد، اُن کے فرزندِ ارجمند، رچرڈ کارناک ٹیمپل (Rechard Carnac Temple) نے ترتیب دے کر لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا ہے۔ اُن کے انکشاف کے مطابق وہ اُس سے پہلے نظام حیدرآباد کے دربار میں ریذیڈنٹ، حکومتِ ہند کے مشیر مالیات، بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر اور بمبئی

Journals kept in Hydrabad: Kasl mir: Sikkim: And Nepal: Sir Richard Temple: Vol.II: L ndon:1887

کے گورنر جیسے اعلیٰ اور اہم مناصب پر فائز رہ کر بطریقِ اَحسن فرائض انجام دیتے رہے۔ اس سے پہلے سر رچرڈ ٹیمپل ہی کی بھارت ۱۸۸۰ء میں، (India in 1880)، ہند میں میرے قیام کے دوران شخصیات و واقعات (Men and events of my time in India) ودیگر اہم تالیفات منظر عام پر آئیں۔ اُن کی ایک اور تالیف للہ واک (The World of Lalla) بھی قابل توجہ ہے۔ نقش گیروں ودیگر روایتی گھریلو دستکاروں کی پیشہ ورانہ بولیوں کو بھی سر رچرڈ ٹیمپل نے اپنی ایک تالیف میں موضوع بحث بنایا ہے۔ اُن کی گوناگوں لسانی، تہذیبی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی اور تحقیقی کاوشیں بلاشبہ اُن کی ہمہ رُخی فعال اور خلاق شخصیت کی غماز ہیں ورنہ رچرڈ ٹیمپل سے کوئی یہ باز پُرس کرنے والا نہیں تھا کہ آپ نے انتظامی امور کو نبھانے اور بخوبی سلجھانے میں تردستی و تردماغی تو دکھائی لیکن تہذیب و ثقافت کے حوالے سے یہاں کی جغرافیائی، انسانی اور نسلی شناخت کو نظر انداز کیا۔ خلاقیت شعروادب اور رنگ و صوت کی ترتیب ہی کا نہیں بوقلموں حُسنِ عمل کا بھی نام ہے: جس کا مظاہرہ سر رچرڈ ٹیمپل نے اپنی ہمہ جہت حیات آفرین دلچسپیوں میں کیا ہے: جن کا ثمر مرغوب کشمیر کی ثقافت اور زبان وادب نصیب ہوا، اور جس کے آئینے میں آج ہم اپنے اور اپنے وطنِ مالوف کشمیر کے ماضی کو بھی جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کے دو سفرناموں سے متعلق تفصیلات سر رچرڈ ٹیمپل نے، جلد دوم[1] میں دیئے۔ اس کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ بغیر کسی لگی لپٹی کے کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر افراط وتفریط اور مبالغہ آمیزیوں کو چھوڑ کر کسی اہانت کا

1 Journals kept in Hydrabad: Kashmir: Sikkim: And Nepal: Sir Richard Temple: Vol.II: London:1887

دامن پکڑے، بغیر ہمدردی، ایمانداری اور حقیقت بیانی سے کیا گیا ہے۔ سر رچرڈ ٹیمپل شاہی مہمان تھا جس کی خاطر تواضع اعلیٰ سرکاری سطح پر کی گئی اور عوام یا عام کشمیری کو اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا، پھر بھی یہاں کے ماحول، فطری حُسن فراواں اور عوام کو قریب سے دیکھتے ہوئے ٹیمپل نے وضعداری کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے ورنہ دیکھا جائے اُس سے پہلے اور اُس کے بعد آنے والے یورپی سیاحوں، برطانوی بھارتیہ سرکاری منصب داروں نے، جا و بے جا کشمیریوں کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔

اب آیئے سر رچرڈ ٹیمپل کے پہلے دورۂ کشمیر سے متعلق تفصیلات کا جائزہ لیں۔ وہ پہلی بار ریاست جموں و کشمیر کے دورے پر ۸ جون ۱۸۵۹ء کو آئے اور ۸ جولائی ۱۸۵۹ء اپنی جموں سے واپسی پر مکمل کیا۔ اسی طرح دوسری بار ۹ اپریل ۱۸۷۱ء کو وارِدِ ریاستِ جموں و کشمیر ہوئے اور ۵ مئی ۱۸۷۱ء یہاں کا دورہ و قیام کر کے واپس خوش وخرم لوٹے۔ ظاہر ہے کہ سر رچرڈ ٹیمپل کا پہلا دورہ کشمیر میں بہار کے جوبن کے زُمرے میں آتا ہے کیونکہ ان دنوں میں یہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اور ندی نالوں کے زوردار بہاؤ اور آبشاروں کے سیمین بناؤ کے دِن ہوتے ہیں اور کچھ کچھ میوے تیاری کے مرحلے میں ہوتے ہیں۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے اور حُسنِ فطرت کی فراوانی۔

اپریل۔مئی کے مہینے بہار کے ابتدائی نکھار کے ایام ہوتے ہیں۔ خوب بارشیں ہوتی ہیں اور ندی نالے زوروں پر ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد "غبارِ خاطر" کے خطوط میں، فصلِ گل و فصلِ ثمر کا موازنہ نہایت ہی بلیغ پیرائے میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر حُسنِ فطرت کی فراوانی کا نظارہ کرنا ہو تو اپریل، مئی کے

مہینے حسن فطرت کے شیدائیوں کے لئے انتخاب ہیں اور اگر شکم پرستی ہی مقصود ہو تو جون تا ستمبر کشمیر کا رُخ کیا جائے۔ ہر موسم اپنی اپنی رعنائیوں اور جداگانہ جلوہ سامانیوں کے ساتھ حیات آفرین شادمانیوں سے ہمارا دامن بھر دیتا ہے ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ☆ بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

مہاراجہ رنبیر سنگھ[1] کا زمانہ تھا اور ۱۸۴۶ء میں بیعنامہ اُمرتسر کے بعد ڈوگرہ عہد کے ابتدائی سال تھے، سر رچرڈ ٹیمپل، لاہور دربار کے کمشنر کی حیثیت سے شاہی مہمان ۸ جون ۱۸۵۹ء اپنا سفر ضلع گجرات کی سرحد کو پار کرتے ہی علی الصباح بھمبر پہنچ جاتے ہیں اور ایک مخصوص کچے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ اُن کے ہمراہ کرنل ارنگٹن (Colonel Errington) مادام ارنگٹن (Mrs. Errington) اور لیفٹیننٹ میکنائیر (Lieutenant Macnair) بھی تھے۔ دیوان ٹھاکر داس اُن دِنوں چبل اور راجوری کے سردار اعلیٰ تھے۔ وہ مہاراجہ کے وزیر دیوان جوالا سہائے کے قرابت دار تھے اور وزیر آباد کے رہنے والے، جہاں ٹیمپل کے اپنے ہی کہنے کے مطابق اُن کے باغ کی سیر کو ایک بار گئے۔ ٹیمپل اس سے پیشتر تین بار ۱۸۵۳ء، ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۸ء میں صوبہ جموں کا دورہ کر چکے تھے۔

دورہ کی آگے کی تفصیل یوں ہے:

بدھ وار ۸ جون، ۱۸۵۹ء	سرائے سید آباد	۱۵ میل
ویروار، ۹ جون، ۱۹۵۹ء	نوشہرہ	۱۲ ½ میل

[1] رچرڈ ٹمپل نے سارے مجلّہ میں صرف ایک بار مہاراجہ کا نام لیا ہے۔ اور وہ بھی غلطی سے رنبیر سنگھ کی جگہ گلاب سنگھ کا جو ۱۸۵۷ء میں سورگباش ہو چکے تھے جبکہ ٹمپل ۱۸۵۹ء میں پہلی بار وارد کشمیر ہوئے۔ اِسی طرح ۱۸۷۱ء کو اُنکی دوسری سیاحتِ کشمیر کے وقت بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ (وفات: ۱۸۷۱ء) ہی فرمانبروائے کشمیر تھے۔ دونوں مہاراجوں کی سمادھیاں احاطۂ دھرم ارتھ ٹرسٹ رام باغ میں موجود ہیں۔ (س۔ ر۔ پ)

جمعہ، ۱۰ جون ۱۹۵۹ء	چنگس سرائے	۱۳ ½ میل
سنیچر وار، ۱۱ جون ۱۹۵۹ء	راجوری	۱۵ میل
اِتوار، ۱۲ جون ۱۹۵۹ء	قیام راجوری	
سوموار، ۱۳ جون ۱۹۵۹ء	تھنہ منڈی	۱۴ میل
منگلوار، ۱۴ جون ۱۹۵۹ء	بہرام گلا	۱۰ میل
بدھوار، ۱۵ جون ۱۹۵۹ء	پوشیَن	۱۰ میل
ویروار، ۱۶ جون ۱۹۵۹ء	درۂ پیر پنچال	۶ میل
جمعہ، ۱۷ جون ۱۹۵۹ء	علی آباد سرائے	۵ میل
سنیچر وار، ۱۸ جون ۱۹۵۹ء	شوپیان	۲۰ میل
اِتوار، ۱۹ جون ۱۹۵۹ء	اسلام آباد	۲۰ میل
سوموار، ۲۰ جون ۱۹۵۹ء	مارتنڈ (سیر و تفریح)	۶ ½ میل
منگلوار، ۲۱ جون ۱۹۵۹ء	اَونتی پورہ بذریعہ کشتی: دریائی سفر جہلم	۱۷ میل
بدھوار، ۲۲ جون ۱۹۵۹ء	سرینگر: بذریعہ کشتی: دریائی سفر جہلم	۱۸ میل
ویروار، ۲۳ جون ۱۹۵۹ء	قیام سرینگر	
جمعہ، ۲۴ جون ۱۹۵۹ء	قیام سرینگر	
سنیچر وار، ۲۵ جون ۱۹۵۹ء	قیام سرینگر	
اِتوار، ۲۶ جون ۱۹۵۹ء	مانسبل: بذریعہ کشتی دریائی سفر جہلم	۱۲ میل

سوموار، ۲۷ جون ۱۹۵۹ء	باباشکورالدین، بذریعہ کشتی	
منگلوار، ۲۸ جون ۱۹۵۹ء	گلمرگ: بذریعہ کشتی دریائی سفرو سڑک	۳۱ میل
بدھوار، ۲۹ جون ۱۹۵۹ء	قیامِ گلمرگ	
ویروار، ۳۰ جون ۱۹۵۹ء	سرینگر براستۂ پٹن	۳۲ میل
جمعہ، یکم جولائی ۱۹۵۹ء	قیامِ سرینگر	
سنیچروار، ۲ جولائی ۱۹۵۹ء	اونتی پورہ، بذریعہ کشتی جہلم	۱۷ میل
اِتوار، ۳ جولائی ۱۹۵۹ء	لگہ بھون: بذریعہ کشتی/سڑک	۲۷ میل
سوموار، ۴ جولائی ۱۹۵۹ء	منچھلتہ، براستہ درۂ بانہال	۲۷ میل
منگلوار، ۵ جولائی ۱۹۵۹ء	بلاوٹ	۳۳ میل
بدھوار، ۶ جولائی ۱۹۵۹ء	اُدھمپور	۳۲ میل
ویروار، ۷ جولائی ۱۹۵۹ء	جموں	۳۲ میل
جمعہ، ۸ جولائی ۱۹۵۹ء	گجرانوالہ	۶۴ میل

بھمبر سے رُوانہ ہونے کے بعد سرائے سید آباد، نوشہرہ اور چنگس کے تین اہم پڑاوٗ آتے ہیں، اس کے علاوہ شوپیان قصبے میں ورود کرنے سے پہلے ایک اور اہم مقام علی آباد سرائے کا ہے جس کا بالواسطہ تعلق مغل حکمرانوں سے ہے، شہنشاہ جہانگیر جب کشمیر سے واپسی پر بہرام گلہ کے مقام پر وفات پا گئے، گرمی کا موسم تھا، نعش کے سڑنے کا اندیشہ تھا، اس لئے نورؔ جہاں نے دُوراندیشی سے کام لیتے ہوئے شہنشاہ کے پیٹ سے انتڑیاں باہر نکال کر سرائے میں دفنادیں، جس

پر سرائے کا نام چنگس سرائے پڑا، کیونکہ چنگس انتڑیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعد میں لاہور پہنچ کر ملکہ نور جہاں نے شہنشاہ جہانگیر کی وفات کا باضابطہ اعلان کیا۔ یہیں پر قریب کے منگل دیو قلعہ سے جواہر سنگھ اور گلاب سنگھ کی فوج کے درمیان مختصر معرکہ آرائی کے بعد ۱۸۸۵ء ڈوگرہ مہاراجوں نے چبل وادی پر فتح کا جھنڈا گاڑھ دیا جبکہ اُن کو یہ معلوم تھا برطانوی حکومت کا لشکر جواہر سنگھ کی مدد کرنے آگے نہیں بڑھے گا۔ یہ سبھی واقعات ماضی کے دَر یچے سے جھانکتے ہیں۔ چنگس سرائے میں ایک چھوٹی سی مسجد آج بھی موجود ہے۔ چنگس سرائے ہو، سیّد آباد یا علی آباد سرائے، شاہی کاروان کے سفر کے دوران قیام وطعام کی محفوظ و مخصوص جگہیں مانی جاتی تھیں۔ یہی پہاڑی راستہ شاہرائے نمک کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گل بنفشہ سے کشمیر اسی راستے سے پہنچا کر پاکستانی نمکِ کوہستانی کا تبادلہ ہوتا تھا جس کی بناء پر اُس کا نام بھی نُمہ پوش پڑ گیا۔ اسی شاہراہ نمک کا نام بعد میں مغل روڈ پڑ گیا جسے اَب جموں سرینگر کی متبادل شاہراہ کے طور تعمیر کیا جارہا ہے۔ تھنہ منڈی کے بعد آنے والے درۂ رتن پانژال تک جو سطحِ سمند سے ۸۲۰۰ فٹ بلند ہے، دیوان ٹھاکر داس اُن کے ساتھ آیا۔ رچرڈ ٹیمپل یہاں فارسی زبان میں لکھے شکریہ کے متن میں اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ یہاں مہاراجہ کے پونچھ کے اعلیٰ عہدہ دار میاں گول سنگھ نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد بہرام گول (گلا)، سفید، دودھیل (میٹھا) پانی کا ذکر ہوتا۔ بیگم نور جہاں سے منسوب آبشار ''نوری چھم'' کا ذکر احترام و التفات سے کیا جاتا ہے جسے رچرڈ ٹیمپل سویزرلینڈ (Switzerland) کی بہترین صحت افزامقامات میں سے فطری حسن و جمال کی بہترین علامت

اور بے مثال مورت قرار دیتے ہیں۔ علی آباد سرائے، شکھ سرائے کے اِردگرد فطری حسن، سرو وصنوبر کے گھنے جنگل اور دامن میں بستی پہاڑی ندی گاتی جھومتی بکھرتی ہوئی، یہ جان کر کہ یہ کشمیر کا میرا پہلا نظارہ ہے میں نے دل سے یہ جانا کہ میں ایک زائر ہوں اور سامنے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بیت المقدس (Jerusalem) ہے۔

علی آباد سرائے کے بعد رچرڈ کا شاہی کاروان ہیر پور سے ہوتے ہوئے ۱۸ جون ۱۹۵۹ء کو شوپیان جا پہنچتا ہے۔ یہاں پنڈت سہج (سہز) رام اُنکا خیر مقدم، مہاراجہ کے معتبر نمائندے کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اُس وقت کشمیر انتظامی سہولیت کیلئے چار حصوں میں منقسم تھا اور اس حصے کا معتبرِ اعلیٰ پنڈت سہج رام ہی تھا۔

شوپیان ایک تاریخی قصبہ ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں قاسم خان نے چک فوج کی اگوائی کرتے ہوئے شہنشاہ اکبر کی فوج کو شکست فاش دی جس کے نتیجہ میں اکبر اعظم نے کشمیر کے خود مختار، بادشاہ، یوسف شاہ چک کو جھانسہ دیکر اپنے دربار میں بلایا اور پھر بسوک بہار میں دمِ واپسیں تک قید رکھا۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر کی حیثیت سے سابق سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی اور کشمیر کے ممتاز تہذیب شناس جناب محمد یوسف ٹینگ کی تحقیق، تحریک وایماء پر اُن کے مزار پر بسوک میں یادگاری لوح ۱۹ رجنوری ۱۹۷۰ء میں نصب کرائی۔

۱۹ جون ۱۹۵۹ء کو وہ اِسلام آباد پہنچے۔ یہاں وہ شیر باغ کے مشرق میں ویشنو مندر کا ذکر بھی چھیڑتا ہے۔ چشموں کا اور مچھلیوں کا بھی 'جو چاول وغیرہ پانی میں ڈالنے سے دانہ دُنکا چننے میں اُچھل اُچھل کر ایک دوسرے پر سبقت لیتی ہیں۔ ہندو مسلمان سبھی پانی کے اِن چشموں میں پَلی بڑھی مچھلیاں سنگار کر کے یا

پکڑ کے نہیں کھاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ رچرڈ ٹیمپل رشی سلسلے کے ایک اہم رُکن بابا ہردے رشی عرف ریش مول کا ذکر بھی بڑے احترام وعقیدت سے کرتے ہیں اور کس طرح عقیدتاً اسلام آباد کے اِردگرد لوگ اُن کے سالانہ عرس کے موقعہ پر کئی روز تک مچھلی یا گوشت نہیں کھاتے۔ ساگ سبزی خاص کر کھٹی مولی عام طور اور شوق سے کھائی جاتی ہے۔

مٹن (بھون) کے مندر اور گوردوارے (جسے رنجیت نے تعمیر کرایا) کے پوتر اَستھان پر بھی حاضری دیتے ہیں اور پھر مارتنڈ کے سُوریہ مندر کے آثار بھی دیکھنے جاتے ہیں۔ مختصر ہی سہی اسکے مشترکہ تہذیب کے نمائندہ کشمیری طرزِ تعمیر پر بھی بحث کرتے ہیں، بڑے بڑے تراشے گئے پتھروں سے تعمیر کیا گیا مندر بھی جو للتا دتیہ (آٹھویں صدی) کے زمانے کی یادگار ہے رچرڈ ٹیمپل کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں کا فطری حُسن بھی جو دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے اُسے خود فراموشی کی گود میں بٹھا لوری دیتا ہے۔ اَچھ بل اور ویری ناگ کی سیر کرتے ہوئے وہ مغل شہنشاہوں کی داد دیتا ہے کہ کس طرح مغل شہنشاہوں نے حُسنِ فطرت کو سنوارنے اور محفوظ رکھنے کی مستحسن کوششیں کی ہیں کہ اُن کے آثار مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ وہ کشمیر کی اسی لئے سرزمینِ روایت وتواریخ قرار دیتا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر ہی نے کہا ہے کہ

اگر فردوس بر روئے زمین است ☆ ہمیں است وہمیں است وہمیں است

اُس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مرنے کے بعد اُسے چشمہ ویری ناگ کے ساتھ ہی باغ میں دفن کر دیا جائے۔ ۳ جولائی ۱۸۵۹ء کو رچرڈ ٹیمپل لکہ بھون جاتے ہوئے، بجبہاڑہ میں بھی رُکا جہاں اُس نے بچشمِ خود مہاراجہ رنبیر سنگھ کے

احکامات کی تعمیل میں یہاں کے مندر کی تعمیرِ نو کا کام ہوتے دیکھا۔ واپسی کا سفر رچرڈ ٹیمپل نے سرینگر، بانہال کارٹ روڈ سے طے کیا اور ۸ جولائی کو گجرانوالہ پنجاب پہنچا۔

دوسری بار جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اُس نے موسمِ بہار کے ابتدائی اَیام ہی کو اس نے اَپنے سرکاری سیاحت (دورے) کیلئے چُنا وہ ۹/ اَپریل ۱۸۷۱ء کو سیالکوٹ سے چلا، جموں سے بانہال کارٹ روڈ کا دشوار گزار راستہ طے کر کے ۲۰/ اپریل ۱۸۷۱ء کو ویری ناگ کشمیر پہنچا۔ جہاں سے سڑک اور دریائی سفر طے کر کے سرینگر سے ہوتے ہوئے جھیل وُلر کی دوبارہ سیر کر کے واپسی کا سفر بھی اسی راستے سے طے کر کے ۵/ مئی ۱۸۷۱ء کو جموں سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچا۔ رچرڈ ٹیمپل کی اس دوسری سیاحت کشمیر کی ڈائری یوں ترتیب دی گئی تھی۔

۱/	اتیوار	۹/اپریل ۱۸۷۱ء	سیالکوٹ	۶۶میل
۲/	سوموار	۱۰/اپریل ۱۸۷۱ء	جموں	۲۷میل
۳/	منگلوار	۱۱/اپریل ۱۸۷۱ء	دھنسال	۱۶میل
۴/	بدھوار	۱۲/اپریل ۱۸۷۱ء	کراچی	۱۳میل
۵/	ویروار	۱۳/اپریل ۱۸۷۱ء	میر	۹میل
۶/	جمعہ	۱۴/اپریل ۱۸۷۱ء	قیامِ میر	......
۷/	سنیچروار	۱۵/اپریل ۱۸۷۱ء	لانڈر	۸میل
۸/	اتیوار	۱۶/اپریل ۱۸۷۱ء	رام بن	۱۷میل
۹/	سوموار	۱۷/اپریل ۱۸۷۱ء	رام سو	۱۲میل

۱۰/	منگلوار	۱۸/اپریل ۱۸۷۱ء	قیامِ رام سو	......
۱۱/	بُدھوار	۱۹/اپریل ۱۸۷۱ء	بانہال	۱۱میل
۱۲/	ویروار	۲۰/اپریل ۱۸۷۱ء	ویری ناگ	۱۰میل
۱۳/	جمعہ	۲۱/اپریل ۱۸۷۱ء	سرینگر سڑک و بذریعہ کشتی	۵۲میل
۱۴/	سنیچروار	۲۲/اپریل ۱۸۷۱ء	شالیمار بذریعہ کشتی	۱۰میل
۱۵/	اتیوار	۲۳/اپریل ۱۸۷۱ء	سرینگر بذریعہ کشتی	۱۰میل
۱۶/	سوموار	۲۴/اپریل ۱۸۷۱ء	زیارتِ باباشکورالدین بذریعہ کشتی	۲۷میل
۱۷/	منگلوار	۲۵/اپریل ۱۸۷۱ء	سرینگر بذریعہ کشتی	۲۷میل
۱۸/	بدھوار	۲۶/اپریل ۱۸۷۱ء	اسلام آباد بذریعہ کشتی	۳۵میل
۱۹/	ویروار	۲۷/اپریل ۱۸۷۱ء	قیامِ اسلام آباد	......
۲۰/	جمعہ	۲۸/اپریل ۱۸۷۱ء	بانہال	۲۷میل
۲۱/	سنیچروار	۲۹/اپریل ۱۸۷۱ء	رام بن	۲۳میل
۲۲/	اتیوار	۳۰/اپریل ۱۸۷۱ء	لور ولاری	۱۴میل
۲۳/	سوموار	یکم مئی ۱۸۷۱ء	سنگلوان	۱۰میل
۲۴/	منگلوار	۲/مئی ۱۸۷۱ء	اُدھمپور	۱۹میل
۲۵/	بُدھوار	۳/مئی ۱۸۷۱ء	جموں	۳۲میل
۲۶/	ویروار	۴/مئی ۱۸۷۱ء	قیامِ جموں	......
۲۷/	جمعہ	۵/مئی ۱۸۷۱ء	لاہور	۹۳میل

سر رچرڈ ٹیمپل کا کہنا ہے کہ ”میں الہ آباد سے ریل کے ذریعہ پہنچنے

سے پہلے اتوار ۹؍اپریل ۱۸۷۱ء کو پہنچا۔ ایم...... کو ہمراہ لیکر چرچ کی دُعائیہ محفل میں شریک ہوا۔ ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ نے اُپنے معتمدِ خاص غلام علی شاہ کو ہمارے پاس بھیجا تھا ہمیں ملنے آیا۔ مہاراجہ ہی کی بھیجی ہوئی خاص سواری کے ذریعہ لاہور سے میں شام کو سیالکوٹ کیلئے روانہ ہوا اور علی الصباح ۹؍اپریل ۱۸۷۱ء کو چھیاسٹھ میل کی مسافت طے کر کے منزلِ مقصود کو پہنچا۔ جہاں ہمارا انتظار مہاراجہ کے وزیرِ اعلیٰ دیوان کرپارام کر رہے تھے۔ میں اُن کے والد بزرگوار جوالا سہائے دیرینہ رفیق اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے دیوان سے بھی ملا۔ وہ عمر رسیدہ اور جسمانی طور کمزور ہونے کے باوجود جموں کے انتظامی اُمور کی نگرانی ایک وزیر کی حیثیت سے کر رہا تھا، لیکن اپنے فرزندِ اَرجمند دیوان کرپارام کے حق میں دیوان کی اعلیٰ منصب سے دست بردار ہو گیا تھا۔" رچرڈ ٹیمپل کا کہنا ہے کہ اُسے سابق دَوروں کے دوران جموں میں دُور دور تک بس جنگل ہی جنگل دکھائی دیا جس کا اَب کچھ کچھ صفا کیا جا چکا تھا اور شہر کو کسی حد تک وسعت ملی تھی۔

۱۱؍اپریل ۱۸۷۱ء کی شام کا کھانا انہوں نے مہاراجہ کے محل میں اکیلے کھایا۔ شاہی محل کو نئے طریقے سے آراستہ وپیراستہ کیا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہمیں مہاراجہ نے شرفِ ملاقات بخشا۔ ہمارے اعزاز میں آتش بازیاں چھوڑی گئیں اور رقص وسرور کی محفل سجائی گئی۔ اُس رات کو بارہ بجے ہم مہاراجہ کی بھیجی ہوئی پالکی میں، جسے کہار اُٹھاتے تھے دھسنال کیلئے چل پڑے، جہاں ہم بدھوار ۱۲؍اپریل ۱۸۷۱ء کو طلوعِ آفتاب کے وقت پہنچے۔

مہاراجہ نے راستے میں ڈاک کا انوکھا انتظام رکھا تھا۔ ہر میل پر ایک چوکی تھی اور ایک ڈاکیہ بھی جو ایک چوکی سے دوسری چوکی تک آنا فانا دوڑتے

دوڑتے ڈاک لے جایا کرتا تھا۔ انہیں ماہانہ دس روپے کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ وہ چمبا وادی سے تعلق رکھتے تھے اس لئے تنومند وتندرست اور باصلاحیت بھی تھے۔

دیوان بدری ناتھ نے بانہال میں اُن کا سواگت کیا۔ بانہال کے درّہ کو عبور کر کے، ویری ناگ پہنچے پر، گورنر، وزیر پُنوں نے ہمارا استقبال کیا اور وہ ہمارے ہمراہ ویرناگ باغ میں ہوئے۔ شام کو یہاں پر گرداگرد چراغاں کیا گیا تھا۔

ایم...... کہیں بیمار رہے کہیں چاک وچوبند، کبھی آگے اور کبھی پیچھے، رچرڈ ٹیمپل کے ہم سفر اور رفیق محترم کے بارے میں، میں سوچتا رہا کہ میں اُس کا کون سا نام دوں اور اُس کے ساتھ اس کا کون سا رشتہ باندھوں میرے تجسس کو تھوڑی سی تشفی ملی جب لڑولاری سے آگے جاتے ہوئے رچرڈ ٹیمپل خاکہ کھینچنے رُکا اور ایم............ آگے بڑھی، صرف متن کی اِن دو سطروں سے پتہ چلا ہے کہ ایم...... عورت ذات ہے اور نام میری (Mary) ہی دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی دلچسپی کیلئے یہاں انگریزی عبارت ہو بہو نقل کرتا ہوں جس سے صاف ظاہر کہ اُسے جا لینے کیلئے اُس نے دوڑ لگائی اور بلاوٹ کے مقام پر اُسے ہمراہ ہوا، جہاں اُسے ایسا ہی عمدہ شاہی گھوڑا سواری کیلئے ملا جیسا کہ اگلے کئی موقعوں ملا کرتا تھا۔

"I Stopped for a short time to Take a memorandum sketch while M--- went on. After a short time I rode on to Catch her up passing by Blaut,I got the Same Badshahi horse I rode on the former occasion"

شاید آنے والی تحقیق اس کے رُخِ ناز سے پردہ ہٹائے اور اسکی اصلیت معلوم ہو۔ اس سفرنامے سے بھی اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ جرمنی اور فرانس کے درمیان جنگ کے نتیجہ میں شالبافی کی صنعت کو بڑا دھکا لگا۔ رچرڈ ٹیمپل کشمیر کی خصائص کا ذکر کرتے ہوئے یہی کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کشمیر کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہی ہے کہ یہ سچ مچ

ہر طرف سے فلک بوس برفانی چوٹیوں سے گھری ہوئی ہے ۔

پربت وہ سب سے اُونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

لارڈ لٹن (Lord Lytton) کے نام ۳۰ ستمبر ۱۸۷۶ء کے خط میں اور باتوں کے علاوہ وہ اِس بات کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ وادیٔ کشمیر میں داخل ہونے کے لئے تین راستے اختیار کئے جاتے۔ ایک جموں - بانہال روڈ ، دوسرا بھمبر - پیر پنچال روڈ' جسے شاہراۂ نمک سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے مغل بادشاہ اپنے عبور و مرور کیلئے اختیار کرتے تھے ۔ یہ راستہ بہت ہی دِلکش ہے اور مغل آثار سے مزین بھی ۔ تیسرا راستہ سرینگر مظفر آباد روڈ جو جہلم کے کنارے کنارے بارہمولہ اوڑی سے ہوتا ہوا سرحد پار جاتا ہے' سارا سال کھلا ہونے کی باعث یہ راستہ فوجی لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ دَریائے جہلم (وتستا) جو سرینگر کے بیچوں بیچ گزرتا ہے، شہر سرینگر کو ایک منفرد شان عطا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بہتی آبی گلی کی مانند ہے جسکی شہری حُسن و جمال کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ شہر سرینگر کو وینس (Venice) جیسا آبی شہر کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اُس سے بھی کہیں بہت زیادہ دِلکش و دلربا۔

سر رچرڈ ٹیمپل نے کشمیر قصبوں، دیہات و دیگر جگہوں وغیرہ کے ناموں کو من وعن کشمیری تلفظ کے ساتھ ہی دیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے ثابت کرکے دکھا دیا کہ وہ کوئی بھی تہذیبی ورثہ محفوظ رکھنے کو انسان کی بقا کیلئے لازمی گردانتے تھے۔ اُس نے اسلام آباد ہی اننت ناگ جگہ جا بجا برتا ہے۔ اُس نے کشمیری مشترکہ تہذیب کو اپنے اصلی خدوخال میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تختِ سلیمان (شنکر آچاریہ) کے راستے لگائے گئے سفیدے کے درختوں کی قطاروں کو وہ شمالی اٹلی سے مناسبت دیتا ہے۔

کشمیر کی دوسرکاری سیاحتوں، کے دوران رچرڈ ٹیمپل نے کُل مِلا کر کشمیر میں ۲ مہینے گذارے جسکے دَوران وہ زیادہ تر گھومتا ہی رہا لیکن حیران کُن بات یہ ہے کہ کوئی بھی لازمی اور اہم مقام، جگہ یا شخصیت اُپنی جُملہ خصوصیات کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانا اُسے بھول نہیں گیا، چاہے وہ نالہ مار ہو، وُلر کے سنگھاڑے ہوں' حاجن کا شاہی اَصطبل ہو، پتھر مسجد کا سرکاری گودام ہو' کونتی لُن (پری محل) ہو، چار چناری ہوُزین دیپ ہو، تو سہ میدان ہو، سرینگر کا ضرابخانہ ہو، کشمیر کا مشہورِ عالم پشمینہ تاجر تختہ میر ہو یا وزیر پنّوں، سرکار کے کارندوں کی زیادتیاں ہوں یا فصلوں کی پیداوار کا آدھا حصہ ڈوگرہ سرکار کو بطور جنس اُدا کرنا۔ سر رچرڈ ٹیمپل حُسنِ فطرت کے شیدائی بھی تھے۔ انہوں نے قدم قدم پر ایک فنکار و مصوّر کی طرح بولتی لکیروں کے خاکے کھینچ کر اَپنے تاثرات کے حُسن کو دوبالا کیا ہے۔

یہ سفرنامے بجا طور کشمیر اور کشمیری تہذیب و آثار کی بولتی تواریخ ہے جسے محفوظ کرنا اور جس کا گہرا تفصیلی و تحقیقی مطالعہ کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے تاکہ ہمارے تہذیبی، لسانی، جغرافیائی اُمور ثقافتی خدوخال محفوظ رہ سکیں۔ اس عظیم اور مستحسن کام کیلئے ایک مربوط فعال اور منفرد ادارے کی ضرورت ہے، جسکا احساس ابھی کشمیری تہذیب کے محافظ دعویداروں کے ضمیروں کو ٹٹولتا بھی نہیں

ہے عرصۂ ہستی میں عمل ہی سے تو سب کچھ
باتوں سے کوئی کام بنا ہے نہ بنے گا
(ماہر القادری)

مشعل سلطانپوری ☆

"کشمیر میں میرے تیس سال"

آرتھر نیو کا سفرنامہ

بحری راستوں سے مختلف ممالک کے ساتھ تجارت پر مسلمانوں کی بالادستی کیخلاف مغربی ممالک کی کوششیں سولہویں صدی عیسوی کے اوائل سے تیز ہونے لگی تھیں اور وہ خاص طور پر مشرقی ملکوں تک نئے راستے دریافت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما کا ہندوستان کے جنوبی کنارے کالی کٹ پہنچنا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اہلِ یورپ میں سے پُرتگیزیوں کی دیکھا دیکھی ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ بھی اِن کوششوں میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں اِس قسم کی کوششیں صرف تجارتی مقاصد سے کی گئیں اور اِس میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کیلئے تصادم بھی ہوتا رہا۔

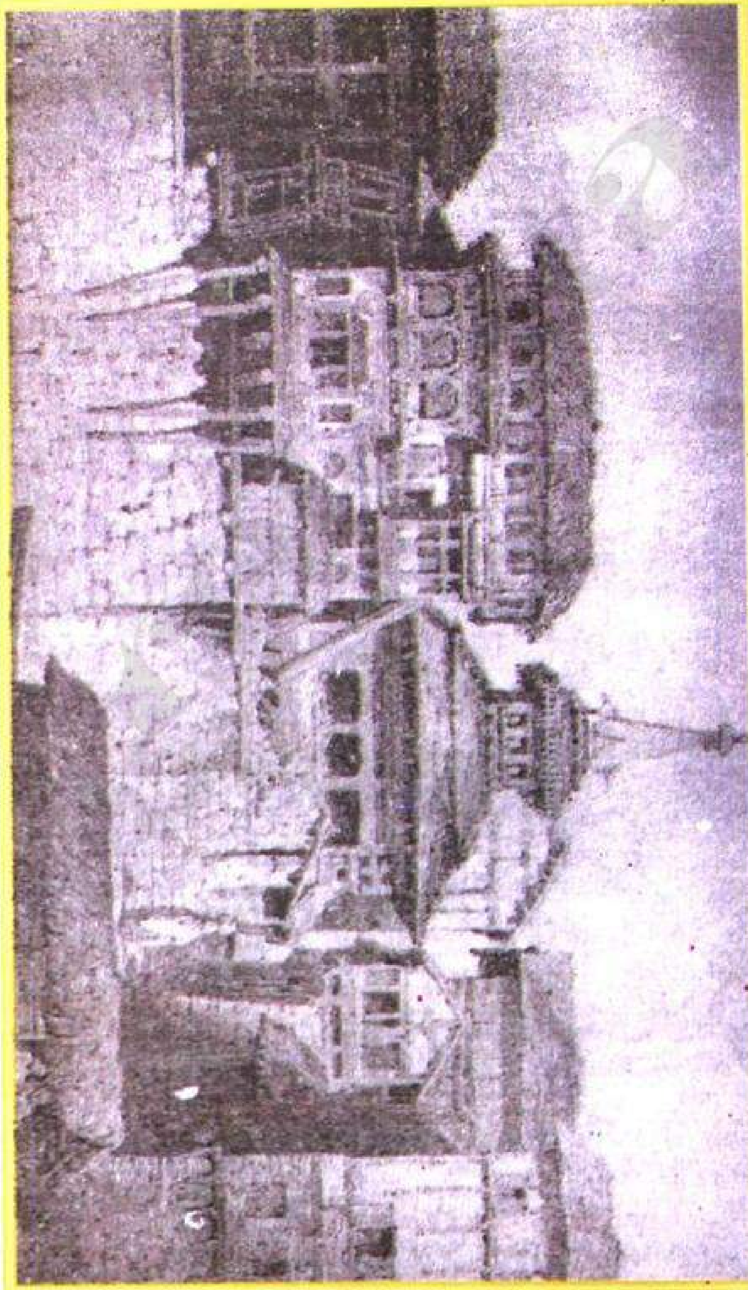
سترھویں اور اٹھارھویں صدی ان ممالک کے باہم دست وگریباں ہونے کے ایک طویل سلسلہ کو سامنے لاتی ہے۔ پہلے پرتگال اور سپین، پھر

☆ جی کالونی، بارہمولہ۔کشمیر

پرتگال اور ہالینڈ، ہالینڈ، پرتگال اور فرانس اور آخر پہ پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگیزیوں کی تجارت پر ضرب لگائی تو ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے پرتگیزی بیڑے کو ہٹا دیا۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی اور ۱۷۰۸ء میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی اور یورپ میں بھی برطانیہ اور فرانس تصادم ہوتے رہے لیکن یہ معرکہ آرائی ہندوستان میں زیادہ نمایاں رہی۔ انیسویں صدی میں یورپ کی تین طاقتیں فرانس، برطانیہ اور رُوس ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں، یہ کبھی آپس میں معاہدے کرتیں تو کبھی توڑ دیتیں۔ مشرقی ممالک میں ان کا عمل دخل پہلے تجارت تک محدود رہا پھر اس کا دائرہ سیاست تک پھیل گیا اور اس میں ہوسِ ملک گیری بھی شامل ہونے لگی۔ ایک طاقت دوسرے کا عمل ودخل روکنے کیلئے ہر قسم کے داؤ و پیچ سے کام لینے لگی۔ انگریز، فرانس اور روس دونوں سے خوف زدہ تھے اور دونوں کی پیش قدمی روکنے کی فکر میں تھے۔ فرانس اور روس دونوں اپنی اپنی جگہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کر کے اس ملک پر اچانک قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے فرانس کی دشمنی کا توڑ کرنے کیلئے ۱۸۰۵ء میں روس کے ساتھ معاہدہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد روس ایران کی طرف بڑھنے لگا تو اُس نے انگریزوں سے مدد مانگی لیکن وہ معاہدہ کی رُو سے ایسا نہ کر سکے۔ ایران نے فرانس کی طرف رجوع کیا۔ روس اور فرانس میں ۱۸۰۷ء میں جنگ ہوئی اور روس ہار گیا۔ اب روس کے ساتھ مل کر فرانس نے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہا لیکن اس



کشمیری کسابہ......جو تواریخ کی بعض کڑیوں کو جوڑتا ہے



جہلم کے کنارے مسجد اور رہائشی مکانات......۱۸۵۸ء

منصوبہ پر عمل نہ ہو سکا۔ انگریز اس سلسلے میں برابر متفکر تھے۔ انہوں نے کابل اور سندھ میں مشن بھیجے جو بظاہر دوستانہ مشن تھے لیکن اصل میں فرانسیسیوں کے اثر میں وہاں کی حکومتوں کو نہ آنے دینے کی کوششوں کا ایک حصہ تھے۔

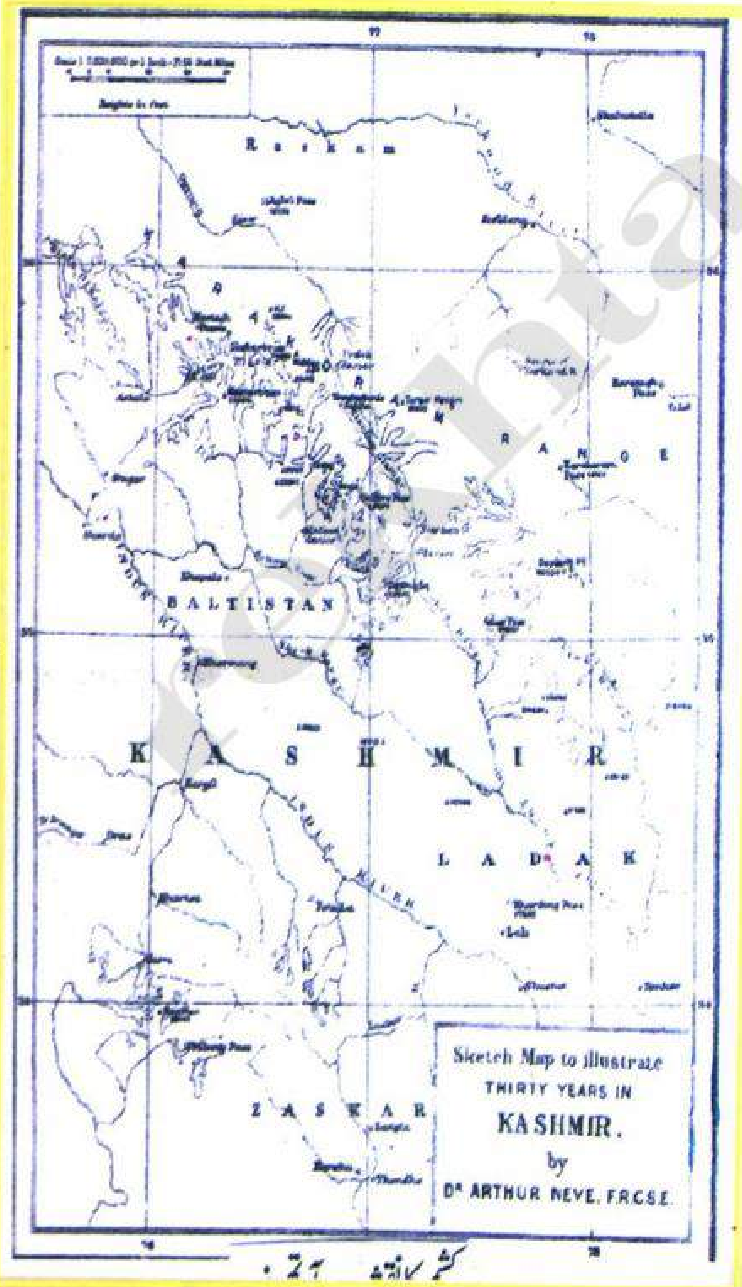
اُنیسویں صدی ہی میں ہندوستان کے اندر ایک اہم طاقت اُبھری تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کئی ریاستوں کو ایک کر کے ایک متحد اور مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور کشمیر سے لے کر پشاور تک کے علاقے اپنے تسلط میں لائے تھے۔ اس طاقت کے ساتھ پہلے انگریزوں کا دوستانہ معاہدہ ہوا لیکن جلدی ان کی نیت سے پردہ اُٹھ گیا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے بعد حکومت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ۱۸۴۵ء میں سکھوں کے ساتھ جنگ میں انہیں ہرا کر سلطنت پنجاب پر تسلط قائم کیا گیا۔ اس طرح جموں وکشمیر کی ریاست بھی انگریزوں کی جھولی میں آ گئی جو اُس وقت سکھ راج کے زیر قبضہ تھی۔ انگریزوں نے یوں تو یہ ریاست مہاراجہ گلاب سنگھ کو سونپ دی لیکن اصلی طاقت کا سرچشمہ وہ خود بنے رہے۔ دَراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ روس اور ہندوستان میں ایک بفر سٹیٹ Buffer State موجود رہے، جو مکمل طور پر نہ صرف یہ کہ اُن کے زیر اثر ہو بلکہ عملاً اُن کے ماتحت بھی ہو۔ چاہے وہ سکھوں کی سلطنت پنجاب ہو یا مہاراجہ گلاب سنگھ کی ریاست جموں وکشمیر۔

مقامی ریاستوں کے ساتھ انگریزوں کے معاہدوں کی حیثیت محض سیاسی نوعیت کی تھی، خصوصاً شمال مغربی طرف سے، تا کہ وہ فرانس یا روس کے اثر میں نہ آئیں اور انگریز اُن کی پیش قدمی سے بے فکر رہیں۔ ۱۸۳۴ء میں

افغانستان میں شاہ شجاع کی جگہ امیر دوست محمد خان نے حکومت سنبھالی۔ اُس نے سکھوں کیخلاف انگریزوں سے مدد چاہی لیکن اُن کا سکھوں کے ساتھ معاہدہ تھا، اُن سے مدد نہ مل سکی تو ایران اور روس کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزوں، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع میں سہ فریقی معاہدہ ہوا۔ امیر دوست محمد خان کے خلاف سکھوں اور انگریزوں نے دو طرف سے حملہ کیا اور افغانستان فتح کر کے شاہ کو بادشاہ بنایا۔ لیکن افغانوں نے بغاوت کی۔ دوست محمد خان کا بیٹا اکبر خان تھا جس کی سربراہی میں انہوں نے انگریزوں کو شکست دی اور دوست محمد خان پھر تخت پر بیٹھا۔

یہ تھا وہ پسِ منظر کہ اُس وقت کی تین بڑی طاقتیں کیوں ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں خصوصاً کشمیر میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ یہ تینوں حریف طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور پیچھے ہٹانے کے درپے تھیں یا کم از کم اپنا بچاؤ کرنے کیلئے فکر مند۔ کشمیر اور کشمیر کے راستے لداخ، گلگت وغیرہ کے علاقوں میں مختلف نوعیت کے مشن بھیجنا اور ان مقامات کی سیاحت کے پسِ پشت یہی اغراض ومقاصد تھے۔ اس لئے میرے خیال میں یہ سوچنا کہ یہاں کے قدرتی مناظر، رشکِ فردوس وادی اور سربہ فلک برف پوش چوٹیاں ہی انگریز سیاحوں کیلئے باعث کشش تھیں، مبنی برصداقت نہیں۔

سیاسی مقاصد حاصل کرنے کیلئے انگریز مختلف سطحوں پر اپنی کوششیں جاری رکھتے تھے، آمد ورفت اور رسل ورسائل کی سہولت پیدا کرنا، ریلوے نظام کی شروعات، ڈاک وتار کے محکموں کا قیام، سڑکوں کی تعمیر وتجدید اور جدید



کشمیر کا نقشہ.....آرتھر نیو



چھلسر کی گلی کی تصویر.....۱۸۷۰ء

تعلیمی وتدریسی نظام کی فراہمی۔ اپنی تہذیب وتمدن پھیلانے اوراپنے عقیدے کی ترویج یعنی عیسائیت کے اصولوں کو عام کرنے اوراس کی تعلیمات کوعام لوگوں تک پہنچانے کیلئے انہوں نے دومحاذ چُن لئے ،ایک تعلیم اوردوسرا صحتِ عامہ۔اُن دونوں پچھڑے علاقوں کاذکر ہی کیا خود شہروں اورقصبوں میں علاج ومعالجہ کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انگریزوں نے اسکول کھولے،ہسپتال قائم کئے ۔پھر آہستہ آہستہ کالج اور یونیورسٹیاں وجود میں آگئیں۔ مشن ہسپتال اورمشن اسکول اس زمانے تک بزبانِ حال ان کی خدمات کی گواہی دے رہے ہیں۔ اُنہوں نے ہرقسم کے مشن آگے بڑھانے کیلئے ایسے افراد کاانتخاب کیا جوتعلیمی میدان یاعلاج ومعالجہ میں شہرت رکھنے کے ساتھ ساتھ عیسائیت پر پورا ایمان رکھتے تھے۔اس کے علاوہ ملک وقوم کے وقاراورعزت کی خاطر ذاتی مفادات توکجا، جان کی بھی پروانہ کرتے تھے اوراس پرطرّہ یہ کہ غضب کے دلیراورمہم جوئی میں یکتا تھے۔فرانس برنیر، سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ مورخ،محقق اورمعالج بھی تھا۔ولیم مورکرافٹ یہاں پہلا یورپ نژاد معالج حیوانات تھا۔ولیم ویکفیلڈ ایک ماہرحالج تھا۔اسی طرح ینگ ہسبنڈ،الیگزنڈر کننگھم،آرل اسٹائن،سروالٹرلارنس اورٹنڈل بسکو جیسے قابلِ ذکرلوگوں میں مختلف صلاحیتیں یکجا ہوگئی تھیں۔

اِنہی مہم جوسیاحوں میں آرتھر نیوکانام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے،اس لئے کہ اُس نے کشمیر پرکم لیکن کشمیر کے شمال مغربی حصوں سے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے۔اس کا سفرنامہ ''کشمیر میں تیس سال''اسی سلسلے کی ایک

کڑی ہے۔وہ اپنے سفرنامے کی ابتدا،۱۸۸۱ء سے کرتا ہےاور۱۹۱۰ء میں یہ اختتام پذیر ہوتا ہوانظرآتا ہے۔آرتھر نیوپیشہ سے معالج تھااور برطانیہ کی چرچ مشنری سوسائٹی سے وابستہ۔انہوں نے ڈاکٹر ایڈمنڈ ڈاونز سے سرینگر میں کشمیرمشن ہسپتال کا چارج سنبھالا۔بہ ظاہرایسا لگتا ہے کہ وہ صرف لوگوں کے علاج ومعالجہ کیلئے کشمیر آیا تھالیکن اُس کی کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ اُس کے کشمیر میں مشن ہسپتال کا چارج سنبھالنے کے پیچھے دوسرے اغراض ومقاصد کیا تھے؟لداخ اوراُس کے آس پاس کے ساتھ ساتھ اسکردو، گلگت'یاسین' ہونزا حتیٰ کہ تبتِ صغیر کی سرحدوں تک اُس کی سیاحت اورمہم جوئی کس مقصد سے تھی' یہاں اُسے بار بار اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑی، کبھی کبھی ایک مہم نامکمل چھوڑ کرواپس آنا پڑااورکبھی ازسرِنو یہ مہم شروع کرنا پڑی۔حتیٰ کہ قراقرم کے دامن اورساچن گلیشیر کاطول وعرض ناپنا پڑا۔

آرتھر نیوپنجاب کے حالات وکوائف سے اپنے سفرنامہ کا آغاز کرتا ہےاورپنجاب سے کشمیر آنے کے واقعہ سے ہمارا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔اُس کے اپنے بیان کے مطابق ایک عام شہری کیلئے اپنے گھر، اپنے وطن اور اقرباواحباب کوچھوڑکرمعمولی تنخواہ پرکسی مقصد کیلئے باہرجانا کوئی دانائی نہیں لیکن اُس مقصد کی خاطر کام کرنا نہایت اطمینان کاباعث بنتا ہے۔اسی لئے اُس نے طالب علمی کے دوران ہی افریقہ کے حالات وکوائف پڑھ کراور لیونگٹن سے متاثر ہوکر اپنی خدمات یوگنڈا کیلئے پیش کیں۔چرچ مشنری سوسائٹی کے اعزازی سیکریٹری جناب ہنری رائٹ کوبھی اس خواہش کے

بارے میں لکھا لیکن افریقہ کے بجائے اُسے ہندوستان جانے کی اجازت مل گئی چند برس پہلے ڈاکٹر ایمزلی کی کتاب ''کشمیر میں بوائی کا موسم'' اُس کی مطالعہ میں آچکی تھی۔ اِس مشن کیلئے مقرر کیا گیا ایمزلی تو وفات پا گیا۔ اُس کے بعد میکس ویل کی طاقت برس دو برس میں جواب دے گئی اور اَب ڈاونز خرابی صحت کی بِنا پر مشن سے واپس آرہا تھا اس لئے یہ غیر معمولی ذمہ داری کے باوجود ایک اعزاز تھا۔ انٹرویو کیلئے ڈیوڈ ڈنکن مائن لنڈن گیا لیکن اُسے یہ کام سونپنے کی بجائے ایک دوسرے ہسپتال میں بھیجا گیا۔ ہیون ہسپتال کے ڈاکٹر ایپری کاٹ کو اِس مشن کے بدلے چین بھیجا گیا۔ اُس وقت چرچ مشنری کے دُنیا کے مختلف حصوں میں صرف چھ سات ہسپتال ہی تھے اور ہر جگہ صرف ایک ڈاکٹر کام کر رہا تھا۔ بعد میں دو دو ڈاکٹر تعینات ہوئے۔ جب آرتھر پنجاب پہنچے تو وہاں انڈین میڈیکل سروس میں کئی نامور ڈاکٹر کام کر رہے تھے اور پنجاب میڈیکل مشنری ایسوسی ایشن کے ساتھ وابستہ تھے۔ ممبئی میں جہاز سے اُترنے کے بعد وہ اچھر، امبھر سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اُمرتسر چرچ مشنری سوسائٹی کا مرکز تھا اور مشنری مرکز کیلئے موزون مقام کیوں؟ وہاں خاص طور پر شمالی حصوں سے لوگ آتے تھے، وسط ایشیا اور افغانستان سے بھی۔ یہ سِکھوں کی سب سے متبرک جگہ بھی تھی۔ رابرٹ کلارک مشنری رہنما کے ساتھ ساتھ سیاستدان بھی تھا، اُسی نے سب سے پہلا کشمیر مشن کا منصوبہ بنایا۔ ۱۸۵۴ میں ء لداخ اور بلتستان کا سفر کر کے اُس نے یہ سارا خطہ نظروں کے سامنے لایا۔ افغانستان کیلئے پہلا مشنری ہونے کے ناطے کئی برس پشاور میں رہا۔ آرتھر کا کہنا

ہے کہ کئی آفیسر غازیوں کے چُھروں کے نشانہ بنے لیکن پچاس برسوں میں کسی مشنری پر حملہ نہ ہوا۔ اگرچہ وہ وحشی اور کٹر پنتھی قبائل کے علاقوں میں پہرہ داروں کے بغیر نہتے گھومتے رہے۔ پنجاب میں اُس سے ذرا پہلے چالیس ہزار لوگ ہیضہ سے ہلاک ہوگئے تھے۔ خود آرتھر بخار کی زد میں آیا۔ وہ امرتسر میں آبپاشی کے صحتِ عامّہ پر بُرے اُثرات کی شکایت کرتا ہے اور اسے ملیریا کے لئے ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ وہ ترن تارن میں کوڑھیوں کے علاج کیلئے گیا۔ حکومت بھی کسی حد تک اُن کی مدد کرتی تھی لیکن وہ پھر بھی بھیک مانگتے تھے۔ اُس کی اس خواہش کے جواب میں کہ ان کی امداد کو اوّلیت ملے، ایک ہندوستانی نے کہا کہ . . . بھکاریوں پر سالانہ بیس کروڑ روپے خرچ کئے جاتے ہیں جس میں یہ بھی حصہ پاتے ہیں۔ ترن تارن میں ایک ماڈل ہسپتال ہے دماغی مریضوں کیلئے، اُس نے سِکھوں میں گلفورڈ کی ہر دلعزیزی کی تعریف کی ہے۔ تیس برس کی کوششوں کے باوجود وہ عیسائیت کے فروغ میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں پاتا ہے۔ وہ پورے صوبے میں پہلے صرف پانچ ہزار ہندوستانی عیسائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اَب یہ تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچی ہے جن میں اکثر دیہات اور دوسرے پچھڑے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ پھر بھی اس پیش رفت سے مطمئن نہیں، مشنری کو اُس کا یہ مشورہ ہے کہ دس میں سے ایک کے بجائے دس میں سے نو اُفراد مشنری عملہ سے صرف پچھڑے علاقوں اور دیہات کیلئے وقف رکھے جائیں۔ اَب یہاں سے اُسے کشمیر بھیجا جاتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ اُن دنوں کوہِ مری تک صرف تانگہ جاتا تھا اور وہ بھی

گرمیوں میں، سردیوں میں چونکہ ہُو کا عالم رہتا تھا اس لئے اُسے گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کرنا پڑا جبکہ اُس کا سامان کچھ فاصلہ تک یکّوں اور پھر خچروں پر ڈھویا گیا۔ اِس سفر کے دوران وہ آس پاس کے دیہات میں رہنے والوں کے بارے میں جانکاری بہم پہنچاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ سرسبز جنگلات، باغوں میں کِھلے گلاب موسمِ بہار کی اَگوائی کرتے ہیں۔ سڑک کے کنارے بَسے ہوئے گاؤں، گھوڑوں کی لید، گائے بیلوں کے گوبر، حُقوں کے دھویں اور بازار کے مصالحوں کی مِلی جُلی بو باس میں بَسے ہوئے ہیں لیکن باغوں سے لوکاٹ کی خوشبو اور سنگترے کے شگوفوں کی معطر ہَوا سے فضاً بھری ہوئی ہے۔ راستے کے ساتھ ساتھ پگھلتی برف پانی سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اور اس کے کناروں پر اُگا سبزہ پورے جوبَن پر ہے۔ منظر کشی پر اُس کا قلم خوب چلتا ہے۔ مری پہنچ کر وہ برف سے اَٹی بستی کا حال بیان کرتا ہے کیونکہ اُونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے وہاں ابھی برف موجود تھی۔ اُس کے لفظوں میں یہ ’’برف میں دَفنایا ہوا شہر‘‘ تھا۔ یہاں اُسے خور دونوش کی کوئی امید نہ تھی، لیکن اُسے ایک انگریز ملا جس نے رات بھر کیلئے اُسے اُپنے پاس ٹھہرایا۔ یہاں صرف چند انگریز تھے، ایک میڈیکل آفیسر، ایک چھاونی کا افسر اور ایک مہمان لارڈ ونیلاک جو اِس حصے کا گورنر تھا۔ اس سفر کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ راستہ صرف گھوڑے پر طے کیا جا سکتا ہے۔ اُس وقت رسیوں کے پل سے کوہالہ کے مقام پر دریائے جہلم عبور کرتے تھے جو ۱۸۹۳ء میں سیلاب کی نذر ہو گیا، یہاں پر دریا کا پاٹ سو گز کے قریب تھا اس لئے کافی

گہرا یعنی معمول کی گہرائی سے تیس فٹ زیادہ۔ اُس نے یہاں کیلے کے درخت اور کھجور کے دو ایک درخت دیکھے۔ اُن دنوں جہلم ویلی روڈ نہیں، جہلم کارٹ روڈ کی تعمیر شروع ہوئی تھی، کام شد و مد سے جاری تھا۔ نتیجہ یہ کہ عام راستہ بھی تہس نہس ہو گیا تھا اور سفر کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ پہلے چھتر اور پھر آگے بڑھتے ہوئے اُن پر کیا گزری، کس طرح مقامات پر لڑھکتے لڑھکتے بچ نکلے، کہاں کہاں گھوڑوں کی پیٹھ سے سامان کی بوریاں گر گئیں، یہ سب کچھ دِلکش انداز میں اس طرح قلمبند کیا گیا ہے کہ پوری فلم آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ اُس کے کارواں کو کہیں کہیں ندی نالے پانی میں اُتر کر پار کرنا پڑے اور پانی گھوڑوں کی پیٹھ تک آ گیا۔ نئی سڑک بنتے دیکھ کر وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیسے نیا راستہ بنانے کی ترنگ میں پرانا بنا بنایا راستہ برباد کیا گیا ہے۔ وہ مذاق اُڑاتے ہوئے مقامی لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے، جنہوں نے پندرہ برس سے اس سڑک کی سروے کرنے والے انگریزوں کو موج اُڑاتے ہوئے دیکھا، اَپنے لئے رہنے کے مکان اور دوسرے لوازمات اور پھر سڑک بنانے میں جَھک مارنا جس سے پُرانا راستہ ہی تباہ ہو گیا۔ کیا یہ نئی تہذیب اور ترقی پسند مذہبی خیالات، وہ سب کچھ ختم نہیں کرتے جو منفعت بخش بھی تھا اور بہتر بھی۔ آرتھر نیو جہاں دَم لیتا ہے، پسند آئی ہوئی چیزوں اور نظاروں کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ راستے میں جو کچھ اُسے نظر آتا ہے، اُسے گرفت میں لینے سے اُس کا قلم نہیں چوکتا۔ بار بردار قلیوں میں وہ اپنے وفادار ملازم جمال جُو کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے جس نے

بار بردار ٹٹوؤں کی پیٹھ پر سے گرنے والا سامان تتر بتر ہو کر پھر جمع کروایا اور سنبھال کر گھوڑوں کی پیٹھ پر لدوایا۔ اس کے بعد کھوئی ہوئی ایک اسکارف پن پر مزدور اور مرکبانوں کی سرزنش کی۔ آرتھر انہیں ڈرانے دھمکانے کا اعتراف کرتا ہے کہ کیسے ''بخشش'' سے محروم کرنے کی علاوہ اُن سے جرمانہ بھی وصول کیا گیا۔ آرتھر نے منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے آس پاس کے نظاروں کو تمام تر جزیات کے ساتھ پیش کیا ہے، بندروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، اُن کی عادتیں، آدمیوں سے خوف کھانا، وحشت کے باوجود اُن کی نقل اُتارنا۔ دریا کے دونوں کناروں پر بنے ہوئے پُرانے قلعوں کے کھنڈرات، جہاں تیس برس پہلے ایک ایک سکھ یا ڈوگرہ جمعدار رہا کرتا تھا اُن کے ساتھ پانچ پانچ سات سات غیر مستقل سپاہ نما ڈاکو۔ مہاراجہ کے ماتحت کھکھے اور بمبئے راجے تھے جن کے پاس معمولی قسم کی بندوقیں رہنے دی گئی تھیں، دومیل، گڑھی، چکوٹھی کے پڑاو، جمال جُو کی زبانی پچھلے زمانے کے واقعات کہ کیسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج اُوڑی تک پہنچیں لیکن آگے بڑھتے ہوئے اُن پر بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں لڑھکائی گئیں، جونہی وہ راستہ صاف کرنے لگے تو دھاوا بول کر اُنہیں کافی نقصان پہنچایا گیا۔ اُوڑی پہنچے تو برف باری ہو رہی تھی۔ انہیں ایک فرسودہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ جہاں اَلاؤ جلا کر جوں توں کر کے رات گزاری۔ یہاں اُسے باتوں باتوں سے جمال جُو کی زبانی یہ پتہ چلا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں' جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا ہے، مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور لیفٹیننٹ پٹین جو مغربی تبت

کی کھوج میں لگا ہوا تھا، واپس لوٹا اور جان نکلسن کی افواج کے ساتھ شامل ہوا۔ اس ریاست سے گئی ہوئی فوجیں کئی ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھیں اور کشمیری گیٹ کی طرف سے حملہ آوروں کو ہٹانے میں بہادری سے لڑی تھیں اوڑی سے وہ برف پھاندتے ہوئے چلے اور برف کے تودوں سے بمشکل جان بچا سکے۔ آرتھر لکھتا ہے کہ ''میں وادی کشمیر کا پہلا نظارہ کبھی نہیں بھولوں گا'' فروری میں ہر مکھ کی برف پوش چوٹیوں کو دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھ کر وہ سراپا استعجاب نظر آتا ہے۔ یہاں سے اُس نے پچاس میل کی مسافت تک پھیلی وادی کا نظارہ کیا اور دریائے جہلم کے آبی راستے سے سفر کرنے لگا۔

اُپنے سفر نامہ میں آرتھر ایڈمنڈ ڈاونز کی خدمات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ کیسے چرچ مشنری سوسائٹی میں شامل ہو کر اُس نے مسلم آبادی والے علاقوں سے گھرے ہوئے علاقہ کافرستان کا رخ کیا جو پچھلے ایک ہزار برس کی لگاتار کوششوں کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جہاں عیسائیت کے فروغ کی اُمید تھی لیکن وہ بھیس بدل کر جانے کے باوجود مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔

انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں سرینگر کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ کوہِ سلیمان کے دامن میں واقع کشمیر مشن ہسپتال سے آس پاس کا نظارہ کرتا ہے۔ بیس لاکھ کی آبادی والے خطے کو لہراتے ریڈ کراس کے جھنڈے کا پیام امن و آشتی سنانے پر مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کے بیان کے مطابق ہائی سکول بننے سے پہلے یہاں عورتوں کا علاج کرنے کیلئے کوئی خاتون ڈاکٹر نہ تھی، نرس نہ تھی، تعلیم نہ تھی۔ بغیر چند نایاب مسوّدوں کے کشمیری

زبان کا اُدب نہ تھا۔ وہ لکھتا ہے ''اَب اِس ندی کے ذرا پچھلے حصے کی طرف جاتا ہوں، میرے پیشرؤوں کا زمانہ، وہ دن جب سردیوں میں کسی یورپی کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، جس میں رکاوٹ ڈالنے والی افسر شاہی کی تنگ نالیوں سے پانی بہنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ پھر وہ مشن کے منبع یعنی کلارک اور ایملی کی طرف نظر اُٹھا کر دہلی کے ہیرو جنرل جان نکلسن کے بھتیجے ڈاکٹر تھیوڈر میکس ویل پر آ جاتا ہے جو کشمیر میں پہلا پولٹیکل آفیسر اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کا ذاتی دوست تھا۔ اِس لئے اُسے رستم گڑھی پہاڑی کی شمالی ڈھلوان پر ہسپتال کیلئے زمین دی گئی اور رہنے کے لئے مکان؛ جس میں اَب آرتھر رہتا تھا۔ پھر ڈاکٹر جان ولیم اور ٹی آر واڈے کی خدمات کا وقت آیا، جس نے ہندوستان میں دس سال کا تجربہ پایا اور کشمیری زبان کیلئے کافی کام کیا۔ خاص کر ''عہد نامۂ جدید'' کا ترجمہ اور گرائمر کی تیاری وغیرہ۔ اُس نے کئی سال تک قحط زدہ لوگوں کی خدمت کی، اگرچہ حکومت ہر خبر کو چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ آرتھر کے کشمیر پہنچنے کے وقت قحط کے آثار باقی تھے اور اُن واقعات کا بیان پریشانیاں بڑھا رہا تھا۔ آرتھر لکھتا ہے کہ ''کشمیر ایک ایسا ملک ہے جہاں تھوڑی سی دُور اندیشی سے کبھی قحط نہیں پڑسکتا کیونکہ پانی کی بہتات ہے، بارش نہ بھی ہو، تو آبپاشی کی محتاج فصلیں کبھی سوکھ نہیں سکتیں۔ البتہ زیادہ بارشیں خطرہ کی گھنٹی ہیں کیونکہ سیلاب تمام خطوں کو بہالے جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ اُن دنوں سارا لگان جنس میں ادا ہوتا تھا۔ مسلمان کسانوں کو سزا دینے کیلئے وزیر پنوں نے تخمینہ لگانے میں دیر کردی۔ اس کے

علاوہ غلہ گوداموں میں سڑ گیا اور بیج بھی مہیا نہ ہو سکے، بیشتر زمینوں میں بوائی نہ ہو سکی اور کسان دوسرے علاقوں میں بھاگ گئے۔ جموں میں اِس قحط کا اثر محسوس نہ ہوا۔ ملازموں نے غلہ کی خرید فروخت میں بہت کچھ کمایا۔ افواہ بھی اُڑی کہ سینکڑوں فاقہ کش ڈل جھیل کے پانیوں کی نذر کردئے گئے۔ اس کا چشم دید گواہ اور مخبر چند گھنٹوں میں اچانک مر گیا۔ قرائنی شہادتوں کے باوصف یہ کہانی قابل اعتماد معلوم نہ ہوئی لیکن یہ باتیں ہمدردی کے فقدان اور مسلمان کسانوں اور شالبافوں کے اُپنے حُکام سے شر آمیز شکوک کی گہری بنیاد کی طرف اِشارہ کرتی تھیں۔ واڈے صاحب اس سیاسی اور دیگر قسم کی رَسہ کشی سے الگ تھلگ رہ کر غلہ بہم پہنچانے اور رفاہِ عام کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۸۸۱ء کے خزاں تک قحط کی یتیموں کو والدین کا سایۂ عاطفت نصیب ہوا اور کئی برس تک یہ عمارت عورتوں کی نگہداشت کے کام آئی۔

نیو کے ورود تک لوگ قحط کے اثرات سے چھٹکارا نہ پا سکے تھے۔ اُن کے بدن پر پڑے چیتھڑوں اور غریب عوام خاص کر شالبافوں کے گھلے سوکھے اجسام قحط زدگی کا مُنہ بولتا ثبوت تھے۔ مشن ہسپتال کی شہرت اَب بہت بڑھ گئی تھی لیکن جراحی کے وسیع پروگرام کیلئے عمارت نا مکتفی تھی۔ آرتھر نے غیر تسلی بخش انتظامات کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے فوراً بعد سرکار کی طرف سے ہسپتال کی تعمیرِ نو کا کام ہونے لگا۔ آرتھر کو اعلیٰ حکام کی مہربانیوں کا تجربہ بھی ہوا، ایک سرکردہ ہندو حاکم جو دو سال پہلے قحط کے مارے لوگوں کے لئے راحت رسانی میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا اور بہت سارا غلہ دبا کر خوب مال کمایا

تھا، کی صحت جانچنے کے لئے جب وہ اپنے آفیسر کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا تو اس نے اُنہیں خدا کے فرشتے قرار دیا یا دیوتا۔ اور حالات سے بے قابو ہو کر اُن کی خوب خاطر تواضع کی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد کشمیر میں پولیٹکل ایجنٹ کو ریذیڈنٹ کا درجہ دیا گیا تھا۔ سری نگر میں قیام کے دوران وہ کئی انگریز مہم جوؤں سے ملا، چینی ترکستان میں واقع یارقند میں ایک وسطِ ایشیائی تجارتی کمپنی سے وابستہ داگلیش صاحب سے، جن دنوں یارقند کے حکمران امیر یعقوب بیگ کے دربار میں ڈوگلس فارستھ کا مشن جانے والا تھا۔ اس مشن نے چینی ترکستان اور پامیر کے ایک بڑے علاقے کی سیاحت کی۔ امیر یعقوب بیگ نے ایک بڑے قتلِ عام کے بعد چینی حملہ آوروں کو پسپا کیا تھا اور کئی برس تک ایسا لگتا تھا کہ وہ خود مختار مسلم حکومت قائم کرے گا اس لئے اس کے دربار سے تعلقات قائم کرنا ضروری تھا۔ لیکن جلد ہی چینیوں نے اس حصے کو پھر فتح کیا اور اس دوران گھر گھر راج کی حالت رہی۔ داگلیش نے مسٹر کرے کے ساتھ مل کر لہاسہ کے شمال مشرق سے لے کر کوکونار سے پرے شمالی تبت کی قابل ذکر مہم میں ایک وسیع علاقے کو چھان مارا۔ وہ ترکی زبان اور کچھ تبتی جانتا تھا اور اند جاتی کا بھیس بدل سکتا تھا۔ داگلیش کو یارقندیوں کے ساتھ چینیوں کے مقابل جانے کو کہا گیا اور اس کے انکار پر مشکوک ٹھہرا۔ نتیجہ یہ کہ قراقرم کے اونچے سلسلہ ہائے کوہ میں ایک پٹھان نے اُسے قتل کر دیا۔ پکڑنے کی کافی کوشش کے بعد گرفتار ہوا لیکن قید خانہ میں خودکشی کی۔ اس سے پورے وسطِ

ایشیا میں ایک اچھا تاثر پیدا ہوا۔ برطانیہ، روس اور چین کی بڑی طاقتوں کی مدد سے مجرم کا یہ انجام ایک مثال بن کر رہ گیا۔ آرتھر کشمیر میں ۱۸۸۵ء کے خطرناک اور تباہ کن زلزلوں کا عینی شاہد رہا ہے۔ اُس برس موسم بہار کی بارشیں غیر معمولی طور پر ماہِ مئی کے آخر تک ہوتی رہیں جس کے نتیجہ میں زمین پھٹتی رہی، تودے اور پسیاں گرتی رہیں اور آخر ۳۰ مئی پانچ بجے صبح زلزلہ شروع ہو گیا، پہلے آہستہ جھٹکے اور پھر ہولناک طرح کے۔ آرتھر کے سامنے مکانوں کی چھتیں گرتی رہیں، دیواریں بیٹھنے لگیں اور بنیادیں نکلتی دکھائی دیں۔ آس پاس لوگوں کے شور وغل، عورتوں کی آہ وزاری، بچوں کی چیخوں سے حشر بپا ہوا۔ وہ اپنے مشاہدہ کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میڈیکل مشن کی ذمہ داریاں کس حد تک بڑھ گئی تھیں۔ اُس کے خیال میں ''لکڑی کے بنے ہوئے مکانات اور ان کا طرزِ تعمیر زلزلوں سے بچاؤ کی اچھی صورت ہے، اکثر مکانات اگرچہ ٹیڑھے ہو گئے، جھک گئے لیکن پھر بھی کھڑے رہے۔ ورنہ ساری آبادی تلف ہو جاتی''۔ سرینگر میں بھی اس زلزلہ کا بہت اثر پڑا۔ اُن دنوں چھتوں پر مٹی ڈالی جاتی تھی۔ جس کے بوجھ سے کافی مکانات دب گئے۔ خود شاہی محل کو اور چند بڑی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ جو لوگ بچ گئے تھے وہ ملبے سے لاشیں نکالنے یا اَدھ موئے لوگوں کو بچانے میں مصروف تھے۔ بڑا دلدوز نظارہ تھا۔ دوسرے دن خبر ملی کہ سوپور اور بارہمولہ کے قصبے اور ملحقہ علاقے بالکل تلف ہو گئے ہیں۔ آرتھر کو دریائی راستے سے بارہ مولہ پہنچنے میں چند دن لگے۔ اُسے سوپور میں سینکڑوں مکانات گرے ہوئے نظر آئے اُس

کے ساتھی جان ہنٹن نولز آس پاس کے دیہات میں جا کر زخمیوں کو ان کے پاس بھیجتے رہے۔ کوئی مکان سالم نہ تھا کہ وہاں اُن کا علاج کیا جاتا۔ ناچار خیموں کا انتظام کرنا پڑا۔ غفلت اور گندگی کے نتیجے میں وقت پر علاج کے لئے نہ آنے سے زخمیوں کی حالت مزید خراب ہوتی گئی تھی۔ دس دس میل کی مسافت سے زخمیوں کو پیٹھ پر اُٹھا کر وہاں لایا گیا۔ پہلے ہفتے میں روز زلزلہ آتا رہا۔ دو آب گاہ میں زمین سے گیس گندھک کی بو پھیلتی رہی۔ پٹن کے قریب بھی ایسا ہی ہوا۔ افسوس کہ کوئی ماہرِ ارضیات موجود نہ تھا کہ اس کی اصلیت کا پتہ لگاتا۔ کئی مقامات پر تیس تیس فٹ کے گہرے شگاف پڑ گئے تھے، اونچائی پستی میں گر گئی تھی اور ہموار میدان تیار ہوئے تھے۔ لری ڈورہ (بارہمولہ) کا گاؤں پوری طرح دَب گیا تھا۔ سنتالیس افراد کی آبادی میں صرف سات اشخاص نکل بھاگے تھے۔ چند دن بعد میں بھی لری ڈورہ پہنچا۔ ساتھ کے جنگل میں دَرختوں کے انبار گرے ہوئے تھے، مویشیوں کی سڑی ہوئی لاشوں کی بُو آدھ میل تک پہنچتی تھی۔ گوہن، مورن اور لری ڈورہ کے درمیان ایک ہزار فٹ اُونچا سطح مرتفع پوری زد میں آیا تھا۔ یہاں ایک پہاڑی پر کئی سو برس پرانی ایک بارگاہ تھی جس کا اب نام ونشان نہ تھا، اُس کے ساتھی بیٹ مین نے لوگوں سے پوچھا کہ ''اس بزرگ نے تمہیں کیوں نہ بچالیا؟ وہ بولے کیسے بچاتا، احمقوں نے اس کی قبر پر بہت سی مٹی ڈالی تھی۔ اُس نے کروٹ بدلی تو زلزلہ آ گیا۔ یہ لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں جہاں زیارتیں بچ گئی تھیں اور لوگ محفوظ رہے تھے وہاں خاص نیاز نذرانے پیش کئے جاتے

رہے۔ آرتھر کہتا ہے کہ ''ضعیف الاعتقادی کی اپنی ایک منطق ہے، بہرحال یہ عمل کا وقت تھا، تلقین، موعظت اور ہمدردی دکھانے کا نہیں''۔ اس سال کے آخر میں مسٹر نولز نے غریبی کے زیادہ شکار لوگوں میں راحت کا سامان تقسیم کیا۔ خود آرتھر کا رول کیا تھا اور کس طرح معمولی سامان سے اُس نے لوگوں کا علاج ومعالجہ کیا، اس کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ وہ پانی گرم کرنے یا کھانے پکانے کے لئے کوئلہ انگیٹھیوں سے کام لیتے تھے لیکن کشتی میں یہ کام مشکل سے ہوتا تھا۔ آرتھر زلزلہ کے بعد پھر بارہ مولہ آیا اور اپنے پہلے مریضوں کی خبر گیری کی۔ اُن دنوں یہاں دیوان ہیرانند گورنر تھا۔

اس سفر کے دوران اُس کے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے کشمیری لوگوں کے بارے میں انہیں اُن کے لالچی، اور جھوٹے ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے حرص وہوس، خود غرضی اور شقی القلبی کا تاثر ملا۔ ایک علاقے میں وہ راحت کا سامان بانٹنے گیا، کچھ کپڑے، سِلے ہوئے پھرن اور دوائیاں وغیرہ۔ اس سلسلے میں وہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''امیر لوگ بھی غریبوں سے زیادہ خود غرض دکھائی دیئے۔ میں جن غریبوں میں پھرن تقسیم کرتا جاتا، وہ اُن سے چھین کر میرے سامنے ننگے روتے چلاتے چھوڑتے اور دھکے دے کر ہٹاتے رہتے تاکہ میری ہمدردی زیادہ عود کر آئے، اُن کی مالی حالت کی جانچ اور اس بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا مشکل تھا۔ نتیجہ یہ کہ سارے پھرن دو ہی تین گاؤں میں ختم ہو گئے۔ میں سوچتا تھا کہ اگرچہ ان کی جائیداد اور مال مویشی زلزلہ کی نذر ہو گئے ہیں لیکن اب کافی اچھی فصل

ہوئی ہے۔ بھیڑ بکریوں اور مرغوں کی بہتات ہے۔ کھانے کو بھی بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ پھر انہیں اس قدر حرص وہوس کیوں؟ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مکانوں میں رہنے اور ان کا سا کھانا کھانے سے ہماری اُن کی عادتوں، خیالات، سوچ اور اقدار حیات کی حد بندیاں ختم نہیں ہوں گی۔

جب تک یورپی آسائشوں سے کام لیتے رہیں گے لوگ انہیں بڑا صاحب ہی سمجھیں گے اور ہم سے امداد کی توقع رکھیں گے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اگر ان کے باہمی قضیوں، زمینی تنازعوں، اور بیگار کے مسائل وغیرہ میں پڑیں تو اگر چہ ہم ایک طرف سے ان کی مدد کریں گے دوسری طرف ہماری خلاف سازشیں ہونے لگیں گی۔ اگر صرف بیماروں اور غریبوں کی مدد کریں تو ہماری دوستی زیادہ قابل اعتماد نہ ٹھہرے گی، مشنری کی یہ بڑی غلطی ہوگی کہ دودھیل گائے بن کر رہے اور راست بازی پھیلانے کی توقع کرے۔'' کشمیر کے بعد آرتھر جموں کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے۔ پہلے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بارے میں کہ سارے ہندوستانی راجوں، شہزادوں اور نوابوں میں اِس سے زیادہ پکا عقیدہ رکھنے والا کوئی نہیں، وہ نہ صرف سادھوسنتوں اور برہمنوں کا سرپرست ہے بلکہ لگاتار ہر دوار جاتا رہتا ہے اور ساتھ ہی دوسرے مقدس مقامات پر بھی۔ اُس نے دُوبار امرناتھ یاترا بھی کی ہے۔ اُس کے باپ کی خواہش تھی کہ جموں دوسرا بنارس بنے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ شاہی انداز کے صرف رقم کے باوجود آمدنی میں بنارس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جموں اگر چہ عرصہ دراز سے راجپوت خاندان کے تحت رہا ہے، پھر بھی پچھلی صدی کے وسط

سے ہی اس ممتاز درجہ تک پہنچا تھا۔ یہ راجواڑہ وقت وقت لاہور، دلی، کشمیر، قنوج جیسی سلطنتوں کا باجگزار رہا ہے۔ لیکن بعد میں اس کی حکومت کا مکمل غلام بن کر رہ گیا تھا۔ گلاب سنگھ اور اُس کے دو بھائیوں دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں تھے۔ گلاب سنگھ اپنی اچھی ...... کارکردگی کی وجہ سے جموں کا راجہ بنا۔ اُس نے آس پاس کے علاقے بھی اپنے راج میں لائے۔ اُس نے اپنے آقا کیلئے لداخ تک فتح کیا۔ کشمیر کا سکھ گورنر اس کی راہ میں حائل ہونا چاہتا تھا۔ گلاب سنگھ ہر اُس طاقت سے ٹکرانے میں نہ ہچکچایا جو لاہور تخت اور اس کے درمیان آجائے۔ اُس نے سکھ طاقت کے انجام کی پیش بنی کر رکھی تھی۔ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سبراءُن کی لڑائی میں انگریز جیت گئے اور گلاب سنگھ کو انگریزوں سے اپنی وفاداریوں کا صلہ مل گیا۔'' لارڈ ڈلہوزی نے جب پنجاب کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا'' تو بقول آرتھر'' وہ معاہدہ امرتسر پر بہت پشیمان ہوا ہوگا'' لیکن کشمیر راج کے تعلقات انگریزوں سے بہت اچھے رہے۔ خاص کر غدر کے دنوں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انگریزوں کی مدد کے لئے اپنی فوجیں بھیجیں۔ معاہدہ امرتسر کی رُو سے اگر چہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے تک گلاب سنگھ کو دیا گیا تھا لیکن ڈوگرہ پہلے ہی دریائے سندھ کو پار کر کے انتہائی شمال مغرب تک پہنچ چکے تھے اس لئے یہ معاہدہ مکمل طور پر صحیح نہیں تھا۔ بہر حال لداخ میں برطانیہ کی طرف سے میجر کننگھم اور وانس ایگنیو اور لفٹنٹ رالف ینگ پر مشتمل سرحدی کمیشن نے حدود کا تعین کیا۔ اب جموں انگلینڈ سے بڑی لطنت کی صورت اختیار کر گیا۔ جموں دربار میں

درجنوں بولیاں بولنے والے اُمرا دیکھے جاتے تھے۔ پنجابی افسر، سکھ جنرل، کشمیری دیوان اور برہمن، ڈوگرہ شہزادے ہی نہیں بلتی راجے، درد اور تبّتی اُمرا بھی۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے وقت آرتھر یہاں آیا جموں سے کئی میل تک ایک فربہ ہاتھی اُس کے استقبال کیلئے بھیجا گیا جو اُسے سرکاری مہمان اختیار کرنے کی علامت تھا۔ آرتھر لکھتا ہے کہ اَب کافی تبدیلی آگئی ہے، اس میں صرف بہتری ہی نہیں جیسے ریل کا انجن، مغربی مصنوعات، طرزِ تعلیم، وغیرہ، بلکہ یہ بھی کہ رعایا کے ساتھ راعی کے پدرانہ تعلقات، وہ شان وشوکت اور درباری آداب ختم ہورہے ہیں" اُس کے بقول کئی برس جموں وکشمیر کا انتظام برطانیہ سرکا کی قائم کردہ کونسل چلاتی تھی لیکن ۱۹۰۵ء میں جب لارڈ کرزن کا دربار لگا تو مہاراجہ کے پورے اختیارات بحال ہوگئے۔ پھر پرنس آف ویلز کنگ جارج یہاں آیا اور ستواری میں نئی ریذیڈنسی پر خوبصورت کیمپ لگا۔ ہمیشہ سے روپے پیسے کی تنگی والی ریاست کے چالیس ہزار پونڈ رقم اس کے استقبال اور اخراجات پر اُٹھ گئی" آرتھر کے نزدیک مشرقی لوگ اس کو اسراف نہیں سمجھتے۔ ایک معمولی ٹیکس دہندہ بھی کہتا ہے کہ اُس کے باپ دادا بھی حفظان صحت کے ان طریقوں کے بغیر زندگی گذارتے تھے جن پر انگریز زور دیتے ہیں، راستے بھی کچھ بُرے نہیں۔ لیکن راجہ کیلئے اس شان وشوکت کا اظہار ضروری تھا۔

بسنت کے دنوں شاہی دربار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دربار میں ہر ملازم نذرانہ پیش کرتا جو اُس کی تنخواہ کا تین فی صد ہوتا تھا۔ یہ رقم راجہ کی طرف سے نمک خواروں کو الطاف وعنایات یا شادی بیاہ کے مواقع پر تحفہ تحائف پر

خرچ ہوتی تھی۔ ہر شخص پیلا لباس پہنتا تھا اور ایسی ہی پگڑی بھی۔ نَوروز پر بھی خاص دربار لگتا تھا اور دسہرہ پر بھی۔ اس موقع پر راون کا پُتلا جلایا جاتا۔ پہلے دِنوں جموں آنے والے سارے یورپی مہاراجہ کے مہمان ہوتے تھے۔ ریل صرف سیالکوٹ تک تھی۔ یہاں جو مہمان آتے، اُن پر کافی رقم صرف کی جاتی، گائے کے گوشت کے بغیر کوئی بھی چیز طلب پر مِل جاتی تھی۔ آرتھر خود شراب نہیں پیتا تھا لیکن دوسروں کے قسم قسم کی شراب نوشی پر کیوں اعتراض کرتا۔ اُس کا دربار میں کیسے استقبال ہوا، اس کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ مہاراجہ نے اُسے اُس وقت تک جموں میں ٹھہرایا جب تک سڑک کی اچھی طرح مرمت نہ ہوئی۔ پھر آرتھر بانہال کے راستے کشمیر آیا جہاں سے کوئی یورپی سفر نہ کرسکتا تھا۔ جموں کی گلیاں بہت تنگ تھیں جن پر پتھر کی سلیں بچھائی گئی تھیں اور مشکوں سے پانی لے جایا جاتا تھا۔ جموں میں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا عجائب گھر اور باغات۔ بانہال کا راستہ گھوڑ سواری کی ہی قابل تھا۔ دن بھر بارہ چودہ میل کا سفر ہوتا تھا۔ اُس نے مزدوروں کا انتظار کئے بنا اُپنا کچھ ہلکا سامان گھوڑے پر باندھا اور چل پڑا۔ ہر چار پانچ میل کی مسافت پر ایک ڈاک چوکی تھی اور ڈاک والے چاک وچوبند اور مستعد تھے۔ راستے میں کشمیر سے باہر جانے والے تاجروں اور مزدوروں کے کارواں بھی ملتے تھے۔ بانہال میں وہ ایک مسلمان فقیر سے ملا جس نے رات گئے اُسے اَپنے پاس ٹھہرایا، اُسے کھلایا پلایا اور بخارا اور ہرات میں گھومنے کے دوران اپنے تجربات بتائے۔ وہ ایک صوفی تھا اور عام مسلمانوں سے ہٹ کر وسیع المشرب اور کُھلے ذہن کا مالک۔

وہ قرآن کے ساتھ ساتھ اُسے فارسی شعراء کے اشعار بھی سُناتا رہا۔

آرتھر کو مہذب طرزِ زندگی کی نسبت قدرتی مناظر میں عام لوگوں کی سی زندگی بڑی دلچسپ دکھائی دی۔ اُس کا خیال ہے کہ اہلِ یورپ کتابوں سے سیکھتے ہیں لیکن اہل مشرق صحبتوں سے، اور اِس طرح کا علم کتنا اچھا ہے۔ اس فقیر نے مسلمانوں کے ستّر فرقوں میں سے ہر فرقہ کے لوگوں سے ملاقات کی ہے۔ اس نے بتایا کہ مسلمان کہلانے والے اکثر خدا کے منکر ہیں اور کچھ مُشرک بھی ہیں، اس کے علاوہ اُس نے عیسائی اور دوسرے عقیدہ کے لوگوں سے بھی معلومات حاصل کی ہیں لیکن اُس کا خیال ہے کہ جو جس کا نظریہ یا عقیدہ ہو اللہ مہربان اور رحیم ہے"

کشمیر پہنچنے کے بعد وہ اِس سرزمین کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر ڈاونز نے اُسے ریاست کے مختلف حصوں کا سفر کرنے اور حالات کا بغور جائزہ لینے کا مشورہ دیا۔ آرتھر اپنے خانساماں جمال جُو اور پنشن یافتہ ڈاکٹر بچن سنگھ کی ہمراہی میں کچھ اَدویات اَپنے ساتھ لے کر گُریز کی طرف چل پڑا۔ رازدانی درّہ کو پار کرتے ہوئے تمام مشکلات کا مقابلہ کرکے درد دیس میں جانکلا۔ راستے میں گلگت بیگار پر گئے ہوئے غریب اور لاچار مزدوروں کے قصے سُنے جنہیں اِن دشوار گزار راستوں پر مَن بھر بوجھ اُٹھائے سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بیس دنوں کیلئے اَپنا سامان خورد ونوش، گرم کپڑے اور گھاس کی جوتیاں۔ کہیں کہیں آرتھر کو سینے کے بل رینگ کر اونچائیاں سر کرنا پڑیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ گریز میں اگرچہ کشمیری بولی جاتی

ہے لیکن لوگ درد نسل کے ہیں، ماقبل تاریخ کے زمانے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ کشمیر کے بادشاہوں کے حملوں کی زد میں آئے ہیں لیکن اُن کے مفاد کی کوئی بات یہاں نہیں ملتی۔ آس پاس کے علاقے میں رہنے والوں کے ساتھ بھی شادی بیاہ کرتے ہیں۔ ان کے مکانات نہایت گندے ہیں، انسان اور مال مویشی ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور اِرد گرد گوبر اور کیچڑ کے ڈھیر ہیں۔ اگرچہ کشمیریوں سے زیادہ کالے نہیں پھر بھی دُھویں سے اَٹے اور سیاہ اونی لباس میں کوئی دلکشی نہیں رکھتے، عورتیں سر پر ایک تھیلا سا پہنتی ہیں جنہیں سردی میں کھینچ کر گردن اور مُنہ ڈھانپا جاتا ہے کافی برف باری اور زور کی سرد ہواؤں سے بچاؤ کیلئے چار پانچ مہینے گھروں میں محبوس رہتے ہیں۔ یہاں کچھ اُطراف سے چیلاس سے حملے ہوتے رہے ہیں اس لئے کوٹھے ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں، اَب گلگت جانے والی سڑک سے تھوڑا بہت فرق پڑا ہے لیکن تعلیم کا اِنتظام نہیں ہو سکا ہے۔ گرمیوں میں آب و ہوا خوشگوار ہے اور قدرتی مناظر خوب۔ خاص بات ایک اہرام نما پہاڑی اور اس کے نیچے ایک پاک چشمہ، جہاں چند برس پہلے مہاراجہ بھی سیر کو گیا۔ اسی کے دامن میں دو ندیاں مل کر دریائے کِشن گنگا کا نام پاتی ہیں۔ شمالی ندی درہ بزریل سے آتی ہے جس کے پانی کا رنگ فیروزی ہے۔ گریز اور متی مرگ کے درمیان چونے اور پتھر سے بنی موٹی تہہ کی پہاڑیاں مشرقی ندی تلیل کی وادی سے گزرتی ہے۔ یہاں کے لوگ کشمیریوں سے زیادہ قریب ہیں، خاص طور پر ڈوگرہ حملوں کے نتیجے میں۔ ڈوگرہ فوج نے کئی دیہات کو لوٹا

اس لئے لوگ کشمیر کی طرف بھاگ گئے، بعد میں لار کے علاقے کے لوگ حملوں کے نتیجہ میں تلیل آ گئے، تاکہ ٹیکسوں اور بیگار سے بچ جائیں۔ کئی دہائیوں تک ڈوگرہ اور سکھ فوجیں لداخ بلتستان اور گلگت کے علاقے فتح کرتی رہیں اور ہر مہم کشمیری مزدوروں کے بل بوتے سر کی گئی۔ یہاں تنگ وادیاں ہیں اور قابلِ زراعت زمین بہت کم۔ کوئی کوئی گاؤں نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ آرتھر کا ارادہ تھا کہ بزریل درّہ سے ہٹ کر دیوسائی سطح مرتفع پرے ہوتے ہوئے اسکردو پہنچے لیکن موسم موافق نہ تھا۔ برف بہت گہری تھی اور نو بجے دن کے بعد اُس پر چلنا کافی مشکل تھا۔ وہ سفر کی تمام صعوبتوں اور دلیرانہ مہم بازی کے تمام احوال وکوائف بیان کرتا ہے۔ اُس کی رائے کہ ''تمام قدرتی خوبصورتی اور فطرت کی شان وشوکت کا وارث ہونے کیلئے ایک سائنسدان یا مہاراجہ ہونے کی ضرورت نہیں، کھلی نظر اور عقیدت بھرا دل چاہئے'' اُس نے رسکن کے بارے میں سُنا تھا کہ الپس پہاڑ دیکھ کر وہ گھٹنوں پر جھکا اور خدا کی حمد کی۔ اس کے بعد ہی ''ماڈرن پینٹرس'' کے ابواب لکھنے کا وجدان حاصل کیا۔ وہ نوجوانی میں برنوا گلیشر اور ماؤنٹ بلاک کی مشرقی جانب کی اونچائیوں تک پہنچا ہے لیکن اُسے نانگا پربت ''چیزے دِگر'' معلوم ہوتا ہے تحیر زا اور عظیم الشان راستے میں اس کے مزدور بے بس ہو گئے۔ اس لئے بلتی مزدور ڈھونڈے گئے۔ اُسے اچنبھا ہوا کہ ساڑھے پانچ فٹ قد سے بھی کم، اچھی غذا کو ترسنے والے یہ لوگ پچیس سے تیس سیر بوجھ اُٹھائے ان راستوں پر کیسے چل سکتے ہیں کشمیریوں سے زیادہ تیز قدم ہیں جو اُن سے لمبے قد اور

خوب ڈیل ڈول کے ہیں۔ یہ اُن کی طرح بڑبڑاتے بھی نہیں۔

اسکردو اور بونجی کے درمیان علاقے میں دریائے شیوک دریائے سندھ کے ساتھ ملتا ہے اور سات ہزار فٹ کی بلندی سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر آ جاتے ہیں۔ کشورا کے مقام پر دریائے سندھ دنیا کی تنگ ترین گھاٹی بناتا ہے۔ وہ اسکردو کے ریتلے میدانوں کا سفر نہیں بھولتا، پینے کو سندھ کا صاف شفاف پانی اور نہانے کو اس کی سرد لہریں۔ خرمنگ کے مقام پر اُنہیں رسیوں کے پُل سے دریا عبور کرنا پڑا۔ اس خطے کی سیر کا حال آرتھر جیسے انگریزوں کی مہم جوئی کی حیرت افزا کہانی ہے۔ وہ اب لداخ کی طرف چل پڑتا ہے۔ اب تک کے سفر میں اُسے مختلف قبائل کے زندگی کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ، دلفریب دیہات اور پہاڑی سلسلہ دیکھنے کو ملا۔ اس کے پار پامیر اور چینی ترکستان تھا۔ وہاں جانے کیلئے الگ مہم کی ضرورت تھی۔

آرتھر کے سفر نامے کا بیشتر حصہ کشمیر کے شمال مغربی علاقوں کی سیاحت، اور مہم جوئی کے بیان سے تعلق رکھتا ہے، سفرنامہ کے تین سو میں سے ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ داستان کافی دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ ۱۸۹۵ء کے اگست میں وہ واڈھ کشن گنگا کے سرے پر بزریل درّہ سے سطح مرتفع دیوسائی کو پار کرتا ہوا بلتستان کی طرف گیا اور مختلف علاقوں سے گزر کے سیاہ پانی اور سرخ پانی کے چشموں تک پہنچا۔ یہاں کے پتھروں سے بنے کوٹھے اسکردو کے راجہ کے بھیجے ہوئے اُن سپاہیوں کی یاد دلاتے تھے جو کئی نسلوں پہلے اس سرحد کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان علاقوں میں ایندھن ڈھونڈنا بھی ایک امتحان تھا۔ ناخوشگوار موسم، دشوار گزار راستے اور تنہائی ان

علاقوں کے جمادات، نباتات اور طرزِ بود و باش کا ذکر وضاحت سے ملتا ہے۔

اسکردو میں تحصیلدار پرساد جو اُس سے ملنے آیا جو اُن دنوں بلتستان کا حاکم تھا اور لداخ کے وزیرِ وزارت یا گورنر کے تابع تھا۔ اس سے پہلے جب ۱۸۸۲ء میں آرتھر وہاں گیا تو مہتر منگول وہاں کا وزیر تھا۔ پرساد جُو نے اُسے سامان خورد و نوش اور تحفے تحائف دیئے۔ اُس وقت اُس کے ساتھ جارج ٹنڈل بسکو بھی تھا۔ آرتھر بدلے میں اُنہیں کچھ اَدویات اور طبی مشوروں سے نوازتا تھا لیکن اس بار سواری کا گھوڑا انجشا جواب مشقت کے قابل نہ رہا تھا۔ دوسرے روز راجا علی شاہ ملنے آیا جس کا پُرانا محل جنگ میں تباہ ہوا تھا اور اَب نیا محل جدید طرز کا ہونے کے باوجود دِلکش نہ تھا۔ مقامی ڈسپنسری میں لوگوں کا کچھ علاج معالجہ بھی کیا گیا۔ اسکردو میں اُن دنوں ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ راجا قسم کے لوگ آبا، واجداء کی بڑائی جتایا کرتے ہیں۔ ایک استفسار کے جواب میں وہاں کا راجا بولا کہ اُس کے پَردادا منچون علی شاہ نے چترال تک گلگت فتح کیا تھا۔ یہ راجے چپلو اور خرمنگ کے راجوں سے رشتے ناطے کرتے ہیں۔ راجا آپسی نااِتفاقی کا رونا روتے ہوئے کہتا تھا کہ اسی وجہ سے ڈوگرے فتحیاب ہوئے۔ یہ راجا ایک بار ڈوگرہ مہاراج کے دربار میں بھی آیا تھا۔ وہ اُردو کی نسبت فارسی زیاد جانتے تھے۔ یہاں دَریائے شغر سندھ کے ساتھ آملتا ہے۔ وادیٔ شغر نے نوبرا وادی کی یاد تازہ کی۔ یہاں پر آرتھر سویڈش مشنری کے گستافسن صاحب سے ملا جس کی مدد کرنا ان کے مشن کا ایک مقصد تھا۔ اُس نے دارجیلنگ میں کچھ تبتی اور بلتی سیکھی تھی۔ وہ بولی جس طرح لکھی جاتی ہے اسی طرح بولی نہیں جاتی۔ بلتی صرف بول چال کی زبان ہے اور تبتی تحریری کی زبان۔ یہاں کی مسجد طرزِ تعمیر میں سرینگر کی مسجدوں سے ملتی جلتی ہے صرف

کچھ تُرک کی اثرات بھی شامل ہیں۔ نشک دَرّہ تک وزیر حیدر نے مصاحبت کی جس کا خیال تھا کہ کچھ بلتی لداخ سے، کچھ گلگت سے اور کچھ نگر سے آئے ہیں۔ وہ بودھ مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔ جناب میر صاحب سجّادین لے کر آئے تو لوگ مسلمان ہوئے۔ اُن کی بنائی ہوئی آٹھ مسجدیں اَب تک موجود تھیں۔ آرتھر نے پوچھا ''حج کرنے جاتے ہو؟ وہ بولا'' نہیں، ہمارا مقدس مقام کربلا ہے۔ مُردوں کو دفناتے وقت، میت کے بغلوں میں مقدس الفاظ کندہ کیے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے رکھے جاتے ہیں اور مُنہ کربلا کی طرف کیا جاتا ہے'' میری مراد میر یحیٰی بن میر دانا علی دانا ہے۔

آرتھر کا خیال ہے کہ راجاؤں نے وہاں اِسلام پھیلایا جسے بعد میں مغلوں نے مکمل کیا۔ وہاں شادی پر کوئی مذہبی رسم ادا نہیں ہوتی بلڑکی چندن، برتن اور عروسانہ لباس ساتھ لاتی ہے اور دولہا لڑکی کے وارث کو دس روپے سے دو سو روپے تک رقم ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ تحفے، بندوق اور گھوڑے وغیرہ۔ ناچتے گاتے ایک جلوس کی صورت میں دولہا جاتا ہے اچھی خاصی دعوت ہوتی ہے جس میں مُلا بن بُلائے بھی شامل ہوتا ہے۔ یہاں سے ایک راستہ یارقند جاتا ہے جس پر تجارتی کارواں چلتے تھے۔ کنجوٹول (ہونزا کے ڈاکوؤں) کے حملوں کی وجہ سے اَب تجارت بند ہے۔ اب اسکردو بلتستان کا صدر مقام ہے۔ ڈوگرہ راج سے پہلے سندھ کے بالائی علاقے لداخ تک خودمختار ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے جو کبھی کبھی ایک ہی سردار کے تحت آجاتے تھے بیرونی حملوں کے خلاف متحد ہوتے تھے۔ اسکردو، رونڈو شغر، کھپلو اور خرمنگ پر باجگزار راجے حاکم تھے۔ ڈاکٹر ڈی فلپ نے لکھا ہے کہ بلتی منگول نسل سے نہیں ہے بلکہ

آریاؤں کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ آرتھر کے نزدیک بلتستان کی مغربی سرحد کے بارے میں یہ کہنا تو کسی حد تک صحیح ہے باقی علاقوں کے لوگوں پر منگول نسل کا گمان ہوتا ہے اُس نے سروں کی لپیٹ سے اس کا اندازہ کرلیا مجموعی طور آریہ، منگول اور درد تینوں نسلوں سے عام لوگوں کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ باشا اور برالڈو وادیوں میں نگر خون کی آمیزش بھی ہے۔ پچھلی دو صدیوں کے دوران بہت سارے نگر کنبے بلتیوں کے ساتھ رشتے ناطے کرتے رہے ہیں۔ راجاؤں کے خاندان ایرانی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ درد لوگ مشرقی ہندوکش سے ہندوستانی عقیدے اور رسم ورواج لے کر آئے۔ بروشسکی بولنے والے بشکن شمال مغرب سے اور بلتی مشرق سے آکر یہاں بس گئے ہیں۔ آرتھر کے دورہ کے وقت فصلیں کاٹی جارہی تھیں اُسے عورتیں گیت گاتے ہوئے کام میں مصروف نظر آئیں، چھتوں پر خوبانیوں کے ڈھیر سکھانے کے لئے پڑے تھے۔ زرد اور پیلے رنگ کے ان کی اعلیٰ قسم ہے، گٹھلیاں الگ کرکے سکھائی گئی خوبانیوں کو کوٹ کر گول گول ڈلے بنائے جاتے ہیں گٹھلیوں سے تیل نکالا جاتا ہے۔ اونچائی پر اخروٹ بھی ہوتے ہیں۔ ٹوٹو کے مقام پر بکری کی کھالوں سے بنے ٹھاٹھ (raft) پر دریا پار کیا جاتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ میں چوبیس کھالیں لگتی ہیں۔ وہاں وزیر نے لنگم کی صورت کے سولہ بلند ہزار فٹ بلند ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ ہندو مسلم دونوں کے لئے برابر مقدس ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شاہ نصیر پیر نے اس پر چلہ کشی کی۔ ان پہاڑوں میں چرتم مقام پر گرم پانی کے چشمے ہیں۔ یہاں سال میں دو میلے لگتے ہیں۔ نیچے وادیوں میں سیب ناشپاتی اور اخروٹ کے درخت ہیں۔ ارنڈو کے لوگ بلتی

بالائی علاقوں کی طرف پڑتا ہے، جب سے وہاں جانے کی سوچ رہا تھا۔ وہاں جانے کا ایک راستہ بونجی سے استور ہوتا ہوا جاتا ہے اور دوسرا درہ مزنیو سے سیدھا جنوب سے کاغان اور درہ بابا کرے سے چوتھا مشرق کی طرف سے وادی لولاب سے ہوتا ہوا کشن گنگا کی وادی میں داخل ہوتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ آرتھر نے براہِ راست کشمیر سے جانا چاہا۔ وُلر کے کنارے بسے دیہات سے عبداللہ بٹ میٹ اور چند مزدور ساتھ لئے' عبداللہ بٹ، آرتھر کے بھائی کے ساتھ ہرموکھ اور کولاہائی کی بلندیوں پر جاچکا تھا اور بالتوا گلیشیر تک بھی۔ سامان خورد ونوش کے علاوہ گھاس کی رسیوں کے کچھ گٹھے بھی ساتھ لئے جو پُھور بنانے کے کام آتے ہیں۔ آرتھر ان کی تعریف میں کہتا ہے کہ یہ پہننے میں انتہائی آرام دہ اور ڈھلوانوں پر پھسلنے سے بچاتے ہیں'' راستے کے گردونواح کی تفصیلات دیتے ہوئے وہ دس ہزار فٹ اونچے درہ کو پار کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ ان علاقوں کے لوگ زیادہ تر بھیڑ بکریاں پالتے ہیں اور انہی پر انحصار رکھتے ہیں، اُن جنگلات کے زبردست دشمن ہیں جن میں پناہ لیتے ہیں۔ ایک مکان بنانے کے لئے تمیں درختوں کا صفایا کرتے ہیں۔ مکان میں صرف ایک دروازہ ہوتا ہے اور کہیں سے ہوا نہیں آتی۔ لکڑی کے لٹھوں سے دیوار کا کام لیتے ہیں جن پر کیچڑ پوتھ کے سردی سے بچاؤ کرتے ہیں۔ فی کس ایک ہزار مکعب فٹ ہَوا کے بجائے چار سو فٹ ہَوا ہی انہیں حاصل ہوتی ہے۔ گرمیوں میں ریوڑ لے کر دُور جنگلوں میں جاتے ہیں۔ کشمیری ان سے بہت ڈرتے ہیں اور یہ ہیں بھی وحشی، کبھی کسی فارسٹ گارڈ کو دے مارا، کبھی کسی گڑریئے کو قتل کیا (غالباً ان سے آرتھر کی مراد گوجر اور بکروال ہیں) سفر جاری رکھتے ہوئے وہ وادئ کشن گنگا میں داخل ہوتے ہیں' سا کے نہایت ٹھنڈے پانی میں نہانے پر لوگوں نے انہیں پاگل

انگریز'' کہہ کر پکارا۔ خیل کا گاؤں پھر سے بسا ہوا لگا' پرانی بستی شاید شاردا مندر بنانے کے زمانے کی ہو جو ایک منزل آگے آتا ہے۔ کیمپ سے قریب ہی ایک قبرستان تھا جس کی اکثر قبروں پر لکڑی کا بنا ہوا گھوڑے کا سر بنا ہوا تھا۔ ایسا یہاں اکثر نظر آتا ہے، شاید زمانہ کفر کے رسم و رواج کی نشانی باقی رہی ہے جب سیاہ پوش کافروں کے گھوڑے کی پیٹھ پر بنی مورت قبرستان میں رکھنے کا رواج تھا۔ خیل میں سینٹ اینڈریو کی صلیب بنی ہوئی نظر آئی۔ اس سے آگے انہوں نے بیری درّہ عبور کیا' غضب کی آندھی سے بچاؤ کے لئے وہ ایک گاؤں میں پہنچے، ہندو کش قبائل کی کرسیاں زمین سے صرف آٹھ نو انچ اونچی ہوتی ہے، خیر، گاؤں والوں نے اُن کی خوب خاطر داری کی اور سمجھے کہ یہ لوگ شکار کرنے آئے ہیں انہیں یقین دلایا گیا کہ صرف منظر بینی اور علاج معالجہ سے غرض ہے۔ اس کے شمال میں نانگا پربت ہے جس کی ممّیری اور اس کی پارٹی نے سیاحت کی تھی اور یہیں ان کی موت ہوئی۔ یہاں عجیب رسمیں ہیں' گرمیوں کے چند مہینوں میں جنسی علاحدگی ہوتی ہے، کیوں کہ مرد ریوڑوں کے ساتھ جاتے ہیں اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں شادی بیاہ کے لئے خزاں کا موسم ہے۔ چیلاس کے قبائلی شن نسل کے ہیں۔ اور داریل' گلگت اور استور کے لوگوں سے قریب ہیں، یہاں اسلام کی اشاعت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا، عالم اور مبلغ سوات سے آتے رہے ہیں۔ چیلاسی کٹر پنتھی نہیں ہر وادی ایک چھوٹی موٹی جمہوریہ ہے۔ مشن اور بشکن لوگوں کا زیادہ رتبہ ہے۔ برطانیہ کا پولٹیکل ایجنٹ صرف آئینی حکمران ہے۔ لوگ سردار کو چنتے ہیں جو جرگہ بناتا ہے اور رواجی قانون کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ بعد میں یہ فیصلے پولٹکل ایجنٹ کو بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں کی آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ مجرم دوسرے حصوں سے آتے ہیں جو

عموماً پٹھان یا گوجر ہوتے ہیں یہاں یہ لوگ بے زراعت اور لا قانون ہیں۔ مجموعی طور چیلاس ایک پُر امن علاقہ ہے، کچھ جغرافیائی وجوہات سے اور کچھ برطانوی پولٹیکل ایجنٹ کی موجودگی سے۔ پہلے یہ لوگ نیپال اور یاسین کے راجوں کو ٹیکس دیا کرتے تھے، اب گلگت کے برطانوی ایجنٹ کے تابع ہیں اور کوئی ٹیکس نہ دے کر بھی محفوظ۔ وہ سامان رسد لینے واپس بُنر قلعہ میں پہنچے جو بونجی' چیلاس راستے پر پڑتا ہے۔ بونجی سے چیلاس تک سندھ کی وادی ایک لق ودق علاقہ ہے، نہایت وسیع' کہستانی سلسلہ پندرہ ہزار فٹ سے تیس ہزار فٹ تک اونچا۔ جہاں سندھ کے ذریعے خوب کٹاؤ ہوتا رہتا ہے۔ قراقرم' مستگ اور ہندو کش کے علاوہ شمال مغربی ہمالیہ کے اَسی ہزار میل لمبے پہاڑی سلسلوں کے گلیشروں سے سیلاب آتے رہتے ہیں اسی علاقہ میں سفر کرتے ہوئے وہ چیلاس پہنچے۔ وہاں دو برطانوی فوجی افسروں نے اُن کی خاطر تواضع کی۔ دوسرے دن صبح فوجی پریڈ دیکھی جس سے داغستانی قبائل خوف زدہ ہوئے تھے۔ وہاں اُن دنوں اَفراتفری سی تھی۔ ایک پیر صاحب نے بندوقیں بند کرنے کا وعدہ دیا تھا لیکن بندوقیں چلی تھیں اور لوگ مارے گئے تھے اُن کا رہنما محمد عیسیٰ زہر سے ہلاک ہوا تھا، وہ انگریزوں کا مخالف تھا۔ اصلی کمانڈنٹ ایک ڈوگرہ میجر تھا۔ اعلیٰ افسر ماتحت انگریزوں سے سند حاصل کرتے تھے۔ آرتھر نے ڈائری میں لکھا تھا ''سندھ سے تربیلا تک ایک پکا راستہ سب کو چین سے بٹھائے گا'' سوات کی بالائی وادیاں کسی یورپی نے اس وقت تک نہیں دیکھی تھیں۔ اُس علاقے پر کسی کا قبضہ نہ تھا اسلئے نہیں کہ لوگ کٹر پنتھی اور خونخوار ہیں بلکہ اس لئے کہ علاقہ تک رَسائی دشوار ہے۔ بونجی سے اٹک تک کوئی پُل نہیں۔ صرف کھالوں سے بنے ٹھاٹھ کام آتے ہیں قبیدہ رسم و رواج اور لسانی لحاظ سے لوگ بٹے ہوئے

ہیں ۔علاقہ بنجر اور غیر آباد ہے ۔ پالوس ہربند، تنجیر اور دارَیل نام صرف سُنے گئے
ہیں ۔گلگت میں مقیم افسر بھی معمولی معلومات رکھتا ہے، چیلاس سے نیچے لوگ
پٹھان ہیں اور بولی شینؔ جو ہزارہ ضلع کی پنجابی میں ضم ہوتی ہے۔ شمالی قبائل درد نسل
کے ہیں، ایک ہی نسل کے باوجود اُن کی بولیوں میں اختلاف ہے، چیلاس کے
مسلمان کٹر سُنی ہیں اور ہم نسل شیعوں کے دشمن ۔ ماضی قریب تک گلگت روڈ پر
چیلاس ڈاکوؤں کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ حد درجہ مالی و جانی قربانیاں دے کر بارہ ہزار
ڈوگرہ فوج نے آخر چیلاس پر قبضہ کیا تھا۔ تمام دردستان میں غلامی کا رواج دیکھا
گیا ۔ اگر چہ مسلمان، مسلمانوں کو غلام نہیں بناتے لیکن وہاں مختلف نسلوں اور
عقیدوں کے لوگ ہیں ۔ بلتی غلام ترکستان کی منڈیوں میں جاتے ہے اور کشمیری
اور اسوات کے غلام چترال میں بکتے ہیں ۔ سیاہ پوش کافر لڑائی میں قید ہوئے
لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور اسی طرح خود افغانوں کے غلام بنتے ہیں۔ دس تولے
غبارِ زر (طلائی ریت) کے عوض غلہ ملتا ہے۔ لوکاٹ مشن کو اس لئے سراہا جاتا تھا
کہ روس کے خلاف ہندوستان کو داؤ بھی لگانے کا موقع آ گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں
چیلاس کے نوجوان اور تنجیر کے مُلا کشمیر کے خلاف سازش میں لگے ہوئے تھے۔
غور اور داریل کو غیر جانبدار رکھا گیا تھا۔ آخر بات چیت سے معاملہ سُلجھ گیا۔ بعد
میں وہ قبائل پھر مقابلہ پر آئے لیکن ناکام رہے۔ اُن دنوں کرنل ڈورانڈ گلگت
میں برطانوی پولیٹکل ایجنٹ تھا۔ اُس کے دور میں حالات میں بہتری آئی۔ اب
آرتھر نے لیسان اور کاغان جانے کی ٹھانی لیکن پہلے واپس ہندوستان آیا۔ اُسے
کاغان کے سفر میں تھکوں کے علاقہ سے گزرنا پڑا جو دوستانہ تعلقات قائم کرنے
کے موڈ میں نہ تھے ۔ وہ لوگ قریشی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ۔ اسلئے وہ
چیلاسیوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ چیلاسی گھوڑوں پر سوار نہیں ہوتے۔ اس

کے برعکس استور اور گلگت والے پولو کے شوقین ہیں اور جہاں تک ممکن ہو پیدل
نہیں چلتے۔ حملوں میں بھی وہ مال مویشی اور بھیڑ بکریوں کو ہانک لے جاتے ہیں،
گھوڑوں کو نہیں ۔ چیلاس نہایت سُست لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور زیادہ تر
کام عورتوں سے کراتے ہیں ۔ بباسر میں پولیٹکل افسر میجر ڈیو کا کیمپ تھا، اُس نے
خاطر تواضع کی۔ انہوں نے قبائل لوگوں کو اُسکے پاس دادرسی کے لئے آتے دیکھا
اور کبھی کبھی اچھی سی گوشمالی مہینوں جیل بھیجنے سے زیادہ موثر ہوتی ہے جہاں سے
مجرم پکا بن کر نکلتا ہے۔ ظہر کے وقت وہ چوٹی پر پہنچے۔ پھر لالوسر جھیل سے ہوتے
ہوئے آگے بڑھے ۔ آس پاس بہت ڈھالو تھا بمشکل بروائی گاؤں تک آ گئے ۔
کشمیری مزدور خستہ ہو چکے تھے جفاکش ہونے کی وجہ سے دوسرے دن کھا پی کر
پھر چلنے پر تیار ہوئے۔ راستہ میں ۳۷ ڈوگرہ فوجیوں کی دو کمپنیاں ملیں جو گلگت
جا رہے تھے۔ یہ لوگ اس سفر کے لئے بے سامان دکھائی دیئے فوج کی نقل و
حرکت قبائیلوں پر رعب ڈالنے کے لئے ضروری تھی لیکن اگر وہ سفر سے عاجز
آئیں اُثر اُلٹا پڑتا ہے۔ بروئی کے لوگ بڑے روکھے مزاج کے ہیں، کشمیری
مزدور (سالن) کے لئے بڑے پریشان ہوئے ۔ اس کے بغیر ''بھتہ'' کھایا نہیں
جاسکتا۔ میں عبداللہ شکاری کے ساتھ ذرا دار گیا اور ریوڑ سے ایک بھیڑ پکڑ لایا۔
گاؤں والے دوڑ کر آ گئے اور مشکل سے اس کے بدلے ایک عمر رسیدہ بھیڑ دے کر
قیمت حاصل کی۔ مشرق کی طرف دراوا اور کشمیر جانے کے یہی دّرے ہیں اور دو
ایک گورکھا افسروں اور میجر بروس کے بغیر کسی یورپی کو معلوم نہیں۔ مغرب کی طرف
سے ''بے خصم'' علاقہ ہے جہاں جلکوٹ قبائلی بھی لوٹ مار کرتے ہیں۔ وادیٔ
کاغان میں تین دِن تک ہمیں کوئی آبادی نہ ملی، نیچے آ کر سات ہزار فٹ کی بلندی
پر کچھ کوٹھے نظر آئے ۔ اس وادی کا بیشتر حصہ سیّدوں کی جاگیر ہے، اُن کا سردار

کاغان میں رہتا ہے۔ چیلاس کے پولیٹیکل افسر اور ایبٹ آباد کے کمانڈنٹ کے سفارشی خطوط پر ہمیں ملاقات کا موقع ملا۔ ہم نے کوئی مدد لینا نہ چاہی کیونکہ گائے بھینسوں کی کثرت کے باوجود دودھ کا قطرہ بھی نہ ملتا تھا۔

اُسے یہ سیّد ناکارہ اور بگڑے لوگ لگے، بے معنی احساس برتری کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرتے تھے۔ مریدوں کے طفیل دن گزارتے یا زمین کے لگان سے اور لکڑی بیچ کر پیٹ پالتے۔ ان سے تنگ آ کر کئی لوگوں نے کشمیر کی طرف ہجرت کی تھی جو اَب برطانیہ کی عملداری سے ذرا محفوظ ہو گئے تھے اور سیّد چند سرداروں کے سوا روز بروز خستہ حال ہو رہے تھے۔ مہندری پہنچ کر دیکھا کہ سڑک بننے لگی ہے۔ آرتھر نے گلگت اور ہونزا کی طرف بھی مہم جوئی کی۔ صدی کی دسویں دہائی میں ہونزا پر قبضہ ہوا تھا، چترال کی طرف سے پریشانی ختم ہو گئی تھی اور پامیر کمیشن قائم ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں پچھلی نصف صدی میں صرف کشمیر کے حدود ہی وسیع ہوتے رہے ہیں۔ آرتھر کے کشمیر پہنچنے کے کئی سال بعد تک گلگت کا نام سنتے ہی کسی بھی کشمیری کا خون خشک ہوتا تھا، گلگت کے معنی تھے، بیگار، زمہریر زدہ پاؤں، اونچی پہاڑی چوٹیاں، موت کی وادیاں اور بھوک اور ہیضہ کا ننگا ناچ، ایک بار سرحدی قبائل کی شورش کی خبر آئی تو فوج بھیجنے کیلئے پانچ ہزار مزدوروں کی ضرورت پڑی۔ آرتھر اسلام آباد میں ہیضہ کی روک تھام میں لگا ہوا تھا۔ اُس نے آس پاس کے دیہات سے قلیوں کو جمع ہوتے دیکھا، سامان تھا، ایک چادر، گھاس کے فالتو پُولے (پلہور)، رسی اور لاٹھی، قصبہ کی مسجد کے صحن تک اُن کے گھر والے بھی رخصت کرنے آئے تھے۔ آہ و فغاں کا ایک دلدوز سماں تھا۔ اُن کے کھیت کون جوتے گا؟ اہل و عیال کی خبر گیری کون کریگا؟

اور وہ واپس آئیں گے بھی یا نہیں۔ آرتھر نویں دہائی میں پہلی بار استور کے درّوں تک پہنچا تھا۔ اُس سفر کے دوران تراگبل کے آس پاس کھائیوں میں لاشوں کے ڈھیر دیکھے تھے۔ کامری درّہ پر ایک جگہ کا نام ہی تھا ''مردہ دفن'' برف کے ایک تودے سے بھی بہت سے سپاہی دب کر مرے تھے۔ اب آہستہ آہستہ خطرات کم ہو رہے تھے۔ گریز کے نواب پہلے استور کے راجوں کو خراج دیتے تھے۔ سکھوں نے ملک دِلاور کو سرینگر بلایا اور قید کیا جہاں سے وہ کسی طرح بھاگ نکلا اور کچھ قبائلی جمع کر کے پھر آزادی سے راج کرنے لگا۔ گریز اور شادری میں قلعہ بننے سے اور استور اُن کے قبضے میں آنے پر گلگت کی طرف بھاگ گیا۔ بزریل درّہ عبور کر کے گلگت کی طرف جاتے ہیں لیکن اس کا ایک متبادل راستہ کامری درّہ سے ہے۔ ۱۹۰۶ء میں آرتھر پھر نانگا پربت کی طرف آیا۔ وہ دو دن تارشنگ میں ٹھہرے، اس کے بعد گُری کوٹ پہنچے۔ اُسی روز بعد دوپہر ریاست کا ریذیڈنٹ فرانسس ینگ ہسبنڈ وہاں پہنچا اور اُن کو بھی دعوت پر بلایا۔ اُس نے لھاسہ پر قبضہ کا کچھ حال بتایا۔ دوسرے دن استور کے سردار سے ملاقات ہوئی اُس سے تعمیر و ترقی کے بارے میں پوچھا گیا اُس نے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سارے عہدے ہندوؤں کے پاس ہیں، یا پنجابیوں اور ڈوگروں کے پاس، استور والوں کو کیا ملتا ہے؟ اُسے بتایا گیا کہ اس کیلئے تعلیم شرط ہے۔ کئی روز بعد گلگت میں ایک اسکول نظر آیا جہاں اُمراء کے بچے پڑھتے تھے۔ اُس کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کرنے کیلئے طلباء کو وظیفے دیئے جانے چاہئیں۔ پھر بھی ان سفید پوشوں کا دفتری کام کرنے کے بارے میں وہ پُر اُمید نہیں۔ اُن کی دوسری شکایت شکار سے متعلق غور کرنے پر

معلوم ہوا کہ اُن میں سے اکثر چوری چُھپے شکار کرتے ہیں۔ گلگت تک چپلاس کے مغرب سے جاتا ہوا راستہ چُنا گیا تھا اسی راستہ سے وہ رام گھاٹ پہنچے جسے "شیطان نار" بھی کہتے تھے، دوسری منزل میں بھوپ سنگھ پاری، جہاں ۱۸۵۲ء میں سکھ فوج تباہ ہوئی تھی۔ یاسین کے حکمران گوہر رحمان نے گلگت کو فتح کیا تھا، جس پر گلگت کے راجہ نے سکھوں سے مدد لی تھی۔ اُسی برس کابل میں انگریزوں کے اتلاف اور لداخ میں زورآور سنگھ کی موت ہوئی تھی۔ نتھو سنگھ نے گوہر رحمان کو شکست دی۔ پھر یاسین، ہونزا اور نگر کے حکمرانوں سے معاہدے ہوئے۔ بعد میں کشمیر ڈوگروں کے زیرِ قبضہ آ گیا اور گلگت میں قلعہ بنا جہاں سنت سنگھ کی ڈوگرہ فوج رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد سندھ کے قبائل، تھالچی اور چیلاسیوں نے ساری ڈوگرہ فوج کو تباہ کر دیا۔ اب انگریزوں نے وہاں امن وامان بحال کر دیا تھا۔ محکمہ رسد رسانی اور رسل و رسائل میں کئی اچھے عہدے نکل آئے تھے۔

اس علاقے میں آغا خان کے ماننے والے مولائی فرقہ کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں کے سفید پوش لوگ اہلِ سیف رہے ہیں اور شکاری، کبھی کلرکی یا کاشتکاری نہیں کی ہے۔ زمین دوسروں کا کاشت پر دیتے ہیں نہ خود کاشت کرتے ہیں۔ اب زرعی غلامی کا زمانہ ختم ہوا ہے۔ میجر گرڈان سڑکیں بنانے میں کافی دلچسپی لے رہا تھا لیکن اُسے کشمیر دربار سے بہت کم رقم ملتی تھی۔ وہاں میک کیری سن کا ہسپتال بہت اچھا لگا اور نیا کھلا ہوا اسکول، تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ ہونے لگی ہے۔ ہونزا کے وزیر کا بیٹا حصول تعلیم کے لئے علی گڈھ گیا ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود لوگوں میں ذات پات کا تفرقہ موجود ہے۔ اعلیٰ ذات کے لوگ نچلی ذاتوں سے رشتے لیتے ہیں، دیتے نہیں ہیں۔ بشکن کرتھین اور ڈوم اکٹھے رہتے ہیں۔ ان

کے کچھ تعصبات بھی ہیں مثلاً گائے کو گندہ سمجھتے ہیں اور اس کا دودھ تک نہیں پیتے۔

آرتھر نے ہونزا کی سیاحت بھی کی۔ ستمبر میں وہاں کی آب و ہوا خوشگوار ہوتی ہے اور سال میں بارش بہت کم۔ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف ہوتی ہے۔ یہاں سفیدے اور بید کے درخت ملتے ہیں۔ دھان، مکی، گندم اور جو کی کاشت ہوتی ہے۔ نارل میں ایک قلعہ ہے جسے سکھوں نے بنایا تھا۔ برزیل درّہ کے اوپر سے ہوکر ہونزا جاتے تھے۔ ہونزا کا راجہ صفدر علی خان باپ کو قتل کر کے حکومت کرنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے بھائیوں کا صفایا بھی کیا تھا۔ اُس وقت گلگت میں برطانوی سرکار کا کوئی پولیٹیکل ایجنٹ نہ تھا اس لئے مہاراجہ کشمیر نے اُس کی حکومت تسلیم کی۔ راجا نے جنرل لوکاٹ کو وہاں آنے کی دعوت دی لیکن جلد ہی روس کے سرحدی افسروں کے تحائف پر للچایا۔ برطانوی سرکار نے معاملات سلجھانے کیلئے کرنل ایلگزین ڈیورانڈ کو بھیجا۔ ہونزا اور نگر میں دشمنی تھی۔ دونوں علاقے نوکیلے پہاڑوں اور ناقابلِ عبور دریا نے انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھا ہے۔ میرو نام کے ایک سردار (جس نے پہلے اِسلام قبول کیا) کے دو جڑواں بیٹے تھے، اُس نے گرکس کو جنوبی علاقہ دیا اور ملکوٹ کو شمالی حصہ جس کے ایک حامی نے گرکس کو قتل کر دیا۔ مقتول کی بیٹی حاکم ہوئی تو قاتل کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُس کا جگر چبایا لیکن چچیرے بھائی نے اُس سے اتنا لبھایا کہ اُس سے ایک لڑکا ہوا۔ ایوشو، ہونزا اور لے اُسی کی اولاد ہیں۔ وہاں سردار کو تھوم کہتے ہیں۔ ہونزا اور لے مولائی فرقہ کے آغا خانی ہیں اور نگر والے شیعہ۔ گلگت کے راستہ پر نگر والوں کا قبضہ ہے اور

ہونزاوالوں کا پامیر کے راستوں پر۔ گلگت سے ہونزا پہنچنا آسان ہے۔ وہاں کے لوگوں نے اکثر ڈوگروں کا ساتھ دیا ہے۔ وہ نگروالوں کی سپلائی بند کرتے تھے لیکن اُن کے لئے یارقند کا راستہ کھلا تھا۔ وہ متحد رہتے تو کشمیر سرکار کے قبضہ میں کبھی نہ آتے۔ وہ ڈوگروں کے حامی ہوکر بھی دغا کرتے تھے۔ اس لئے نتھو شاہ کے زیرکمان تمام فوج کا قتل عام ہوا۔ آخر جنگ میں انہیں شکست ہوئی اور ہونزا پر قبضہ ہوگیا۔ یشکن لوگ بروشسکی بولتے ہیں۔ وہاں چنار بھی ہوتے ہیں اور کابلی سفیدے بھی۔ شکار کیلئے کُتے پالے جاتے ہیں۔

آرتھر یہاں سے نون کون پہاڑی سلسلہ کی سیاحت پر نکلا۔ سُورُو دریا کے آس پاس اونچی پہاڑیوں پر گیا۔ سُورُو واڈوں اور ٹنگول سے ہوتا ہوا وادئ زوج نائی پہنچا۔ سفر کے شروع میں اُن کے ساتھ پہلگام کے نہایت مضبوط سُتر کشمیری مزدور تھے، جنہوں نے آس پاس کے پہاڑوں کی سیاحت میں بڑی جوانمردی دکھائی تھی لیکن یہ لوگ جونہی گھروں سے دور ہوجاتے ہیں تو اِن کی عملی شیخیاں کرکری فوراً گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ لداخی کشمیریوں کی نسبت اگرچہ بھاری بوجھ نہیں اُٹھاسکتے پھر بھی ثابت قدم ثابت ہوتے ہیں اور اپنی رُسد خود ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ اُنہیں ماہانہ سات پونڈ ملتے تھے۔ آرتھر آگے چل کر بتاتا ہے کہ کن صعوبتوں سے وہ سورو دریا کو پار کرتے ہوئے اُن پہاڑوں میں گھومے۔ دوسری بار آرتھر نے ۱۹۱۰ء میں نون کُن کے پہاڑوں کا سفر کیا۔ اس بار اُس کے ساتھ لاہور کا پادری اور وِگرام صاحب تھے، جو حصہ پچھلی بار رہ گیا تھا، اُس کی سیاحت مطلوب تھی۔ اس بار وہ پہلگام سے سُنا سر درّہ سے

گزرتے ہوئے چلے اور کئی ہفتوں تک نون کون کی پہاڑی کو کھنگال ڈالا۔ اس کے بعد تبتِ صغیر کا رُخ کیا۔ زوجیلا درّہ تک ہمالیہ کا کئی سو میل برفانی پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا ہے جس کی سیاحت آسان کام نہیں۔ شملہ سے لداخ کے راستہ پر بارالاچی درّہ آتا ہے۔ اسی راستہ سے ہندوستان اور وسط ایشیا کے درمیان آمدورفت ہوتی تھی۔ تبت کا علاقہ سولہ ہزار فٹ بلند ایک سطح مرتفع ہے۔ کرگل، خربُووادی، جہاں کے لوگوں نے ساٹھ برس پہلے سکھوں سے جنگ لڑی، کھلسی، جہاں اُنہوں نے برہمی خط میں دوسو برس قبل مسیح کا ایک کتبہ دیکھا۔ اس علاقہ پر پہلے دردراج کرتے تھے۔ ایک ہزار عیسوی کے قریب تبتیوں نے اپنے قبضہ میں لایا۔ وہ کرگل کے بعد لیہہ پہنچے، جہاں کی چہل پہل وہاں کی آبادی کی بجائے تبت، یارقند، ختن اور دوسرے وسط ایشائی شہروں سے آتے جاتے تجارتی کاروانوں کی وجہ سے تھی۔ لیہہ میں گیالپو کا محل قابلِ دید ہے، یہاں کے ایک مندر میں مہاتما بدھ کی ایک عظیم مورتی ہے۔ یہاں کے ہسپتال میں ایک انگریز جراح موجود تھا۔ کشمیر سرکار کی شاہی فوج کے تربیت یافتہ پچاس سپاہی حفاظت پر مامور تھے، یہاں کی دو اہم تفریحیں ہیں پولو اور جادوئی کھیل۔ متعہ کی رسم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ارُغون کہلاتے ہیں، جن کے باپ یارقندی یا کشمیری ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں ماں باپ کے عیب تو ہوتے ہیں لیکن اُن کی خوبیاں نہیں۔ بودھوں میں چند شوئی یعنی تعدّدِ ازدواج کا رواج نہیں ہے اور اس کی غایت شاید آبادی کم کرنا ہے۔ کیونکہ بچوں کی پرورش کے وسائل نہیں۔ یاک یہاں کا خاص پالتو جانور ہے جو اُن کے ہر کام آتا ہے۔ یاک جنگلی بھی ہوتے ہیں۔ یاک کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اپنی جبلت سے چھُپے ہوئے شگافوں اور کھائیوں کو جو

برف یا یخ سے بند دکھائی دیں، بھانپ جاتا ہے۔ نوبرا وادی تیرت کے مقام پر شیوک سے ملتی ہے۔ لداخی کی چیخ زنسکھے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ بھی وہاں ہوا۔ نوبرا وادی جتنی خوبصورت لداخ میں کوئی جگہ نہیں۔ یہاں اخروٹ، ناشپاتی اور سیب ہوتے ہیں، کہیں کہیں انگور کی بیلیں بھی نظر آئیں۔ لداخی بودھوں کے دو فرقے ہیں، زرد نشان اور سرخ فرقہ، سُرخ والوں میں کوئی نظم وضبط نہیں۔ اب لاما لازم ہے، یعنی پادری بھی مرکر دیوتا ہو جاتا ہے۔ بودھ گوشت بھی کھاتے ہیں۔

لداخ کو تبتِ صغیر کہتے ہیں۔ اس ملک کو زیر کرنے کے لئے کئی لڑائیاں ہوئیں، پہلی 16 اگست 1834ء کو آخر گیالپو شاہ لداخ نے امان چاہا اور لداخ پر قبضہ ہوا۔ یہ معلومات بہم پہنچاتے ہوئے آرتھر مُرغستھنگ گلیشر کی سیاحت پر چل پڑا۔ راستہ میں اُسے کئی وسطِ ایشیائی کارواں ملے۔ یہاں سے آرتھر کو سائی چن پہنچنے کا ارمان تھا۔ سائی کے معنی ہیں جنگلی گلاب۔ آرتھر کے ساتھ رسول گلوان بھی تھا۔ وسطِ ایشیا کا راستہ چنگ لنگ کے سلسلہ سے جاتا ہے۔ گلیشروں پر سے ہوتے ہوئے وہ لوگ قراقرم کے لئے رَختِ سفر باندھنے لگے، ریزیڈنٹ کشمیر ینگ ہسبنڈ اس میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ آرتھر کے ہمراہ تھا ڈاکٹر لانگ سٹاف اور لفٹنٹ سلنکس بے۔ اس سفر میں خرمنگ کا اہم پڑاؤ آتا تھا جہاں راجہ شیر علی خان نے انہیں کافی سہولیات بہم پہنچائیں پھر کیرس کا مقام آیا۔ اُس کے بعد گورُوجہاں کے خطرناک سیلاب کے بارے میں کننگھم نے 1841 میں کُھل کر لکھا ہے۔ یہاں سے وہ کھپلو واپس آئے اور پھر سالڑو اور بلافانڈ درّوں کو پار کرنے کا ارادہ کیا جن کے پار پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اور درمیانی وادیوں میں درختوں کے جھنڈ تھے اور

خوشحال گاؤں۔ یہاں کی مسجدیں، خاص طور پر پیرو کی مسجد اچھی خاصی وسیع اور بڑی خوبصورت تھی بالکل کشمیر کی مسجدوں جیسا طرزِ تعمیر تھا۔ ایسا لگا کہ ہزار سال پہلے تبتی حملہ آوروں نے بروکپا لوگوں کو قراقرم کے اندرونی علاقوں میں دھکیل دیا ہے۔ قُندس گلیشر سے نیچے ایشیا کا سب سے بڑا گلیشر ہے۔ چوبیسویں باب میں آرتھر نے میڈیکل مشنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کام لوگوں کو موہ لینے کا ہے اس لئے کہ خدمت سے بڑھ کر کوئی جادو نہیں۔ وعظ وتبلیغ اس کے ساتھ لازمی ہے۔ کشمیری افغانستان کے سرحدی ڈاکوؤں کی خصوصیات نہیں رکھتے، کوئی ہیروؤں جیسا ماضی بھی نہیں، پھر بھی بقولِ آرتھر ان کے نرم دل اور ہمہ جہت ہنرمندی دیکھ کر ان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شمالی ہندوستان ان کے ہمسائے انہیں نہیں سراہتے لیکن ان کی حاضر دماغی، ہوشیار ذہانت اور فنکارانہ خصوصیات میں اعلیٰ صفات کے عناصر نہیں۔ اُس نے انہیں ایک بار آگ کے شعلوں میں کود کر دوسروں کو بچاتے دیکھا ہے۔ اُنہیں ٹنڈل بسکو کے روپ میں ایک رہنما ملا ہے۔ اُس کے اسکاوٹوں نے کالرا کے دنوں کافی مستعدی دکھائی۔ آرتھر کا تعصب بھی کبھی کبھی سطح پر آجاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ یہ کہتا کہ ''اسلام اُس سے زیادہ لوگوں کا بھلا نہیں کرسکتا، جتنا کیا ہے، ہم اماموں کی اخلاقی سطح تک آ گئے ہیں۔ وہ آدمی آدمی ہی نہیں جو حضرت عیسیٰ کے رہنما اصولوں پر نہ چلے۔ میرا یقین ہے کہ عیسائیت سے وجدان پا کر ہی ہندوستان کے لوگ نسلوں اور ذات پات کا امتیاز ختم کر کے ایک بڑی اور متحد قوم کی صورت میں اُبھر سکتے ہیں''۔

☆☆☆

ارجن دیو مجبورؔ☆

”گلابؔ نامہ“ میں کشمیر

گلاب نامۂ دیوان کرپارام کا مشہور تواریخی دستاویز ہے جو فارسی زبان میں بکرمی سن ۱۹۲۲ میں مکمل کیا گیا اور سموت ۱۹۳۳ میں مُصنّف کے مرنے کے بعد شائع کیا گیا۔ سرورق پر جس پریس کا نام درج کیا گیا ہے وہ تحفۂ کشمیر پریس ہے، جو سرکاری تحویل میں رہا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں ”رنبیر پرکاش“ پریس سے اِس دستاویز کا ایک خوبصورت ایڈیشن جموں سے شائع کیا گیا لیکن اس ایڈیشن کا ٹائٹل ۱۹۲۳ بکرمی سنہ دکھاتا ہے۔ یہ دستاویز مہاراجہ گلاب سنگھ کی سوانح حیات کے علاوہ جموں کی تواریخ اور کشمیر کے بعض اہم واقعات پر گہری نظر ڈالتا ہے۔

اس کی تحریر مرصع طرز کی ہے۔ زبان شاعرانہ اور توصیف والقاب سے جگہ جگہ بھری پڑی ہے۔ تحریر کا پانچواں حصہ رسمی باتوں میں صرف کیا گیا ہے۔ مثلاً:

۱ر تمہید کے بعد فلسفۂ کائنات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

۲ر خاندانی حسب ونسب پورانک طریقے پر دیا گیا ہے جو برہما سے شروع ہو کر منوؔ، اِکھشن واکو اور بعد میں ہندوستانی رزمیہ کے لافانی کرداروں تک پہنچتا ہے۔

☆جموں (توی)

۳ر رامائن اور مہابھارت کے مختصر تذکرے کے بعد راجہ ہریش چندر کا تذکرہ ہے۔

۴ر اس کے بعد جموں کی تواریخ اور بعد میں راجہ مال دیو اور اُن کے وارثوں کا تذکرہ ہے۔ بعدازاں گلاب سنگھ کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔

۵ر گلاب سنگھ کے جات نامے سے علمِ جیوتش کی گتھیوں اور باریکیوں پر تفصیلی بحث بھی کتاب میں موجود ہے۔

میں نے یہ مضمون پروفیسر سکھ دیو چاڑک کے گلاب نامہ کے انگریزی ترجمے کی بناء پر لکھا ہے۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں لائٹ اینڈ لائف پبلشرس کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ دستاویز کے متعلق کے ایم پانیکر لکھتے ہیں:

”یہ دستاویز اگرچہ فارسی قصیدہ گوئی کے مرصع طرزِ تحریر پر تحریر کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک غیر معمولی تواریخی دستاویز ہے کیونکہ دیوان کرپارام نے اس میں بہت سی ایسی اصل دستاویز شامل کی ہیں جو کسی اور جگہ دستیاب نہیں۔ اس کے حقائق اور سنہ وغیرہ شک سے بالاتر ہیں۔“

وہ آگے لکھتے ہیں:

”گلاب نامہ مشکل طرز اَدا اور مرصع زبان ہونے کی وجہ سے تواریخی تذکرے کے بجائے ایک اَدبی تخلیق لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف اس کی طوالت کم کر سکتا تھا لیکن اس کے دِل میں گلاب سنگھ کی زبردست عقیدت اور وفاداری تھی اسی وجہ سے اُس نے اس قسم کا سٹائل اَپنایا ہے۔ کہیں کہیں شاہنامے اور سکندر نامے کے حصے درج کیے ہیں۔ ان رزم ناموں کے اشعار بھی اس تصنیف میں درج ہیں“۔

بہر حال انگریزی ترجمے میں مترجم نے کئی حصے نظر انداز کیے ہیں۔

اَلقاب اور تعارف، جن کا آنے والے واقعات پر کوئی اثر نہیں پڑتا انگریزی ترجمے میں حذف کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مترجم نے بعض ایسی سطریں چُنی ہیں:

"دریں اثنا بادِ بہاری رنگ افروز عارض گل شد و نسیم نوروزی گرہ کشائی خاطر بلبل جہانیاں را ہوائی شادمانی بسر رسید و جہاں را رختِ نو شگفتگی در بر ساقی روزگار از رحیق انبساط دماغ افسردگاں عالم را تازہ و تر فرمود و عطارِ صبا ختن ختن مار نفحاتِ مشکبار بر روی شگفتگانِ گلزار کشود گلچیر گان، گلچیرہ خوبی را بگلگونہ لطافت اَفروختند و سمن سوری بنظرِ تشحیم خوش دماغانِ گلشن عود قماری سوختند، بلبلان خوش الحان از شورِ مستی غزلہائے رنگین سرائیدند و قمریاں نوازی پای سروِ آزاد نالہ شوق بر کشیدند جامِ نرگس از شراب لبریز آمد و لب غنچہ از تبسم گلریز۔"

یہ عبارت پڑھ کر اُس سٹائل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو دیوان کرپارام کے حصے میں آیا تھا۔ کاش وہ شاعر ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اُس نے فارسی شاعری میں ایک بہترین مقام حاصل کیا ہوتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ موت نے اُسے اپنے پورے جوہر دکھانے کا موقع نہیں دیا اور وہ فقط ۴۴ سال کی عمر میں اس عالمِ فانی سے رُخصت ہو گیا۔ پروفیسر چاڑک کے مطابق گلاب نامہ تاریخی ترتیب میں اَفسوسناک حد تک ناقص ہے۔ لیکن کرپارام نے گلاب سنگھ کو صحیح رنگ میں پیش کیا ہے۔ چاڑک کی دوسری بات سے مجھے اتفاق نہیں کیوں کہ مصنف نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے خلاف انگریزوں کی طرف سے قائم کردہ "کمیشن آف انکوائری" کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ کمیشن ۵۰-۱۸۴۹ء میں قائم کیا گیا اور گلاب نامہ ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو دیوان کرپا

رام کو اس بات کی مکمل جانکاری نہیں تھی، جو میرے خیال میں قرینِ قیاس نہیں کیونکہ دیوان کرپارام، مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے اکثر و بیشتر انگریز حاکموں کے ساتھ ملاقات کرتا تھا اور اُسے سرکاری کاغذات پر پوری دسترس تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید مصنف گلاب سنگھ کے متعلق اس واقع کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ انگریزوں کا خیر خواہ بھی ہو سکتا تھا۔

دیوان کرپارام کا حسب و نسب امین آباد کے مشہور دیوان خاندان دیوان بشن داس سے وابستہ تھا۔ کرپارام کا دادا دیوان امیر چند اور دیوان جوالا سہائے اُس کا باپ تھا۔ دیوان جوالا سہائے تیس سال تک ڈوگروں کی ملازمت میں رہا۔ حسن کھویہامی دیوان کرپارام کے بارے میں لکھتا ہے:

"وہ ہمہ گیر غیر معمولی ذہانت کا مالک ہونے کے علاوہ عالم، مدبر، سیاستدان، شائستہ، آداب محفل جاننے والا اور فیاضی میں لاثانی تھا۔ اُس کی دیوانی کے دور میں ریاست وزارتوں اور تحصیلوں میں تقسیم کی گئی۔ شہروں اور قصبوں میں عدالتیں قائم کی گئیں۔ فوج کو نئے انداز سے منظم کیا گیا اور شہروں و قصبوں میں صدرمقام اور ہسپتال قائم کیے گئے۔ سکولوں میں شاستروں اور فارسی کی تعلیم شروع کی گئی۔ سڑکیں اور ڈاک بنگلے تعمیر کیے گئے۔ مچھلیوں کا شکار پر پابندی عاید کی گئی۔ مختصر یہ کہ انتظامیہ کو اس انداز سے صحت مند بنیادوں پر استوار کیا گیا کہ زندگی اور جائیداد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے"۔

لیل گرفن بھی دیوان کرپارام کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ "گلاب نامہ" مہاراجہ گلاب سنگھ کی سوانح پر اوّلین دستاویز ہے۔

اس کے بعد کے ایم پانیکر کے ہاتھوں ۱۹۳۰ء میں گلاب سنگھ کی ایک مختصر سوانح عمری شائع کی گئی۔ اس کے بعد باوا ستندر سنگھ نے ایک اور سوانح عمری لکھی جس کا نام "The Jammu Foo"[1] ہے۔

گلاب سنگھ ۲۱/ اکتوبر ۱۷۹۲ء کو جموں سے بارہ میل دُور سانبہ میں پیدا ہوا۔ اُن کے والد کا نام میاں کیشور سنگھ تھا۔

پروفیسر چاڈک کو ترجمے میں بارہ سال لگے ہیں۔ یہ محنت اختتام کو پہنچانے کے ساتھ ساتھ اُس نے جگہ جگہ اہم فٹ نوٹ دیئے ہیں جس سے اہم واقعات کی پوری پوری صراحت ہوتی ہے لیکن کمیشن آف انکوائری کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ایم، ایل، کپور نے "Commission of Enquiry against Gulab Singh" نام کی کتاب ۱۹۷۸ء میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب اس واقعے کا پورا پورا جائزہ لیتی ہے۔

پروفیسر چاڈک نے انگریزی ترجمہ (گلاب نامہ) ۵۹/ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں جو ابواب کشمیر سے متعلق ہیں، وہ یوں ہیں:

باب ۶ - وزیر فتح خان کے ہاتھوں کشمیر فتح کرنے کا واقعہ۔

باب ۷ - شاہ لاہور کی کشمیر پر چڑھائی۔

باب ۱۶ - بیانِ فتح کشمیر۔

باب ۱۸ - فتحِ کشتواڑ۔

باب ۳۸ - کشمیر میں گڑبڑ۔

باب ۴۰ - فتحِ لداخ۔

---

[1] مہاراجہ گلاب سنگھ کا ایک اور ذات نامہ سالگرام کول نے "گلاب سنگھ" نام سے انگریزی میں لکھا ہے۔ (ادارہ)

باب ۴۱ - معاہدہ لداخ۔

باب ۴۹ - کشمیر کو گلاب سنگھ کی تحویل میں دینا۔

باب ۵۰ - برٹش کمپنی اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین معاہدہ۔

باب ۵۱ - کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضے کے بعد کے واقعات۔

باب ۵۶ - گلگت بغاوت کی تفصیلات۔

باب ۵۸ - رنبیر سنگھ کی تخت نشینی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس دستاویز میں کن اہم واقعات کا تعلق کشمیر سے ہے، اور اس کے بعد ان کو دیگر کئی تواریخوں کے مواد کے مقابلے میں پرکھیں گے جو کشمیر کے متعلق رقم کی گئی ہیں۔

۱۸۲۸ء میں سردار فتح محمد خان برکزئی والیٔ کابل کو کشمیر کی خوبصورت وادی فتح کرنے کا خیال آتا ہے۔ اس خاطر وہ رنجیت سنگھ کے پاس آیا جس نے یہ تجویز منظور کی۔ اُس نے دیوان محکم چند کے ساتھ فوج بھیجی اور سردار خان نے اُس وقت کے گورنر سردار عطا محمد خان پر فتح حاصل کرلی لیکن جو شرائط فتح محمد خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ طے کی تھیں اُس نے وہ نظر انداز کیں۔ اُس نے محکم چند اور اس کے افسروں کو ختم کرنے کی کوششیں کیں لیکن سردار جے سنگھ اٹاری والا نے، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نوکری سے تنگ آکر کابل بھاگ کر وہاں دوست محمد خان کا معتمد بن گیا تھا، نے دیوان چند کو یہ راز بتایا۔ اس سے حالات بدل گئے۔ جب سردار فتح محمد خان نے حالات بگڑتے دیکھے اُس نے دیوان محکم چند کو آٹھ آٹھ لاکھ روپے ادا کرکے اُسے سکھ فوج واپس بھیجنے پر آمادہ کرلیا۔ کچھ وقت بعد وہ خود بھی کابل سے نکل پڑا اور کشمیر کو محمد

عظیم خان کے حوالے کیا۔

وزیر جہاں داد خان پوپل زئی، رنجیت سنگھ کو اٹک قلعہ کی چابیاں سونپتا ہے جس کے عوض میں اُسے وزیرآباد جاگیر میں دیا جاتا ہے۔ اسی دوران وزیر فتح محمد خان، جس نے کشمیر کو قبضے میں لایا تھا، پیش قدمی کرتا ہے اور شمس آباد میں ڈیرہ ڈالتا ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے دیوان محکم چند فوج لے کر روانہ ہوتا ہے، جو وزیر فتح خان کو شکست دیتا ہے۔

کشمیر میں حملہ کرنے کی خاطر مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۸۷۳ بکرمی مطابق ۱۱رجون ۱۸۱۴ء کو کشمیر کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ وجہ عظیم خان کا نذرانہ دینے سے انکار ہے۔ راجہ اگھر خان، جو راجوری کا راجہ تھا، رنجیت سنگھ کے ساتھ دھوکے اور چالاکی سے پیش آتا ہے۔ جب رنجیت سنگھ راجوری میں پڑاؤ ڈالتا ہے، اُس نے فوج کا ایک دستہ پیر پنچال سے اور دوسرا بڈھل کے راستے کشمیر بھیجا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ لوہرینہ میں ڈیرہ ڈالتا ہے۔ پونچھ کے وزیر روح اللہ ناموار نے رنجیت سنگھ کی فوج کے ساتھ مقابلہ کیا اور ہار تسلیم نہیں کی۔

رنجیت سنگھ کی جو فوج پیر پنچال راستے سے دیال اور دَل سنگھ کے ماتحت بھیجی گئی تھی وہ سیدھے راستے سے کشمیر میں داخل ہوگئی۔ اسی اثناء میں اگھر خان نے اپنا چولا بدلا اور رنجیت سنگھ کے ساتھ ملاقات کی اور رنجیت سنگھ پر یہ باور کرایا کہ جو فوج اُس نے پیر پنچال راستے کشمیر بھیجی تھی وہ شکست سے دوچار ہوگئی (جو کہ صریحاً جھوٹ تھا) رنجیت سنگھ نے اپنی فوج مختلف مقامات کو روانہ کری۔ فوج میں اُفراتفری مچ گئی۔ آس پاس کے زمینداروں نے بھی فوج کے لئے پریشانیاں پیدا کیں۔ اسی دوران سردار بسنت سنگھ نے فوج جمع کی اور اُن

قبیلوں پر حملہ کیا جنہوں نے سکھ فوج کو پریشان کیا تھا۔ اُن میں سے بعض مارے گئے لیکن اس کارروائی بسنت سنگھ خود بھی کام آیا۔ انجامِ کار رنجیت سنگھ اور اُس کی فوج کو واپس لاہور آنا پڑا۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ مصنف، اگھر خان اور باقی زمینداروں کا تذکرہ سخت کلامی کے ساتھ کرتا ہے۔ اُسے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اگھر خان، رنجیت سنگھ کو دھوکہ دے۔ حالانکہ محبت اور عشق میں سب کچھ جائز مانا جاتا ہے۔

کشمیر پر فتح (۱۸۷۶ بکرمی):

مہاراجہ گلاب سنگھ کو کشمیر فتح کرنے کی شدید خواہش تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ کام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں (جو اُسکا آقا بھی تھا) اپنے انجام کو پہنچے۔

بیربل در، پرگنۂ دیوسر کا ذیلدار تھا۔ وہ مالیئے پر مقررہ نشانہ حاصل نہیں کر سکا جس پر عظیم خان نے اُس کی جائیداد ضبط کی اور اُسے شدید اذیتیں دیں۔ بیربل اپنے بیٹے راجہ کاک کو لے کر نارواؤ کے راستے رنجیت سنگھ سے فریاد کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اُس کے ساتھ کھر نارواؤ کے ملک بھی تھے۔ عظیم خان نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا تھا۔ اس ظلم وستم کا خاص نشانہ کشمیری پنڈت تھے۔ اُن پر جزیہ عاید کیا گیا۔ بہت سے پنڈتوں کو قتل کرایا گیا۔ ہرداس تکو جیسا شخص جو ہر سال اُمرناتھ یاترا جانے والے یاتریوں کو تین لاکھ روپے دیا کرتا تھا، قتل کیا گیا۔ آفاتِ سماوی سے جانور مر گئے اور فصلیں برباد ہوگئیں۔ عظیم خان نے بیربل در کو زبردستی مسلمان بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جوں ہی عظیم خان کو بیربل در کے لاہور روانہ ہونے کی اطلاع ملی وہ غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ اُس نے سہز رام اور مرزا پنڈت کو بُلوا بھیجا اور پوچھا کہ

بیربل در کہاں چلا گیا۔ انہوں نے جواباً کہا کہ یا وہ گنگا کی یاترا پر گیا ہوگا یا سکھ فوج کو بلانے۔ عظیم خان نے بیربل در کے رشتے داروں کو ہتھکڑیاں ڈال کر دربار میں بلوایا۔ بیربل در کی بیوی نے راستے میں ہی زہر کھالیا اور خودکشی کر کے اپنی عصمت بچالی۔ گھر ناروا وٴ کے ملکوں کے مکانات، مال و جائیداد سمیت نذر آتش کر دیئے گئے۔ بیربل در پہلے جموں میں گلاب سنگھ کے پاس پہنچتا ہے۔ وہاں سے امیر چند کو اُس کے ساتھ بھیج دیا جاتا ہے جو بیربل در کو راجہ دھیان سنگھ کے پاس لاہور لے جاتا ہے۔ وہاں سکھ فوج کو کشمیر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سکھ فوج دَیی گام پہنچ جاتی ہے۔ جبار خان اس فوج کے ساتھ مقابلے کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے لیکن ہار جاتا ہے اور رنجیت سنگھ کی فوج جیت جاتی ہے۔

گلاب سنگھ نے قبل ازیں رنجیت سنگھ سے استدعا کی ہوتی ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے دور میں اُن کے آباء واجداد کو کشمیر میں ایک لاکھ روپے کی جاگیر دی گئی تھی۔ اب جب کہ کشمیر پر قبضہ کیا جا چکا ہے لہٰذا کشتواڑ کو گلاب سنگھ کو بطور جاگیر دیا جائے۔ رنجیت سنگھ نے اس کے لئے حامی بھر لی تھی لیکن بیربل در نے گلاب سنگھ کو روک دیا۔ اس کے عوض گلاب سنگھ کو ۲۰ ہزار روپے نقد دیئے گئے۔ کشمیر کے انتظامی اُمور دیوان موتی رام کے حوالے کئے گئے۔ گلاب سنگھ اس کے بعد ریاسی کے راستے جموں چلا جاتا ہے جہاں اُسے رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس حملے کے متعلق باب ۱۶ میں پروفیسر چاڈک نے کوئی فٹ نوٹ درج نہیں کیا ہے۔ اس حملے کا مفصل ذکر پی این کے بامزئی کی تواریخ "A History of Kashmir" میں مفصل طور صفحہ نمبر ۴۵۴ سے ۴۵۷ تک درج ہے۔

افغانوں کے مظالم اور سکھ فوج کے حملے کے متعلق بعض واقعات جو بامزئی صاحب نے درج کیے ہیں، مختصراً یوں ہیں:

i) افغانوں کے ظلم کے سبب کشمیریوں کی مائیں زار و قطار رو رو کر یہ تمنا کرتیں ''کاش سکھوں کا راج آجائے اور ہمیں اس رونے سے نجات ملے۔''

ii) حملے کے متعلق شری بامزئی کہتے ہیں کہ ''بیربل در نے مہاراج رنجیت سنگھ کے پاس اس بات کی ذمہ داری لی کہ اگر اُس کی فوج کشمیر فتح کرنے میں ناکام ہو جائے وہ اس صورت میں وہ تمام اخراجات ادا کرے گا جس رنجیت سنگھے اس مہم پر صرف کرے گا۔ اس بات کے لئے بیربل در اپنے بیٹے راج کاک در کو رنجیت سنگھ کے پاس بطور یرغمال رکھے گا۔ رنجیت سنگھ نے ۳۰ ہزار سپاہی بیربل در کے ساتھ کشمیر روانہ کیے۔ اس فوج کی کمان راجہ گلاب سنگھ، دیوان چند مصر، سردار ہری سنگھ، جوالا سنگھ پنڈا، نیا اور حکم سنگھ وغیرہ افسروں کے حوالے کر دیئے۔ پیر پنچال درے پر زبردست جنگ ہوئی اور افغانوں کو شکست ہوئی۔ جبار خان بھاگ گیا۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع ملی اُس نے راجہ کاک در اور باقی افسروں کو شاہی خلعت عطا کئے اور لاہور میں تین دن چراغاں کیا گیا۔

کشمیر میں گڑبڑ:

۱۸۹۸ بکرمی میں صوبہ دار کشمیر جنرل میاں سنگھ مارا جاتا ہے۔ مہاراجہ شیر سنگھ (لاہور دربار) کنور پرتاپ سنگھ کو گورکھا پلٹن ساتھ دے کر کشمیر میں گڑبڑ دور کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ راجہ گلاب سنگھ کو بھی کشمیر روانہ ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ دیوان جوالا سہائے اور دیوان نہال چند کے ہمراہ کشمیر روانہ ہوتا ہے۔

پہلے وہ شوپیاں پہنچتے ہیں اور وہاں سے سرینگر روانہ ہوتے ہیں۔ یہ فوج شیر گڈھی اور نٹی پورہ میں خیمہ زن ہوتی ہے۔ دودھ گنگا دریا (نالے) پر زبردست جنگ ہوتی ہے۔ پہلے دونوں اطراف سے شدید جسمانی نقصان ہوتا ہے لیکن بالآخر کامیاب ہوجاتا ہے۔ سکھ فوج اس خوشی میں شادیانے مناتی ہے۔ فوج اور فوجی افسروں میں ۴۳ ہزار روپیہ بطور انعام تقسیم کئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے حکم سے شیخ غلام محی الدین صوبیدار کشمیر مقرر کیا جاتا ہے۔ چالیسویں اور اکتالیسویں باب میں زور آور سنگھ کے ہاتھوں لداخ فتح کرنے کا مفصل اور مدلل تذکرہ درج ہے۔ زور آور سنگھ نے جو لڑائیاں تبت میں لڑیں اور جن میں وہ بالآخر خود بھی کام آتا ہے، کی رُوداد تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ لداخ فتح کرنے میں زور آور سنگھ اپنی بہادری کا مکمل ثبوت پیش کرتا ہے۔ آخر میں لداخ کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رُو سے لداخ ریاست جموں و کشمیر کا حصہ بنتا ہے۔

باب ۴۹ر میں اُس ملاقات کا ذکر ہے جو سر ہنری لارنس اور گلاب سنگھ کے مابین ہوئی۔ ہنری لارنس نے گلاب سنگھ کا زبردست استقبال کیا۔ اُسے ۱۵ توپوں کی سلامی دی گئی اور مذاکرات کے بعد اُسے خلعت عطا کیا گیا۔ اس کے بعد گوبند گڑھ قلعے میں نواب، گورنر جنرل بہادر اور گلاب سنگھ کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔

دراصل انگریز، سکھ طاقت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے کرنا بہتر جانا۔ اس سے سکھوں کی طاقت کمزور ہوگئی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ گلاب سنگھ کے اختیار سے کشمیر نکال کر انگریز

ریذیڈنٹ کے ہاتھوں میں دیا گیا۔ اس حقیقت کی مکمل تصویر ڈاکٹر ایم ایل کپور اپنی کتاب "Kashmir sold and snatched" میں پیش کرتا ہے۔ دیوان کرپارام اس کے متعلق اُس انداز سے حالات بیان نہیں کرتا جس تفصیلی انداز اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ ڈاکٹر کپور نے اپنی کتاب میں کئے ہیں۔ دراصل انگریز، کشمیر اور اس کے ساتھ وابستہ گلگت، لداخ وغیرہ سرحدی علاقوں کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔ یہ علاقے چین، روس اور وسطِ ایشیا کے نزدیکی علاقے ہیں، تب ہی انگریزوں کے لئے ان کی اہمیت رہی ہے۔ ان تفصیلات کی طرف دیوان کرپارام ''گلاب نامہ'' میں نہیں جاتا، وہ فقط واقعات بیان کرتا ہے۔

جب کشمیر میں ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک معرضِ وجود میں آئی، اُس وقت ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف بھرپور تحریک چلائی گئی لیکن برطانوی سامراج کے تحت بہت کم کہا گیا اور لوگوں کو یہ ذہن نشین نہیں کرایا گیا کہ اصلی دشمن برطانوی سامراج تھا، جس نے ہندوستان کے حصے بخرے کئے کیوں کہ برطانوی سامراج Divide and Rule پالیسی پر عمل کر کے حکومت کرتا تھا۔ اب یہ بات عام لوگوں کی سمجھ میں آئی ہے۔ بہرحال ہم اُن واقعات کی طرف لوٹ آتے ہیں جو گلاب سنگھ کے کشمیر پر قبضہ کرنے کے وقت یہاں تھے۔

اُس وقت کشمیر کا گورنر شیخ امام الدین تھا۔ وزیر لکھپت، جو گلاب سنگھ کی طرف سے بھیجا گیا تھا، قلعہ ہاری پربت گورنر سے حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ خزانے اور توشہ خانوں کی رسیدگی کے معاملے پر ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے۔ وزیر رتنو بھی شیخ امام الدین کے ساتھ گرم گفتاری کرتا

ہے۔ راجہ لال سنگھ معاملے کو طول دیتے ہیں اور اسے ڈوگرہ فوج کے ساتھ جنگ کراتے ہیں۔ جنگ میں وزیر لکھپت اور رام سنگھ کمیدن مارے جاتے ہیں اور شدید قتل و غارت ہوتا ہے۔ اسی درمیان فقیر اللہ اور فیض طلب رام پور، راجوری کی حدود میں بغاوت کا علم بلند کرتا ہے۔ یہ اطلاع مہاراجہ گلاب سنگھ کو ریاسی میں کھر اور ناروا وَ کے ملک (کھر ناروا وَ ہونا چاہئے) دیتے ہیں۔ وہ دیوان جوالا سہائے کو شملہ بھیجتے ہیں۔ سہائے گورنر جنرل سے امداد طلب کرتا ہے۔ برٹش فوج مختلف اطراف سے کشمیر بھیجی جاتی ہے۔ بالآخر باغی اپنی ہار تسلیم کرتے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ ۹ رنومبر ۱۸۴۶ء صبح آٹھ بجے کشمیر میں داخل ہوتا ہے۔ شیخ امام الدین سے پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں لال سنگھ کے خطوط پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لال سنگھ نے اُسے جنگ پر آمادہ کیا۔ وزیر لال سنگھ کو انگریزی سرکار برطرف کرتی ہے اور اُسے آگرہ جلاوطن کیا جاتا ہے۔

۱۹۰۴ بکرمی میں ہزارہ اور کوہاٹ کے زمیندار باغی ہوجاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد گلاب سنگھ انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کرکے ہزارہ، پکھلی، اور کوہاٹ (مظفر آباد تک) کے بدلے مُناور حاصل کرتا ہے۔ اسی دوران سردار چتر سنگھ عطاری والا، ناظم ہزارہ باغی ہوجاتا ہے۔ سکھ فوج خالصہ دربار کے افسر کنورا صاحب کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ادھر ملتان سے بھی بغاوت کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ ساون مل کے دَور میں ملتان اچھی ترقی کرتا ہے لیکن اُس کا بیٹا مولراج اُتنا مالیہ جمع کرکے انگریزوں کو نہیں دے پاتا ہے۔ وہ حاکمی سے دستبردار ہونا چاہتا ہے لیکن باغی اُسے شورش کی رہنمائی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شیر سنگھ، مولراج کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس طرح سے پنجاب کی سرحدوں

پر بغاوت تیز ہوجاتی ہے۔ سلطان محمد برکزئی، جارج لارنس اور بیوہامس کو گرفتار کرکے چتر سنگھ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اُدھر، امیر دوست محمد خان، چتر سنگھ کی اس بات کیلئے مدد کرتا ہے کہ کشمیر، ہزارہ اور راولپنڈی کو اپنے قبضے میں کر لے۔

دیوان کرپارام، گلاب نامہ میں یہ واقعات بیان کرکے گلاب سنگھ کو دور اندیش گردانتا ہے۔ چتر سنگھ، گلاب سنگھ کا دوست تھا۔ وہ یہ کہہ کر گلاب سنگھ سے مدد مانگتا ہے کہ گلاب سنگھ پنجاب کا حکمراں بنے گا اور چتر سنگھ اُس کی ماتحتی میں رہے گا۔ گلاب سنگھ، چتر سنگھ کو جواب بھیجتا ہے کہ خالصہ حکومت نے وہ علاقے انگریزوں کو بیچے ہیں لہٰذا وہ انگریزوں کی وفاداری ترک نہیں کرسکتا اس لئے چتر سنگھ کو انگریزوں کے پاس رحم کی درخواست بھیج دینی چاہئے۔ دوسری صورت میں اُس کے لئے حالات اَبتر ہوسکتے ہیں۔ دوست محمد خان کا جو سفیر تحائف لے کر گلاب سنگھ سے مدد مانگنے آیا تھا اُسے سرینگر پہنچنے سے قبل ہی واپس کیا جاتا ہے۔ آخر میں انگریزی فوج چلیان (Chilian) پہنچ جاتی ہے۔ وہاں سکھ فوجوں اور انگریزی فوجوں میں خونریز جنگ ہوتی ہے جس میں انگریز کامیاب ہوجاتے ہیں۔ دیوان مولراج معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور اُسے قید کرلیا جاتا ہے۔ ۲۲ پھاگن کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان گجرات میں لڑائی ہوتی ہے اور پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ گلاب نامہ میں ان ہی واقعات کا تذکرہ ہے۔ انگریزوں نے جو شک گلاب سنگھ پر کیا اُس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے۔

جنگ آزادی:

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی جنگ آزادی کا بگل بجایا جاتا ہے۔

پوربیا فوجی دستے، جو انگریزی حکومت کے ملازم تھے، باغی ہو جاتے ہیں اور وہ گورے حاکموں کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی فوج انگریز چھاونیوں کو نذرِ آتش کر دیتی ہے۔ اس بغاوت کی اطلاع گلاب سنگھ کو بھی ملتی ہے۔ وہ دیوان جوالا سہائے کو انگریز حاکموں کے پاس روانہ کرتا ہے اور اپنی نمک حلالی کا ثبوت پیش کرنے کی خاطر انگریز سرکار کو مالی اور فوجی امداد کی پیش کش کرتا ہے، جو وہ قبول کرتے ہیں۔ اس طرح گلاب سنگھ، انگریزوں کے حکم کے مطابق ۱۰ر لاکھ روپے دے کر سرینگر اور دیوان ہری چند کے تحت فوجی دستوں کا انتظام کرنے کی خاطر رنبیر سنگھ کو جموں روانہ کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی گلاب سنگھ بیمار ہو جاتا ہے اور ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو ۶۵ر سال کی عمر میں اس عالم سے رخصت ہو جاتا ہے۔

گلاب سنگھ کے اقتدار سنبھالنے کے وقت کشمیر کی کیا حالت تھی اس کے متعلق گلاب نامہ تفصیل بیان نہیں کرتا۔ پی، این، کے، بامزئی کے مطابق اُس وقت کشمیر کے عام لوگوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ اُن کو افغان اور سکھ حکومت نے سخت پریشان کیا ہوا تھا۔ بامزئی کہتا ہے:

۱) شالبافوں کو یومیہ چار آنے مزدوری ملتی تھی۔ اس میں دو آنے ٹیکس کے کاٹے جاتے تھے اور دو آنوں کے بدلے سنگھاڑے یا دھان دیا جاتا تھا۔

۲) ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۸ء کے قحط نے لوگوں کو خستہ حال کر دیا تھا اور اس وجہ سے لدھیانہ اور امبرسر (امرت سر) بھاگ گئے تھے۔ لوگ سنگھاڑوں پر گزارہ کرتے تھے۔ سنگھاڑوں پر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔

۳) کسانوں کی حالت بھی خراب تھی۔ پیداوار کا ۳/۴ حصہ انہیں

سرکار کو دینا پڑتا تھا۔ اُن کے پاس بعد میں صرف ۱/۴ حصہ رہتا تھا جو سرکار کے کارندے اُڑا لیتے تھے اور کسان فاقہ کشی کرتے۔

۴) شیخ امام الدین صوبہ دار کشمیر نے بہت سی جاگیریں اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کو تفویض کی تھیں اور اس کے بدلے اُن سے نقدی نذرانے حاصل کئے تھے۔ اس سے پیداوار پر منفی اثرات پڑ گئے تھے۔

۵) بارہ مولہ سے کھکھ اور بُمب، کشمیریوں کو اذیتیں دیتے تھے۔

۶) یہاں چور ڈاکو خوف و ہراس کا ماحول زندہ رکھے ہوئے تھے اور لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے۔

جی، ٹیلر جو اُن ہی دنوں کشمیر کی سیاحت پر آیا تھا، لکھتا ہے کہ شہر بڑا تکلیف دہ منظر پیش کرتا ہے۔ مکانات لکڑی کے ہیں۔ بازار گندے ہیں کیونکہ صفائی کرنے والا کہیں نظر نہیں آتا اور خوشحالی غائب ہے۔

پی این کے بامزئی کے مطابق گلاب سنگھ کشمیر میں امن و امان قائم کرنے اور کشمیریوں کی حالت سدھارنے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات اُٹھاتا ہے۔

۱ر چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف زبردست مہم چلائی جاتی ہے۔ اُن کو سرِعام پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے۔ اُن کی لاشوں کو مہینوں لٹکائے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اس بدعت کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔

۲ر کھکھ اور بمب کشمیر کی وادی سے باہر نکالے جاتے ہیں۔

۳ر شیخ امام الدین نے جو نئی جاگیریں بارسوخ لوگوں کو عطا کی تھیں اُن کو کاک در کی مدد سے واپس لیا جاتا ہے۔ اس سے بہت سے جاگیردار گلاب سنگھ کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت دھرم ارتھ کی ۳۱۱۵ جاگیریں کشمیر میں موجود تھیں۔

۴/ محکمہ پولیس اور مال اَز سرِ نو منظم کئے جاتے ہیں اور ان میں قابل افسر مقرر کئے جاتے ہیں۔

۵/ بیگار کی بدعت کشمیر میں راجہ شنکر ورمن کے وقت سے جاری ہے۔ (ممکن ہے اس سے قبل بھی ہو) بڈشاہ (۱۴۲۰-۱۴۷۰) میں بھی کشمیر میں بیگار لی جاتی تھی۔ افغان اور سکھ حکومت میں کشمیریوں کو زبردستی بیگار پر لگایا جاتا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ پہلے پہلے اس کا طریقہ بدل دیتا ہے۔ بیگار باری باری لی جاتی تھی۔ بیگار کے بدلے دھان دیا جاتا تھا۔ لیکن جب لوگ اس کے خلاف آزاو بلند کرتے ہیں، بیگاری ختم کی جاتی ہے۔

۶/ گلاب سنگھ اپنا زیادہ تر وقت کشمیر میں گزارتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی شکایت صرف ایک روپیہ نذرانہ پیش کرنے پر سُنتا ہے۔ کہتے ہیں ایک روز ایک شخص اپنی فریاد لے کر گلاب سنگھ کے پاس آیا، اُس کی مٹھی میں ایک روپیہ تھا۔ مہاراجہ نے جب نذرانے کا روپیہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو فریادی نے کہا کہ تب تک میں روپیہ نہیں دوں گا جب تک میری فریاد نہ سُنی جائے۔ اس پر مہاراجہ نے پہلے فریاد سُنی اور دادرسی کی اور اس کے بعد فریادی نے نذرانے کا روپیہ ان کے حوالے کر دیا۔

گلاب نامہ میں جن اہم کاموں کا ذکر ہے اُن میں پہلا کام مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں شہر میں مقررہ قیمتوں پر چاول کا ماہوار راشن مقرر کرنا اور وہ راشن فراہم رکھنے کا بندوبست کرنا ہے۔ دوسرا کام شالبافوں کو راحت پہنچانا ہے۔ شالبافی کی صنعت از سرِ نو منظم کی جاتی ہے۔ اس وقت اس صنعت سے ۲۷ ہزار قالباب، گیارہ ہزار لوموں پر کام کر رہے تھے لیکن اُجرت بہت ہی کم

تھی۔ شالوں کا کاروبار اُس وقت یورپ، فرانس اور برطانیہ کے ساتھ اَحسن طریقے پر چل رہا تھا۔ اس کاروبار سے کارخانہ دار اور شالوں کی تجارت کرنے والے اچھا خاصا نفع کما رہے تھے۔ کارخانہ داروں نے شالباف اپنے غلام بنائے تھے۔ قالباف جب اس غلامی سے تنگ آئے انہوں نے ۶ جون ۱۸۴۷ء کو کشمیر سے بھاگ کر پنجاب جانے کی راہداری مانگی لیکن گلاب سنگھ قالبافوں کا مسئلہ حل کر دیا۔ کارخانوں سے ان کی غلامی ختم کر دی گئی۔

بعض ناموں وغیرہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں مجھے گلاب نامہ میں نظر آئیں اُن کا مختصر سا جائزہ یوں ہے:

۱/ صفحہ ۶۶ پر ''بہرام گلہ'' کے بدلے ''بارہ مولہ'' درج ہے۔ یہ کشمیر کی Topography نہ جاننے کی دلالت کرتا ہے۔ بہرام گلہ کشمیر کے جنوب مغرب میں مغل روڈ پر واقع ہے اور ''ورل'' (بارہمولہ) کشمیر کے شمال میں مشہور قصبہ ہے۔

۲/ اسی صفحے پر سیدو کے بدلے Sadhu درج ہے، جو صحیح نہیں۔

۳/ صفحہ ۶۷ پر لاہور کے بدلے Lahosc درج ہے جو غلط ہے۔

۴/ صفحہ ۸۹ پر پنڈت سہز رام اور میرزا پنڈت درج ہے جو سہز رام در اور میرزا پنڈت در ہونا چاہئے (دیکھئے ''اے ہسٹری آف کشمیر'' از پی این کے بامزئی۔ صفحہ ۴۵۴)

۵ فارسی گلاب نامہ میں شوپیان کے بدلے Soyia درج ہے جو غلط ہے۔

۶/ صفحہ ۲۰۰ پر Punachh درج ہے جو Punch ہونا چاہئے۔

۷/ صفحہ صفحہ ۳۳۶/ پر ''لاہول'' کے بدلے ''الائبل'' درج ہے جو صحیح نہیں،

۸/صفحہ ۳۳۹/ پر Disposition کے بدلے Dispotion چھاپ ہوا ہے۔

۹/صفحہ ۳۴۰ پر مائسمہ کے بدلے Mahisum درج ہوا ہے۔

۱۰/صفحہ ۴۵۶ پر گلاب نامہ کے بدلے گلابو نامہ درج ہے۔

۱۱/صفحہ ۵۷ پر محکم چند کے بدلے مون چند لکھا گیا ہے۔

اور بھی بہت سی غلطیاں ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی غلطیاں پروف کی ہوں لیکن ایک تاریخی دستاویز کا ترجمہ کرتے وقت ترجمہ کار کو چاہئے کہ وہ نام درج کرتے وقت احتیاط سے کام لے۔

مترجم: محمد ادریس ملک

☆☆☆

کتاب نامہ

1. Gulabnama of Diwan Kripa Ram; Translated by Sukhdev Singh Chadak
2. A History of Kashmir by P.N.K. Bamzai
3. ''سون ادب'' ۱۹۸۴ء، شائع کردہ کلچرل اکادمی
4. Commision of Enquiry against Gulab Singh (1978) by Dr. M.L.Kapoor.
5. Kashmir sold and snatched (1968) by Dr. M.L.Kapoor

غلام نبی خیالؔ

رابرٹ تھورپ
اہلِ کشمیر کا جاں نثار ہمدرد

کشمیر کے بارے میں لکھی گئی مشہورِ عالم کتاب ''کشمیر- دھوپ اور چھاؤں میں'' کے مصنف سی ای ٹینڈیل بسکو لکھتے ہیں۔ ''سرینگر کے شیخ باغ علاقے میں عیسائی قبرستان میں ایک ایسی قبر موجود ہے کہ میں جب بھی وہاں سے گذرتا ہوں تو احتراماً اپنی ٹوپی اُتارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس قبر میں لفٹنٹ رابرٹ تھورپ کے ابدی آثار موجود ہیں۔ رابرٹ تھورپ وہی شخص تھا جس نے ۱۸۶۸ء میں اہلِ کشمیر کے لئے اپنی جان قربان کر ڈالی''۔

گذشتہ چند صدیوں کے دوران مغربی دُنیا سے جو سیاح، مورّخ، ادیب، ماہر لسانیات اور فنونِ لطیفہ کی مختلف اصناف سے دلچسپی رکھنے والے ہزاروں لوگ واردِ کشمیر ہوئے اُن میں رابرٹ تھورپ کا نام اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت اور شان کا حامل ہے کہ اُس نے کشمیر اور کشمیریوں کے حالِ زار اور اُن کی غلامانہ زندگی کا درد سب سے زیادہ محسوس کیا۔ اس درد اور تڑپ کی شدت کو تھورپ نے اپنی ایک مختصر مگر عہد آفرین کتاب ''بد انتظام حکومت'' میں بیان کیا

اوراس بے باکی اورحق گوئی کی پاداش میں اُسے حکامِ وقت کے ہاتھوں اپنی جانِ عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ تھورپ کی قبر آج بھی شیخ باغ کے اِسی قبرستان میں اس ایک جملے کی زبانی اس کی کشمیرنوازی اور کشمیر کے لئے جان نثاری کا حال بیان کرتی ہے جو اِس قبر کے لوحِ مزار پر اِس طرح رقم ہے۔ ''رابرٹ تھورپ، عمر تیس سال، وفات ۲۲ نومبر ۱۸۶۸ء، جس نے کشمیر کے لئے اپنی جان نچھاور کردی''۔

۱۸۳۳عیسوی میں جب سکھ پنجاب اور کشمیر پر حکومت کر رہے تھے ایک برطانوی فوجی افسر رابرٹ تھروپ ایک سیاح کی حیثیت میں کشمیر آیا۔ یہاں اُسے ایک کشمیری دوشیزہ سے عشق ہوگیا جس کے ساتھ اُس نے شادی کرلی اور اُسے اپنے ساتھ انگلستان لے گیا۔

رابرٹ تھورپ اسی جوڑے کا تیسرا بچہ تھا۔ وہ بھی کشمیر کی سیر کو آیا۔ ایک نوجوان فوجی افسر کی حیثیت میں افریقہ کا دَورہ کرنے کے بعد وہ ۱۸۶۵ء میں کشمیر پہنچا۔ اُس وقت تک انگریزوں نے سکھوں کو شکست فاش دی تھی۔ کشمیر کو ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے ایک ڈوگرہ سپہ سالار گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ رابرٹ تھورپ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں واردِ کشمیر ہوا اور یہاں آکر اُسے عام کشمیریوں کی بے بسی اور بے کسی کا ناگفتہ بہ حالِ زار دیکھ کر زبردست کوفت ہوئی۔

اُن دنوں غیر ملکیوں کو کشمیر میں داخلے کے لئے برطانوی حکام سے اِجازت لینا پڑتی تھی اور اُن کا قیامِ کشمیر بھی دو ماہ سے زیادہ عرصے کے لئے منظور نہیں تھا۔ لیکن تھورپ اپنی والدہ کی جنم بھومی میں عوام کے مصائب کا مشاہدہ

کرنے کی غرض سے اس سے زیادہ دِنوں تک کشمیر میں مقیم رہا۔ یہاں اُس نے کشمیریوں کی حالت سے برطانوی اہلِ اقتدار اور ہندوستانی عوام کو باخبر کرنے کی غرض سے ہندوستانی اور بھارتی اخبارات میں مضامین لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

اُسی دوران ایک حیران کن سانحہ پیش آیا۔ رابرٹ تھورپ کی لاش سرینگر میں کوہِ سلیمان (شنکر آچاریہ) پہاڑی پر پائی گئی۔ اگرچہ اس کی ناگہانی موت کے سلسلے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں لیکن واقف کاروں کا یہی خیال ہے کہ اُسے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارندوں نے زہر دے کر مار ڈالا کیونکہ ایوانِ اقتدار کے حکام اُس کی اُن تحریروں سے بالکل ناخوش تھے جن کے ذریعہ تھورپ نے اُن کے عوام دشمن مظالم کا پردہ چاک کیا تھا۔

اس سے قبل تھورپ کو سرکار نے شہر سرینگر چھوڑنے کا حکم دیا تھا اور اُسے شہر کے باہر بھی لے گئے تھے لیکن ۲۱ نومبر ۱۸۶۷ء کو وہ پھر چوری چھپے واپس لوٹ آیا اور اگلی صبح اُسے مُردہ پایا گیا۔ اس سانحہ کے بعد مہاراجہ کشمیر سے پوچھ تاچھ بھی کی گئی لیکن گمان اغلب ہے کہ اس سلسلے میں عینی شہادتوں اور دیگر دستاویزوں کو سرکار کی ہدایت پر تلف کرلیا گیا اور یہ معمہ ہمیشہ کے لئے لاینحل ہی رہا۔

کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار ''فرینڈ آف انڈیا'' نے جو ظاہراًانگریزوں کا حامی تھا، بہرصورت اپنی ۱۱ مئی ۱۸۷۵ کی اشاعت میں لکھا کہ ''یہی عام قیاس ہے کہ اُسے زہر دے دیا گیا۔ لیکن جرّاح نے جو موقعہ پر ہی موجود تھا اُس کی لاش کا ملاحظہ کرنے کے بعد بتایا کہ اُس کا دل پھٹ گیا تھا جو

شاید اِس عمل کا نتیجہ تھا کہ کچھ سرکاری اہل کار اُس کے سینے پر چڑھ کر اُس کی چھاتی کو زور زور سے دباتے رہے"۔

"کشمیر پیپرس" کے مصنف ایس این گاڈرو نے تھورپ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ "تھورپ کا باپ کرنل تھا۔ تھورپ نے کشمیر کی ایک مسلمان لڑکی جانی سے شادی کرلی تھی جس سے دو اولادیں ہوئی۔ جب بعد میں لڑکا تھورپ کھاگ کے نزدیک واقع گاؤں سکن میں اپنے عیال کی خبر گیری کے لئے آیا تو اُس نے گاؤں والوں کی غربت دیکھی اور یہیں سے کشمیر سے اُس کی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ تھورپ نے کشمیر کے بارے میں جو کتاب لکھی اُسے بعد میں ضبط کیا گیا"۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گاڈرو نے اپنی تحریر میں کرنل تھروپ اور اُس کے بیٹے تھورپ کے ناموں کو خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ رابرٹ تھورپ تیس سال ہی کی عمر میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان ہو کر ہی موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔

تھورپ نے اپنے قیام کشمیر کے دوران "بدانتظام حکومت" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب بھی تصنیف کی جو ۱۸۷۰ء میں یعنی اُس کی موت کے دو سال بعد لندن میں لانگ مین کے اشاعتی اِدارے کی طرف سے شائع ہوئی۔

یہ تصنیف تھورپ نے اُن لوگوں کی نذر کی ہے جو "اِنسانوں کے ساتھ ظلم و جبر کو رد کرتے ہیں اور جو اِخلاقی، مذہبی اور سماجی طور پر برتر ہیں اور استبداد کو بالکل پسند نہیں کرتے"۔

تھورپ کی کتاب کی اِشاعت اور اس میں درج تلخ حقائق کو قبول کرتے ہوئے برطانوی سرکار کشمیر کی صورتِ حال کا از سر نو جائزہ لینے پر مجبور ہوگئی اور

اِس سلسلے میں کئی ایسے اقدامات کئے گئے جس سے کسی حد تک کشمیر کے اَبتر حالات اور کشمیریوں کی کس مپرسی میں بہتری پیدا ہوئی۔

تھورپ جب ۱۸۶۵ء میں کشمیر پہنچا تو اُسی سال اس ملک میں زبردست قحط پڑا اور لوگ فاقہ کشی اور بے وقت کی موت سے بچنے کے لئے پنجاب کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ملکِ کشمیر اِس قدر خوشحال تھا کہ پنجاب سے لوگ یہاں آکر یہاں کے مکین ہو گئے تھے لیکن اَب اہلِ کشمیر اُپنے وطن سے بھاگ کر پنجاب ہی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

رابرٹ تھورپ نے اُپنی کتاب کے پیشِ لفظ میں اس تصنیف کی تخلیق اور اس کے مقاصد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مختصر سی کتاب، جو اُس کے اخباری مضامین اور دوسری نگارشات پر مشتمل ہے، دراصل مغربی دنیا اور خاص کر انگلستان کو کشمیر کے بدتر حالات سے واقف کرنے کی ایک کوشش تھی۔ تھورپ نے اِس کتاب میں ڈوگرہ راج کے ظلم و جبر اور غیر انسانی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> "اُس سمجھوتے کے پیشِ نظر جو حکومتِ ہند اور جموں سرکار کے درمیان طے پایا ہے اور جس کی رو سے انگریزوں کو جاڑے کے دنوں میں جموں سرکار کی طرف سے ہر اختیار سے محروم کیا جاتا ہے اور اِس حقیقت کے مدنظر بھی کہ مہاراجہ کی رعایا کو حق بات بتانے کا زبردست خوف ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ مندرجہ ذیل اطلاعات جو میں نے نہایت مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد جمع کی ہیں بالکل نئی ثابت ہوں گی اور ان کا وہ لوگ مقابلہ نہیں کر سکیں گے جنہوں نے کشمیر کا سفر تو کیا ہے لیکن جن کی اطلاعات اخباروں اور معاشرہ کی بات چیت سے اخذ کی گئی ہیں۔

لہٰذا مجھے یہ یقین کرنے کی ضرورت ہے کہ میں ایک ایسے ملک کے بارے میں جس کی بہبود کے لئے ہم ذمہ دار ہیں جو ترسیل میں کرنا چاہوں گا دلچسپی کا باعث ہوگی۔ خاص طور پر اولاً اُن کے لئے جو یہ چاہتے ہیں کہ جس حکومت کے تحت وہ رہتے ہیں یا جس کی وہ خدمت کرتے ہیں وہ سرپھری ہونے کے برعکس بے لاگ ہونے اور محض ایک طاقت ہونے کا مظاہرہ کرے۔

یہ عبارت اُن کے لئے بھی باعث توجہ ہوگی جو لوگوں کی خواہ مخواہ کی مصیبتوں اور آلام کے لئے اُن پر رحم کھاتے ہیں جن لوگوں کے دانشورانہ اور اخلاقی اقدار کو اُس عمل نے پامال کر رکھا ہے جو ہر لحاظ سے اُن سے اُبتر ہے۔ یہ اقدار ایک جابر انتظام کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہیں۔ لہٰذا میں بغیر کسی اقتدار کے اُن عوام کے مصائب اور مشکلات کا حال بیان کروں گا جو مہاراجہ کی سرکار کے ظلم واستبداد سے پس رہے ہیں''۔

ذبیحہ گائے کے بارے میں رابرٹ تھورپ کا بیان ہے کہ:

گائے کو ذبح کرنے کی پاداش پہلے پہل سزائے موت تھی لیکن جیسا کہ میں کہہ سکتا ہوں یہ سزا بعد میں برطانوی سرکار کی شکایت کے مدنظر عمر قید میں بدل گئی۔ اگرچہ مجرم کو عمر قید کی سزا اس دہشت ناک طریقے سے برداشت کرنا پڑتی تھی کہ موت کی سزا سے زیادہ رحم دلی کا اس میں کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ ۔ ۔ ۔ انتقامی عمل کی لاٹھی نہ صرف گائے ذبح کرنے والے فرد پر پڑتی تھی بلکہ اُس کا سارا کنبہ اس کی زد میں آجاتا تھا۔ جو بھی ایک یا دوسرے طریقے سے اس عمل میں شریک پائے جاتے تھے وہ بھی مجرم کے ساتھ کال کوٹھری میں یہ اذیت رساں سزا بھگتنے کے لئے ڈالی دیئے جاتے تھے۔

مزید برآں ہر روز کی تحقیقات کے بعد کہ یہ جرم کن حالات میں سرزد ہوا قیدیوں پر کوڑے برسائے جاتے تھے اور جب انہیں زنداں میں ڈال دیا جاتا تھا تو لوہے کی گرم سلاخوں سے اُن کے بدن پر داغ لگائے جاتے تھے اور انہیں اذیت دی جاتی تھی۔ ناکافی غذا اور ظالمانہ سلوک کی بناء پر وہ وقت سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ میری دانست میں ایسا کوئی واقعہ نہیں جس کی رُو گائے ذبح کرنے والے کسی بھی شخص کو رہائی نصیب ہو۔

جہاں تک انصاف کا تعلق ہے وہ نہ ہونے یا بہت کم ہونے کے برابر ہے۔ سرکار یا ہندوؤں کے خلاف اقدامات زبردست سزا کے ساتھ انصاف کے ترازو پر تولے جاتے تھے۔ دوسری طرف حکومت یا ہندو جن جرائم کا ارتکاب کرتے تھے انہیں عام طور پر نظرانداز ہی کیا جاتا تھا۔ حال ہی میں سرینگر میں چھوٹے جرائم کے لئے مقدمے چلانے کی غرض سے ایک نئی عدالت قائم کی گئی ہے۔ جس میں پانچ سُنی مسلمان، دو شیعہ اور تین کشمیری پنڈت شامل ہیں، اس عدالت کی حد اختیار میں مجرم پر صرف دس چلکا روپے کا جرمانہ عائد کرنا ہے۔ اس عدالت کو چیف جج کے اختیارات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں یعنی کسی کو بھی اپنی مرضی کے مطابق یا بغیر کسی جواز کے جیل میں ڈال دیا جائے۔ اگر کوئی قرض خواہ اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو اُسے قرض دینے والے کی غلامی میں دیا جاتا ہے''۔

ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں لیفٹیننٹ رابرٹ تھورپ کشمیر کے دورے پر آیا جیسا کہ ٹینڈیل بسکو نے لکھا ہے:

''اُس کا ذہن جلد ہی ایک سنگین معاملے کی طرف پھر گیا یہ معاملہ اہل کشمیر کے اُن مصائب کا تھا جو وہ سرکاری بدنظمی کے مارے اُٹھا رہے

تھے۔ اُس نے دیکھا کہ مسلمان کاشتکار ہندو سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں زبردست مشکلات میں مبتلا تھے جو اُن کا خون چوستے تھے۔ یہ غریب کاشتکار جنس کی صورت میں ٹیکس ادا کرتے تھے۔ اس طرح سے اُن کی فصلوں کا نصف حصہ سرکار کو جاتا تھا اور ایک چوتھائی حصہ یہی سرکاری اہل کار ہڑپ کرتے تھے۔"

ہندو اہل کاروں کی فوج کو مہاراجہ نے یہ اختیار دیا تھا کہ وہ فصلیں پکتے ہی کاشتکاروں پر ہلّہ بول دیں اور اُن سے ٹیکس کی صورت میں اُن کی سال بھر کی محنت پر شب خون ماریں۔ اس طرح سے کاشتکار کے اپنے کنبے کے لئے نہایت ہی قلیل تعداد میں چاول یا آٹا بچتا تھا اور اس کی بنا پر وہ اور اس کے اہل خانہ وقتاً فوقتاً فاقہ کشی کا شکار ہوتے تھے۔ بسااوقات یہ کاشتکار درختوں کی جڑیں کھا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

تھورپ اس تکلیف دہ صورت حال سے نہایت رنجیدہ ہو گیا۔ جب اُس نے اچھی طرح سے باور کر لیا کہ مصائب کے یہ پہاڑ...... کشمیر کے لوگوں پر اُن کے اپنے حکمران کے ہاتھوں ٹوٹ پڑے ہیں تو اُس نے کشمیریوں کے حالِ زار کے بارے میں مبنی بر حقائق تفصیلات جمع کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اُس نے اپنی جمع کردہ رپورٹ سے نہ صرف حکومت ہند کو آگاہ کر لیا بلکہ ان حالات پر مبنی مقالے اُس نے برطانوی اور ہندوستانی اخبارات اور جرائد میں بھی شائع کیں۔ بسکو لکھتے ہیں:

اُس صورت حال کے نتیجے میں اُس پر مشکلات حاوی ہو گئیں اور اُسے ملک سے باہر چلے جانے کو کہا گیا۔ چونکہ اُس نے اس سرکاری حکم کی تعمیل سے انکار کیا لہٰذا اُسے اس کی چارپائی کے ساتھ باندھا گیا اور سپاہی

اُسے درّے کی طرف لے گئے۔ تھورپ بھاگ جانے میں کامیاب ہوا اور وہ واپس سرینگر لوٹا لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ اگلی صبح وہ ناشتہ کرنے کے بعد زہر خورانی سے ہلاک ہوا تھا"۔

رابرٹ تھورپ غیر کشمیریوں میں اس حیثیت میں اوّلین شہید کا درجہ رکھتا ہے کہ اس نے آزادیٔ کشمیر کی راہ میں اپنی جان قربان کی۔ وہ سرینگر میں شیخ باغ میں انگریزوں کے قبرستان میں ایک گھنے چنار کے درخت کے سائے تلے ابدی نیند سو رہا ہے۔

۱۸۳۳ء میں لیفٹننٹ کرنل تھروپ ایک انگریز سیاح کی حیثیت میں کشمیر آیا۔ جب وہ توسہ میدان میں قیام پذیر تھا تو اُس کی نظر ایک دوشیزہ جانی پر پڑ گئی جس پر وہ دم زدن میں فریفتہ ہو گیا۔ جانی، کشتواڑ کے شاہی خاندان کے مقتدر فرد والم راٹھور کی بیٹی تھی۔ تھروپ نے اس دوشیزہ کو حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کر کے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ جانی اپنے شوہر کے ساتھ بعد میں انگلستان چلی گئی۔ رابرٹ تھورپ اس جوڑے کی تیسری اولاد تھا جسے اپنی والدہ کی زبانی کشمیر کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ یہ امکان اغلب ہے کہ اپنی ماں کے بیان کردہ واقعات کشمیر سے بھی اُس کے دل پر ایک گہرا اثر پڑا ہوا اور اس کے دل میں مظلوم اور غلام کشمیر کو دیکھنے اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی ہو۔ اس طرح سے تھورپ انگلستان سے چل پڑا اور بمبئی اور دہلی میں چند روز تک قیام کرنے کے بعد ایک سیاح کے رُوپ میں کشمیر پہنچا۔ اُسے کشمیر کے فطری حُسن اور یہاں کے قدرتی نظاروں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے کشمیر کے دیہاتوں کا دورہ کیا اور عوام کے

حالات کے بارے میں حقائق جمع کرتا رہا۔ یہ حالات جب اُس کے مضامین کی شکل میں اخبارات میں شائع ہوئے تو سارے ہندوستان میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اُس نے کشمیر کے حال سے اعلیٰ ترین انگریز عہدہ داروں کو کلکتہ اور لاہور کے پتے پر مُراسلے بھیجے۔

بہر حال تقدیر کی ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۶۸ء کو اُسے تختِ سلیمان کی پہاڑی پر مردہ پایا گیا۔ ڈاکٹر محمد امین تاثیر کے بقول اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اخبارات میں شائع شدہ تھورپ کے مضامین دو سال بعد ایک کتاب کی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اس کتاب میں اُس نے بنکروں کے حالات کے بارے میں لکھا ہے:

"مختلف رنگوں کے دھاگے جو یہ بنکر کپڑا اور لوئیاں بُننے کے کام میں لگاتے ہیں کبھی کبھار اُن کے گلے کا پھندا بھی بن جاتے ہیں کیونکہ یہ لوئیاں اور پشمینے کے شال اُن کی بیماریوں اور مصیبتوں کے دِنوں میں بُنے جاتے ہیں۔ ان شال بافوں کے لئے صرف موت یا لڑائی کا دروازہ کھلا ہے لیکن وہ لڑ نہیں سکتے لہٰذا اُن کے ناتوان جسم موت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر کشمیری شال بافت پنجاب کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ جبکہ یہ ہجرت صرف انہیں کے لئے موزون ہے جو صحت مند ہوں اور جن میں قوتِ برداشت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ ورنہ پنجاب پہنچنا بھی کشمیریوں کے لئے مشکل ہے کیونکہ وادی سے باہر جانے کے چند درّے مکمل طور پر سپاہیوں کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی دشوار گذار پہاڑی راستے اپنا کر اپنا سفر پورا کرتے ہیں یا انگریزوں کے ساتھ اُن کے خدمت گاروں کی شکل میں بیرون ملک جاتے ہیں۔ یہ مظلوم مہاراجہ کے

داغِ شال کے ظلم سے بچنے کی خاطر بہرحال ہجرت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ حکومتِ ہند مہاراجہ سے یہ تک نہیں کہتی کہ ان مہاجروں کو واپس لاکر اپنے اپنے گھروں میں بسایا جائے"۔

تھورپ کے خیال میں اس بات کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے کہ اس کٹھن سفر کے دَوران کشمیری شال بافوں کو کن کن مصائب سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف سرکاری کارندوں کی طرف سے گرفتاری اور سزا کا خوف، دوسری جانب دشوار گذار سفر کے دوران صحیح سلامت منزل کو پالینا اور پھر یہ اندیشہ کہ اُس ملک میں اُن کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا جس کا صرف نام پنجاب انہوں نے سُنا ہے اور جہاں کے لوگ اُن کے لئے ناآشنا اور غیر ہیں۔ اس غیر اِنسانی سلسلے کے بارے میں اُس نے لکھا ہے:

"ان پناہ گزینوں میں سے ایک کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ وہ بے بس اور بے یارومددگار انسان اپنی بیوی اور بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لینا چاہتا تھا لیکن اُس کا یہ ارادہ انجام تک نہیں پہنچا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس اقدام سے اُس کی بیوی بچوں کی زندگیاں خطرے میں پڑسکتی تھیں"۔

تھورپ جہاں ایک طرف کشمیر کی حسین وادیوں پر بھی اپنی پُرجوش نظریں ڈالتا تھا وہاں کشمیر کے حالات اُسے رنجیدہ بھی کر رہے تھے۔ اُسے بار بار ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس وادی میں ایک ناتوان پرندے کی طرح شکاری کے جال سے بچنے کی خاطر اپنے پر پھڑ پھڑاتا تھا۔

تھورپ کے بقول یہ مہاجر کسی تاجر یا کسی آشنا کے ہاتھوں اپنے گھر والوں کو پیسے بھیجا کرتے تھے اور آج تک ایسی ایک بھی شکایت نہیں ملی ہے

کہ اس رقم میں کسی طرح کی خرد بُرد کی گئی ہو۔ یہ عمل کشمیری کردار کے ایک خوش رنگ پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ اہلِ کشمیر کے بارے میں دو باتیں بہت ہی فخر کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہیں کہ وہ نرم دل اور دیانتدار ہیں۔ تھورپ کہتا ہے کہ اُس نے زندگی بھر کسی بھی انگریز کو یہ شکایت کرتے نہیں سنا ہے کہ کسی کشمیری نے اُس کی کوئی چیز چُرائی ہو۔ دیہاتوں میں ناتوان اور ناکارہ بوڑھوں کی دیکھ بال گاؤں کے لوگ خوشی خوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح سری نگر شہر میں اُن مستحق افراد کو کھانا اور پیسے دئے جاتے ہیں جو دوسروں سے یہ چیزیں مانگتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ کو ماہِ رمضان میں اور عیدین پر زیادہ جوش وخروش کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے۔ کشمیری معاشرے کے اِن خوش کن پہلوؤں کی طرف تھورپ کی توجہ زیادہ دیر تک مرکوز نہیں رہ سکی کیونکہ اُس کی آنکھیں ساتھ ہی اُن ستم زدہ انسانوں کے ناگفتہ بہ حال کو دیکھ کر اشک بار ہوتی تھیں جو شخصی راج کے شکنجے میں بے زبان حیوانوں کی طرح جکڑے گئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مہاجر شال باف ہجرت کے دوران بھی آرام سے جینے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ انصاف کے ہندوزاویۂ نگاہ سے بلا اجازت گھر چھوڑنا بھی ایک جرم گردانا جاتا تھا۔ کسی مظلوم کی ہجرت کے بعد ہی کارخانہ دار'داروغہ کو اس واقعہ کی اطلاع دیتا تھا تاکہ کارخانہ دار پر ایک ملازم کی ہجرت کی وجہ سے ٹیکس میں کمی کی جاسکے۔ لیکن یہ ٹیکس برابر ایک سال تک وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی شال باف سال کے پہلے مہینے میں فوت ہوجاتا تھا تو اُس کے مرنے کے بعد بھی اُس کا ٹیکس اگلے گیارہ مہینوں تک زبردستی وصول کیا جاتا تھا۔

مرے ہوئے لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے کا یہ طریقہ غالباً دورِ غلامی

کے بدترین دنوں میں بھی رائج نہیں تھا۔ جب ٹیکس کی ادائیگی کے بعد متوفی کا نام داغِ شال کی فہرست سے خارج کیا جاتا تھا تو سرکاری اہل کار اس "خوشی" میں کارخانہ دار سے ایک مخصوص رقم وصول کرتے تھے۔

اُن دنوں رائج بیگار کے غیر انسانی سلسلے کے بارے میں تھورپ نے کچھ اس طرح اس بہیمانہ عمل کی تصویر کشی کی ہے:

"میں نے کماری درّے کو پار کیا جو گریز کو استور وادی سے ملاتا ہے۔ یہ اکتوبر ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے۔ گریز کی جانب یہ علاقہ میلوں تک برف سے ڈھکا ہوا تھا اور مجھے استور کی وادی میں پہنچنے تک دو دن کا سفر کرنا پڑا۔ ایک وادی سے دوسری وادی میں داخل ہوتے وقت میں نے برابر تین روز تک کسی ذی حیات کو نہیں دیکھا نہ ہی اس راستے پر کسی قسم کی پناہ گاہ نظر آئی۔ اس طرح سے ہم برف و باراں کے موسم میں کسی پناہ کے بغیر تھے۔ بہر حال آخر پر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں برف بھی نہیں تھی اور چند خیمے پناہ گاہوں کے طور پر نصب کئے گئے تھے۔ اس علاقے سے فوجی چند روز قبل گذرے تھے اور ہم نے جس تعداد میں ٹٹوؤں کی لاشیں دیکھیں اُس سے اس راستے کی دشواری کا علم ہوتا تھا۔

کشمیر کے زمیندار عام طور پر نومبر کے مہینے میں بیگار پر گلگت بھیجے جاتے تھے جبکہ یہ سارے راستے اور درّے نسبتاً دشوار گذار تھے۔ ان مظلوموں کو بیگار پر بھیجے جانے کے وقت کسی قسم کے کپڑے، خوراک یا پناہ لینے کے سامان بالکل نہیں دیئے جاتے تھے۔ وہ اپنی پیٹھ پر چاول کی بوریاں اُٹھا کر یہ سفر طے کرتے تھے اور راستے میں کئی ایک کی موت بھی واقع ہوتی تھی۔ ہندو سرکار نے کبھی یہ زحمت نہیں کی کہ ان مرنے والے بے چارے لوگوں کے نام تک کسی جگہ درج کرے۔

آپ اُن سخت ترین ویرانوں کا تصور کیجئے جہاں یہ بیگار مزدور عالمِ بے کسی میں اپنی آخری سانس لینے پر مجبور تھے۔ اس خوف ناک انجام کا کوئی شخص اندازہ بھی نہیں لگا سکتا جب تک کہ وہ ان حالات سے دوچار نہ ہو۔ آس پاس برفانی کہساروں کی فلک بوس چوٹیاں، گہری کھائیاں، طوفانی ہوائیں جو بیگار مزدوروں کے ننگے جسموں پر کوڑے برساتی تھیں اور انہی حالات میں جب یہ لوگ آخری سانس لیتے تھے تو اُن کے ہونٹوں پر صرف اللہ اور اُس کے رسولؐ کا نام ہوتا تھا۔

اپنی اِس طویل اور جان لیوا مزدوری کے دوران یہ بے بس لوگ صرف اس بات کی آرزو کرتے تھے کہ وہ کسی طرح بخیر وسلامت گلگت پہنچ سکیں اور وہاں سے لوٹ کر واپس اپنے گھروں میں اپنی بیوی بچوں کو دوبارہ دیکھ سکیں لیکن اُن میں سے اکثر کی یہ خواہش رستے میں ہی اُن کی بے وقت موت کے ساتھ ختم ہو جاتی تھی''۔

یہاں پر تھورپ کا لہجہ ایک طنزیہ اندازِ بیان اختیار کر لیتا ہے اور وہ کہتا ہے:

چلئے فی الحال اس موت کے نظارے کو پیچھے چھوڑ دیں لیکن اے میرے برطانوی قاری! تم یہ نہ بھولنا کہ یہ ساری مصیبتیں کشمیریوں پر اُس سرکار نے نازل کی ہیں جو برطانوی سرکاری کی پروردہ ہے اور یہ وہی سرکار ہے جو انگریز کے نام پر ایک کالا دھبہ ہے''۔

۱۸۶۷ء میں کشمیر میں زبردست وَبا پھوٹی جس سے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ سری نگر کے مشن ہسپتال میں ان دنوں کام کرنے والی ایک انگریز ڈاکٹر کے بقول:

''اس وبا کے دوران جو ظلم، غفلت اور حرص و ہوا میں نے دیکھی اُس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جب کالرا زوروں پر تھا تو

شہر میں اعلان کیا گیا کہ ہز ہائی نیس مہاراجہ نے اس وباء سے نجات کے لئے ایک موثر علاج دریافت کر لیا ہے۔ یہ علاج ایک چھپے ہوئے کاغذ کی شکل میں تھا جس پر کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ یہ عبارت کئی بار پڑھ کے اس منتر کو مکان کے دروازے پر لٹکانا تھا۔ اس کاغذ کے پرچے کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ اس سے نہ صرف وبائی بیماری کا علاج ہوگا بلکہ اس کی بدولت اُس گھر میں آئندہ بھی ایسی بیماریِ داخل نہیں ہو سکے گی جس کے دروازے پر یہ تعویذ لٹکائی گئی ہو۔ ہر تعویذ کے لئے چار آنہ قیمت مقرر کی گئی اور اسے مہاراجہ کے ڈاک خانے سے قیمتاً حاصل کیا جا سکتا تھا۔ میں نے بھی کئی تعویذ خرید لئے، جو اَب بھی میرے پاس ہیں اور جن کے نام نہاد اثر کے بارے میں اگر میں گالی گلوچ والی زبان استعمال کروں تو مناسب نہیں ہوگا''۔

اس ڈاکٹر نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جس کے مطابق ایک غریب سپاہی کو گلگت جانے کے لئے کہا گیا جبکہ اُسے معدے کی شدید بیماری لاحق تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے، گلگت کا سفر کرنے سے منع کیا لیکن جب ڈوگرہ کرنل کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے نہ صرف یہ کہ اس شخص کی ایک سال کی تنخواہ بطور جرمانہ اس سے وصول کی بلکہ اُسے فوراً گلگت کے سفر پر روانہ کر لیا۔ وہ بے چارہ راستے میں ہی دم توڑ چکا ہوگا اور اُسکی لاش کو گدھوں اور چیلوں نے نوچ نوچ کر کھا لیا ہوگا۔

تھروپ نے ۱۸۶۶ء میں وقوع پذیر اِس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے کہ اُس سال کشمیری تاجروں، کشتی بانوں اور کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد کو جبراً گلگت بھیجا گیا تا کہ وہ وہاں فوج کیلئے رسد پہنچائیں۔ ڈوگرہ سرکار نے ان میں فی کس ایک دن کے لئے صرف چاول کا ایک سیر بانٹ دیا اور بس۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن

میں سے اکثر لوگ راستے میں ہی لقمۂ اجل بن گئے۔

اس بیگار کے مروج طریقے پر ایک آزاد خیال ہندو شیام لال کپور نے بھی اپنے اخبار گورو گھنٹال لاہور کی ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں یہ دردناک واقعہ بیان کیا:

''مالیر کوٹلہ کے نواب نے کشمیر کے پہاڑی علاقوں کی سیر کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کشمیر سرکار نے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو نواب کے کیمپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لینے پر مامور کیا۔ ایک روز جب وہ گھوڑے پر سوار تھا تو اُس کی نظر انہی بیگار مزدوروں کی ایک جماعت پر پڑی تو وہ اُن سے ہم کلام ہونے کی غرض سے اُن کے پاس گیا۔ گفتگو کے دوران اُسے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ وہ شادی کی برات کے رُکن تھے جنہیں اُس وقت سرکاری کارندوں نے پکڑا تھا جب وہ دلہا کے سسرال سے دلہن کو لے کر واپس لوٹ رہے تھے انہیں نواب کے کیمپ کے لئے کام کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس حکم کی زد میں دلہا بھی لایا گیا تھا جسے اپنی دلہن کو بھی گھر لے جانے سے روکا گیا تھا''۔

جموں وکشمیر کولیلیشن آف سول سوسائٹی نے چند سال قبل رابرٹ تھورپ کی یاد میں ایک انعام کا اعلان کیا جو انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں نمایاں کام سرانجام دینے والے کو دیا جانا مقصود ہے۔

سوسائٹی نے اس سلسلے میں پہلا انعام ۲۰۰۳ء میں پٹریشیا گاسمن نامی امریکی خاتون کو دیا جو کچھ سال پہلے کشمیر آئی تھی اور یہاں پر ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اُس نے ایک تحقیقی رپورٹ ایشیا واچ کے لئے مرتب کی تھی۔

سوسائٹی کی طرف سے دوسرا انعام کشمیر نژاد آسیہ جیلانی کے حق میں بعد از مرگ دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ آسیہ اپنے پیشہ ورانہ کام کے سلسلے میں پارلیمانی انتخابات کے دوران شمالی کشمیر میں لولاب گئی تھی جہاں ۲۰ اپریل ۲۰۰۴ء کو ایک دھماکے میں اُس کی موت واقع ہوئی۔

اہل کشمیر کو اس سوسائٹی کا سپاس گذار ہونا چاہئے کہ اس کی طرف سے اُس انگریز سیاح اور کالم نگار رابرٹ تھورپ کی یاد میں انعام قائم کر کے اُس کا نام زندہ رکھنے کی قابل داد کوشش کی گئی ہے جس نے خود بھی کشمیر کے لئے اپنی جان قربان کر ڈالی۔

پروفیسر محمد ابراہیم

مُلا عبدالقادر بدایونی
"مُنتخب التواریخ" اور کشمیر

مغل دَور اور اِس سے قبل کشمیر کے تواریخی حالات کے سلسلے میں جو کتابیں ماخذ کی صورت میں قابلِ ذکر ہیں اُن میں مرزا حیدر دوغلات کاشغری کی "تاریخ رشیدی"، مُلا نظام الدین کی "طبقاتِ اکبری"، "اکبر نامہ"، "آئینِ اکبری"، "مآثرِ رحیمی"، "مآثر الامراء"، "عمل صالح" اور "بادشاہ نامہ" کے علاوہ مُلا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کا نام لیا جا سکتا ہے، جو عرصۂ دراز تک پسِ پردہ رہا اور کشمیر کی تواریخ لکھنے والے بہت حد تک اس سے فیضیاب نہیں ہو سکے۔ قبل اِس کے کہ منتخب التواریخ کشمیر کے حالات اور واقعات کے سلسلے میں ماخذ کی صورت میں یا بطورِ ذکر ہمارا موضوع بحث بنے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف یعنی مُلا عبدالقادر بدایونی کے حالات اور کوائف پر نظر ڈالی جائے۔

عبدالقادر بدایونی جو تواریخی دائرے میں مُلا عبدالقادر بدایونی کے نام سے جانا جاتا اور مشہور ہے، ۹۴۸ھ (۱۵۴۲/۱۵۴۱ء) میں ہندوستان کے اُتر

پردیش صوبے کے مردم خیز شہر بدایوں یا بساور میں پیدا ہوا۔ اگرچہ بدایونی اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ بھی نہیں بتاتا، البتہ ایک واقعہ جو بدایونی اپنے متعلق کہتا ہے، اس بات کے متعلق جانکاری دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) میں جب میں اپنے والد کے ساتھ شیخ میاں حاتم سنبھلی[1] کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت میں عمر کے بارہویں سال میں تھا"۔

یہ بات واضح ثبوت ہے کہ بدایونی ۹۴۸ھ، مطابق ۱۵۴۱ء یا ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا[2]۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے والدِ محترم ملوک شاہ کی رُوحانی اور خدادوست شخصیات سے دِلی عقیدت تھی، اس وجہ سے اُن کی پیروی میں بدایونی بزرگوں کی خدمت میں رہتا تھا۔ اِن بزرگوں میں میاں حاتم سنبھلی خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔

بدایونی نے میاں حاتم کے لنگر خانے میں رہ کر قصیدۂ بُردہ اور "کنز فقہ حنفی" زبانی یاد کیا تھا۔ اس موقعے پر شیخ میاں حاتم نے بدایونی کو ٹوپی اور چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا شجرہ حفظ کرنے کے لئے عطا کئے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُلا عبدالقادر بدایونی کے والدِ محترم ملوک شاہ اہلِ دل بزرگ اور چشتیہ

---

1. سنبھل مراد آباد ضلع کا ایک اہم قصبہ ہے جہاں میونسپلٹی ہے، مغل دَور میں یہ دہلی صوبے کے ساتھ شامل تھا اور اسے "سرکارِ سنبھل" کہتے تھے۔
2. "مُلا"۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی برتر۔ اِس سے مُراد وہ شخص ہے جو علم میں برتر ہو۔ یعنی بہت بڑا عالم اور دانشمند۔ کچھ عرصہ قبل تک کی تواریخ میں مُلا لفظ ہندوستان، ایران اور افغانستان میں عام طور برگزیدہ عالموں اور مولویوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً نورالدین جامی، ملا صدرائے شہزادی اور مُلا عبدالقادر گوجواری۔

سلسلہ میں بیعت رکھتے تھے اور والدِ محترم کے واسطے بدآیونی کی یہی کیفیت تھی۔ میاں حاتم سنبھلی ۹۶۹ھ مطابق ۱۵۶۱ یا ۱۵۶۲ء میں رحلت کر گئے اور بدآیونی کے والدِ محترم کا سالِ وفات بھی یہی ہے۔''درویشِ دانشمند'' میاں حاتم کے اِنتقال کا مادۂ تاریخ ہے۔

زمانے کے رسم اور دستور کے مطابق مُلا عبدالقادر بدایونی کی تعلیم عربی اور فارسی زبانوں میں ہوئی جو مغل دَور میں فضیلت اور شان سمجھی جاتی تھی۔ مُلا نے فارسی کی دَرسی کتابوں کے علاوہ عربی میں فقہ، حدیث، اَدب اور شاعری میں دسترس حاصل کی۔ آگرہ میں انہوں نے مولانا مرزا سمرقندی سے اُمیر سید محمد ہمدانی، فرزندِ میر سیدعلی ہمدانی کی کتاب ''الشمسیہ'' کا کچھ حصہ پڑھا۔ عربی میں بدایونی کو اِس حد تک قدرت تھی کہ اُنہوں نے ۱۵۷۱ء میں شیخ سلیم چشتی کو اُن کے حج بیت اللہ سے واپسی پر فصیح اور بلیغ ایک طویل خط لکھا۔

حصولِ علم کے بعد مُلا عبدالقادر بدایونی، محمد حسین خان ٹکڑیہ[1] کی ملازمت میں داخل ہوا۔ یہ شخص شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر اعظم کی طرف سے پنجاب کے صوبے کا گورنر تھا۔ اِسی محمد حسین کے واسطے بدآیونی لاہور ضلع کے چاٹی گاؤں چلا آیا جہاں وہ ایک بلند مرتبت بزرگ شیخ داؤد کی خدمت سے فیضیاب ہوا۔ محمد حسین خان ٹکڑیہ ۹۸۳ھ مطابق ۱۵۷۰ء میں ایک لڑائی میں کام آیا۔ اس کے

[1] ''ٹکڑیہ'' محمد حسین خان یا یوں کہیے یا حسین خان کا لقب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے اپنے پنجاب صوبے کی حکومت کے دوران وہاں کے غیر مسلموں پر یہ لازم کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے الگ اپنی شناخت کے لئے اپنے لباس پر ''ٹکڑے'' یعنی پیوند لگائیں۔ اسی وجہ سے وہ ''ٹکڑ'' لقب سے مشہور ہو گیا۔ عبدالقادر بدایونی اسی حسین خان کا درباری تھا۔ حسین خان تین ہزار سواروں کا کماندار تھا۔ ۱۵۷۰ء میں وہ ایک لڑائی میں کام آیا۔

بعد ہی بدایونی نے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر اعظم کی نوکری اختیار کی جو بدآیونی کے ''منتخب التواریخ'' تصنیف کرنے یعنی ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۶ء تک جاری تھی۔

علمی دائرے کے اَندر بدایونیؒ دو کتابوں کا مصنف تھا۔ ایک ''نجات الرشید'' جو مذہب اور دینیات سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ''منتخب التواریخ'' ہے جو تین جلدوں میں ہے اور اسی پر مورّخ اور واقعہ نگار کی حیثیت سے اُس کی شہرت کا دارومدار ہے۔ یہ کتاب، اگرچہ جلال الدین محمد اکبر اعظم کے ابتدائی چالیس برسوں کے دورِ حکومت کا سیر حاصل مطالعہ ہے لیکن اس سے کشمیر میں ابتدائی مغل دور اور اس سے قبل کے تاریخی حالات پر قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے جس کا کسی قدر خلاصہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

منتخب التواریخ اور اس کی پوشیدگی:

بدایونی کا منتخب التواریخ عہد جہانگیر کے ابتدائی برسوں تک پوشیدہ رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدایونی اکبر کے نورتنوں میں سے ہونے کے باوجود اُس کی مذہبی پالیسی یا عملی طریقے کا سخت مخالف تھا۔ اس معاملے میں بدایونی راسخ العقیدہ تھا اور مذہبی روایت سے ذرا بھی انحراف لامذہبیت اور بے دینی سمجھتا تھا۔ اس اَمر کے زیرِ نظر ''منتخب التواریخ'' وصیت کے مطابق پوشیدہ رکھا گیا تھا کیونکہ اس کا منظرِ عام پر آنے سے نہ صرف اُس کی دَرباری ملازمت چلی جاتی بلکہ اُسے اکبر کے عتاب کا شکار بھی ہونا پڑتا۔ ''مراۃ العالم'' کے مصنف کے مطابق ''منتخب التواریخ'' جہانگیر کے ابتدائی اَیام یعنی ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ سنہ ''مآثر رحیمی'' کی تصنیف کا بھی ہے۔ وہ نہایت افسوس سے

لکھتا ہے کہ ''طبقاتِ اکبری'' اور ''اکبر نامہ'' کے بغیر فارسی میں (اُس وقت) کوئی بھی قابلِ اعتنا تواریخ موجود نہیں۔

اس کی پوشیدگی کا سبب غالباً یہ تھا کہ مُلا عبدالقادر بدایونی اُن اشخاص، جو اکبر کے دَورِ حکومت میں اہم اراکین تھے، کے بارے میں اپنے اظہارِ خیال سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ منتخب التواریخ کے تیسرے حصے کی ابتداء میں، جو اولیائے کرام اور عظیم مشائخین کے متعلق ایک تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے، رقمطراز ہے:

''پہلے میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ''تاریخِ نظامی'' کے مصنف نے ''تواریخ سلطنت'' کے پتے سے اپنے وقت کے شرفا کے حالات اور واقعات تحریر کیے ہیں جن میں سے بہت جہنم رسید ہو چکے ہیں لیکن میرے قلم کی زبان اُن بُرے اور نابکار اشخاص کے تذکرے سے آلودہ نہیں ہوسکتی۔ برعکس اِس کے میری اِس کتاب میں اہلِ دین اور پاک شخصیات کا تذکرہ ہوگا کیونکہ لچوں اور لفنگوں کی نسبت اولیائے کرام کا ذکر افضل اور اولیت کا مستحق ہے۔ ساتھ ہی بے جا دھمکیوں اور عذاب سے مبرّا رہوں گا۔ اُن لوگوں کے منہ پر کالک ہو جو لوگوں کی بے جا تعریفیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ظالموں کے شر سے محفوظ رکھے۔ یہ دونوں عربی کے مشہور مقولے ہیں جن میں سے پہلا مقولہ حدیث ہے اور دوسرا عام دُعا۔ اکبر کے دینِ الٰہی ماننے والوں کی کمینہ حرکات اور اُن کے ناپاک وجود سے زمانہ آلودہ ہوگیا ہے۔ اُن کے حروف بے مطلب اور خیالات بے ہودہ ہیں۔ کمینہ خصلت سے کمینہ خیالات جنم لیتے ہیں۔ وہ اشخاص جن کی برکات سے اکبر کا دورِ حکومت بامعنی تھا، ایک ایک کرکے غائب ہو چکے

ہیں جیسے عنقا[1] نے اپنا ٹھکانہ کوہِ قاف[2] میں میں بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے اُن اشخاص کا اتفاق رائے سے یہ فیصلہ تھا اکٹھے، ایک ہی وقت میں اِس زندگی کی دولت کو دوسرے عالم میں پہنچائیں گے''۔

مُلا عبدالقادر چوں کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ صوفیائے کرام اور عظیم مشائخین کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کے علاوہ وہ دینیات کا ایک زبردست عالم تھا۔ اس وجہ سے اکبر کے دینِ الٰہی کی سرگرمی سے تبلیغ کرنے والے اُس کی ذلالت اور حقارت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر بدایونی نے یہ شاہکار پسِ پردہ رکھا اُس کے انتقال کے بعد لگ بھگ ۲۰ سال بعد منظرِ عام پر آیا۔ اِس بات کا اظہار اُس نے خود یوں کیا ہے:

''خدارا یہ کارنامہ کچھ وقت تک بحفاظت رکھا جائے اور ان جیب کتروں سے بچا کے خدائی حفاظت میں دیا جائے۔ اس صورت میں انشاء اللہ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لچوں اور نامُرادوں کے ہاتھوں میں میری یہ تخلیق کبھی بھی نہیں پہنچ پائے گی''۔

---

[1] ایک قوی الجثہ جانور، جس کا وجود اَب غائب ہو چکا ہے۔ یہ جانور، جانوروں اور انسانوں کے بچے نگل لیتا تھا۔ یہ یمن کے قصبے ''رَس'' میں پایا جاتا تھا اور آخر پر ''حنظلہ بن صفوان علیہ السلام'' کی دُعا سے نابود ہوگیا۔

[2] پہاڑوں کا وہ دائرہ جس کے متعلق اہلِ مشرق کا خیال تھا کہ وہ زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے خیال کے مطابق کوہِ قاف جنوں اور دیوؤں کے رہنے کی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ کا سلسلہ زمرد کا ہے اور اسی سے آسمان کا رنگ نیلا ہے۔ فارسی میں ''از قاف تا قاف'' کا مطلب ساری دنیا ہے۔ ایران کے شمال میں جو کوہِ قفقاز ہے اس پر بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سعدیؔ کے مطابق عنقا کے رہنے کی جگہ بوستاں میں ہے لکھتے ہیں۔

چناں پہن خوانِ کرم گسترد ☆ کہ سیمرغ در قاف قسمت خورد

منتخب التواریخ اور کشمیر:

ملا عبدالقادر بدایونی کا ''منتخب التواریخ'' اگرچہ بنیادی طور پر اَپنے عہد کے ہم عصر کشمیر کی مفصّل تواریخ ہے تاہم اِس سے چوتھی اور پانچویں صدی ہجری (دسویں اور گیارھویں عیسوی) کی تواریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری (۳۹۷/۱۰۰۶ء) میں سلطان محمود مُلتان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اُس وقت راجہ آنند پال کا فرزند راجہ جے پال، سلطان کی پیش قدمی روکنے کے لئے سامنے آیا تھا لیکن شکست کھا کر کشمیر کے پہاڑوں میں چھپ گیا۔ سلطان نے ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء کشمیر کی فتح کے ارادے سے لوھر کوٹ[1] کے قلعے میں خیمہ زن تھا۔ لیکن شدید سردی اور لوہر کوٹ والوں کی ہمت کے باعث اُسے خالی ہاتھ غزنی کی طرف مراجعت کرنی پڑی۔ اس واقعے کے بعد دوبارہ سلطان محمود لوہر کوٹ آیا اور ایک مہینے کے مختصر گھیراو کے بعد اُسے لاہور کے راستے واپس غزنی لوٹنا پڑا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے دوران مغرب میں کشمیر کی جغرافیائی حدود پرنتس (موجودہ پونچھ) تک وسیع تھیں۔ ایک اور خاص بات جو البدایونی کے منتخب التواریخ سے بطور نتیجہ ہمارے سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں

---

[1] تواریخ کشمیر میں اس کے لئے لوہ کوٹ یعنی لوہے کا قلعہ استعمال کیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ قلعہ مضبوطی میں فولاد تھا اس وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا تھا۔ یہاں لوہر کوٹ سے علاقہ لورن مراد ہے جو پونچھ کے تحصیل حویلی سے ۱۵ میل شمال مشرق میں سلسلہ ہائے کوہ کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ راقم ۱۹۶۰ء میں پنچایتی انتخابات کے سلسلے میں وہاں گیا تھا۔ یہاں کے رہنے والے اکثر کشمیری ہیں جو تانترے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لورن کے متصل ''وند تانتریاں'' نام کا ایک گاؤں آباد ہے۔

صدی عیسوی) کے بجائے کشمیر کے لوگ اسلام سے قبل اَزیں واقف ہو چکے تھے کیونکہ بہت سے لوگ آب و ہوا خوشگوار ہونے کے باعث جنتِ کشمیر میں آباد ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں حضرت سید بلبل شاہ کی تشریف آوری دوسری ایک قابلِ دید لہر تھی جب کہ پہلی لہر اَپنا خاص اَثر نہیں دکھا سکی، اسی وجہ سے یہ تواریخ کی بھُول بھلیّوں میں کھو گئی ہے۔ ۴۲۴ھ (۱۰۳۴ء) میں ہم پھر سے کشمیر کا نام پڑھتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب سلطان محمود کا فرزند سلطان مسعود ہندوستان پر حملہ کرتا ہے اور کشمیر کے راستے میں ''سرتی قلعہ'' (یہ سموٹ یا سورن کوٹ[1] ہونا چاہئے) قصبے میں لیتا ہے۔

منتخب التواریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں حسرت خان گکھڑ، سلطان علی شاہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے جو کہ کشمیر کا حکمران تھا، جب وہ ٹھٹھ (سندھ) فتح کرنے کی مہم پر روانہ ہوتا ہے لیکن سلطان کی زبردست فوجوں کے سامنے وہ بُری طرح شکست کھا کر واپس بھاگ جاتا ہے۔ یہ شکست اُسے کشمیر کے ایک پہاڑی درّے میں ملتی ہے۔ کشمیر کے متعلق دیگر تواریخیں اِس واقعے کے بارے میں مکمل خاموش ہیں۔

منتخب التواریخ کشمیر میں مغل دَور کی زیادہ واضح اور برحق تواریخ ہے اور اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات کاشغری، ہمایوں بادشاہ کے مشورے سے کشمیر کی ملازمت پر فائز ہوا تھا اور خواجہ کلان کو ہدایت تھی کہ وہ مرزا کے مشوروں پر عمل کرے۔ اس سے یہ نتیجہ اَخذ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ وسط ایشیا سے آتے ہی کشمیر فتح کرنے کا اِرادہ دل میں بسائے

---

[1] سورن کوٹ یا سموٹ، تحصیل حویلی میں پونچھ سے ۱۴ میل مشرق میں پونچھ سڑک پر آباد ہے۔

ہوئے تھے۔ مرزا حیدر تب تک کشمیر پر قابض نہیں ہو سکا جب تک یہاں کے بعض رہنے والے اُس سے مِل نہیں گئے۔ لکھتے ہیں:

''جب مرزا حیدر نوشہرہ پہنچتا ہے پھر وہ اہلیانِ کشمیر کی رضامندی اور خوشنودی سے شہر میں داخل ہوتا ہے اور اِسے فتح کرتا ہے۔ اس موقع پر نیازی[1] قبیلے کی آنکھ کشمیر پر پڑ جاتی ہے لیکن کشمیریوں کی چالاکی اور ہوشیاری سے اُنہیں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بعض لوگ بھاگ کر کشمیر کے متصل پہاڑوں میں چھُپ جاتے ہیں''۔

ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق امرِ واقعہ یوں ہے کہ نیازی پٹھانوں کو دراصل کشمیریوں نے خود ہی راجوری پر اپنے ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ بعد میں اُنہیں بھٹکا کر اور کشمیر کے پہاڑی دروں کو بند کر کے انہیں ہلاک کروایا۔ مردوں کے شانہ بشانہ اگرچہ نیازی خواتین نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن سب لاحاصل رہا۔ اس واقعے کی نسبت بدایونی، مُلا شاہ محمد آبادی کی ''تاریخ کشمیر[2]'' کا حوالہ دیتا ہے۔

اِس موقع پر پہلی مرتبہ کشمیری شال کا ذکر آتا ہے۔ بدایونی کے مطابق بیرم خان نے کشمیر میں شال کا ایک خوبصورت لباس تیار کروا کے ایک ایسے درویش کو دیا تھا جس سے اُس کو بے حد عقیدت تھی۔

---

[1] نیازی غلوئی یا خلجی پٹھانوں کی ایک اہم شاخ ہے۔ یہ لوگ عام ہندوستان، افغانستان، اور وسطِ ایشیا کی ریاستوں اور شمالی ریاستوں میں تجارت کرتے ہیں اور برسوں سے اس پیشے سے مصروف ہیں۔

[2] کشمیر میں مغل دورِ حکومت سے قبل ''تاریخ کشمیر'' فارسی میں کشمیر کی سب سے قدیم تاریخ ہے۔ شاہ آباد جنوبی کشمیر کے اسلام آباد ضلع میں ایک اہم گاؤں ہے۔ اس گاؤں کو کشمیر میں سلطان بڈشاہ مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں آباد کیا تھا۔ اسی لئے اس کا نام شاہ آباد رکھا گیا تھا۔

''منتخب التواریخ''، کشمیر کے والی مرزا یوسف خان کے بھتیجے مرزا یادگار کی بغاوت کے متعلق ایک اہم سند ہے۔ اِس کے مطابق کشمیر میں جلال الدین محمد اکبر کے اِبتدائی نظامِ حکومت میں مرزا یوسف خان کشمیر کا صوبیدار تھا۔ دربار میں حاضری دینے کے لئے دہلی روانہ ہونے سے قبل اُس کے اپنے بھتیجے مرزا یادگار کو نائب بنا کر کشمیر میں رکھا تھا۔ قدرتی طور مرزا یادگار گنجا تھا۔ اسی وجہ سے اُسے ''یادگار کل'' کہتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق حکومت کا چوغہ، یادگار کے جسم پر تنگ ہو گیا تھا، اسی لئے مرزا یوسف خان کے کشمیر سے نکلتے ہی اُس نے خود کے سلطان کشمیر ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ بھمبر[1] پہنچ گیا تھا اور اُسے اس بات کی اطلاع موصول ہوئی۔ اُدھر مرزا یادگار جنگ کے ارادے سے ہیر پورہ[2] کے درّے پر پہنچ گیا لیکن آتے ہی جنگ کی تیاریوں کے بجائے شراب کے نشے میں بدمست ہو گیا۔ مرزا یوسف خان کے نوکروں کو جب یادگار کے اس ارادے کا پتہ چل گیا، انہوں نے بعض پٹھانوں سے، جو مرزا یادگار کے ساتھی تھے، ساز باز کر کے یادگار کا سر اُس کے جسم سے علیحدہ کر لیا۔ یہ سر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ بادشاہ نے یہ سر لاہور کے قلعے میں رکھوایا۔ بدایونی کے مطابق مرزا یادگار بیگ نے حکومت کا ڈھول صرف چالیس روز تک بجایا۔ ابوالفضل کے مطابق یہ خوشخبری سُننے کے وقت جلال الدین محمد اکبر کشتی میں راوی دریا کی سیر پر تھا۔ اس موقعے پر ابوالفضل کا یہ شعر اس واقعے

---

[1] راجوری اور پونچھ کے درمیان ایک چھوٹا موٹا پہاڑی گاؤں۔

[2] ہیر پورہ شوپیان سے آٹھ کلومیٹر جنوب میں ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک پنجاب سے کشمیر آنے والے راستے پر تھا۔ اس وجہ سے ہیر پورہ کی بڑی تواریخی اہمیت رہی ہے۔

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کلاہِ خسروی و تاجِ شاہی ☆ بہر کل کے اُسد حاشا و کلا

(بادشاہت کا کلاہ اور تاج کہاں ہر گنجے کے واسطے ہوتا ہے)

شعر میں لفظ ''کل'' اور ''کلا'' میں رعایت لفظی کی خوبصورت مناسبت زیرِ نظر رکھی گئی ہے جو کہ سبکِ ہندی میں ہندوستان کے فارسی شاعروں کا محبوب اور دِل پسند شغل رہا ہے۔

منتخب التواریخ میں بدآیونی لکھتا ہے کہ جلال الدین محمد اکبر نے کشمیر میں اَپنے نام پر بادشاہی[1] باغ بھی بنوایا تھا اور جب وہ ۶/محرم الحرام (منگلوار ۳/اکتوبر ۱۵۹۲ء) میں کشمیر آیا تھا۔ اور یہاں دو دن کم ایک مہینہ گزار کر پکھلی بارہ مولہ سے واپس روانہ ہوگیا۔ بارہ مولہ تک یہ سفر کشتی کے ذریعے تھا۔ اس موقعے پر زینہ لنک (جھیل وُلر) کی سیر سے لُطف اُٹھایا تھا۔ بدآیونی کے مطابق جھیل وُلر دو پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہے۔ ایک پہاڑ مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں۔ اس جھیل کا رقبہ تیس کروہ ہے اور دریائے کشمیر اس کے بیچ سے نکلتا ہے۔ سلطان زین العابدین نے زینہ لنک (جزیرہ) وُلر جھیل میں پتھر ڈال کر تعمیر کرایا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس نوعیت کی کوئی جھیل کسی جگہ موجود نہیں۔

منتخب التواریخ اور چک دورِ حکومت:

1. یہ باغ کوہ ماراں (ہاری پربت) کے دامن میں مشرق میں اُس جگہ واقع تھا جہاں کشمیر کی سنٹرل جیل ہے۔ البتہ یہ باغ مغرب میں ذرا بلندی پر تھا۔ اس کا صحیح محلِ وقوع ''چاہ وارث خان'' اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ یہ باغ خواجہ حسین کابلی کی نگرانی میں بنایا گیا تھا۔ اس باغ کا

مغل دَور کے تواریخ کشمیر کے علاوہ ملا عبدالقادر بدآیونی کا منتخب التواریخ کشمیر میں چک دورِ حکومت پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمال خان گھکھڑ نے ۹۶۵ھ (۱۵۵۸/۱۵۵۷ء) میں کشمیر کے حکمران علی خان چک پر حملہ کیا تھا لیکن شکست کھا کر اُسے بھاگنا پڑا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ ابوالمعالی جو سید مبارک خان بیہقی کا فرزند تھا، لوہر کوٹ میں قیدی تھا اور کسی طرح وہاں سے بھاگ کر کمال خان گھکھڑ سے مل گیا۔ دونوں کشمیر کے راجوری سرحد پر جمع ہوگئے تھے جہاں اُن سے کشمیر کے بعض باغی بھی آکر مل گئے لیکن علی خان چک کے مقابلے میں اُن کی ایک نہیں چلی اور خالی ہاتھوں واپس بھاگ گئے۔

اکبر کی فتحِ کشمیر میں شیخ یعقوب صَرفی کا حصہ:

عام خیال ہے کہ کشمیر میں یعقوب شاہ چک کے مظالم اور چیرہ دستیوں کی وجہ سے بعض کشمیری اکابرین اکبر کے دربار میں گئے تھے تاکہ کشمیر میں شیعہ حکومت ختم کر کے سُنی حکومت قائم کی جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلال الدین محمد اکبر ابتداء ہی سے کشمیر کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس مقصد کے لئے اُس نے پہلے ہی کشمیر کے بعض اَثر و رسوخ رکھنے والی شخصیتوں سے وعدہ کر رکھا تھا جن میں سے ایک ہستی شیخِ اُمم شیخ یعقوب صرفی کی تھی۔ شیخ یعقوب صَرفی کشمیر میں اکبر کی حکومت قائم ہونے سے بیس سال قبل اکبر کی حکومت میں رہ چکے تھے۔ اکبر کے دربار میں انہیں نورتنوں کا درجہ حاصل تھا۔ انہیں ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) سے ہی یعنی کشمیر میں اکبری حکومت قائم ہونے سے قبل اٹھارہ برس، دربارِ اکبری میں رسائی حاصل تھی۔ چنانچہ البدآیونی کہتا ہے کہ ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں خواجہ حسین مَروی نے بادشاہ کے جنم دن کے موقعے پر ایک توصیفی قصیدہ گزارا۔ اُس وقت

عینِ موقعے پر شیخ یعقوب صرفی کشمیری بھی پیچھے نہیں رہے اور بادشاہ کی توصیف میں اپنے قلم کا اسپ خوب دوڑایا لیکن بدقسمتی سے انعام خواجہ حسن مروی کو ملا۔

بدایونی کے مطابق اکبر بادشاہ کشمیر فتح کرنے کی شدید چاہت رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں کشمیر کے والی حسین شاہ چک کے نمائندے میرزا مقیم اصفہانی اور میر یعقوب کشمیری کو اس وجہ سے قتل کرایا کہ مؤخرالذکر نے قاضی حبیب کو زخمی کیا تھا۔ اس قتل کا فتویٰ کشمیر کے باہر کے مفتیوں نے دیا تھا۔ یہ دونوں اشخاص اکبر کے حکم سے فتح پور سیکری میں قتل کیے گئے تھے۔ اس قصے کی تفصیلات کے لئے بدایونی اپنی ایک کتاب ''خلاصۂ تاریخ کشمیر'' کی طرف رجوع کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ اس قتل کا فتویٰ صادر کرنے والوں میں مُلّا عبدالغنی قابل ذکر ہیں۔

بدایونی کے وقت میں کشمیر کا زعفران اور شال بطورِ تحفہ پنجاب اور ہندوستان روانہ کئے جاتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق مُلّا عشقی فارسی کا ایک صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اُس نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی اور ''خان'' لقب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ قاضی صدرالدین لاہوری نے اُسے اپنا وکیل بنا کر کشمیر کے والی علی خان چک کے پاس روانہ کیا تھا۔ واپسی پر کشمیر کے والی کا سفیر محمد قاسم کشمیر کے تحائف، جن میں زعفران اور کشمیری شال شامل تھے' اُسکے ہمراہ تھے۔

کشمیر فتح کرنے کے سلسلے میں بدایونی کا بیان:

۹۹۴ھ (۱۵۵۶ء) میں مُلّا عبدالقادر بدایونی فتح کشمیر کے وقت اس واقعے کا معتبر گواہ تھا۔ منتخب التواریخ میں ایک بیان کے مطابق بادشاہ کے حکم

---

[1] تبت خورد علاقہ کرگل اور تبت کلاں لداخ کو کہا جاتا ہے۔

سے محمد قاسم خان میر بحری[1]، فیل خانے کا محافظ فتح خان اور دیگر امیر اور سپہ سالار کشمیر کی مہم پر روانہ ہوئے۔ اس سے قبل یوسف شاہ چک یعنی کشمیر کا حکمران اکبر کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا اور اُسے راجہ بھگوانداس کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ بادشاہ یوسف شاہ چک کو قید خانے ہی میں مروانا چاہتا تھا لیکن بھگوانداس سامنے آیا اور اس اقدام کو سراسر وعدہ شکنی قرار دے کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن بے دین شیخ عبدالرحمان کے بھروسے پر اپنے اِرادے سے باز رہا۔ عین اسی موقعے پر یوسف شاہ چک کا فرزند، جو شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے پاس یرغمال تھا اور سرکاری خزانے سے تیس تا چالیس[2] روپے بطور تنخواہ حاصل کرتا تھا، کسی طرح قید سے رہا ہو کے کشمیر پہنچ گیا۔

یعقوب شاہ جوں ہی کشمیر پہنچا اُس نے لوگوں کی ایک جماعت کی اعانت سے قلعہ بندی شروع کی اور کہا کہ اُس کا باپ وفات پاچکا ہے۔ یعقوب شاہ اصل میں ایک اچھا[3] انسان نہیں تھا اسی وجہ سے اُس کے بعض ساتھی قاسم خان میر بحری کے ساتھ مل گئے اور کئی ایک نے کشمیر کی راجدھانی سرینگر میں بغاوت کی۔ یہ دیکھ کو یعقوب شاہ چک کشمیر سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کسی

---

[1] محمد قاسم خان میر بحری کا نام کشمیر میں ابھی جھیل ڈل کے علاقے میں ''میر بحری'' کے نام سے زندہ ہے۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے کا سکہ عہدِ اَبری میں بھی رائج تھا۔ یہ ''روپے'' کا سب سے قدیم حوالہ ہے

[3] بدایونی کے مطابق یعقوب شاہ کے اچھا آدمی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے وقت کے سُنی مفتی قاضی موسیٰ کو ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں انتہائی بے رحمی سے شہید کروایا۔ قاضی موسیٰ شہید کا مقبرہ آج بھی سری نگر کے ''ملہ کھاہ'' قبرستان میں ایک بلند چبوترے پر ہے۔ ''از آمد ایں موسیٰ شہید'' مادۂ تاریخ ہے۔

مزاحمت کے بغیر کشمیر میں داخل ہوئی۔ یعقوب خان بَددِل ہو کے پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے پھر حملہ کیا لیکن اس بار کراری شکست کھائی۔ آخر میں اُس نے آپ کو شاہی فوج کے حوالے کردیا اور ہندوستان روانہ ہوگیا۔ اکبر نے دونوں باپ بیٹوں کو بہار روانہ کیا جہاں دونوں نے تنہائی کی جیل میں رہ کر زندگی کی قید سے نجات پائی۔ بدایونی کے کہنے کے مطابق اکبر کشمیر فتح کرنے کے دوسرے سال یعنی ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) کشمیر کی سیر کے لئے روانہ ہوا۔ ۲۲ جمادی الثانی ۹۹۷ھ (سوموار ۲۸/اپریل ۱۵۸۹ء) اکبر تیسری مرتبہ کشمیر کی سیر کے لئے آیا لیکن کابل کے راستے سے۔ اس موقعے پر وہ اپنے ذاتی باغ میں داخل ہوا اور وہیں قیام کیا۔ بیگمات کو شہزادہ مراد[1] کے پاس بھمبر میں چھوڑ آیا۔ اس موقع پر فتح اللہ شیرازی جو بادشاہ کے ہمرکاب تھا، رحمتِ حق ہوگیا۔ اس کا مزار شہر کے نزدیک تختِ سلیمان[2] کی پہاڑی کے دامن میں سید عبداللہ چوگان بیگی کی قبر کے ساتھ ہی ہے۔ ملک الشعراء فیضی نے شاہ فتح اللہ کی وفات پر ایک ترکیب بند مرثیہ[3] لکھا تھا۔

---

[1] یہی شہزادہ مراد آباد، اُتر پردیش، کے شہزادہ کا بانی ہے اور میرٹھ اور دہلی کے درمیان مرادنگر قصبے کا بھی

[2] واضح ہوتا ہے کہ شنکر آچاریہ پہاڑی دورِ اکبری میں بھی تخت سلیمان کے نام سے مشہور تھی۔ کوہِ تختِ سلیمان کا دامن کشمیر کے شہمیری دور میں بھی مسلمانوں کے قبرستان کی صورت میں استعمال ہوتا تھا۔ سلطان حسن شاہ کے عہد کے بزرگ بابا اسماعیل زاہد نے اپنا باغ رینہ واری مقبرۂ عام اہل اسلام کے لئے وقف کردیا تھا۔

[3] اس موقعے پر فیضی نے کشمیر کی تعریف میں ایک قصیدہ پیش کیا تھا جس کے ابتدائی اشعار یوں تھے۔

ہزار قافلۂ عیش مے کشد شب گیر — کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر
دریں دیار مغنی ترانہ ساز مگن — بس است از لب مرغان نغمہ سنج سفیر

یہ قصیدہ ۱۰۴۵ بیتوں پر مشتمل ہے اور اکبر نامہ میں درج ہے

کشمیر کے عجائبات:

ملا عبدالقادر بدایونی کا منتخب التواریخ کشمیر کے عجائبات پر روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ ملا بدایونی لکھتا ہے کہ خامپورہ میں ایک مغل سپاہی نے ایک حساس پیڑ کا مشاہدہ کیا۔ پیڑ کی چوڑائی ۱۸ سے ۲۲/انچ تک تھی اور اونچائی ایک گز۔ اس کی شاخیں مجنون پیڑ کی طرح (یعنی جھکی ہوئی) تھیں۔ اگر اس کی ایک شاخ ہلائی جاتی تو پورا پیڑ حرکت میں آجاتا۔ اس موقع پر بدایونی شاہ فتح اللہ شیرازی کا حوالہ دیتا ہے جس نے کشمیر کے عجائبات تفصیل سے ترتیب دیئے تھے اور بعد میں انہوں نے ابوالفضل کے ''اکبر نامہ'' میں جگہ حاصل کرلی۔

کشمیر کی تواریخ کا دُوبارہ لکھا جانا اور اس کا خلاصہ:

۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں جلال الدین محمد اکبر، ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیتا ہے کہ وہ کشمیر کی تواریخ ازسرِ نو مرتب کرے۔ اس واقعے کو بدایونی اپنی زبان میں یوں دہراتا ہے:

''اُس وقت' یعنی ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں مجھے شہنشاہ کی طرف سے حکم ملا کہ میں سہل اور آسان اسلوب میں کشمیر کی وہ تواریخ دوبارہ لکھوں جو ملا شاہ آبادی نے، جو ایک عالم اور علوم وفنون کا گلدستہ تھا، اور شاہی فرمان کے مطابق ''تاریخ کشمیر'' کا فارسی[1] ترجمہ کیا تھا۔ اس فرمان کے مطابق میں نے دو مہینوں کی مدت میں اس کا خلاصہ لکھ کر تیار کیا۔ آخر پر یہ شعر ہے۔

بحکم شاہ در مدت دو ماہ ☆ شدہ تاریخ ایں تحریر ہمدم''

(بادشاہ کے فرمان سے دو مہینوں کی مدت میں اس تحریر کی تاریخ لکھی گئی)

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی کا فارسی ترجمہ دراصل شاہ محمد آبادی کے فارسی ترجمے کی تصحیح اور جدید ترتیب تھی۔ ورنہ راج ترنگنی کا اصل ترجمہ کار، عام خیال کے مطابق مولانا عماد الدین تھا۔

اِس کے چار سال بعد ۱۰۰۳ھ (جمعرات، ۸ مئی ۱۵۹۵ء) کو بادشاہ کی طرف سے فرمان جاری ہوتا ہے کہ میں ہندوؤں کا وہ باقی ماندہ حصہ ترجمہ اور تکمیل کروں جس کا کچھ حصہ کشمیر کے والی سلطان زین العابدین کے حکم سے "بحرالاسمار" (باتوں کا سمندر) کے عنوان سے ترجمہ ہوا تھا[1]۔ اس کتاب کا بہت سا حصہ بغیر ترجمے کے تھا۔ اسی وجہ سے فرمان آیا کہ کتاب کی آخری جلد جو سات چیزوں پر مشتمل تھا، کا میں ترجمہ کروں۔ میں نے یہ بھاری کام صرف پانچ مہینوں میں ختم کیا۔ ان ہی دنوں جب میں ترجمہ کرنے میں مصروف تھا، شہنشاہ نے مجھے اپنے پلنگ کے دائیں طرف بٹھایا اور "بحرالاسمار" کی باتیں سُنیں۔ اِرشاد ہوا کہ جلد اوّل، جس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کروایا تھا، قدیم فارسی میں ہے جس وجہ سے اِسے سمجھنے میں دِقتیں پیش آرہی ہیں۔ کیا تم اسے آسان فارسی میں منتقل کرسکتے ہو؟ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مُسوّدہ بھی زیرِنظر رہنا چاہئے جو قبل ازیں ترجمہ ہوا ہے۔ میں یہ خدمت عاجزی کے ساتھ بجالایا اور کام شروع کردیا۔ بادشاہ نے اس خدمت کے عوض مجھے دس ہزار تنکہ[2] (ٹکہ) دیئے جو کہ چھوٹے سکوں میں تھے اور ایک گھوڑا انعام میں دے دیا، مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ میں یہ کام دو تین مہینوں میں انجام کو پہنچاؤں گا"۔

شیخ یعقوب صرفیؒ کے ساتھ بدآیونی کے خاص تعلقات:

کشمیر کی دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کی وہ شخصیت

[1] یہ ترجمہ مُلا احمد کشمیری نے کیا تھا جو بادشاہ کا خاص درباری تھا۔ اس مجموعے سے شاید بدآیونی کی مراد ویدویاس کی تصنیف مہابھارت ہے۔ ہوسکتا ہے راج ترنگنی مراد رہی ہو جو اصل میں سنسکرت میں کلھن (کلیان) پنڈت کی تصنیف ہے۔

[2] اس نام کا سکہ آج بھی بنگلہ دیش میں چلتا ہے اور اس کا مول روپے کے برابر ہے۔

جس کے حالات پر بدآیونی کا "منتخب التواریخ" خاص طور سے روشنی ڈالتا ہے، وہ شخصیت شیخ اُمم شیخ یعقوب صرفی کی ہے جو ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء) میں رحلت کرگئے۔ بدآیونی کے کہنے کے مطابق شیخ اُمم شیخ یعقوب صرفی کشمیری، بزرگی اور علم کا سنگھم تھے۔ آپ شیخ حسین خوارزمی کے رُوحانی خلیفہ اور جانشین تھے۔ انہیں حاجی الحرمین ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ شیخ ابن حجر مکی کے پاس درسِ حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ عربی شیخ کا لباس زیب تن کرکے فارس اور شام کا سفر بھی کیا تھا اور وہاں کے جیّد عالموں کی صحبت بھی حاصل ہوئی تھی۔ کشمیر اور ہندوستان میں اُن کے بہت سے مرید تھے۔ آپ بہت سی اعلیٰ پایہ اور شاندار کتابوں کے مصنّف تھے۔ نظامی گنجوی کی متابعت میں خمسہ (پانچ مثنویوں کا مجموعہ) منظوم کیا۔ "معما" پر بہت سے مقالے لکھے اور تشریح کے ساتھ رباعیاں لکھیں جو تصوّف کے رنگ میں ہیں۔ اُن تصانیف کا بیان چند سطروں میں کرنا کافی نہیں۔ علم کے جملہ شعبوں میں نامادار اور قابلِ اعتماد تھے۔ ان علوم کا تعلق تفسیر، عربی علم اور تصوف کے ساتھ ہے۔ آپ ایک باوثوق مذہبی پیشوا تھے۔ رحمتِ حق ہوجانے سے قبل کچھ عرصہ پہلے قرآنِ شریف کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ مکمل نہیں ہوسکی۔ موجودہ اور گزرے ہوئے شہنشاہ (یعنی ہمایوں) کے نزدیک اور قابلِ اعتماد تھے۔ یہ دونوں اُن کے ساتھ عزت اور احترام سے پیش آئے تھے۔ دونوں نے اُن کو اپنا درباری بنایا تھا۔ شیخ یعقوب صرفی ہم عصر کشمیریوں میں زیادہ سخی تھے۔ اس قول کے پیشِ نظر کہ "شاعری عالم نہیں ہوتی" اگر وہ شاعری میں کمزور بھی تھے تاہم اس جانب توجہ دیتے تھے۔ لاہور سے اپنے وطنِ عزیز جاتے ہوئے شیخ نے مجھے دریائے راوی کے اُس پار بہت دور سے ایک

خط لکھا تھا جو میں نے ایک عزیز اور بے بہا نشانی جان کر نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرے مددگار اور طاقت والے، راسخ دوستی کی دُعا اور سلام کے بعد میں آپ کے آفتاب جیسے روشن قلب مبارک پر یہ بات واضح کرتا ہوں کہ دوستی کا تقاضا تھا کہ آپ اپنے دوست کو صحیح راستہ دکھاتے لیکن موجودہ حالات میں آپ یہ کام اُنجام نہیں دے سکے۔ باوجود اس کے مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے نہیں بھولیں گے اور غائبانہ طور یاد کرنے کی عادت قائم رکھیں گے۔ اگر آپ کو مُسوّدات کے لئے کشمیری کاغذ کی حاجت ہے تو مجھے لکھئے تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیروں کا مُسوّدہ پیش کرسکوں۔ اس کاغذ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی روشنائی دھوئی جاسکتی ہے اور کاغذ پر کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ فقط والسلام، والاکرام''

کشمیر پہنچ کر شیخ یعقوب صرفیؒ نے مجھے دوسرا خط لکھا یہ اُن کا آخری خط تھا اور یہاں میں اس کی نقل پیش کر رہا ہوں۔

''سخی شیخ عبدالقادر کی خدمت میں، جو تمام تعریفوں سے آزاد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہمارے پیشوا اور علم میں ہمارے امام ہیں۔ بدایونی واقعتاً علم میں دوّانی[1] سے آگے نکل گئے ہیں۔ جہاں تک اُن کے نام وقتاً فوقتاً میرے خطوط لکھنے کا تعلق ہے، یہ جان کر کہ یہ لاجواب ہیں، تاہم ایک مخلص دوست کا قلم جواب سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ نواب فیضی فیاضی کے حجرے میں بیٹھے ہوئے ظریفانہ گفتگو میں محو ہوں گے۔ اُس وقت وہ مجھے غم اور مصیبت کے قیدی کو ضرور یاد کریں

---

[1] اشارہ جلال الدین محمد بن کازونی دوّانی صدیقی کی طرف ہے جو ۹۰۲ھ (۱۴۹۶/۱۴۹۷ء) میں فوت ہوا۔ وہ فلسفے اور منطق کے بہت بڑے عالم تھے جن سے ایک سو سے زیادہ کتابیں منسوب ہیں۔ یہاں شیخ یعقوب صرفی نے تکلف سے بدایونی اور دوانی میں رعایت لفظی سے کھیلا ہے۔

گے۔ براہِ کرم اپنے نیک اور معزز فرزند محی الدین کے لئے میرا آداب قبول کیجئے۔ مجھے اُمید ہے کہ میراں سید قطب الدّین کی طرح آپ میرے خط کے جواب میں لاپرواہی نہیں کریں گے۔ کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ میرے پاس نظموں کی وہ نقل رہی ہے جو میں نے آصف خانی انداز میں لکھا تھا جس میں وہ بیان کیا گیا جو قبل ازیں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ کیا آپ جیسے عزت مند دوستوں نے مجھ سے اس کی نقل حاصل کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے اس نقل کی نقل بھیج دیں۔ اگر خط کا جواب دیں تو بہت ہی اچھا ہوگا''۔

شیخ عبدالقادر اس خط کا جواب یوں دیتے ہیں:

''میں کیسے آپ کی تعریف کرسکتا ہوں جب آپ شیخ عبدالقادر کے سُبک اور بے مزہ اُسلوب سے بالکل لاپرواہ ہیں اور جو شخص آپ کی فصاحت (بلند بیانی) اور میرے اُسلوب میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کرے وہ اصلی سمندر کو کوزے میں سمونا چاہتا ہے (یہاں ایک فارسی رباعی ہے جسے جان بوجھ کر چھوڑا گیا ہے)۔

جب سے آپ اپنے وطنِ عزیز کی طرف مراجعت کرگئے ہیں، جہاں آپ رہتے ہیں تب سے غیبی راز کے ترجمان نے بڑا دن آنے سے قبل اور اس کے بعد مجھے شاد اور خوش کیا ہے (رباعی) جہاں تک میرے حجرے کی خوشبو اور گھاس کا تعلق ہے، جس کا ذکر آپ نے کیا ہے، یہ خوشبو اِن اشعار نے میرے دل میں لائی ہے............

بادشاہ سلامت جو بلندی اور رتبے میں آفتاب ہیں، نے میری طرف سے کسی درخواست کے بغیر ہی اپنی زبان مبارک سے اجمیر کے عالی مرتبت علاقے میں واقع درگاہ (مراد خواجہ معین الدین اجمیری کا



ریاست پونچھ کے سنہری دور کا راجہ رُستم خان (87-1760)



خطہ پیر پنجال......جس کے دامن میں علاقہ پونچھ اور راجوری واقع ہیں



پونچھ کا شاہی قلعہ........

جو مسلم دور (1596-1787)، سکھ دور (1819-46) اور ڈوگرہ دور حکومت (1852-1947) میں تعمیر ہوا۔



آستانۂ مبارک ہے) کا ولی بنانے کے سلسلے میں میرا نام لیا ہے۔ تاہم ابھی اس عہدے پر فائز نہیں ہوا[1] ہوں۔ امید ہے کہ یہ عہدہ ضرور غائب کے پردے سے ظاہر ہوگا۔ تب میرا دل روزمرہ زندگی کے چکروں سے اور ہر ملک کی ناخوشگواری سے آزاد ہوگا۔ اور میری زندگی سچائی کی چھاؤں بن جائے گی۔ اس موقعے پر دنیاوی مال میل (یعنی گندگی) ہوگا اور وقت کا برفیلا پانی ایک سراب (دھوکہ) میری بدنصیبی مجھ سے یہ اشارے کہلواتی ہے۔ آپ کے خیرخواہ کا نظریہ یہ ہے کہ دینی اور روحانی کاموں میں آپ میری امداد کریں تا کہ جو اجمیر جائے وہ کشمیر کو یاد کرے جس کا وزن "اجمیر[2]" سے ملتا ہے۔ دونوں شادمانی کے مرکز یا محور ہیں کہ ایک سرا شمالی ہے دوسرا جنوبی۔ جیسے آپ کشمیر میں "جھالرا[3]" چشمے کا برفیلا پانی نوش کرتے رہے ہوں گے اور عین اُسی موقعے پر میں اپنے محسن کے نتھارے ہوئے پانی کے شکرانے کے ساتھ زبان تازہ کر رہا ہوں گا۔ آپ کے نوکر کا فرزند محی الدین[4] بدایوں چلا گیا ہے جہاں وہ آپ کے حق میں دعائے خیر میں مصروف ہے۔ اللہ کرے آپ کا بلند سایہ کبھی کم نہ ہو۔

تحریر ؟ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء)"

شیخ یعقوب صرفی پر تنقید:

بلاشبہ ملا عبدالقادر بدایونی ایک مخلص دوست کی حیثیت سے شیخ یعقوب

---

۱ اُمید اور خوش خیال کے باوجود ملا عبدالقادر بدایونی درگاہِ اجمیر کی ولایت حاصل نہیں کر سکے۔ شاید مخالفوں کے کہنے پر اکبر نے یہ خیال بدل دیا تھا۔

۲ بدایونی تکلف کر کے اجمیر کا وزن کشمیر سے ملانے کی کوشش کرتا ہے جب کہ صحیح تلفظ "اجمیر" "مونگھیر" کے وزن کے برابر ہے۔

۳ کشمیر میں "جھالرا" نام کا کوئی چشمہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ شاید بدایونی کی مراد جھیل ولر رہا ہوگا

۴ یہ بدایونی کے فرزند کا نام تھا۔

صرفی کا دل سے احترام کرتے تھے لیکن اکبر کے دینِ الٰہی کی کھُل کر مخالفت نہ کرنے کی وجہ سے بدایونی، شیخ یعقوب صرفی کی تنقید سے باز نہیں رہے۔ آخر پر بدایونی، جناب شیخ کے متعلق رقمطراز ہیں:

"مختصر بات یہ ہے کہ جناب شیخ اتنے بُلند و بالا تھے کہ اُن کے وصف تحریر میں سموئے نہیں جا سکتے۔ جو بلند پایہ کارنامے شیخ نے اُپنے پیچھے چھوڑے ہیں وہ روزِ قیامت تک گِنے جائیں گے۔ ۱۸/ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ (منگلوار ۱۵ جولائی ۱۵۹۵ء) کو اُنکی رُوح کا جانور جس کا آشیانہ تقدس تھا، دُنیا کے محدود پنجرے سے نکل گیا اور آزاد فضا میں پرواز کی۔ شیخ اُمم بُود۔ کے الفاظ اُن کا سنۂ وفات نکلتا ہے۔"

ملا مظہری کشمیری:

کشمیر کی دوسری اہم شخصیت جس کا منتخب التواریخ (از بدایونی) ذکر کرتا ہے، ملا مظہری کشمیری کا ہے۔ اس کے متعلق لکھتا ہے:

"مظہری کشمیری نے دیوان مرتب کیا ہے اور اپنے ہی ملک میں سرکاری خدمت[1] پر مقرر رہے"۔

کشمیر اور باہر کے ملکوں کے لوگ:

ملا عبدالقادر بدایونی کا منتخب التواریخ اُن اشخاص کے متعلق خاص طور

---

۱ "آئینِ اکبری" جلد ۱، ص ۵۸۴ میں مظہری کا ذکر اِن الفاظ میں ہے:

"بچپن ہی سے مظہری شعر کہتا تھا۔ طویل مدت تک عراق میں رہا۔ نیک لوگوں کی صحبت میں نیک اوصاف پیدا ہو گئے تھے۔ داغستانی کے مطابق عراق میں مظہری، محتشم اور وحشی کا رفیق تھا۔ ہندوستان آنے پر اکبر نے اُسے میر بحری کا عہدہ دے کر سرفراز کیا۔ سرکاری خدمت پر مقرر کرنے کا بدایونی کا اشارہ اسی طرف ہے۔ مظہری شیعہ ہو گیا تھا لیکن اصل میں سنی تھا۔ اس وجہ سے دونوں میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ روایت کے مطابق مظہری

سے سند ہے جو عہدِ اکبری یا اِس سے قبل ہندوستان یا دوسرے ممالک سے کشمیر آئے۔ یہ لوگ یوں ہیں:

۱/شیخ عارؔفی حسینی:

شیخ عارؔفی حسینی، ایران کے والی شاہ اسماعیل کا پوتا تھا اور جادوگری کا بڑا ماہر تھا۔ اس سے بہت سے کارِ جادوگری منسوب ہیں۔

پنجاب میں جب شیخ عارؔفی حسینی کا ٹھیک طرح سے استقبال نہیں کیا گیا تو یہ شخص کشمیر کے والی علی خان چک کے پاس چلا گیا (۹۷۱-۹۸۶ھ/۱۵۶۳-۱۵۷۸ء) علی خان چک نے اپنی بیٹی اُس کے نکاح میں دی لیکن جب اُس نے مشاہدہ کیا کہ شیخ عارؔفی ایک کے بعد دوسرا بہانہ کرتا ہے یعنی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اُس نے بیٹی کا مہر واجب کیا اور طلاق حاصل کی۔ یہاں سے عارؔفی تبت چلا گیا۔ پہلی مرتبہ جب بادشاہ (اکبر) کشمیر سے کابل چلا گیا تو سیاحت کے دوران اُس کی ملاقات عارؔفی سے ہوئی۔ بادشاہ نے جعلسازی اور فریب کاری کی وجہ سے اُس پر نگراں مقرر کیئے تھے۔ شاہ عارؔفی حسینی ہمیشہ چہرے پر نقاب لگائے رہتا تھا۔ ایک روز اکبر کے سامنے حکیم ابوالفتح نے اس کی نقاب اُلٹ دی۔ یہ بات عارؔفی کو... ناگوار گذری۔ کہا کہ نقاب اُلٹ کے تم نے میرا چہرہ دیکھ لیا ہے لہٰذا جان لو تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ اس واقعے کے پندرہ روز بعد حکیم ابوالفتح جگر کی بیماری میں مبتلا ہو کے وفات پا گیا۔

۲/میر فتح اللہ شیرازی:

یہ شیراز کا رہنے والا تھا اور اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا۔ میر فتح اللہ شیرازی کشمیر کے اندر ہی ۹۹۷ھ (۱۵۸۸/۱۵۸۹ء) وفات پا گیا۔ ''تختِ

سلیمان'' نامی جگہ پر دفن[1] کیا گیا۔ ''فرشتہ بود[2]'' (فرشتہ تھا) مادۂ تاریخ ہے۔

۳/اُلفتی عراقی:

اُلفتی کچھ وقت تک مرزا یوسف خان کے ہمراہ کشمیر میں تھا۔ اس شہر کے لوگوں پر، جس میں وہ رہتا تھا، اُس نے ایک نظم بھی لکھی ہے[3]۔

۴/جعفر بیگ:

آصف خان قزوینی کے نام سے مشہور تھا اور غیاث الدین علی کا بھائی تھا۔ یہ شخص سوات کا تھانیدار، کشمیر کا گورنر اور دیوانِ کُل اور بہار کا صوبے دار رہا تھا۔

۵/شاہ ابوالمعالی:

ہمایوں کے امیروں اور اراکینِ سلطنت میں تھا۔ اس کا خاندان کاشغر کے امیروں میں سے تھا۔ اکبر کی بادشاہت کے ابتدائی ایام میں لاہور میں قید تھا۔ وہاں سے بھاگ کر کمال خان گھکھڑ کے پاس چلا گیا اور اُسے کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی لیکن ناکام رہا۔

۶/طالب اصفہانی:

بدایونی کے مطابق طالب اصفہانی بہت عرصے تک کشمیر میں مقیم تھا۔ اوّل اوّل مذہبی فقیر اور بعد میں سرکاری افسر۔ طالب اصفہانی کشمیر سے تبت

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اکبری دور میں بھی دامنِ کوہ تختِ سلیمان قبرستان کی صورت میں استعمال ہوتا تھا اور اس کو شنکر آچاریہ پہاڑی کے بجائے 'کوہِ تختِ سلیمان' کہا جاتا تھا۔ مُلا احمد کشمیری جو زین العابدین کا ہمکال تھا، اُسکے بعد ملا عبدالقادر بدایونی دوسرا تاریخ دان ہے جس نے تختِ سلیمان کا نام استعمال کیا ہے۔ یہ پہاڑی سری نگر کے بالکل متصل مشرق میں زبروَن کی گود میں واقع ہے۔

[2] ۴+۶+۲+۵+۴۰۰+۳۰۰+۲۰۰+۸۰=۹۹۷ ہجری

[3] اُلفتی کی یہ نظم اِس وقت امتدادِ زمانہ کی وجہ سے نایاب ہے۔

کے والی علی رائے کے پاس سفیر کی حیثیت سے روانہ ہوا تھا۔ واپس لوٹ کے تبت کے عجائبات پر ایک روئیداد ترتیب دی تھی جو ابوالفضل نے اکبر نامہ میں درج کی ہے۔ بدآیونی کے مطابق طالب آصفہانی ایک بامُروّت اور رحم دل اِنسان تھا۔ اُس کا شاعرانہ ذوق اور نثر نگاری قابلِ دید ہے۔

۷۔ میرزا علی خان:

ہمایوں کے ایک امیر، محترم بیگ خان کا فرزند تھا۔ میرزا علی خان ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں کشمیر میں اُس وقت مارا گیا جب میر بحری قاسم خان کی زیرِ قیادت مغل افواج نے یعقوب شاہ چک کے حمایتیوں پر شب خون مارا تھا۔

۸۔ نشآئی:

یہ مولانا حسین نقشی دہلوی کا فرزند تھا۔ نشآنی کا اصل نام مولانا علی احمد تھا۔ یہ شخص مہریں بناتا تھا لیکن ساتھ ہی عالمِ بے بدل اور بڑے شہزادے کا اتالیق تھا۔ لاہور سے نشآئی نے شیخ یعقوب صرفی کو ایک خط لکھا تھا۔ نشآئی کبھی کشمیر نہیں گیا۔ لیکن ایک کشمیری (غالباً شیخ یعقوب صرفی) کے ساتھ اُس کے اچھے تعلقات تھے۔

۹۔ جعفر:

''نہانی'' نام کی ایک خاتون کا فرزند تھا۔ یہ خاتون آگرہ میں رہتی تھی۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق ''جعفر'' کشمیر میں ''احدی'' کے عہدے پر فائز تھا۔ میر بحری کی خدمت اُس کے سپرد تھی۔ یہ ایک قابل جوان تھا۔

۱۰۔ وقوعی نیشاپوری:

نام محمد شریف اور وقوعی تخلص تھا۔ نیشاپور (ایران) کا رہنے والا تھا۔ یہ

شخص اَز حد لامذہب تھا۔ گردشِ لیل والنہار کا معتقد تھا۔ تناسخ یعنی آواگون بھی مانتا تھا۔ بدایونی کے مطابق ایک روز وقوعی نے بھمبر، جو کشمیر کی پہاڑی زمین کی سرحد پر واقع ہے، مجھ سے گزارش کی کہ میں اُسکے ساتھ (وقوعی کے ساتھ) کشمیر جاؤں۔ جب اسکی نظر پہاڑوں اور چٹانوں پر پڑی تو غمناک آواز میں کہا کہ یہ بدقسمت اِس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ انسانی شکل میں تبدیل ہو جائیں۔

..........☆..........

مختصر یہ کہ ملا عبدالقادر بدآیونی کا منتخب التواریخ اگرچہ بنیادی طور عام ہندوستان، خاص طور اکبری دور کے ابتدائی چالیس برسوں کی تواریخ ہے، جس کے اختتام پر ہندوستان کے پُرعزم اور باعظمت بزرگوں کے حالات وغیرہ درج ہیں تاہم اس کے باضابطہ مطالعے سے امیر تیمور کے زمانے سے ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۶ء) تک کشمیر کے سیاسی حالات اور یہاں کے بڑے بزرگوں کے حالات کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

کشمیر میں اکبری دور کے مورّخ کے لئے ضروری ہے کہ اوّل درجے پر دستیاب ماخذ کی صورت میں وہ بدآیونی کا منتخب التواریخ ضرور زیرِ نظر رکھے۔ ورنہ اُس کا بیان بہت حد تک سچائی سے خالی ہوگا۔ بدآیونی کا منتخب التواریخ ماہِ صفر ۱۰۰۴ھ (ستمبر-اکتوبر ۱۵۹۶ء) میں مکمل ہوا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق منتخب التواریخ میں بیان کردہ واقعات بحرِ عمان کا ایک بُلبلہ اور بارش کا ایک قطرہ ہیں۔ اس کا اِرادہ ''تاریخِ کشمیر'' مکمل کرنے کا تھا لیکن رقم کر گیا تاریخِ ہند!

..........☆..........

کے-ڈی-مینی ☆

راجوری اور پونچھ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں

خطہ پیر پنچال، بانہال درّے سے شروع ہو کر علاقہ راجوری اور پونچھ سے ہوتا ہوا اُوڑی اور مظفر آباد تک کے تمام علاقوں پر مشتمل ہے جس کی لمبائی ۲۴۰ کلومیٹر اور چوڑائی ۹۰ کلومیٹر کے آس پاس ہے۔ یہ علاقہ سلسلہ ہائے کوہ پیر پنچال کے چناب اور جنوب مغربی ڈھلوانوں، وادیوں، تلہٹیوں اور چھوٹی چھوٹی تنگ گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔ ۳۲۶ ق م میں سکندر کے حملہ کے وقت اُس کے ساتھ آنے والے مؤرخوں سڑبو اور آریانہ نے اپنے سفرناموں میں شمالی ہندوستان میں تین اہم ریاستوں یعنی تکشلا، ہزارہ اور ابھیسارہ کا ذکر کیا ہے جبکہ ابھیسارہ کو ایک چھوٹی پہاڑی ریاست بتایا ہے۔ آج کے مورخ ابھیسارہ ریاست کی نشاندہی دریائے چناب اور دریائے جہلم کے تمام بالائی پہاڑی علاقوں کی کرتے ہیں جو وادئ کشمیر کے جنوب اور جنوب مغرب میں واقع تھے۔ جناب ایس اے سٹین، جنہوں نے راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اپنے ایک نوٹ میں اس خطہ کو راجوری پونچھ کوٹلی اور بھمبر کے علاقے دان گلے تک

☆ پونچھ (جے اینڈ کے)

تک بتاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد جب حد متصارقہ خطۂ پیر پنچال کے درمیان قائم ہو تو اس خطہ کے بھمبر کوٹلی، پونچھ کی تحصیل باغ سندھتی اور مظفر آباد سرحد کے اُس پار چلے گئے جبکہ سرحد کے اس طرف راجوری کے علاقہ بدھل، کالا کوٹ، نوشہرہ، سندربنی، راجوری، تھنہ منڈی، درہال اور ضلع پونچھ کے علاقہ مینڈھر، حویلی، سرن کوٹ اور منڈی پڑتے ہیں۔

پیر پنچال خطہ قدیم زمانے سے جغرافیائی حالات کے پیشِ نظر کشمیر کا قدرتی محافظ اور نگہبان مانا جاتا رہا ہے اور اس کی ڈھلوانوں، تلہٹوں اور وادیوں پر محیط علاقہ راجوری پونچھ قدرتی حُسن، دلکش مناظر اور ست رنگے موسمی حالات کے لئے بھی مشہور ہے۔ برف کی دستاریں سجائے ہوئے بلند و بالا پہاڑی سلسلے، جہاں ذوقِ نظر کی تسکین کا باعث ہیں وہیں پہاڑوں کی کوکھ سے جنم لینے والے ندی نالے، جھرنے، جھیلیں اور آبشاریں اس علاقے کو زیبائی عطا کرتی ہیں۔ ڈھلوانوں پر تنگ دیودار اور چیڑ کے جنگل باوردی سپاہیوں کی طرح صف در صف کھڑے نظر آتے ہیں تو سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ سے بلند پہاڑی چوٹیوں کے درمیان واقع ڈھوکیں، مرگیں، بہکیں اور چراگاہیں سبزہ کی نرم نرم دُمب اور رنگ برنگے خوشبودار پھوں کے باعث کسی قالین کی طرح خوبصورت اور فطرت کے انمول حُسن کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اُدھر پہاڑوں کی آغوش میں بجی سنوری وادیاں آزاد طبیعت، بے ساختہ، بانکے اور بہادر عوام کی بستیاں اُن کے رنگ رنگیلے مشغلے اور موج میلے منفرد تہذیبی اور ثقافتی ورثہ اس خطہ کی عظمت کو دُوبالا کرتا ہے اور اس کی پہچان اور شناخت کی علامت ہے۔

خطہ پیر پنچال کو قدیم زمانہ میں پانچال دیس کہا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں رہنے والے لوگوں کی تاریخ کے ڈانڈے مہابھارت کے زمانہ سے جا ملتے ہیں۔ مہابھارت میں پانچال نریش اور اُس کی بیٹی دروپتی، جسے پانچالی بھی کہا جاتا تھا کا ذکر ملتا ہے جن کا اُس دَور میں اہم رول رہا ہے کیونکہ پانچالی کی شادی پانچ پانڈوؤں کے ساتھ ہوئی تھی اور پانچال دیس کے جنگجو قبائل نے مہابھارت کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ بہت سے تاریخ دان پنچال کو ہی پانچال دیس مانتے ہیں۔ بعد میں مسلمان عہد حکومت میں جب اِس علاقے میں اِسلام کو فروغ حاصل ہوا تو پنچال ایک پیر کے نام سے منسوب ہوا اور پیر پنچال کہلانے لگ پڑا۔ آج بھی پیر پنچال کے دامن میں واقع علاقہ پونچھ، راجوری میں پھیلی ہوئی بستیوں اور گاؤں میں بہت سی باولیاں، مورتیاں اور عمارتوں کے کھنڈر موجود ہیں جنہیں لوگ پانڈوؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ اِنہی عمارتوں میں کالاکوٹ کا پاندو مندر اور مینڈر پونچھ کا پانڈو محل شامل ہیں۔ لوگوں میں یہ بھی روایت ہے کہ بن باس کے زمانہ میں پانڈوؤں نے اس علاقہ میں پناہ لی تھی جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ پانڈوؤں کی مقامی راجہ پانچال نریش کے ساتھ گہری رشتے داری تھی جو مشکل کے وقت اُن کے کام آیا تھا۔

جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا ہے سکندر کے حملہ کے وقت یعنی ۳۲۶ ق م میں اِس خطہ کو دراو ابھیسار ریاست کہا گیا ہے دِراو ابھیسار کے بارے میں یونانی مورّخوں سڑبو اور آریانہ نے اپنے سفرناموں میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انہوں نے اس علاقے کے راجے کا نام ابھیساری بتایا ہے جس کے ملک کی سرحدیں پورس کی ریاست ہزارہ سے ملتی تھیں۔ آریانہ اپنے سفرنامے Anadasis میں

لکھتا ہے کہ راجہ پورس اور راجہ ابھیساری میں گہرے مراسم تھے۔ حالانکہ اَبھیساری کی پہاڑی ریاست پورس کی مملکت سے بہت چھوٹی تھی اور اس راجہ کی فوجی طاقت بھی کم تھی لیکن ہزارہ کے بعد دراو ابھیسار ہی اہم ریاست مانی جاتی تھی اور راجہ ابھی ساری پورس کا اتحادی تھا لیکن پورس اور سکندر کے درمیان حملہ شروع ہونے سے پہلے سکندر کے وزیروں نے اُسے بتایا کہ اگر پورس کا ساتھ ابھیساریوں نے دیا تو جنگ کا جیتنا مشکل ہوگا۔ سڑبو اَپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ ان حالات میں سکندر نے پورس پر حملہ سے پہلے ابھیسار کے راجہ سے نپٹ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ اُس نے ابھیسار کے راجہ کو لکھا کہ پورس پر حملہ کے وقت وہ اس کی مدد کرے اور میرے دربار میں آکر حاضر ہوجائے یا پھر اَپنی بربادی کے لئے تیار رہے۔ جب قاصد نے یہ پیغام ابھیساری کو دیا تو اُس نے سیاسی حکمتِ عملی کے طور سکندر کو لکھا کہ وہ بیمار ہونے کے باعث خود حاضر ہونے سے قاصر ہے اور اَپنے بھائی کو روانہ کر رہا ہے اور حملے کے وقت سکندر کا ساتھ دے گا۔ ڈیوڈرس اپنے سفرنامے میں درج کرتا ہے کہ وہ دوغلی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھا۔ حالانکہ وہ پورس کا اتحادی اور حمایتی تھا اس کے باوجود سکندر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور اَپنے بھائی کو سکندر کے دربار میں بھیجنا محض ایک جنگی چال تھی۔ اِن حالات میں سکندر نے اپنے قاصد اور نمائندے راجہ ابھیسار کے دربار میں روانہ کردیئے تاکہ وہ راجہ پر نظر رکھیں اور راجہ ابھیسار، ہزارہ کے راجہ پورس کی مدد نہ کرسکے۔ اسی روان ابھیسار کا راجہ فوت ہوگیا اور سکندر نے اُس کے بیٹے کو راجہ بنا کر اُسے اپنا ہمنوا بنالیا۔ جناب محمد دین فوق نے تاریخ کشمیر میں سکندر کے بیٹے کا نام بُدھسٹر بتایا ہے۔ اَب ابھیساری ناطرف دار ہوگئے جس سے پورس کو

سخت دَھکا لگا۔ ڈیوڈرس لکھتا ہے کہ اطاعت قبول کرنے کے باوجود راجہ بدھسٹر ہزارہ کے راجہ پورس کی مدد پر آمادہ تھا اور اپنی فوجوں کی شیرازہ بندی کر رہا تھا۔ اس بات کی اطلاع سکندر کو مل چکی تھی۔ اس لئے سکندر نے پونچھ راجوری کے ان جنگجو پہاڑی قبائل کے دستوں کے پہنچنے سے پہلے ہی پورس پر یلغار کے لئے اَپنی فوجوں کو جہلم سے ۱۸ میل مشرق کی جانب سے دَریا کو عبور کرالیا۔

جب ہزارہ کے سپاہیوں نے پورس کو اطلاع دی کہ سکندر کی فوجوں نے فلاں جگہ سے جہلم کو عبور کرلیا ہے تو اُس نے بے ساختہ کہا کہ سکندر وہاں کیسے جاسکتا ہے وہ تو ابھیساریوں کا علاقہ ہے لیکن سپاہیوں نے پورس کو بتایا کہ سکندر نے اِسی لئے پہلے ابھیساریوں کے علاقے پر قبضہ کیا ہے تاکہ وہ پورس کی مدد کیلئے نہ پہنچ سکیں کیونکہ یہاں سے ہی دراوابھیسار کو جاتا ہے۔ اِن حالات میں ایک خونریز لڑائی کے بعد سکندر کو پورس پر سبقت حاصل ہوئی اور پورس کو شکست ہوگئی۔ یونانی مؤرخوں نے اَپنے سفرناموں میں لکھا ہے کہ پورس کو آخری وقت تک دراوابھیسار کی طرف سے فوجی امداد حاصل ہونے کی امید تھی۔ چونکہ سکندر نے ابھیسار کی طرف جانے والے راستے پر قبضہ کرلیا تھا اور ابھیسار کے راجہ پر زَبردست دَباؤ بنائے ہوئے تھا اس لئے راجہ بدھسٹر ہزارہ کے راجہ پورس کی مدد کے لئے نہیں آسکا۔ مؤرخوں کا خیال ہے کہ اگر دراوابھیسار راجہ کی طرف سے پورس کو بروقت امداد حاصل ہوجاتی تو یقیناً میدان جنگ کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

۳۲۶ ق م میں سکندر کے حملے کے وقت ریاست دراوابھیسار کا سراغ ایک سکے سے لگتا ہے جس کی نشاندہی انگریز مورخ جناب بیلے صاحب نے لاہور

کے عجائب گھر میں کی تھی۔ یہ سکہ پہلی صدی عیسوی کا ہے جس پر دراوابھیسار کے راجہ سیوا سین کا نام درج ہے اور جس کی راج دھانی کا نام ابھیسار پرستھ تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پہلی صدی عیسوی تک پونچھ راجوری ایک خودمختار ریاست تھی لیکن اس کے بعد ایک عرصے تک اس ریاست کے وجود کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطہ پیر پنچال کے جنوب کی ڈھلوانوں میں واقع علاقہ پونچھ راجوری کی ریاست دراوابھیسار کو مملکتِ کشمیر میں مدغم کردیا گیا۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ ۶۲۹ تا ۶۳۱ء کے دَرمیان جب اِس علاقے سے گزرا تو اُس نے ریاست دراوابھیسار کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جبکہ اس خطہ کی دو بڑی اکائیوں یعنی پونچ اور راجوری کا علیحدہ علیحدہ ذکر اَپنے سفرنامے میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں علاقے کشمیر کا حصہ تھے اور یہاں اپنی کوئی حکومت نہ تھی۔

ہیون سانگ اَپنے سفرنامے ''ٹریولز آف یانگ سو'' میں راجوری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ''پارتاستو'' کا نواحی علاقہ ہے۔ راجوری کا نام اُس نے ''ہولوشی پولو'' بتایا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ علاقہ کی آب وہوا گرم ہے لوگوں کا رنگ سیاہ مائل ہے۔ لوگ لب ولہجہ کے سخت ہیں۔ یہ علاقہ کشمیر کے ماتحت ہے یہاں اَپنی کوئی حکومت نہیں، یہاں بدھ مت کے پیروکار نہیں ملتے بلکہ یہ لوگ ہندومت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

علاقہ پونچھ کے بارے میں وہ دوسری طرح کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ پونچھ ۲۰۰ سرکٹ میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں گنّے کے کھیت ہیں۔ انگور کے پودے ملتے ہیں۔ بڑھیا قسم کی چائے کی پیدا ہوتی ہے، گندم اور

پھل اُگائے جاتے ہیں، لوگ اُپنی جھونپڑیوں کے ساتھ باغیچے لگاتے ہیں۔ عوام ذہین ہیں۔ بُدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اِس علاقے میں تقریباً پانچ بڑے بُدھ وِیہار ہیں۔ یہاں کی کوئی آزاد حکومت نہیں اور یہ علاقہ کشمیر کا حصہ ہے۔

کلہن نے راج ترنگنی میں بار بار علاقہ پونچھ اور راجوری کا ذکر کیا ہے۔ کلہن کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان علاقہ پونچھ کشمیر کے مشہور راجہ للتادتیہ کے تحت تھا جو ۷۵۲-۷۱۵ء کے درمیان پونچھ آئے تھے اور انہوں نے ہی پونچھ کے شہر کو آباد کر کے اس کا نام پُرنا اُتسور کھا تھا۔ پرنا اُتسو سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب ''پتوں کا تہوار'' سے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس زمانہ میں پونچھ شہر والا علاقہ پتوں اور سبزے سے آراستہ تھا جسے دیکھ کر للتادتیہ نے اس کا نام پرنا اُتسور کھا جو بدلتے بدلتے پرنا اتسو سے پرونتس، پرونتس سے پرونس اور پھر پرونس سے پونچھ ہوگیا۔ راج ترنگنی کے مطابق للتادتیہ نے پونچھ کو اپنی فوجوں کی چھاونی میں بھی تبدیل کر دیا تھا تا کہ ایک طرف کشمیر پر بیرونی حملے کے وقت دشمن کو یہاں روکا جا سکے اور دوسری جانب ملک کے دوسرے حصوں پر یلغاریں کرنے کے لئے للتادتیہ نے یہاں فوجوں کی چھاؤنی رکھی تھی۔ علاقہ پونچھ میں رام کُنڈ کے مقام پر للتادتیہ کے عہد کا ایک قدیمی مندر آج بھی موجود ہے جِسے للتادتیہ نے رام چندر جی کی کشمیر میں آمد کی یاد کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔

کلہن کے مطابق پونچھ میں خود مختار حکومت کی بنیاد ۸۵۰ء میں ایک مقامی سردار راجہ ''نَر'' نے ڈالی تھی جو اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا سوداگر تھا۔ نَر نے کشمیر کی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اُپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اس طرح علاقہ پونچھ پر مقامی کھش قبیلے کی حکومت قائم ہوجاتی ہے۔ کھش اپنی

ریاست کے دارالخلافے کو مقامی پونچھ شہر سے تبدیل کر کے لوہر کوٹ لے جاتے ہیں جو پونچھ شہر سے ۳۱ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ یہ مقام اُس زمانہ میں کشمیر جانے والی اہم شاہراہ اور درّہ توش میدان کے عین دوسری جانب واقع تھا۔ کھشوں نے اس مقام پر ایک اچھا خاصا قصبہ اور ایک عظیم قلعہ تعمیر کیا جِسے کشمیر کا دروازہ مانا جاتا تھا۔ کھش قبائل نے پونچھ پر ۸۵۰ء سے لے کر ۱۳۲۳ء تک حکومت کی ان میں اہم ترین راجے نرواہن، سنگھ راج، وگرہ راج، ترلوچن پال، بھون راج، کشتی راج، اُت کرش، کندوپ، سُسل، اوچل، بھاگک، پریمن، لوتھن، ملارجن، کپل اور گلہن شامل ہیں۔ اِسی دوران پونچھ کے راجہ سنگھ راج ۵۸-۹۵۰ء نے اپنی بیٹی ''درا'' کا بیاہ کشمیر کے راجہ کیشم گپت سے کر دیا، جس نے اُپنے شوہر کے انتقال کے بعد باقی تمام دعوے داروں کو برطرف کر کے ۹۸۰ء میں خود کشمیر کی حکومت سنبھالی تھی اور پھر ۹۸۰ء سے ۱۰۰۳ء تک بڑی بہادری، جرأت اور شان کے ساتھ کشمیر پر حکومت کی۔ اُپنے اِنتقال سے کچھ عرصہ پہلے ''درا'' کے اپنے بھتیجے اور لوہر کوٹ پونچھ کے شہزادے سنگرام راج کو کشمیر کی گدی پر بٹھا دیا اس طرح لوہر کوٹ پونچھ کے شاہی خاندان کی حکومت کشمیر پر بھی قائم ہوگئی اور تقریباً ۱۶۱ سال تک چلتی رہی۔

اِسی دوران ۱۰۱۵ عیسوی میں پورے شمالی ہندوستان کو فتح کرنے والے سلطان محمود غزنوی نے کشمیر فتح کرنے کا عزم کیا اور ایک بڑی فوج لے کر کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ اس زمانہ میں پونچھ پر واگرہ راج کی حکومت تھی۔ غزنوی کی فوجوں نے سالٹ رینج جہلم کے قریب پنجاب کے راجہ ترلوچن پال کو ۱۰۱۲ء میں نندن قلعہ سے بھگا دیا۔ ترلوچن پالؔ پونچھ کے قلعہ لوہر کوٹ میں پناہ گزیں

ہوگیا۔ محمود نے اُس کا تعاقب جاری رکھا۔ جب کشمیر کے راجہ سنگرام پال کو محمود کی مہم جوئی کا علم ہوا تو اُس نے حکمتِ عملی کے طور پر کشمیر کا تحفظ کرنے کے لئے ترلوچن پال کو اپنے بزرگ چچا وگرہ راج کی جگہ لوہر کوٹ کا راجہ بنا دیا اور اُپنے آزمودہ کار وزیر تنگ رائے کو ایک بڑی فوج دے کر اُس کی مدد پر روانہ کر دیا تا کہ سلطان محمود کے حملے کو پونچھ کے پہاڑوں میں روکا جا سکے۔ سلطان محمود اور ترلوچن پال کی فوجوں کے درمیان ۱۰۱۴ء میں پہلا مقابلہ پونچھ شہر کے قریب دریائے پونچھ کے کنارے ہوتا ہے۔ اِس لڑائی میں وزیر تنگ رائے کے بے جا تکبّر اور لاپروائی کے باعث ترلوچن پال کو شکست ہو جاتی ہے اور وہ تنگ رائے کے ساتھ بھاگ کر لوہر کوٹ چلے جاتے ہیں اور قلعہ لوہر کوٹ میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔ سلطان محمود پیشِ رفت جاری رکھتا ہے اور ۱۰۱۵ء میں قلعہ لوہر کوٹ کا محاصرہ کر لیتا ہے اور قلعہ داروں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیتا ہے۔

مورّخ ابو سعید گردیزی ''شیرازہ جنوری تا اپریل ۱۹۷۹ء'' شمارہ میں لکھتے ہیں کہ محمود نے قلعہ لوہر کوٹ فتح کرنے کے لئے اَپنی پوری طاقت جھونک دی لیکن راجہ ترلوچن پال نے کشمیری فوجوں کی مدد سے اِس بہادری اور عزم کے ساتھ محمود کی فوجوں کا مقابلہ کیا کہ ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد بھی سلطان کی فوجیں قلعہ کا ایک پتھر بھی اکھیڑنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اِسی دوران ترلوچن پال کو کشمیر کے راج سنگرام راج کی جانب سے مزید کمک حاصل ہو گئی۔ دوسری جانب زبردست برف باری شروع ہو گئی اور سلطان کی فوجوں کے اَپنے مراکز کے ساتھ روابط درہم برہم ہو گئے۔ رسد سامان کا پہنچنا مشکل ہو گیا۔ اس گمنام وادی میں گِھر جانے کے خوف نے سلطان کی فوجوں میں گھبراہٹ اور سراسیمگی

پھیلا دی۔ سلطان محمود نے جب ان تمام باتوں پر غور کیا اور اُسے شبہ ہوا کہ اُس کی فوج کہیں بغاوت نہ کر دے تو اُس نے مجبوراً اَپنی فوجوں کو قلعے کا محاصرہ اُٹھا لینے اور کشمیر حاصل کئے بغیر واپس غزنی کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا۔

ابو سعید گردیزی لکھتے ہیں کہ جب سلطان کی فوجیں لوہر کوٹ پونچھ سے واپس غزنی کی طرف پسپا ہو رہی تھیں تو پونچھ کے راجہ ترلوچن پال اور اُس کے سپاہی تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے اور محمود کی فوجوں پر پہاڑی درّوں اور ڈھلوانوں سے شب خون مارنے شروع کئے اور تیروں کی اِتنی زبردست بوچھاڑیں کیں کہ جس سے محمود کی فوجوں کا سخت جانی اور مالی نقصان ہوا اور بڑی مشکل سے سلطان بچی کھچی فوج لے کر واپس غزنی پہنچا۔ مشہور تاریخ دان ابو القاسم تاریخِ فرشتہ میں محمود کی کشمیر پر ناکام مہم کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''۱۰۱۵ء بمطابق ۴۰۶ھ میں سلطان محمود غزنوی نے کشمیر کی ہزیمت کا فیصلہ کیا اور قلعہ لوہر کوٹ جو رفعت اور متانت میں مشہور و معروف تھا، کا محاصرہ کر لیا۔ جب چند ماہ کا عرصہ گزر گیا تو برف باری ہوئی اور شدت کا جاڑا آیا۔ کشمیر کی کمک بھی قلعہ داروں کو آن پہنچی تو سلطان محاصرہ ترک کر کے غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک خلقتِ کثیر ہلاک ہو گئی، یہ پہلا زخم اور صدمہ تھا جو سلطان محمود کے لشکر کو ہندوستان کے سفر میں پہنچا''۔

راج ترنگنی کلہن کے مطابق ۱۰۰۳ء کے آس پاس خطہ پیر پنجال میں تین اہم راجواڑے قائم تھے یعنی ریاست لوہر کوٹ پونچھ، ریاست کالنجر جسے موجودہ وقت میں کوٹلی کہا جاتا ہے اور راج پوری یعنی راجوری۔ علاقہ پونچھ راجوری کو اُس وقت بڑی اہمیت حاصل ہوئی جب سلطان محمود غزنوی نے گیارہویں

صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہندوستان پر اُس دَور میں پال شاہی راجاؤں کی حکومتیں تھیں لیکن آپس میں رقابت کے باعث یہ راجے مل کر محمود کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے شکست کھاتے گئے۔ سر کننگھم کے مطابق جے پال کو ۱۰۰۲ء میں شکست ہوئی اور اُس کے بیٹے آنند پال کو ۱۰۰۸ء میں محمود نے کوہستان نمک میں ہرادیا اور اُس نے اپنے آپ کو آگ لگا کر ختم کر دیا۔ چنانچہ باقی پال شاہی راجے دھیرے دھیرے پنجاب سے فرار ہو کر کشمیر میں داخل ہو گئے۔

کشمیر کے حاکموں کو معلوم تھا کہ سلطان اِن راجاؤں کا تعاقب کرتے ہوئے ضرور کشمیر کا رخ کرے گا اور اُن کے لئے مشکلیں پیدا ہوں گی۔ کشمیر کے راجاؤں کو یہ بھی کھٹکا تھا کہ یہ پال شاہی راجے، شہزادے اور اہلکار جو کشمیر میں پناہ گزین تھے کسی بھی وقت کشمیر میں اپنا اُثر ورسوخ قائم کر کے بغاوت کر سکتے ہیں اور کشمیر پر قابض ہو سکتے ہیں۔ اِن حالات میں پال شاہی خاندان کے اِن راجاؤں سے نجات حاصل کرنے اور کشمیر کے دفاع کی غرض سے راج سنگرام راج نے حکمت عملی سے کام لیا اور اِن پناہ گزین راجاؤں سے کہا کہ چونکہ وہ محمود کی فوجوں سے لڑ چکے ہیں اور محمود کی فوجوں کی کمزوریوں سے واقف ہیں اس لئے انہیں کشمیر کی سرحدوں پر جا کر آباد ہونا چاہئے تا کہ محمود کے حملے کی صورت میں بہتر طور سے کشمیر کا دفاع ہو سکے۔ اس طرح جہاں پونچھ میں راجہ ترلوچن پال کو تعینات کر کے راجہ تسلیم کیا گیا، وہیں راجوری میں ایک اور پال شاہی راجہ پرتھوی پال کو راجہ بنا کر بھیج دیا گیا۔

پرتھوی پال شاہی نے اُپنے راج کماروں اور ساتھیوں و رشتے داروں

کے ساتھ ۱۰۰۹ء راجوری آ گیا اور علاقے کا نام پال راجاؤں کی نسبت سے راجہ پوری رکھ دیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے بدلتے راجہ پوری سے راجپوری، راجپوری سے رازوری، رازوری سے رازویر، رازویر سے راجوار اور پھر راجوار سے راجوری ہو گیا۔ کشمیر زبان میں آج بھی راجوری کو راز ویر ہی کہا جاتا ہے۔

راج ترنگنی کے مطابق پال شاہی راجاؤں نے راجوری پر ۱۰۰۰ء سے ۱۱۹۲ء تک حکومت کی۔ ان میں پرتھوی یا جانگی پال شاہی، سنگرام پال، سوم پال، ناگپال، بھوپال اور آمنا پال قابل ذکر راجے ہوئے ہیں۔ اِسی دوران علاقہ بدھل کا ایک تنگ رائے کسانہ راجوری کے راجے کا پیغام لے کر کشمیر دربار میں وارد ہوتا ہے جہاں کشمیر کی رانی ''دِدا'' ۹۸۰-۱۰۰۳ء تنگ رائے کی خوبصورتی، ذہانت اور بہادری سے متاثر ہو کر نہ صرف اُسے کشمیر دربار میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سونپ دیتی ہے بلکہ دل وجان سے اُس پر فریفتہ بھی ہو جاتی ہے۔ راج ترنگنی میں تنگ رائے اور رانی دِدا کی محبت کے تذکرے ملتے ہیں۔ لیکن تنگ رائے بڑا بہادر اور دلیر شخص بھی تھا۔ ددا کے بعد بھی اُسے وزارت کے عہدہ پر ایک عرصے تک بحال رکھا گیا۔

راجوری پر پال شاہی راجاؤں کے دَور میں اِسلام کو فروغ بھی حاصل ہوا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں راجوری وہ پہلا خطہ ہے جہاں گیارہویں صدی عیسوی میں ہی اِسلام کے پودے نے اپنی کونپلیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ ابوسعید گردیزی اپنی کتاب ''فتح کشمیر اور قنوج'' میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ محمود کشمیر فتح نہ کر سکا تھا لیکن پونچھ اور راجوری کے بہت بڑے حصے پر اُس کا قبضہ ہو چکا تھا اور اُس نے ۱۰۱۵ء میں کشمیر پر حملے کے وقت ایک مقامی سردار جانگی پال شاہی کو

راجوری اور پنج سراں علاقے کا حکمران بنادیا تھا جس نے کشمیر پر حملہ کے وقت سلطان محمود کی مدد اور پہاڑی راستوں میں رہبری کی اور کشمیر کے دروں سے واقف کرایا تھا اور لوہر کوٹ سے پسپا ہوتی ہوئی سلطان کی فوجوں کو محفوظ قلعوں تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ محمود کے غزنی لوٹنے کے بعد سے ہی راجوری میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی جہاں سلطان کے نمائندے جانکی پال کی حکومت تھی۔ ۱۰۳۶ء میں البیرونی، سلطان محمود کے بیٹے شاہ مسعود کے ساتھ راجوری تک آیا تھا وہ ''کتاب الہند'' میں لکھتا ہے کہ مسلمان تاجر راجوری میں اپنا کاروبار کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔

۱۱۲۱ء میں جب راجوری کا راجہ سوم پال پونچھ کے راجہ سُسل پر حملہ کرنے کے لئے آتا ہے تو اُس کی فوجوں میں مسلمان سپاہیوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو پونچھ کے راجہ سُسل کو باندھنے کے لئے اپنے ساتھ رسیاں لائے تھے اس طرح دھیرے دھیرے راجوری کے علاقے میں اسلام پھیلتا گیا۔

مرزا ظفر اللہ خان کی کتاب ''تاریخ راجگانِ راجوری'' کے مطابق ۱۹۲۱ء میں کلانور پنجاب کے راجہ نیل سین نے اِسلام قبول کر کے نورالدین نام رکھ لیتے ہیں لیکن کلانور میں لوگ انہیں برداشت نہیں کرتے۔ چنانچہ نورالدین عرف نیل سین اَپنے خاندان کے ساتھ وطن کو خیر باد کہہ کر پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور ۱۱۲۱ء میں راجوری کے علاقہ برمنڈل میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب نورالدین کے حسب ونسب کا علم راجوری کے راجہ آمنا پال کو ہوتا ہے تو وہ انہیں اَپنے دربار میں مدعو کر لیتے ہیں اور وزیر بنادیتے ہیں۔ نورالدین کچھ دیر تو وفاداری سے خدمت انجام دیتے ہیں لیکن بعد میں وہ راجوری دربار میں اپنا

اثر ورسوخ بڑھا لیتے ہیں اور پھر ۱۱۹۴ء میں راجوری کے راجہ آمنا پال کے خلاف بغاوت کر کے اُس کا تختہ پلٹ دیتے ہیں اور خود راجوری کے راجہ کا لقب اختیار کر کے حکومت سنبھال لیتے ہیں۔ اِس طرح پوری ریاست جموں وکشمیر میں راجوری وہ پہلا علاقہ ہے جہاں بارہویں صدی عیسوی میں کسی مسلمان راجے کو حکومت ملی تھی۔

راجہ نورالدین عرف نیل سین کا جرال راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کی نسل کے راجاؤں نے ۱۱۹۴ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک راجوری پر مسلسل ۶۵۲ سال تک حکومت کی۔ راجوری کے جرال راجاؤں میں قابلِ ذکر راجے، راجہ نورالدین، راجہ بہاءالدین عرف بھاگ سینہ، راجہ انور خان عرف اردن سینہ، راجہ سردار خان عرف رین سینہ، راجہ دولت خان عرف دولت سینہ، راجہ شاہزمان خان عرف جنگ سینہ، راجہ شہاب الدین عرف سکار سینہ، راجہ بہرام خان عرف بہرام سینہ، راجہ علی خان، راجہ بہادر خان عرف بہادر سینہ، راجہ مست ولی خان، راجہ تاج الدین عرف چتر سینہ، راجہ حیات اللہ خان، راجہ عنایت اللہ خان، راجہ ہدایت اللہ خان، راجہ عظمت اللہ خان، راجہ عزت اللہ خان، راجہ کرم اللہ خان، راجہ اگہر اللہ خان، اور راجہ رحیم اللہ خان ہیں۔ راجہ رحیم اللہ خان کو ۲۱ راکتوبر ۱۸۴۶ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے راجوری کی ریاست سے بے دخل کر کے جلاوطن کر کے راجوری کے علاقہ کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ جناب ظفر اللہ خان کی تاریخِ راجگانِ راجوری کے مطابق جرال مرزا خاندان نے راجوری پر تقریباً ۶۵۲ سال تک حکومت کی۔ اِس دور میں راجوری کا علاقہ بہت سے نشیب وفراز سے دوچار ہوا۔ اس علاقے نے خوشیاں دیکھیں اور غم دیکھے، عروج دیکھا اور

زوال دیکھا۔ یہ وہ دَور تھا جب راجوری کے راجہ سردار خان ۱۳۱۸-۱۲۸۹ء کے عہد میں راجوری کے علاقہ بُدھل سے شاہ میر نام کا ایک شخص کشمیر کے دَربار میں ۱۳۱۲ء میں وارد ہوتا ہے۔ ۱۳۴۳ء میں کشمیر کے تخت پر سُلطان صَدرالدّین کے لقب سے بیٹھ کر شاہ میری حکومت کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ شاہ میر کے اَصل وطن کے بارے میں اگرچہ مختلف تاریخ دانوں کے مختلف بیان ہیں لیکن اکثریت کی رائے ہے کہ وہ راجوری سے تعلق رکھتے تھے۔ جونراج کی راج ترنگنی اور ابوالقاسم کی تاریخِ فرشتہ کے مطابق شاہ میر پانڈو راجہ ارجن کی نسل سے تھا اور کھش قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو اُس زمانہ میں بُدھل اور راجوری میں آباد تھے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ میر کا راجوری سے تعلق تھا لیکن مُحب الحسن نے تاریخ ''کشمیر انڈر سلطانز'' میں شاہ میر کو سوات کا باشندہ بتایا ہے جس کا اندراج فارسی تاریخوں میں سوادگیر کے نام سے ہوا ہے۔ اُدھر فارسی تاریخ دانوں سے سوادگیر کو جونراج کی راج ترنگنی سے اَخذ کیا ہے جہاں اِس لفظ کو سنسکرت میں Panchgahwara لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سنسکرت لفظ کو جب فارسی میں لکھا گیا تو اُس کی اصل صورت میں تبدیلی واقع ہوئی اس لئے شاہ میر کے اصل وطن کی نشاندہی کے لئے ہمیں جونراج کی راج ترنگنی کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ یہ تاریخ شاہ میری سلطانوں کے عہد میں لکھی گئی تھی اس لئے شاہ میری خاندان کے بارے میں اَندراج غلط نہیں ہوسکتا۔

اِس سلسلے میں جناب این کے زتشی نے ''تاریخِ زین العابدین'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ شاہ میر کے وطن کے بارے میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ شاہ میر کا اصل وطن بدھل راجوری تھا۔ وہ جونراج کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں

کہ شاہ میر کا اصل وطن پنچ گہوارہ تھا اور شاہ میر کے اَجداد نے پنچ گہوارہ کی سرحد پر ایک قصبہ بھی آباد کیا تھا جس کا نام گربھ ہارپور (Gurbharpur) تھا اور شاہ میر کھش قبیلے کا فرد تھا۔ زتشی نے پنچ گہوارہ اور گربھ ہارپور کی نشاندہی علاقہ راجوری کے گاؤں ''پنچ گبر'' ہے جو راجوری اور بدھل کے درمیان واقع ہے۔ گربھ ہارپور کی نشاندہی گبر گاؤں سے کی ہے جو بُدھل قصبے کے قریب واقع ہے۔ اس طرح زتشی نے ثابت کیا ہے کہ شاہ میر کا اصل وطن راجوری کا علاقہ بُدھل تھا۔ شاہ میر کے وطن کے بارے میں سب سے اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ مشہور فارسی مورّخ ابوالقاسم کی ''تاریخِ فرشتہ'' میں درج ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں شاہ میر کے بارے میں ذکر کا اقتباس یوں ہے:

> ''اب سلاطینِ کشمیر کا ذکر کرتا ہوں جو کشمیر کے فرمانروا ہوئے۔ یہاں ۷۱۵ھ تک سہہ دیو کی حکمرانی تھی۔ جبکہ شاہ مرزا نامی ایک شخص بہ لباسِ قلندری کشمیر میں وارد ہوا اور راجہ کا نوکر ہوا۔ وہ اپنا حسب یوں بیان کرتا ہے ''شاہ مرزا ابن طاہر بن آل بن گرشاپ بن نکودر'' اور نکودر کا حسب ارجن پانڈو تک پہنچتا ہے''۔

ابوالقاسم شاہ میر کو شاہ مرزا لکھتا ہے جس سے راجوری کے شاہی مرزا خاندان کے ساتھ بھی اُس کی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ چونکہ کشمیر میں مرزا خاندان کے لوگ اُس زمانہ میں آباد نہ تھے اس لئے ہوسکتا ہے کہ شاہ میر نے کشمیر پہنچ کر اپنا نام شاہ مرزا کے بجائے شاہ میر بتایا ہو کیونکہ میر لقب کشمیر میں مقبول تھا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شاہ میر کا راجوری کے علاقہ سے تعلق تھا۔

زتشی، تاریخ زین العابدین اور محمد دین فوق تاریخ بڈشاہی میں لکھتے ہیں

کہ کشمیر کے سلطان علی شاہ اور اُس کے بھائی شاہی خان (بڈ شاہ) کے درمیان ۱۴۲۰ء میں اقتدار کی حتمی جنگ راجوری کے علاقہ تھنہ منڈی میں لڑی گئی تھی۔جس میں علاقہ راجوری کے ٹھکر اور ملک قبائل نے شاہی خان کا ساتھ دیا تھا۔علی شاہ گرفتار ہو کر قتل ہوگیا جبکہ شاہی خان سلطان زین العابدین بڈشاہ کے لقب سے کشمیر کے تخت پر جلوہ افروز ہوگیا تھا۔

۱۵۸۶ء میں جب کشمیر مغلوں نے فتح کیا تو راجوری کی چھوٹی سی ریاست کی اہمیت بہت بڑھ گئی کیونکہ مغلوں نے کشمیر کو لاہور کے ساتھ رابطے کے لئے مغل روڈ کو اپنالیا جس کا ایک بڑا حصہ راجوری کی ریاست سے گزرتا تھا۔اَب ایک طرف مغل روڈ کے پڑاؤں یعنی نوشہرہ، چنگس، راجوری شہر، تھنہ منڈی اور بہرام گلہ وغیرہ میں سُرخی اور اینٹوں کے استعمال سے عمارات کی تعمیر کا سِلسلہ شروع ہوگیا اور دوسری جانب مغل شہنشاہوں اور شاہی کاروانوں کی کشمیر کی طرف آمد ورفت جاری ہوگئی جس کے باعث راجوری کا علاقہ رونقوں، رنگوں، خوشیوں اور چہل پہل کا مرکز بن گیا۔شہنشاہ اکبر ۱۵۸۷ء پہلی بار راجوری کے راستے کشمیر گئے تھے۔اس سفر کے بارے میں اقبال نامہ اکبری میں یوں درج ہے:

''شہنشاہ اکبر نے ۱۶ فروری ۱۵۸۷ء کو راوی سے کوچ کیا۔تین ہزار سنگ تراش اور خارہ شگاف و دس ہزار کارگزار پہلے راستے کی ہمواری کے لئے روانہ کئے۔بادشاہ کوچ بکوچ بھمبر پہنچا۔پھر راجوری آیا اور شہر کے قریب جموں میں اُترا.......راجوری کے مقامی راجہ مست ولی خان نے سابق خدمت گزاری جو کہ راجہ نے فتح کشمیر کے وقت انجام دی تھی، کا

پروانہ بادشاہ کو دکھایا۔بادشاہ نہایت متاثر ہوا اور راجہ کے اہل خاندان کو میرزا کے خطاب سے نوازا..........''

شہنشاہ جہانگیر نے ۱۶۰۵ء اور ۱۶۲۹ء کے درمیان تیرہ مرتبہ کشمیر جاتے ہوئے راجوری میں قیام کیا تھا۔اُس کے دور میں مغل روڈ تعمیرات کا کام مکمل ہوا اور شاہی کاروانوں کی کشمیر آمدورفت میں اضافہ ہوا۔۱۶۲۰ء میں جب وہ راجوری پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ مقامی ہندو اور مسلمان آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور مسلمان بھی اہلِ ہنود کی سَتی کی رسم کو اس طرح جاری رکھے ہوئے ہیں کہ عورت کو خاوند کے ساتھ زندہ دفنا دیا جاتا ہے۔شہنشاہ نے راجوری میں رائج اِس بدعت کے خاتمے کے لئے احکام صادر فرمائے۔اقبال نامہ جہانگیری میں اس واقعے کا یوں ذکر آیا ہے:

''دوسرے روز ہم موضع راجور آئے۔یہاں کے لوگ قدیم زمانہ میں ہندو تھے۔اس سرزمین کے بڑے زمیندار کو راجہ کہا جاتا ہے۔جس طرح ہندو عورتیں خاوند کی موت پر اُن کے ساتھ زندہ جلتی ہیں اُسی طرح یہاں کے مسلمان راجاؤں کی عورتیں بھی کے انتقال کی صورت میں زندہ دفن ہو جاتی ہیں۔بعض اوقات ہندوؤں کے ساتھ رشتہ داریاں بھی طے پایا کرتی تھیں۔چنانچہ شہنشاہ نے فرمان جاری کیا کہ آئندہ راجہ ایسی بدعتیں اَپنے علاقے میں نہ ہونے دے گا۔نہ کوئی عورت زندہ دفن کی جائے گی، نہ کسی ہندو کو مسلمان لڑکی کا رشتہ دیا جائے گا۔اگر آئندہ کوئی شخص ان بدعتوں کا مرتکب ہوا تو اُسے سزا دی جائے گی''۔

ظفر اللہ خان 'تاریخ راجگان راجور' میں لکھتے ہیں کہ ۱۶۴۴ء میں شہنشاہ شاہِ جہاں لاہور سے کشمیر روانہ ہوا تو شہزادہ اورنگ زیب بھی اُن کے ساتھ تھا۔

جب شہنشاہ راجوری پہنچا تو مقامی راجہ تاج الدین خان نے مہمان نوازی اور خدمت گزاری کے فرائض انجام دیئے۔ کئی روز تک شاہی قافلہ راجوری میں خیمہ زن رہا۔ اِسی دوران شاہ جہان راجوری کے راجہ کے حُسنِ سلوک سے نہایت متاثر ہوا اور اُس کی پچھلی خدمات و راجوری کے ریاست کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تاج الدین سے اُس کی لڑکی راج بانی کا رشتہ اورنگ زیب کے لئے قبول کیا۔ اگرچہ شہزادہ اورنگ زیب کی ۱۶۳۶ء میں شادی ہو چکی تھی لیکن بادشاہ کے حکم پر اُنہوں نے دوسری شادی قبول کی۔ اورنگ زیب کا نکاح راج بانی سے پڑھایا گیا اور تمام رسومات اَدا: وئیں۔

کشمیر پر مغلوں کے عہد میں علاقہ پونچھ میں بھی ایک ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے۔ منشی محمد دین فوق ''تاریخِ اقوامِ پونچھ'' میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر، جو کہ تین مرتبہ کشمیر آئے تھے نے اَپنا دوسرا سفر ۱۵۹۶ء میں پونچھ کے مغربی علاقے کہوٹہ حاجی پیر کے راستے کیا تھا۔ اِس دورے میں شہزادہ سلیم اُن کے ہم رکاب تھے۔ جب شاہی یہ کارواں پونچھ شہر سے ۱۲ میل شمال میں کہوٹہ کے مقام پر رُکا ہوا تھا تو وہاں کے مقامی سردار چوہدری حبیب گجر اور اُس کے نَومُسلم داماد سراج الدین راٹھور عرف سُرجن سنگھ نے شاہی کارواں کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ آؤ بھگت کے فرائض انجام دیئے۔ شہزادہ سلیم، سراج الدین کے حُسن اخلاق سے اور حسب نسب کو جان کر نہایت متاثر ہوا اور اُسے اپنے والد شہنشاہ اکبر کے رُوبرو پیش کیا اور اپنے والد سے علاقہ پونچھ جاگیر کے طور پر دلوا کر اُسے پونچھ کا راجہ تسلیم کروالیتا ہے۔ سراج الدین راٹھور عرف سرجن سنگھ راجگی کا پروانہ لے کر موجودہ پونچھ شہر میں آجاتا ہے اور مغل فوج کی مدد سے ۱۵۹۶ء میں پونچھ

ریاست میں اپنی حکومت قائم کرلیتا ہے۔ سراج الدین نے ۱۶۴۵ء تک پونچھ پر اَپنا اقتدار قائم رکھا۔ اُن کی وفات کے بعد راجہ فتح محمد خان راٹھور ۱۶۴۵ء تا ۱۷۰۰ء راجہ عبدالرزاق خان راٹھور ۱۷۰۱ تا ۱۷۴۷ء، راجہ محمد زمان خان راٹھور ۱۷۶۰-۱۷۵۷ء اور راجہ خان بہادر خان راٹھور ۱۷۹۸-۱۷۹۲ء تک پونچھ کے حکمران رہے۔ ۱۷۹۸ء میں راجہ خان بہادر خان راٹھور کو ایک سازش کے تحت سری نگر میں زہر دے کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور پونچھ کے تخت پر اُس کا وزیر روح اللہ خان سانگو گجر قبضہ کرلیتا ہے۔ اگرچہ راٹھوروں کی شاخ سے سدھرون کے راجہ شیر باز خان ۱۸۰۴ء میں روح اللہ خان سے حکومت چھین لیتے ہیں لیکن رُوح اللہ ۱۸۰۸ء میں افغان گورنر کشمیر کی مدد سے پھر پونچھ کا اقتدار حاصل کرلیتا ہے اور اپنے بیٹے امیر خان اور پوتے میر باز کی وساطت سے پونچھ پر ۱۸۱۹ء تک حکومت کرتا ہے۔ لیکن مہاراجہ رنجیت کے دوسرے حملہ کشمیر میں رُوح اللہ خان اور اُس کا بیٹا امیر خان مارے جاتے ہیں جبکہ پوتا میر باز خان مہاراجہ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ مگر ۱۸۲۰ء میں میر باز کو بھی خالصہ سرکار اکھیڑ پھینکتی ہے اور یہاں خالصہ دربار کے گورنر متعین ہو جاتے ہیں جو ۱۸۴۶ء تک حکومت چلاتے ہیں۔ ۱۵/اپریل ۱۸۴۶ء میں معاہدۂ اَمرت سر کے تحت جب ریاست جموں و کشمیر کا وجود عمل میں آتا ہے اور جموّں کے راجہ گلاب سنگھ مہاراجہ کے لقب سے ریاست کا اقتدار حاصل کرلیتے ہیں تو راجوری ریاست کی طرح علاقہ پونچھ بھی مہاراجہ کے تصرف میں چلا جاتا ہے۔

پونچھ کی پہاڑی ریاست پر مسلمان دورِ حکومت ۱۵۹۶ء سے لے کر ۱۸۶۴ء تک چلتا ہے۔ یہی وہ دور تھا جب ۱۷۷۳ء میں کشمیر مغلوں کے ہاتھ

سے نکل کر افغانوں کے ہاتھ میں جا پڑتا ہے۔ اُدھر پنجاب میں سِکھوں کے اِنتشار سے سارا پنجاب افراتفری کا شکار ہوتا ہے لیکن چھوٹی سی پہاڑی ریاست پونچھ اُمن اور سکون کا گہوارہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راجہ رستم خان کے عہد میں یعنی ۱۷۶۰-۱۷۸۷ء کے درمیان پونچھ میں آرٹ اور فن کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے۔ راجہ رستم خان ایک رواداراور پُرخلوص راجہ تھا جس نے ہندو تاجر اور حکیم بُلا کر یہاں آباد کئے تھے۔ جناب ڈبلیو۔ جی آرچر اپنی کتاب "Indian Paintings in Punjab Hills" میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۷۵-۱۸۰۱ء کے آس پاس گلیر ہماچل سے تربیت یافتہ فن کار ہجرت کر کے پونچھ آ گئے تھے راجہ رستم خان نے اُن کی بڑی عزت افزائی کی اور راجہ کی حوصلہ افزائی کے باعث اِن فن کاروں نے پونچھ میں فنونِ لطیفہ کی بنیاد ڈالی اور آرٹ کو فروغ دیا۔ آرچر صاحب نے اپنی کتاب میں پونچھ قلم کی بہت سی تصاویر دی ہوئی ہیں جو پونچھ کے مسلمان راجاؤں کے عہد میں تیار ہوئی تھیں اِن تصویروں سے اُس زمانہ کے لباس، رہن سہن اور طرز زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ ان میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصاویر بھی شامل ہیں جس سے مقامی راجہ رستم خان کی مذہبی رواداری کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا ہے کہ ۱۸۴۶ء میں ریاست جموں وکشمیر کے وجود میں آنے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ دونوں پہاڑی راجواڑوں پونچھ اور راجوری کو تحلیل کر کے انہیں ریاست جموں وکشمیر میں مدغم کر دیتے ہیں اور ۱۸۶۰ء میں راجوری کے علاقہ کو ضلع بھمبر کی تحصیل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ پھر ۱۸۰۶ء میں ریاست کی نئی حد بندی کے تحت تحصیل راجوری کو ضلع ریاسی کا حصہ بنادیا جاتا

ہے۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد راجوری کو پونچھ سے ملا کر ضلع پونچھ راجوری وجود میں آیا تھا لیکن ۱۹۶۷ء کی نئی اِنتظامی حد بندی کے ۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ء کو راجوری کو نوشہرہ اور بُدھل سے ملا کر نئے ضلع کا درجہ دیا گیا جو اَب تک جاری ہے۔

پونچھ کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے بھائی راجہ دھیان سنگھ کی جاگیر تھی، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۷ء میں اپنے وزیر اعظم دھیان سنگھ کی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُسے دی تھی۔ اس پر بھی ۱۸۴۶ء کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے قبضہ کر لیا تھا۔ ان حالات میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے بھتیجے اور راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے موتی سنگھ اور جواہر سنگھ اپنی جاگیر کی واگزاری کے لئے ۱۸۴۸ء میں لاہور میں انگریز ریذیڈنٹ کے روبرو پیش ہوئے اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے خلاف دعویٰ پیش کر دیا۔ ان حالات میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے مصلحت اِسی میں سمجھی کہ راجہ دھیان سنگھ کے بیٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے۔ چنانچہ انگریز حکومت کی مداخلت پر مہاراجہ گلاب سنگھ نے پونچھ چبال جاگیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اِس معاہدے کے تحت جو ۱۲ر اگست ۱۸۴۸ء میں طے پایا بٹالہ کنڈی سمانی اور آلس کھل کے علاقے راجہ دھیان سنگھ کے بڑے بیٹے جواہر سنگھ کے حصے میں آئے جبکہ ایک لاکھ پانچ ہزار روپے مالیت کا علاقہ پونچھ جواہر سنگھ کے چھوٹے بھائی موتی سنگھ کو ملا جس میں پونچھ خاص، اِسلام آباد، منڈی، سرن، ہرام گلہ، ٹاٹ، پلنگی، دارمن کوٹ باغ، کھار منگ، جواہر گڑھ، پلندری، کیری، وغیرہ شامل تھے۔ ۱۶ر اگست ۱۸۵۲ء کو موتی راجہ خطاب حاصل کر کے پونچھ گئے اور اس علاقہ کا انتظام سنبھال لیا۔ راجہ موتی سنگھ (۱۸۹۲-۱۹۵۲ء) کے راجہ بلدیو سنگھ ۱۸۱۷-۱۸۹۲ء، راجہ سکھ دیو سنگھ ۱۹۲۶-۱۹۱۸ء) اور راجہ جگت

دیوسنگھ ۱۹۲۶-۱۹۳۹ء تک علاقہ پونچھ کے حکمران رہے۔ ۱۹۳۹ء میں راجہ جگت دیوسنگھ کی وفات کے وقت اُن کے بیٹے شورتن دیوسنگھ نابالغ تھے۔ اس لئے کشمیر حکومت نے علاقہ پونچھ کا انتظام سنبھال لیا اور ۱۹۴۰ء میں شورتن سنگھ کو پونچھ کے راجہ کے خطاب سے نواز کر انہیں اجمیر کالج میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد علاقہ پونچھ دو حصوں میں بٹ گیا اور اِس کی چار تحصیلوں میں سے ڈھائی تحصیلیں یعنی تحصیل باغ، تحصیل سدھنتی اور آدھی تحصیل حویلی حد متصارقہ کے اُس پار رہ گئیں جبکہ باقی ماندہ ڈیڑھ تحصیل مینڈر اور آدھی تحصیل حویلی سرحد کے اِس طرف آ گئیں۔ چنانچہ اس علاقے کو ضلع راجوری پونچھ کا حصہ بنا دیا گیا لیکن ۱۹۶۷ء کی نئی حد بندی کے بعد علاقہ پونچھ ایک ضلع کے طور پر اُبھرا جو رقبے کے لحاظ سے ریاست کا سب سے چھوٹا ضلع ہے۔ ۱۸۱۹ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان بہت انگریز سیاح علاقہ راجوری اور پونچھ کے راستے کشمیر جاتے ہوئے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ اِن سیاحوں نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں راجوری اور پونچھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے جس سے اُس زمانہ کے حالات، سیاسی صورتِ حال اور عوام کی طرزِ زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ اِن سفرناموں میں سے چند اہم حوالہ جات کا ذکر کرنا مناسب رہیگا۔

جناب بیرن چارلس ہیگل کشمیر پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ۱۸۲۰ء کے عین بعد کشمیر جاتے ہوئے راجوری میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ وہ اپنی کتاب ''کشمیر اور پنجاب'' میں لکھتے ہیں:

''پونی سے ہم دھرم سالہ پہنچے۔ یہ ایک اچھا خاصا قصبہ ہے۔

یہاں سے میں نے راجوری کے راجہ کو خط لکھ کر چھ گھوڑے طلب کئے جو دستیاب ہو گئے۔ مرکبان نے بتایا کہ راجوری کا راجہ مراد پور کے مقام پر استقبال کے لئے آیا ہوا ہے۔ مراد پور جہاں ایک شکستہ سرائے تھی وہاں راجہ سے ملاقات ہوئی۔ راجہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ رکھتا تھا۔ درباریوں نے اُسے گھیرا ہوا تھا۔ پھر ہم راجوری آ گئے۔ راجہ مجھے خوبصورت مگر پُرانے وقتوں کے باغ میں لے گیا جہاں اکثر مغربی ممالک کے سیاح قیام کرتے تھے۔ یہاں دریا کے اُس پار راجوری کا قصبہ ہے جس کا منظر قابلِ دید ہے۔ راجہ جو میرے ساتھ تھا نے فخر کے ساتھ اُس پہاڑ کی طرف اِشارہ کر کے قلعے کو دکھایا جہاں قلعہ عظیم گڑھ تھا (یہ قلعہ پہلے راجہ رحیم اللہ خان کو جاگیر کے طور پر دیا گیا تھا) راجہ رحیم اللہ خان پورا دن میرے ساتھ رہا اور میرے لئے پھل، مچھلی اور پھول بھیجے۔ ایک بھیڑ اور کھانے کے لئے دوسری اشیاء بھی مہیا کیں۔ یہاں سے میں نے بہرام گلے کی طرف کوچ کیا''۔

۱۸۳۷ء میں جی ٹی وینی صاحب کشمیر جاتے ہوئے راجوری پہنچے۔ وہ اَپنے سفرنامے میں راجوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قصبہ راجوری دو ندیوں کے اتصال پر واقع ہے اور مثلث کی شکل رکھتا ہے۔ راجہ کے محلات کی بلند دیواریں اور وسیع بُرج دریا کی طرف سے بڑے خوبصورت اور شاندار نظر آتے ہیں۔ اس قصبہ میں پانچ سو گھر ہیں جن میں کچھ خام، مگر اکثریت پختہ مکانوں کی ہے۔ یہاں ایک عمدہ بازار ہے۔ یہ قصبہ مغل عہد میں بہت بڑا اور بڑا مشہور ہوا کرتا تھا۔

ہم راجوری شہر سے پار پرانی بارہ دری میں اُترے جو ایک باغ میں تھی۔ دریا طغیانی پر تھا اس لئے باغ میں ٹھہرنے کا اہتمام کیا گیا۔

ملازمین نے بتایا کہ ہاتھی دریا عبور کر رہا ہے۔ لوگ غالباً مجھے لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ ان میں ایک خوبصورت نوجوان سے میری ملاقات کرائی گئی۔ یہ راجہ کا بیٹا تھا۔ اُس نے کپڑے اُتارے ہوئے تھے تاکہ دریا میں کوئی حادثہ پیش آئے تو مدد کر سکے۔ مجھے کہا کہ ہاتھی پر سوار ہو جاؤں۔ میں اپنے ترجمان کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہوا۔ ہاتھی اپنے زور سے دریا پار کر گیا۔ دریا کے اُس پار راجوری کا راجہ رحیم اللہ درباریوں کے ساتھ استقبال کے لئے کھڑا تھا جو مجھے بلند برج میں لے گیا جہاں سے نہایت عمدہ نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ مجھے شیرین چائے پیش کی گئی۔ چائے کے بعد راجہ نے لندن کی ایک پرانی تصویر اور آلہ تصویر کشی دکھایا جو انگریز سیاح مورکرافٹ نے اُسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ میں تین بار راجہ کا مہمان رہا۔ ایک بار راجہ نے مجھے اصلی اسناد جن پر اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے دستخط اور مہریں تھیں، دکھائیں۔ سکھوں کی فتوحات کی وجہ سے اب راجوری کی آمدنی بہت کم رہ گئی ہے۔ مالیہ کا ایک حصہ جو ۱۲ ہزار خروار شالی تھا، کشمیر سے آتا تھا۔ میں نے راجہ سے اُس کی ریاست کا اصل نام دریافت کیا تو راجہ رحیم اللہ نے بتایا کہ اس کا نام پہلے راج آور تھا جو اب راجور ہو چکا ہے۔ عوام میں راجہ رحیم اللہ ایک عالم تصور کیا جاتا ہے۔ میری نظر میں اس سے اچھا آدمی اور کوئی نہیں گزرا جس سے پرانی باتیں اور علاقے کی تاریخ معلوم ہو"۔

جناب Fredrik Drew جو اُنیسویں صدی کے دوران ۱۸۵۵ء کے آس پاس راجوری سے گزرے تھے، وہ اپنی کتاب "The Northern Barrier of India" میں راجوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"پھر ہم راجوری پہنچے۔ یہاں انگریز سیاحوں کے رہنے کے لئے ایک باغ میں انتظام کیا جاتا ہے، جو ندی کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ جسے پتھروں کی دیوار کے بیچ خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہاں دو بارہ دریاں ہیں جن کو بنگلے یا پھر گرمیوں میں رہنے کے لئے گھر کہا جا سکتا ہے۔ ایک بنگلے سے ندی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے راجوری کا خوبصورت شہر بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ ندی کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ راجوری کا شہر پتھروں کے استعمال سے بنایا گیا ہے۔ کچھ محل اب تباہ ہو چکے ہیں۔ یہاں مسلمان راجپوت راجاؤں کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ راجوری میں ایک خوبصورت عمارت ڈوگرہ حکمران نے بنائی ہے۔ اِس حکمران نے دریا میں ایک چٹان پر بہت بڑا مندر بھی تعمیر کیا ہے جو اِس بات کا غماز ہے کہ شہر میں ہندو پھر سے آباد ہو چکے ہیں۔ ڈوگروں نے راجوری کا نام تبدیل کر کے رام پور رکھ دیا ہے لیکن عوام میں یہ نیا نام مقبول نہیں ہے۔ جناب سی ای بیٹس ۱۸اء کے آس پاس راجوری آئے تھے۔ وہ اپنی کتاب The Gazzeetter of Kashmir میں راجوری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ راجوری کو رام پور بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا شہر ہے جو پتھروں کی فصیل میں سمٹا ہوا ہے۔ اِس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑوں پر جنگلی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ شہر دریائے توی سے ۱۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شہر میں مکان اکثر پختہ ہیں، پتھروں کو تراش کر لگایا گیا ہے۔ بہت سے گھر دو منزلہ ہیں۔ شہر میں بہت سے محلات بھی ہیں جبکہ شاہی محل شہر کی پشت میں واقع ہے، جس کے اُوپر ۲۰ مینار بنے ہوئے ہیں۔ مسافر خانہ شہر کے وسط میں بنایا گیا ہے جس کے ساتھ ہی ایک مندر بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

یہاں پر پُرانے طرز کی ایک منڈی یا بازار بھی موجود ہے جو کہ محل کے قریب ہے' جہاں عمارتوں کا ایک بڑا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج نے ۱۸۱۳ء میں کشمیر پر ناکام حملہ کے وقت ان تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا تھا اور اب ان کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کے شمال مشرق میں ایک اُونچی پہاڑی پر ایک قلعہ موجود ہے جہاں سے تمام وادی پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ قلعہ دس سال پہلے تعمیر ہو رہا اور ابھی بھی اس کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ راجوری میں بارشوں کے موسم میں بخار کی بیماری عام ہوتی ہے۔ سردیوں میں برف باری ہوتی ہے اور آندھی طوفان بھی آتے رہتے ہیں۔ دریا کے مابین کنارے پر سیاحوں کے رہنے کیلئے بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے جو کہ راجوری شہر کے بالکل سامنے واقع ہے"۔

اُنیسویں اور بیسویں صدی میں علاقہ پونچھ بھی انگریز سیاحوں کی آمد و رفت کا مرکز رہا تھا کیونکہ جب سری نگر کو ابھی سڑک کے ذریعے بیرون ملک سے نہیں جوڑا گیا تھا۔ اُس زمانے میں انگریز سیاح مغل روڈ کے راستے پیدل پنجاب سے کشمیر جایا کرتے تھے۔

مغل روڈ کا ایک بڑا حصہ علاقہ پونچھ سے بھی گزرتا ہے۔ اِس لئے انگریز سیاحوں نے اَپنے سفرناموں میں پونچھ کا ذکر بھی اکثر کیا ہے جس سے اُس وقت کے حالات اور طرزِ زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

جناب جی ٹی وینی ۱۸۳۷ء میں کشمیر جاتے ہوئے پونچھ آئے تھے۔ اُس زمانہ میں یہاں آپ راجی کا دور تھا اور یہاں کے عوام اپنی آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ مقامی راجہ شمس خان چار ہزار فوج کے ساتھ جموں کے راجہ گلاب سنگھ سے برسرِ پیکار تھا۔ ان حالات میں وِنی پونچھ آئے تھے۔ وہ اَپنی کتاب

'Travelles in Kashmir, Ladakh and Iskardu' میں لکھتے ہیں:

"۲۰ مئی ۱۸۳۷ء کو ہم پونچھ پہنچے۔ اُس زمانے میں پونچھ کا شہر زیادہ دلچسپ نہ تھا۔ یہ قصبہ راجوری کے شہر سے بہت چھوٹا تھا جبکہ کوٹلی کے قصبے سے بڑا تھا۔ مکانوں کی بناوٹ بھی کوٹلی اور راجوری کے قصبہ میں تعمیر شدہ مکانوں کی طرح ہی تھی۔ اس شہرت میں کوئی بھی قابلِ ذکر بات نہ تھی اس لئے یہاں قیام کرنے کے بجائے ہم سرن کوٹ چلے گئے جہاں ایک پُرانا قلعہ موجود تھا"۔

آج کل اگرچہ سُرن کوٹ میں ایسا کوئی قلعہ نظر نہیں آتا لیکن روایت ہے کہ سرن کوٹ سے ایک میل مشرق میں ایک قلعہ ہوا کرتا تھا جسے البرونی نے اپنی کتاب "کتاب الہند" میں قلعہ راجگری لکھا ہے۔

۱۸۵۵ء کے آس پاس جب پونچھ پر راجہ موتی سنگھ کی حکومت تھی' جناب فیڈرِک ڈِرو کشمیر جاتے ہوئے پونچھ میں رُکے تھے۔ وہ اپنی کتاب "دی ناردرن بیرئیر آف انڈیا" میں پونچھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ریاست پونچھ کی اس علاقے میں بڑی اہمیت ہے۔ یہاں راجہ موتی سنگھ کی حکومت ہے، جن کا وسیع علاقے پر راج قائم ہے۔ پونچھ کا شہر بڑا گنجان آباد ہے۔ یہاں شاہی قلعہ اور شاہی محلات کی تعمیر ہو چکی ہے۔ شاہی قلعے کی مرمت اور اس کی وسعت اَز سرِ نو راجہ موتی سنگھ نے اپنے مزاج کے مطابق کرائی ہے"۔

اِسی دَور میں ایک اور انگریز سیاح سر رچرڈ ٹیمپل کشمیر جاتے ہوئے پونچھ سے گزرے تھے۔ وہ اپنی کتاب "حیدر آباد، سکم، کشمیر اینڈ نیپال" میں پونچھ کے

علاقہ پنج سراں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب ہم نے رتن پیر دَرّے کو پار کیا تو بہرام گلے کی طرف آتے ہوئے ہمیں دریائے بوڑھا گنگا کے گرجنے کی آوازیں سُنائی دیں (یاد رہے کہ آج کل اِسے دَریائے پونچھ کہا جاتا ہے) پرنئی نالے پر ایک پُل بنا ہوا تھا جہاں ڈوگرہ حکومت کے نمائندے میاں گل سنگھ نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر ہم بہرام گلہ پہنچے جہاں ایک بستی آباد ہے"۔

۱۸۷۲ء میں انگریز مصنف سی، ای، بیٹس پونچھ آئے تھے وہ اَپنی کتاب "The Gazetteer of Kashmir" میں پونچھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پونچھ کی ریاست پانچ تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ دَریائے پونچھ کو پلست ندی کہا جاتا ہے۔ پونچھ شہر کے چاروں جانب خوبصورت جنگل ہیں۔ لوگ چاول، گندم اور دالیں اُگاتے ہیں۔ لوئیاں، کمبل اور کپڑے بھی تیار کرتے ہیں لیکن زیادہ تر کپڑا پنجاب سے منگوایا جاتا ہے اور وزیر میاں گلاب سنگھ ہے۔ ریاست پونچھ کی آمدن ۷½ لاکھ روپے نانک شاہی ہے۔ زمین داروں سے مالیہ نقدی اور جنس دونوں صورتوں میں وصول کیا جاتا ہے۔ راجہ موتی سنگھ کے پاس ایک توپ خانہ اور ۱۲۰۰ سپاہیوں پر مشتمل فوج ہے جن میں سے چھ سو سپاہی پونچھ شہر میں رہتے ہیں۔ باقی فوج گاؤں میں تعینات ہے۔ فوج کا اہم کام لگان وصول کرنا اور اَمن قائم رکھنا ہے۔

پونچھ شہر کی حفاظت کے لئے کوئی دیوار یا خندق نہیں بنائی گئی۔ یہ ایک کُھلا شہر ہے۔ گلیاں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ شہر کے درمیان میں بازار ہے۔ یہ شہر ۷۵۰ گھروں پر مشتمل ہے۔ عام طور پر ایک منزل گھر ہیں۔ مکانوں کی

چھتیں مٹی کی ہیں۔ شہر کے مشرق میں دَربار ہال ہے۔ یہ عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس عمارت کے ساتھ میگ زین کی عمارت ہے جہاں فوج کے لئے گولہ بارود رکھا جاتا ہے۔ شہر میں ایک سرائے بھی ہے جہاں گاؤں سے آنے والے مسافر رہتے ہیں۔ دَربار ہال کے آگے جیل خانہ ہے جہاں دو سو قیدی رکھے گئے ہیں۔ شہر کے نچلے حصے میں شاہی باغ ہے۔ باغ کے آگے مدرسہ ہے جبکہ شہر میں دو مسجدیں، دو زیارت گاہیں اور ہندوؤں کا ایک بڑا مندر کھکھانا بن چشمے کے قریب واقع ہے۔ شہر میں پانی کی سپلائی کے لئے ایک نہر نکال کرلائی گئی ہے جبکہ شمال کی طرف ایک مندر کے قریب باؤلی کا پانی بھی لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ شہر کے نچلے حصّے میں ایک کُھلا میدان ہے جو کہ پونچھ کے دَریا تک پھیلا ہوا ہے۔ دُور دُور تک شالی کے کھیت نظر آتے ہیں۔ بیٹس آگے لکھتے ہیں کہ شاہی قلعہ پونچھ ایک ٹیلے پر واقع ہے جو کہ شہر کے جنوبی حصے سے تین سو گز کے فاصلے پر قائم ہے۔ قلعے کی شکل مربع نما ہے۔ ہر کونے پر گنبد بنے ہوئے ہیں، بیچ میں ایک مینار ہے۔ اِس قلعے کی دیواریں ۳۵ فٹ اُونچی ہیں۔ جنوب کی طرف سے اُندر داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تین سو سپاہی ہر وقت قلعے میں رہتے ہیں جہاں راجہ موتی سنگھ اَپنے بیٹے کے ساتھ قیام کرتا ہے۔ پونچھ میں سیاحوں کے لئے ایک بنگلہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

۱۹۲۱ء میں راج ترنگنی پر تحقیق کی خاطر جناب سٹین صاحب پونچھ آئے تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف پُرانے وقتوں کے قلعہ لوہر کوٹ کو ڈھونڈ کر اُس کی نشاندہی پونچھ شہر سے ۳۱ میل شمال مشرق میں کی تھی بلکہ پونچھ علاقہ کے اُن تاریخی گاؤں کا پتہ بھی لگایا تھا جن کا راج ترنگنی میں ذکر ہے۔ اِن گاؤں میں سارمبر (چھمبر کناری) اور اتا لکا (اتولی) بھی شامل ہیں جہاں گیارہویں صدی

عیسوی میں لوہر کوٹ پونچھ کے راجاؤں کی فوج رہا کرتی تھی۔

مندرجہ بالا سفر ناموں کے اقتباسات سے ہمیں علاقہ راجوری اور پونچھ کے عہدِ رفتہ کے حالات، سیاسی صورتِ حال اور عوام کی طرزِ زندگی کے بارے میں اہم اور کارآمد معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد خطۂ پیر پنچال کے دامن میں واقع علاقہ پونچھ اور راجوری تقریباً تقریباً دو حصوں میں بٹ گیا اور آدھا علاقہ حدِ متصارقہ کے اُس پار رہ گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کے ساتھ ساتھ گھر، کنبے اور رشتے بھی بٹ گئے۔ ماں اِس طرف ہے تو بیٹا اُس پار، زمین اُس طرف ہے تو مکان اِس طرف، پانی اُس طرف ہے تو پیاس اِس طرف، درگاہ اِس طرف ہے تو عقیدتمند اُس طرف.......... حدِ متصارقہ کے باعث یہاں کے عوام نہایت متاثر ہوئے اور ایسے مسائل اور مصائب پیدا ہوئے کہ وہ پسماندگی اور ناخواندگی کی دلدل میں دھنستے چلے گئے جس کی وجوہات علاقے کا اہم مرکزوں سے کٹ جانا، مخصوص جغرافیائی حالات، سڑکوں اور پلوں، بجلی اور پانی جیسی بنیادی سہولتوں کی کمی اور سرحد پر نت نئی فائرنگ اور گولہ باری تھی۔لیکن اَب جبکہ سرحد پر خاموشی طاری ہے، اَمن وسکون کی فضا پھر سے قائم ہو رہی ہے۔ایک طرف مغل روڈ اور دوسری جانب راولاکوٹ سڑک کے کھلنے کے امکان روشن ہو رہے ہیں۔تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ علاقہ پونچھ اور راجوری ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا تشخص واپس حاصل کرے گا اور اپنی شناخت اور پہچان بنائے گا جن کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے اور انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

----★----

کتابیات

۱/ "Alexander the great "by Arjan Dass Malik

۲/ "Alexander"by Macrendel Malik

۳/ تاریخِ کشمیر، مصنف محمد دین فوق

۴/ Traveles of Yans Su by Huien Tsang

۵/ راج ترنگنی، مصنف پنڈت کلہن۔

۶/ تاریخ کشمیر اور قنوج، مصنف ابوسعید گردیزی۔

۷/ شیرازہ، شمارہ جنوری تا اپریل ۱۹۷۹ء۔

۸/ تاریخ فرشتہ، مصنف ابوالقاسم۔

۹/ کتاب الہند، مصنف البرونی۔

۱۰/ کشمیر انڈر سلطانز، مصنف محب الحسن۔

۱۱/ زین العابدین، مصنف این کے زتشی۔

۱۲/ تاریخ بڈشاہی، مصنف محمد دین فوق۔

۱۳/ اقبال نامۂ اکبری۔

۱۴/ اقبال نامۂ جہانگیری۔

۱۵/ تاریخ راجگانِ راجور، مصنف ظفر اللہ خان۔

۱۶/ تاریخ اقوامِ پونچھ، منشی محمد دین فوق۔

۱۷/ Indian paintings in Punjab hills مصنف ڈبلیو جی آرچ

۱۸/ Archives-Documents related to Poonch, Kashmir and Punjab, by C. B. Hugal

۱۹/ The northern barrier of India by Fredric Drew

۲۰/ The Gazetteer of Kashmir, by C.E.Bats

۲۱/ Travel in Kashmir, Ladakh and IsKardu by G.T.Wegne

۲۲/ Hydrabad, Skim, Nepal and Kashmir, by Richard Temple

☆☆☆

صباح الدین عبدالرحمٰن

کشمیر

فارسی تاریخ وادب کی روشنی میں

کشمیر کی سب سے پُرانی اور باقاعدہ تاریخ ''راج ترنگنی'' ہے۔ جس کو نویں صدی میں پنڈت رتناساگر نے سنسکرت میں لکھا۔ اسی نام سے کلہن پنڈت نے ۱۱۵۰ء میں ایک تاریخ لکھی جس میں عہدِ قدیم سے ۱۱۵۰ء تک کے واقعات قلمبند کیے۔ اس کو ''راج ترنگنی'' کا دُوسرا حصہ سمجھنا چاہیے۔ یہ سلطان زین العابدین کے عہد میں محکمۂ عدل کے نگران سری بھٹ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ جون راج کے شاگرد سری ور نے اس کا تیسرا حصہ لکھا اور اس کا نام ''زینہ راج ترنگنی'' رکھا۔ اس میں ۱۴۸۶ء تک کے حالات ہیں۔ چوتھے حصے کو پرَاجیہ بھٹ نے مرتب کیا۔ اِس میں ۱۵۱۲ء تک کے تاریخی واقعات ہیں۔ اس کا نام ''راجاولی ٹیک'' ہے۔ اِن چاروں حصوں کا فارسی ترجمہ اکبرِ اعظم کے عہد میں ہوا۔ قدیم زمانے میں ہندو اور بودھ راجاؤں کی حکومت ایک عرصہ دراز تک رہی جس کے بعد مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ مغل بادشاہوں سے پہلے یہاں مسلمان سلاطین دوسو بیاسی سال تک حکومت کرتے رہے۔ اِن سلاطین کی معاصر تاریخ

صرف ''تاریخ کشمیر'' مؤلفہ سید علی ہے، جو میری نظر سے نہیں گزری۔ ''ملفوظاتِ تیموری'' سے قطع نظر کشمیر کی اور تاریخیں عہدِ مغلیہ ہی میں لکھی گئیں، جو زیادہ تر سیاسی ہیں۔ اِس مقالہ میں سیاسی واقعات کا مطلق ذکر نہیں۔ صرف ان ہی چیزوں کا ذکر ہے جن سے کشمیر جنتِ نظیر کی رعنائیوں اور دل آویزیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

''راج ترنگنی کے مصنّف نے لکھا ہے کہ تینوں لوک میں کیلاش سب سے زیادہ عمدہ لوک ہے اور کیلاش کا سب سے زیادہ عمدہ حصہ ہمالیہ ہے اور ہمالیہ میں سب سے زیادہ عمدہ مقام کشمیر ہے۔ یہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، اس لئے یہاں کے آدمیوں کو عقبیٰ کے خوف کے سوا دُنیا کا کوئی خوف نہیں۔ دریاؤں میں نہانے کے لئے جاڑوں میں گرم پانی اور گرمیوں میں سرد پانی موجود رہتا ہے۔ یہاں کے دریاؤں میں تلاطم نہیں ہے۔ بڑے بڑے پاٹ شالاؤں کی عالی شان عمارتیں ہیں۔ زعفران کے کھیت ہیں۔ برفانی علاقے ہیں۔ اَنگور یہاں کے اچھے ہوتے ہیں جو بہشت میں بھی نہ ہوں گے۔ یہاں بہت سے مقدّس مقامات ہیں۔ ایک پانی کی سیل بھی ہے جو ایک پہاڑ پر شام کو رواں ہوتی ہے۔ یہ نیک آدمیوں کو دکھائی دیتی ہے، بُرے آدمیوں کو نظر نہیں آتی۔ یہاں دیوی سرسوتی ایک تال میں ہنس کی شکل میں دیوی نہنگ کی چوٹی پر ہے، جہاں سے گنگا نکلتی ہے۔ پھر یہاں نندی میں ایک شاردا یعنی دُرگا ہے۔ جس کو دیکھ کر شیریں بیانی حاصل ہوتی ہے۔

ملفوظاتِ تیموری

''راج ترنگنی'' کے بعد راقم کی نظر ملفوظاتِ تیموری پر جاتی ہے، تیمور

(التوفی ۱۳۹۵ء) کی خودنوشتہ سوانح عمری ہے۔ یہ چغتائی...... میں لکھی گئی۔ لیکن اس کا فارسی ترجمہ ابو طالب حسینی نے شاہ جہاں کے عہد میں کیا۔ اُس نے کتاب کو بادشاہ کے نام سے معنون کیا۔ یہ فارسی ترجمہ زیادہ مقبول ہوا اور اسی سے عام طور معلومات حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس میں تیمور کے قلم سے کشمیر سے متعلق مفید حالات درج ہیں۔ تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وسطِ ایشیا کی طرف اس کی واپسی جموں و کشمیر ہی کی طرف سے ہوئی۔ کشمیر پہنچا تو یہاں کے بارے میں لکھتا ہے:

"کشمیر ایک ایسا ملک ہے جو بے نظیر ہے۔ اس کے بیچ میں ایک بہت بڑا اور آباد شہر نغر (سری نگر مُراد) ہے۔ اس ملک کے حکمران اسی شہر میں رہتے ہیں۔ یہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں جو لکڑی کی بنی ہوئی ہیں اور چار چار پانچ پانچ منزلوں کی ہیں اور یہ بہت مضبوط ہوتی ہیں جو پانچ سے سات سو برس تک قائم رہتی ہیں۔ اس شہر کے بیچ سے ایک بہت بڑا دریا بہتا ہے اور اس کے دونوں ساحلوں پر شہر آباد ہے۔ اس دریا کا منبع حدودِ کشمیر ہی کی ایک جھیل میں ہے جس کی چوڑائی اور لمبائی کچھ فرسنگ تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کا منبع ویرناگ کہلاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں نے اس دریا پر تین پل بنائے ہیں جو لکڑی، پتھر اور کشتیوں کے ہیں۔ سات پل تو شہر کے اندر ہیں اور بقیہ اس کے نواح میں ہیں۔ یہ دریا جب کشمیر سے نکل جاتا ہے تو پھر جس شہر سے گزرتا ہے اسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً دریائے دندانہ، دریائے جہلم وغیرہ۔ یہ دریا ملتان کے بالائی علاقے میں جا کر چناب سے مل جاتا ہے۔ پھر یہ دونوں ملتان کے زیریں حصہ سے گزر کر راوی میں مل جاتے ہیں دریا ۔ بیاس دوسرے حصہ سے آتا

ہے اور پھر دونوں دریاؤں میں مل جاتا ہے اور یہ تینوں دریا مل کر اوچھ کے پاس دریائے سندھ میں جاکر گرتے ہیں"۔

"ظفرنامہ" اور کشمیر

تیمور کی وفات کے تیس سال بعد شرف الدین یزدی نے "ظفرنامہ" ۱۴۲۴ء میں لکھی۔ یہ تیمور کے حالات زندگی کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے اور گو اِس کے زیادہ تر واقعات "ملفوظاتِ تیموری" سے ماخوذ ہیں پھر بھی اس سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا مؤلف تیمور کی مہم کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر سے متعلق بہت سی جغرافیائی اور نباتاتی تفصیلات لکھتا ہے جس کے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

"ولایتِ کشمیر چہارم اقلیم کے وسط سے قریب ہے۔ خطِ استوا سے کشمیر کا عرض ۳۵ درجہ اور اس کا طول جزائر سعدا سے ۱۰۵ درجہ ہے۔ چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اِس کے جنوب میں ہندوستان ہے۔ شمال میں بدخشان اور خراساں ہیں۔ مغرب میں اوغانی (مرادافغانی) اقوام آباد ہیں۔ مشرق میں تبت ہے۔ اس کے مسطح میدان کا طول پورب سے پچھم تک تقریباً چالیس فرسخ ہے۔ اس مسطح علاقہ میں دس ہزار گاؤں ہوں گے جہاں بے اِنتہا خوشگوار چشمے پائے جاتے ہیں۔ سبزہ زاروں کی بھی کثرت ہے۔ پورے ولایت میں ایک لاکھ قریئے ہوں گے۔ آبادی بڑی گھنی ہے۔ زمین پر کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کا حُسن و جمال تمام دنیا میں مشہور ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں بکثرت میوہ دار درخت ہیں جن کے پھل بہت خوش ذائقہ اور صحت کے لئے مفید ہیں۔ یہاں کی آب وہوا سرد ہے، اس لئے یہاں گرم ممالک کے پھل اور میوے مثلاً خرما، نارنج ؟؟

اور لیموو غیرہ نہیں ہوتے۔ لیکن پاس کے گرم ممالک سے آتے رہتے ہیں۔ حکام جہاں رہتے ہیں اس کا نام نغر (مرادسری نگر) ہے۔ اس کا محل وقوع بغداد سے مشابہ ہے۔ شہر کے بیچ سے ایک بہت بڑی نہر بہتی ہے۔ جس کو بہت کہتے ہیں۔ یہ نہر دجلہ سے بڑی ہے۔ اس کا پانی بہت ہی قوی اور عمدہ ہے۔ اس کا منبع اسی ملک میں ہے۔ اس کو چشمہ ویر کہتے ہیں۔ شہر کے باشندے اس نہر کے کنارے ہزاروں کشتیاں زنجیروں سے بندھی رکھتے ہیں اور ان پر ہی آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ نہر کشمیر کی سرحد سے گزرنے کے بعد دندانہ کہلاتی ہے اور ملتان کے بالائی حصہ میں جاتی ہے جہاں پہنچ کر دریائے چناب سے مل جاتی ہے اور پھر بیاس سے مل کر اوچہ کی طرف جاتی ہے۔ ان سب کو دریائے سندھ کہتے ہیں جو ٹھٹھ کے دامن سے ہوکر دریائے عمان میں جا گرتا ہے۔ حکمتِ الٰہی سے یہ ولایت پہاڑوں سے ایسا گھِرا ہوا ہے کہ یہاں کے باشندے دشمنوں سے بالکل بے خطر ہوکر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس ولایت سے تین راہیں کھلی ہیں۔ ایک راستہ خراساں کو جاتا ہے جو بہت ہی دشوار گذار ہے۔ جانوروں کی پشت پر ادھر سے مال و اسباب کا لے جانا ممکن نہیں۔ یہاں کے مزدور اپنے کاندھوں پر مال و اسباب لے جاتے ہیں اور ایسی جگہوں تک پہنچادیتے ہیں جہاں وہ جانوروں پر لادے جاسکتے ہوں۔ دوسرا راستہ ہندوستان کی طرف سے ہے لیکن یہ بھی خراساں کی طرح بہت ہی دشوار گذار ہے۔ تیسرا راستہ تبت کی طرف جاتا ہے جو نسبتاً آسان تر ہے لیکن اس راستہ میں جانوروں کے لئے زہریلی گھاس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ملتا ہے۔ اس لئے سوار اپنی سواری کے تلف ہوجانے کے خوف سے اس راستہ سے بھی سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ (ظفر نامہ جلد دوم، ص ۱۸۱-۱۷۷،

مطبوعہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)''

''تاریخِ رشیدی'' اور کشمیر:

''ظفر نامہ'' کے بعد کشمیر سے متعلق مفید معلومات ''تاریخِ رشیدی'' میں ملتی ہیں جو ۱۵۴۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس کا مصنف مرزا حیدر دوغلت کشمیر کا ایک بااقتدار حاکم بھی رہا۔ وہ بابر کا خالہ زاد بھائی تھا اور بابر ہی کی طرح اس کی زندگی بھی جنگ وجدل میں گزری۔ وہ کاشغر کے سلطان سعید خان کی ملازمت میں تھا تو کئی بار لداخ پر فوج کشی کی اور کشمیر کی حدود میں بھی داخل ہوا لیکن یہاں اس کے قدم جم نہ سکے اور جب اس نے کاشغر کی ملازمت چھوڑی تو وہ بابر کے لڑکے کامران سے وابستہ ہوکر لاہور کا حاکم ہوا۔ اس وقت کشمیر کی اندرونی سیاسی حالت اطمینان بخش نہ تھی جس سے بددِل ہوکر بعض کشمیری امراء نے کامران سے امداد طلب کی۔ کامران مرزا حیدر دوغلت کے اصرار کے باوجود خاطر خواہ مدد نہ دے سکا اور جب حیدر مرزا دوغلت کامران کی ملازمت چھوڑ کر ہمایوں کے ساتھ جُڑا تو ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد سندھ کے صحرا میں جانکلا لیکن مرزا حیدر نے کشمیر کی طرف رُخ کیا اور دشوار گذار راہوں سے گزر کر جب ۹۴۷ھ (نومبر ۱۵۴۰ء) میں سری نگر پہنچا اور بالآخر کشمیر کا سلطان بن بیٹھا اور وہاں گیارہ سال تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں کشمیر میں بڑی خوشحالی رہی۔ وہ اہلِ سیف ہونے کے ساتھ اہلِ قلم بھی تھا۔ اس کی ''تاریخ رشیدی'' ایک مشہور تاریخ ہے۔ اس میں وسطِ ایشیا کے چغتائیوں کے مفصل حالات ہیں جن کے لکھنے میں وہ کچھ ایسا اُلجھا رہا کہ وہ اس کتاب میں کشمیر کے حالات بہت زیادہ پھیلا کر نہ لکھ سکا پھر بھی اس نے کشمیر سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے

بہت ہی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کے ایک باب میں ''ظفرنامہ'' کے وہ اقتباسات بھی دیئے ہیں جو کشمیر سے متعلق ہیں لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ ''ظفرنامہ'' کا مؤلف کشمیر نہیں آیا۔ اس نے سیاحوں کے بیانات پر بھروسہ کرکے تفصیلات لکھی ہیں جو بہت زیادہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے خود یہاں کے خاص خاص حالات قلمبند کئے جن کے مستند ہونے پر اُس کو پورا اعتماد ہے۔ لیکن اُس نے اِن کو قلمبند کرتے وقت کوئی ترتیب نہیں رکھی ہے۔ کہیں تو اس علاقہ میں اس کی جنگی مہمات کا ذکر ہے۔ کہیں کشمیر کی جغرافیائی، کہیں عمرانی، کہیں مذہبی اور کہیں سیاسی حالات ہیں۔ یہاں کا جغرافیہ بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

''کشمیر دُنیا کے مشہور ملکوں میں سے ہے۔ طرح طرح کی خوبیوں اور نادر باتوں کی وجہ سے مشہور ہے لیکن اُپنی شہرت کے باوجود یہاں کے حالات اوروں کو معلوم نہیں ہیں...... محرم ۹۵۰ھ (۴۴-۱۵۴۳ء) میں جبکہ میں نے اِس دِل آویز ملک کو فتح کرلیا ہے اور یہاں کی قابلِ دید چیزیں دیکھ لی ہیں، جو کچھ لکھوں گا وہ چشم دید ہوگا...... کشمیر کا علاقہ جنوب مشرق سے شمال مغرب تک پھیلا ہوا ہے اور اِس کا مسطح میدان سو کروہ لمبا ہے اور چوڑائی میں کہیں بیس دس کروہ ہے۔ اس کی زمین چار قسم کی ہے۔ ایک حصہ میں زراعت ہوتی ہے، جو آبی کہلاتی ہے۔ دوسرے حصہ کو بلمی کہتے ہیں جس میں سینچائی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ تیسرے حصہ میں باغات ہیں اور چوتھا حصہ میدان ہے۔ مسطح میدان میں رطوبت کی وجہ سے غلہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس میں کھیتی نہیں کی جاتی ہے۔ میدان میں دریا کے کنارے بنفشہ، نرگس، سنبل، سوسن، نسرین، نسترن اور یاسمن وغیرہ

کے پھول بکثرت پائے جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں حرارت اتنی معتدل ہوتی ہے کہ پنکھے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ برف باری کے باوجود جاڑے کا موسم بھی معتدل ہوتا ہے اس لئے پوستین استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کی سردی محض گرمی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہوتی ہے۔ جب کبھی آفتاب ابر کے اندر ہوتا ہے تو البتہ جسم کو گرم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کشمیر جیسا ملک نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے، جہاں چاروں موسم کی آب وہوا ایسی خوشگوار ہو''۔

مرزا دوغلت سری نگر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں جو ساکھو کی بنی ہوئی ہیں۔ اکثر مکانات پانچ پانچ منزلوں کے ہیں، ہر منزل میں ایوان، مجرے گیلریاں اور برجیاں ہیں۔ ان مکانات کے بیرونی حصوں کو دیکھ کر لوگ متحیر رہتے ہیں لیکن اندرونی حصے بیرونی حصوں کی طرح خوبصورت نہیں ہوتے۔ شہر کے بازاروں اور سڑکوں کے فرش پتھر کے ہیں۔ یہاں کے بازار دوسرے شہروں کی طرح نہیں ہیں۔ بزازوں اور خوردہ فروشوں کے علاوہ تمام تاجر اپنے گھروں کے اندر تجارت کرتے ہیں۔ بقال، ؟؟؟؟، شراب فروش اور ایسے تاجر جن کی وجہ سے بازاروں کی زینت ہوتی ہے، دکانوں پر نہیں بیٹھتے۔ اس شہر کی آبادی دوسرے بڑے شہروں کے برابر ہے۔

پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا حیدر دوغلت لکھتا ہے کہ پھلوں میں ناشپاتی، شہتوت، میٹھے اور کھٹے مکوہ عام طور سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے سیب بہت اچھے ہوتے ہیں، اور دوسرے پھل مثلاً آلو، گیلاس، انگور، عناب، ؟؟؟؟، پستہ، چار مغز اور انجیر وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کشمیر کی عجیب چیزوں میں شہتوت کے درخت ہیں جن کی پتیوں سے ریشم تیار ہوتا ہے۔ اسی

لئے یہاں کے لوگ شہتوت نہیں کھاتے بلکہ ریشم نکالنے کے لئے ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ فصل کے وقت پھلوں اور میووں کی پیداوار اس کثرت سے ہوتی ہے کہ یہاں ان کی خرید وفروخت کا دستور نہیں ہے کسی کے پاس باغ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ یہاں باغات میں چہار دیواری نہیں ہوتی ہے کیونکہ کسی کو پھل کھانے سے روکا نہیں جاتا ہے۔

عجائبات:

مرزا حیدر نے کشمیر کے عجائبات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں سرفہرست یہاں کے بُت خانوں کو رکھا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو پچاس بتائی ہے۔ یہ تمام عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور حیدر مرزا کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ پتھر کے ٹکڑے کاٹ کر؟؟ کے بغیر جوڑے گئے تھے اور یہ اُوپر نیچے اس طرح رکھے گئے تھے کہ کہیں دراڑ نظر نہیں آتی تھی۔ اتنی بھی نہیں کہ باریک سی باریک چیز بھی اس میں جاسکے۔ یہ پتھر تین سے بیس گز تک چوڑے اور ایک گز موٹے تھے۔ تمام مندر ایک ہی طرح کے بنے تھے۔ ان میں مربع احاطے بھی ہوتے ہیں جن میں بعض جگہوں کی دیوار کی بلندی تیس گز تک ہوتی اور ہر ضلع کم وبیش تین سو گز ہوتا۔ احاطہ کے اندر عمارتیں سنگی ستونوں پر قائم ہوتیں۔ ان ستونوں کے اوپر مربع ستون ہوتے۔ یہ مختلف حصے ایک ہی پتھر کے بنے ہوئے ستونوں پر محرابیں ہوتیں۔ ہر محراب کی چوڑائی تین چار گز ہوتی جس کے نیچے ایک بڑا کمرہ اور دروازے کا راستہ ہوتا ہے محراب کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں چالیس پچاس گز اونچے ستون ایک ہی پتھر کے بنے ہوتے۔ پھر ان کے اوپر بھی ایک یا دو پتھروں کے چار ستون کھڑے نظر آتے۔ کمروں کے اُندرونی اور بیرونی

حصوں کی شکل موجودہ دور کی برساتی ایسی ہوتی۔ ان تمام عمارتوں پر نقش نگار کے علاوہ تصویریں بھی ہوتیں جو بعض تو ہنستی اور بعض روتی نظر آتیں۔ جابجا بلند کرسی اور اس کے اوپر اونچا گنبد بھی ہوتا۔ ان عمارتوں کی خوبیاں بیان نہیں کی جاسکتی ہیں۔ دُنیا میں ان کی ایسی عمارتیں ایک بھی نہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ یہاں ایسی ایک سو پچاس عمارتیں ہیں۔

ویرناگ:

دوسری عجیب چیز کشمیر کے پورپ کو ضلع ہے جو برناگ یعنی ویرناگ کہلاتا ہے۔ یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں ایک غار حوض کی شکل میں ہے۔ اس کی تہہ میں ایک سوراخ ہے۔ یہ حوض تمام سال خشک رہتا ہے لیکن جب آفتاب برج ثور میں داخل ہوتا ہے تو حوض کے سوراخ سے پانی دن میں تین بار جوش کھا کر نکلتا ہے۔ اس طرح کے حوض پانی سے لبالب بھر جاتا ہے۔ پانی کا جوش اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے زور سے دو تین میل تک قرب و جوار کی زمین ہلنے لگتی ہے۔ تھوڑے زمانے کے بعد یہ جوش کم ہو جاتا ہے، اور فصل ثور کے بعد حوض بالکل خشک ہو جاتا ہے اور سال بھر اسی حالت میں رہتا ہے۔ حوض کے سوراخ کو اینٹوں پتھروں اور چونے سے مضبوطی کے ساتھ بند کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جس زمانے میں پانی کا اُبال ہوتا ہے، وہ فوارہ کی پرجوش روانی سے پانی تمام چیزوں کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔

درخت بید:

تیسری عجیب چیز وہ بید کا درخت ہے جو کشمیر کے مشہور گاؤں ناگام میں واقع ہے۔ یہ درخت اس قدر بلند ہے کہ بڑے بڑے تیرانداز اپنے تیر اس کے

سرے تک نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی ایک شاخ پکڑ کر اس کو ہلاتا ہے تو یہ اُوپر سے جڑ تک ہلنے لگتا ہے۔

چشمہ دیوسرہ:

چوتھی عجیب چیز دیوسرہ کا مقام ہے۔ یہاں ایک چشمہ بیس گز مربع ہے۔ اس کے اطراف میں سرسبز سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ شہر کے لوگ اس چشمہ سے فال نکالتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ایک کوزہ میں چاول پکا کر اس کو چشمہ میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ کبھی پانچ سال تک پانی کی تہہ میں پڑا رہتا ہے اور کبھی اِسی روز نیچے سے پانی کی سطح پر چلا آتا ہے۔ کوزہ کھول کر دیکھا جاتا ہے۔ اگر پکا ہوا چاول اپنی اصلی حالت پر برقرار رہتا ہے تو یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے اور اگر چاول کی شکل میں تغیر ہوجاتا ہے تو یہ بُرا فال تصور کیا جاتا ہے۔

تالاب اُولر:

اس تالاب کا دَور سات فرسخ ہے۔ اس کے بیچ میں سلطان زین العابدین نے ایک عمارت بنائی ہے۔ اس طرح کہ پہلے تالاب میں پتھر بچھائے گئے اور اس کے اُوپر چار سو گز مربع اور دس گز بلند ایک پختہ چبوترہ بنایا گیا جس پر نہایت دلکش عمارتیں تعمیر کی گئی۔ اِن کے چاروں طرف سایہ دار اور فرحت بخش درخت نصب کئے گئے۔ اِس کے ایسی دل کش عمارت کہیں اور رُوئے زمین پر موجود نہیں۔

راج دان:

سلطان زین العابدین نے ایک دوسری عمارت سرینگر میں تعمیر کروائی ہے جس کو اہلِ کشمیر اپنی زبان میں ''راج دان'' کہتے ہیں۔ اس مکان میں بارہ

درجے ہیں۔ بعض درجوں میں حجروں، کھڑکیوں اور دالانوں کی تعداد پچاس تک ہے اور پوری عمارت لکڑی کی ہے۔ دُنیا میں بہت سی خوبصورت عمارتیں ہیں۔ مثلاً تبریز میں سلطان یعقوب کی ہشت بہشت، ہرات میں باغ زاغان، باغ سفید، باغ شہر، سمرقند میں رائے افزاء باغ، دلکشا باغ اور تولدی باغ۔ ممکن ہے کہ ان کے طرز سری نگر کی مذکورہ عمارت سے بہتر ہوں لیکن عجیب وغریب منظر میں سرینگر کی اس عمارت کا کوئی مقابلہ نہیں۔''

مرزا حیدر دوغلت سلطان العابدین کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے کشمیر میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کر کے اس کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ اسی کے عہد میں سری نگر باضابطہ ایک شہر ہوگیا جو اَب تک قائم ہے۔ اسی کے زمانے میں سنگ تراشی، بوتل سازی، تابدان تراشی، حکاکی اور زرگری وغیرہ کو ایسی ترقی ہوئی کہ سمرقند کو چھوڑ کر ماوراء النہر کا کوئی شہر ان صنعتوں میں کشمیر کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے[1]۔

آئینِ اکبری اور کشمیر:

کشمیر سے متعلق مفید معلومات ''تاریخ رشیدی'' سے زیادہ ''آئینِ اکبری'' میں ہیں، جس کو ابوالفضل نے اکبر کے عہد میں مرتب کیا۔ اَپنے زمانے کے کشمیر کا جغرافیہ بتاتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ صوبہ کابل میں ایک سرکار ہے جس کا طول قنبر دیر سے کشن گنگ تک ایک سو بیس کوس اور عرض دس سے

---

[1] (ان تمام معلومات کے لئے دیکھو ''تاریخ رشیدی'' قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، نیز انگریزی ترجمہ از ان-ایلیس وای ڈی، روس ص ۴۳-۴۲۴ ''تاریخ فرشتہ'' جلد دوم ص ۳۳۳-۳۷۔ اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، جلد چہارم ص ۵۱-۷۴۸)(ص ع ر)

پچیس کوس تک ہے۔ اِس کے پورب میں پُرستان اور دریائے چناب ہیں۔ دکھن پورب میں بانہال اور کوہ جموں ہیں۔ اُوتر پورب میں تبت کلان، پچھم میں پکھلی اور دریائے کشن گنگ۔ پچھم اور دکھن میں گھکر اور پچھم و اُوتر میں تبت خورد واقع ہیں۔ اِس کے چاروں طرف اُوتری پہاڑ کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان سے کشمیر جانے کے ۲۶ راستے ہیں لیکن بھنبھر اور پکلی کی راہیں اچھی ہیں اور سواریوں پر سفر کیا جاسکتا ہے۔ بھنبھر کی راہ قریب تر ہے۔ اس کی تین شاخیں ہیں، ہستی وتر، پیر پنچال[1] اور تنگ تلہ۔ اسی سلسلہ میں ابوالفضلؒ نے ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ پیر پنچال کے پہاڑ پر کسی بیل یا گھوڑے کو مار دیا جاتا ہے تو ابر و باد کا طوفان فوراً اُٹھتا ہے اور بارش کے ساتھ اولے بھی گرنے شروع ہوجاتے ہیں۔

دل فریبی:

ابوالفضلؒ نے کشمیر کی دلفریبی کا ذکر بہت ہی انشاپردازانہ انداز میں کیا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ ایک دلکش ملک ہے۔ اس کو ایک باغ ہمیشہ بہار لکھنا مناسب ہے۔ اس کو نازک مزاجوں کی عشرت گاہ اور گوشہ نشینوں کا خلوت کدہ کہنا بھی صحیح ہے۔ اس کے چشمے بہت ہی خوشگوار، آبشار سامعہ اَفروز اور ہَوا بہت ہی فرحت بخش ہے۔ بارش اور برف باری میں یہ ایران وتوران اور موسمِ برسات میں ہندوستان سے مشابہہ ہے۔ ملک کی زمین آبی، للمی (خشک) اور جلکہائی (؟) ہے۔ جورُوح کو فرحت بخشتی ہے۔ بنفشہ گل سرخ اور نرگس کے خودرو جنگل لہلہاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے پھولوں کا شمار کرنا اندازہ سے باہر ہے۔ یہاں کے بہاروخزاں دونوں موسم بے حد دلفریب ہیں۔

کشمیر کے سلسلہ میں ابوالفضلؒ نے بہت سی اور پُر اَز معلومات باتیں لکھی

ہیں جن کو ترتیب کے ساتھ ہم علیحدہ علیحدہ عنوانات قائم کرکے لکھتے ہیں۔

مکانات:

یہاں کے تمام مکانات لکڑی کے بنے ہوتے ہیں جن میں چار چار اور اِن سے بھی زیادہ منزلیں ہوتی ہیں۔ مکانات کی چھتوں پر گلِ لالہ ضرور اُگائے جاتے ہیں جو موسمِ بہار میں کِھل کر بے حد لطف انگیز منظر پیش کرتے ہیں، مکان کے سب سے نیچے حصّے میں جانور اور دوسرے اَسباب رکھے جاتے ہیں۔ دوسرے حصہ میں گھر والے خود رہتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے حصوّں میں قیمتی سامان ہوتے ہیں۔ لکڑی کی کثرت اور زلزلوں کی وجہ سے اینٹ اور پتھر کے مکانات نہیں بنائے جاتے ہیں۔ ملک بے حد آباد ہے اور گو سرمایہ زندگی قلیل ہوتا ہے، پھر بھی یہاں چوری اور گداگری بہت کم ہے۔

پھل:

شاہ آلو اور شہتوت کے سوا اور دوسرے پھل بکثرت پائے جاتے ہیں۔ خربوزہ، سیب، شفتالو اور زرد آلو بہت ہوتے ہیں۔ انگور بھی بکثرت ہوتا ہے۔ لیکن اس کی عمدہ قسم کم ہوتی ہے۔ کشمیر کے باشندے توت کم کھاتے ہیں اور اِس کی پتیاں ریشم کے کیڑے تیار کرنے کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہیں اِن کا تخم گلگت اور تبت کو چک سے آتا ہے۔ گلگت کا تخم نسبتاً زیادہ عمدہ اور بارآور ہوتا ہے۔

خوراک:

یہاں کی خوراک میں چاول، شراب، مچھلیاں اور مختلف قسم کی ترکاریاں استعمال کی جاتی ہیں۔ عام طور سے لوگ ترکاریاں سُکھا کر محفوظ رکھتے ہیں۔ پختہ چاول کو ایک رات گزار کر کھاتے ہیں۔ یہاں شالی، چاول بکثرت پیدا ہوتا

ہے۔لیکن اس کی بہترین قسم دستیاب نہیں ہوتی۔ گیہوں چھوٹا، سیاہ اور کم ہوتا ہے۔ چنااور جَو بالکل نہیں پائے جاتے۔کدی (؟) سے مشابہ ایک قسم کا بکرا ہوتا ہے جو یہاں ہنڈو کہلاتا ہے۔اس کا گوشت نازک، مزیداراور زود ہضم ہوتا ہے۔

لباس:

لباس میں عام طور سے پوستین کا رواج ہے۔ایک پوستین کئی سال تک کام دیتی ہے۔

جانور:

یہاں کے گھوڑے چھوٹے لیکن مضبوط ہوتے ہیں۔دشوار گزار راستوں کو خوبی سے طے کرتے ہیں۔ ہاتھی، اونٹ نہیں پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی گائے سیاہ اور بدشکل ہوتی ہے لیکن اس کا دُودھ اور گھی نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ سانپ، بچھواور دوسرے زہریلے جانور نہیں پائے جاتے ہیں۔

تجارت:

بڑے شہروں کی طرح یہاں بھی مختلف قسم کے پیشہ ور ہیں۔ بازار میں خرید وفروخت کا دستور بہت کم ہے۔ تاجر اُپنے اُپنے مکانوں میں بیٹھ کر سودا فروخت کرتے ہیں۔ یہاں طرح طرح کے پشمینے تیار ہوتے ہیں۔ یہاں سے شال تمام دُنیا میں تحفہ کے طور پر بھیجی جاتی ہے۔ بارکشی عام طور پر کشتیوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔اِنسان بھی بھاری بوجھ اپنے اُوپر لاد کر دشوار گذار راہ طے کرتے ہیں۔ملاّح اور بڑھئی اُپنے اُپنے پیشوں میں بے حد کامیاب ہیں۔

شکار:

کمان کشی کا عام رواج ہے اور یہاں کے لوگ اس قدر عادی ہیں کہ

جہاں کہیں گوریا نظر آتی ہے فوراً اپنی کمان کھینچ لیتے ہیں۔اسی لئے یہاں گوریا کا نام ونشان تک نہیں۔ یہاں کے لوگ کشتیوں میں تالابوں کی سیر کرتے وقت اپنے ساتھ شکاری پرندے بھی رکھتے ہیں جو ہوا میں اُڑ کر مرغابیوں کو پکڑتے ہیں اور کشتیوں میں لے آتے ہیں۔کبھی یہ تالاب ہی میں مرغابیوں کو اَپنے پنجوں سے دَبا کر ان کی پیٹھ پر سوار ہوجاتے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بارہ سینگوں، چکوروں اور چیتوں کا بھی شکار کرتے ہیں۔

علوم:

کشمیر کی مقامی زبان خاص ہے۔لیکن ہندوؤں کے علوم وفنون کی کتابیں سنسکرت میں لکھی گئی ہیں۔اہلِ کشمیر کا خط بھی علیحدہ ہے۔جس میں وہ خط وکتابت کرتے ہیں۔وہ ''توز'' پر لکھتے ہیں جوایک درخت کی چھال ہے۔اسی سے وہ اَوراق بھی بناتے ہیں جن پر لکھی ہوئی عبارتیں عرصے تک قائم رہتی ہیں۔قدیم کتابیں توزی اَوراق ہی پر لکھی ہوئی ہیں۔ان کی سیاہی بھی پائیدار ہوتی ہے۔دھونے سے بھی نہیں چھٹتی۔اگرچہ قدیم زمانے میں ہندی علوم رائج تھے لیکن اَب دوسرے علوم وفنون بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہاں رمل اور اختر شناسی ہندوستان ہی کے علوم کے مطابق ہیں۔

ہندوؤں کی زیارت گاہیں:

یہاں مہادیو کی ۴۵، بشنو کی ۶۴، برہما کی ۳/اور دُرگا کی ۲۲ زیارت گاہیں ہیں۔سات سو جگہوں پر سانپ کی شکلیں ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ان کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔

تیرتھ گاہیں اور بُت خانے:

۱۔قصبہ پرنگ کے قریب ایک طویل دُرّہ ہے۔ اس میں ایک حوض، سات گز لمبا اور چوڑا ہے۔ قدِ آدم گڈھا بھی ہے۔ ہندو اِس کو بہت بڑی تیرتھ گاہ مانتے ہیں۔ حیرت انگیز اُمر یہ ہے کہ یہ حوض گیارہ مہینے خشک رہتا ہے اور اردی بشت ماہ الٰہی (یعنی اپریل میں) دو چشمے پھوٹتے ہیں۔ ایک چشمہ ایک کونے کے غار سے جوش کھاتا ہے۔ اس کی شکل ہاون کی سی ہے۔ اس غار کو سندھ براری کہتے ہیں۔ دوسرا چشمہ دوسرے گوشہ سے پھوٹتا ہے جو ستہ بشی کہلاتا ہے۔ یہ حوض اِن ہی دو چشموں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کبھی تو یہ چشمے ایک پہر تک جوش مارتے ہیں اور کبھی صرف ایک لمحہ تک۔ اس کے بعد پانی کے جوش میں کمی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ روزانہ صبح دوپہر اور شام تین بار پانی بڑھتا ہے۔ پُجاری رنگ رنگ کے پھول ہر چشمہ کے نام سے جدا جدا پانی میں ڈالتے ہیں اور پانی کا زور کم ہو جانے کے بعد ہر چشمہ مخصوص پھول اِسی کی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔ اِسی کے پاس ایک اور چشمہ ہے جو چھ مہینے تک خشک رہتا ہے۔ ایک مقررہ دن کاشت کار اس چشمہ کے کنارے جا کر شکرانے کے طور پر ایک بکرا یا بھیڑ کی قربانی کرتے ہیں۔ اِس کے بعد چشمہ سے پانی پھوٹتا اور آس پاس کے پانچ گاؤں کو سیراب کرتا ہے۔ اگر پانی سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر دوسری قربانی کی جاتی ہے اور پانی خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اسی کے پاس ایک دوسرا چشمہ بھی ہے جس کو؟؟؟ ناگ کہتے ہیں۔ اس کا پانی بہت ہلکا، ٹھنڈا اور ہاضم ہے۔ اگر کوئی بھوکا شخص اس کا پانی پی لیتا ہے تو شکم سیر ہو جاتا ہے۔ اگر شکم سیر اس کا پانی استعمال کرتا ہے تو اس کو فوراً

بھوک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس چشمہ سے تھوڑے فاصلہ پر سات چشمے اور ہیں جو اَپنی رَوانی کی پوری بہار دِکھاتے ہیں۔ اس کے بیچ میں ایک خوبصورت پتھر کا بُت خانہ ہے۔ جس کے گرد عبادت گزار ایک بہت بڑی آگ روشن کرتے ہیں اور خدا کا تقرب حاصل کرنے کے خیال سے مَردانہ وار جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے اوتر جانب ایک پہاڑ ہے جس میں لوہے کی کان ہے۔

۲۔رانچ کے مضافات میں موضع پنج برارہ میں بھی ایک بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے۔ پہلے یہ ایک بہت بڑا شہر تھا جس میں ایک عجیب غریب مندر تھا۔ اس کے قریب ایک دلکش سبزہ زار ہے جو نندی مرگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سبزہ زار کی ہمواری، اس کے پھولوں کی دلفریبی اور آب و ہوا کی فیض بخش تاثیر تعریف کے لائق ہیں۔

۳۔موضع زیون میں ایک چشمہ اور حوض بھی ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تخم زعفران اِسی چشمہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ موسم کے شروع میں آ کر اس میں گائے کا دودھ ڈالتے ہیں۔ اگر دُودھ پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتا ہے تو نیک فال سمجھتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق زعفران کی پیداوار کی امید رکھتے ہیں۔ اور اگر دُودھ پانی کی سطح پر رہ جاتا ہے تو اِس کو شگونِ بد سمجھتے ہیں۔

۴۔موضع کوکھتر میں ایک عجیب وغریب چشمہ کے گرد ایک بُت خانہ بھی ہے۔ اِس چشمہ کا پانی کم ہو جاتا ہے تو مہادیو کی ایک مندلی مورت ظاہر ہوتی ہے۔ اس چشمہ کا پانی متغیر نہیں ہوتا ہے۔ اس کے نواح میں ایک بہت بلند پہاڑ ہے جہاں کشمیری بارہ سنگے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس پر ایک نمکین

چشمہ بھی ہے۔

۵/مٹن ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ ایک زمانے میں یہاں تک بہت بڑا بُت خانہ تھا۔ پہاڑی پر ایک چھوٹا حوض ہے جس کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چاہِ بابل اسی مقام پر واقع ہے لیکن اَب صرف ایک گڑھے کا نشان پایا جاتا ہے۔ پہاڑی کے نشیب میں ایک چشمہ ہے جس کے سِرے پر ایک تالاب بنادیا گیا ہے۔ تالاب میں بے شمار مچھلیاں ہیں۔ مقامی تقدس کی وجہ سے مچھلیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔ اس کے پہلو میں ایک غار بھی ہے جس کی گہرائی کا کچھ پتہ نہیں۔

۶/تبت کلاں اور قصبہ دچھن پارہ کے درمیان ایک غار ہے جس میں اَمرنات نامی برف کی ایک مورت ہے۔ یہ بھی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے۔ جب نیا چاند اُفق پر نمودار ہوتا ہے تو برف کا ایک حباب سطح پر آ کر روزانہ پندرہ دن تک تھوڑا تھوڑا بڑھتا رہتا ہے اور آخر میں دو گز سے زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ اور جب چاند کم ہونے لگتا ہے تو اس کی صورت میں بھی گھٹنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں صورت بھی غائب ہو جاتی ہے۔ ہندو اس کو مہادیو کی مورت خیال کرتے ہیں۔ اس غار کے قریب اراوُتی نام کی ایک نہر ہے جس کی مٹی بالکل سفید ہوتی ہے۔ ہندو اس کو مہان اور مقدس سمجھ کر اُپنے بدن پر ملتے ہیں۔ اس کوہستانی حصّہ کی برف کبھی کم نہیں ہوتی۔

۷/شکرناگ ایک چشمہ ہے جو تمام سال خشک رہتا ہے۔ لیکن جس مہینہ کی نویں تاریخ جمعہ کے روز پڑتی ہے۔ اس دن چشمہ پھوٹتا ہے اور صبح سے شام تک جاری رہتا ہے۔ بے شمار اشخاص برکت حاصل کرنے کے لئے یہاں جمع

ہوتے ہیں۔

۸/ایشہ بلاری میں بھی ایک چشمہ ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے جس کے چاروں طرف متعدد بُت خانے ہیں۔

۹/موضع رنبل میں ایک چشمہ اور ایک حوض ہے۔ اہلِ حاجت پانی میں جَو ڈالتے ہیں۔ اگر یہ پانی کی سطح پر رہتا ہے تو نیک فال سمجھا جاتا ہے اور اگر پانی کے اندر چلا جاتا ہے تو شگونِ بد خیال کیا جاتا ہے۔

۱۰/بانہال میں دُرگا نام کا ایک بت خانہ ہے۔ جو شخص اُپنے دشمن کا مستقبل معلوم کرنا چاہتا ہے تو دو برتنوں میں پختہ چاول بھر کر بُت خانے کے اندر رکھ دیتا ہے اور دونوں پر نام لکھ کر بُت خانہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ دوسرے دن دروازہ کھولا جاتا ہے جس کا برتن پھولوں اور زعفران سے بھرا ہوا ملتا ہے وہ خوش نصیب سمجھا جاتا ہے۔ اور جس کا برتن خس و خاشاک سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ بدنصیب سمجھا جاتا ہے۔

۱۱/دریا متی کے کنارے ایک دُرگا مندر ہے۔ اس کا نام شارداہے۔ ہندو اِس مندر کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کیونکہ سال میں ایک دن اِس مندر میں جنبش ہوتی ہے اور اس طرح کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۲/ہست پور میں بھی ایک مقدس حوض ہے اور بھومنیسر کا مندر ہے۔ ہندو اس مندر کی زیارت کو آتے ہیں تو رات بھران کو ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ اور ان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔

۱۳/شکروہ کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر ایک چشمہ ہے جو سال بھر پانی سے لبریز رہتا ہے۔ یہ مقام ہندو جوگیوں کی زیارت

گاہ ہے۔اس پہاڑی کی چوٹی پر برف نہیں گرتی ہے۔

ان کے علاوہ موضع کھریو میں تین سو ساٹھ چشمے ہیں جن میں ہر ایک چشمہ عبادت الٰہی کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔

چشمے:

کشمیر میں طرح طرح کے چشموں کی کثرت ہے۔مثلاً:

(۱) کھادر پارہ میں ایک چشمہ ہے جس کا پانی عجیب وغریب طریقہ سے شور مچاتا ہوا اُوپر کی جانب اُچھلتا ہے۔

(۲) موضع تہد میں سات چشمے ایک جگہ آ کر ملتے ہیں۔ان میں ایک چشمہ ایسا بھی ہے جس کا پانی جاڑوں میں گرم اور گرمیوں میں سَرد رہتا ہے۔

(۳) ویرناگ کا چشمہ بڑے زور سے اُبلتا ہے اور اس سے پھپن نکلتا ہے کہ اس کی گہرائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

(۴) قنبر میں ایک چشمہ ہے جس کا نام یہاں کے باشندوں نے بون سندھ رکھا ہے۔یہ موسم بہار کے دو مہینوں میں خوب اُبلتا ہے اور ہر وقت پانی سے لبریز رہتا ہے۔کبھی خشک نہیں ہوتا ہے۔(۵)

بالو کے ایک گاؤں میں دیوسر نامی ایک حوض ہے جو پہلو ناگ کے نام سے مشہور ہے۔اس کی تہہ سے پانی اُبلتا ہوا نکلتا ہے۔اس کے چاروں طرف آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے والا سبزہ زار ہے اور اس کے اوپر سرسبز درختوں کا ایک فطری سائبان ہے۔(۶)

اسی کے پاس ایک اور چشمہ ہے جس کو وسی کہتے ہیں۔یہ پہاڑ کے ایک دہانہ سے پھوٹتا ہے جس کا منظر بہت ہی نشاط انگیز ہے۔اسی جگہ ایک عمیق غار

ہے جس میں بیس گز کی بلندی سے پانی کی چادر بڑے زور شور سے گرتی ہے۔ہندو جوگی مردانہ وار اس غار میں کود کر اپنی جان دیتے ہیں اور اس کو رُوحانی خوشی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔(۷)

کوتھار کے ایک چشمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ گیارہ مہینے خشک رہتا ہے لیکن بارہویں مہینے میں مشتری برج اسد میں داخل ہوتا ہے تو پہلی جمعرات کو یہ پانی سے لبریز ہو جاتا ہے اور ایک ہفتہ تک بھرا رہتا ہے جس کے بعد یکا یک خشک ہو جاتا ہے اور پھر دوسری جمعرات کو خود بخود لبریز ہو جاتا ہے۔اسکے بعد ایک سال تک پانی اسی طرح جمع رہتا ہے۔

(۸) ناکامو میں ایک چشمہ ہے جس کو نیلہ ناگ کہتے ہیں۔اس کا پانی بہت صاف شفاف اور نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔اس کے گرد جان باز جوگی آگ میں جل کر اپنی جانیں دیتے ہیں۔ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اِس حوض کے نیچے ایک بڑا شہر آباد ہے۔

(۹) موضع پاردہ میں ایک چشمہ ہے جس میں اتوار کے دن مبروص نہاتے اور شفا پاتے ہیں۔

(۱۰) لار کے دامن سے دو چشمے بہتے ہیں۔ایک کا پانی بہت ٹھنڈا اور دوسرے کا بہت گرم رہتا ہے۔ہندو اپنے مُردے یہاں جلایا کرتے ہیں۔اِن دونوں چشموں کے قریب ایک جھیل بھی ہے۔مشہور ہے کہ اس جھیل میں کسی جانور کا گوشت گر پڑتا ہے تو شدید بارش اور برف ہونے لگتی ہے۔

(۱۱) پرگنہ کمراج کے ایک موضع تراہ گاؤں میں ایک چشمہ چتر ناگ ہے۔اس کا پانی بہت خوشگوار ہے۔اس میں بڑی بڑی مچھلیاں ہوتی ہیں۔مشہور

ہے کہ جو شخص ان مچھلیوں کو ہاتھ لگاتا ہے کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

(۱۲) پرگنہ بھاگ میں ایک بڑا تالاب ہے۔اس کے قریب ایک چشمہ بھی ہے جس کا پانی پی کر مریض شفا پاتے ہیں۔

(۱۳) موضع اش میں بابا زین الدّین ریشی کی خانقاہ ہے جو پہاڑ کے دامن میں ہے۔مشہور ہے کہ اس پہاڑ پر پانی نہ تھا۔لیکن جب بابا صاحب نے یہاں قیام کیا تو ایک چشمہ خود بخود پھوٹ پڑا۔

(۱۴) اچھول کے مضافات میں ایک چشمہ ہے جو ایک ہاتھ اُوپر اُچھلتا ہے۔اس کا پانی ٹھنڈا اور ہاضم ہوتا ہے۔جس کو پی کر مریض تندرست ہوتے ہیں۔

(۱۵) موضع داکھامون میں ایک چشمہ ہے۔مشہور ہے کہ جب اس کا پانی اُبل کر گندہ ہوجاتا ہے تو ملک میں کوئی فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے۔اس کے قریب سلیمان کی ایک کان ہے۔جس سے برتن بنائے جاتے ہیں۔

آبشار:

موضع بازوال میں ایک آبشار کوتل شاہ کوٹ سے بہت زور سے گرتی ہے۔اس کو شالامار کہتے ہیں۔اس جگہ مچھلیوں کا شکار خوب کیا جاتا ہے۔بہتے ہوئے پانی کے دونوں طرف بند پنجرے رکھ دیئے جاتے ہیں جن کے اندر مچھلیاں آکر پھنس جاتی ہیں۔

اُولر جھیل:

تبت کو چک سے ملحق کوہامو میں ایک بہت بڑی جھیل ہے۔جس کو اولر کہتے ہیں۔اس کا دَور ۲۸ کوس ہے۔دریائے بہت اِسی جھیل میں گرتا ہے اور نہر کے قریب پہنچ کر دریا کا دامن نابود ہوجاتا ہے۔اس مقام پر سلطان زین العابدین

نے زین لنک نامی ایک عالیشان محل تعمیر کرایا ہے۔یہاں کے باشندے کشتیوں کو پتھروں، درختوں کی شاخوں اور پتوں سے بھر کر جھیل میں ڈال دیتے ہیں۔تین چار مہینے کے بعد ان کشتیوں کو ڈوریوں سے اُوپر کھینچتے ہیں جن میں بکثرت مچھلیاں بھری ہوتی ہیں۔یہاں مرغابیوں کا شکار بھی عمدہ تفریح ہے۔موضع احسن میں ہرنوں کو جھیل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے، جہاں ان کا شکار آسانی سے ہوجاتا ہے۔

دل:

پرگنہ پھاگ سے ملحق ایک بڑا تالاب ہے۔جس دل کہتے ہیں۔اس کی ایک سمت شہر سے ملی ہوئی ہے۔تالاب کی سطح پر چند خود ساختہ جزیرے ہیں جن میں کھیتی ہوتی ہے۔بددیانت لوگ کبھی کبھی ان جزیروں کے کچھ حصوں کو کاٹ کر دوسری جگہ بھی لے جاتے ہیں۔سلطان زین العابدین نے اس تالاب میں ایک کوس لمبی بند بھی بنوائی تھی۔اس کے قریب ایک چشمہ بھی ہے جس کا پانی پی کر مریض اچھے ہوتے ہیں۔

جزیرہ:

ماچھالون کے قریب ایک گنجان جزیرہ ہے۔جس میں کثرت سے درخت پائے جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ درخت ہوا سے ہلتے ہیں تو جزیرہ میں بھی جنبش آجاتی ہے۔

دُرّے:

کرگاؤں کے قرب ایک درّہ کا نام سویم ہے جہاں دس جریب لمبا ایک زمین کا ٹکڑا ہے۔جب ستارہ مشتری برجِ اسد میں داخل ہوتا ہے تو یہ ٹکڑا

ایک مہینہ تک اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ یہاں کے تمام درخت بالکل جل جاتے ہیں۔حتیٰ کہ اگر دیگ میں غلہ بھر کر رکھ دیا جاتا ہے تو پک جاتا ہے۔

کمراج سے بھی ایک دَرّہ شروع ہوتا ہے جس کا ایک سرا کاشغر اور دوسرا پورپ کی جانب پکلی سے ملتا ہے۔اِس میں سونا پایا جاتا ہے۔سونا نکالنے کی ترکیب یہ ہے کہ لمبے بال والے بکروں کے چڑے درے کی گزرگاہوں پر بچھا دیئے جاتے ہیں اور ان کو بڑے بڑے پتھروں سے دبا دیا جاتا ہے تاکہ پانی میں ڈوبنے نہ پائیں۔تین روز کے بعد ان کو باہر نکال کر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے اور جب یہ جھاڑے جاتے ہیں تو ان میں سے تین تولے کے وزن تک کے ریزے زمین پر گرتے ہیں۔

کاشغر سے ملحق ایک دوسرا دَرّہ ہے جو درّہ گلگت کہلاتا ہے۔اِس دَرّہ کی خاک سے بھی سونا نکلتا ہے۔سونا دریا متی کے پانی سے بھی نکالا جاتا ہے۔

سری نگر:

یہ شہر کشمیر کا پائے تخت ہے۔اس کے بیچ سے دریائے بہت مار اور لچھمہ کول گزرتے ہیں۔لچھمہ کُل اکثر خشک رہتا ہے۔مار میں پانی اِس قدر کم ہو جاتا ہے کہ اس میں کشتیاں نہیں چلتی ہیں۔یہ شہر مختلف پیشہ وروں سے آباد ہے۔یہاں کے صناع شال بہت عمدہ بُنتے ہیں۔بھیڑ کے بالوں سے نرم ؟؟؟ اور صوف بنا کر درمۂ پٹو اور پشمینے تیار کئے جاتے ہیں لیکن ان کی بہترین قسم تبت سے لائی جاتی ہے۔یہاں میر سید علی ہمدانی کی بھی ایک خانقاہ ہے۔

اس شہر کے پورپ میں ایک پہاڑی ہے جو کوہِ سلیمان کے نام سے مشہور ہے۔شہر سے متصل دو تالاب ہیں جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہتے ہیں۔ان کا پانی خوش

ذائقہ اور ہاضم ہوتا ہے۔

زعفران:

موضع پن پور کے مضافات کے بارہ ہزار بھگوں میں زعفران پیدا ہوتی ہے جن کے لہلہاتے ہوئے کھیت سب ہی کو فریفتہ کر دیتے ہیں۔آخر ماہ فروریں (فروری) اور اردی بہشت (اپریل) میں زعفران کی کاشت کا موسم ہے۔اس کی کھیتی ایک مہینہ میں سرسبز ہو جاتی ہے۔پودے بُلندی میں ایک بالشت سے زیادہ نہیں ہوتے۔ان کا پتہ سفید ہوتا ہے۔پودا ایک اُنگل بڑھنے پر پھول دینے لگتا ہے اور یکے بعد دیگرے آٹھ پھول پھولتے ہیں۔پھول میں چھ سوسنی رنگ کی پتیاں ہوتی ہیں۔چھ پنکھڑیوں میں تین زرد اور تین سُرخ ہوتی ہیں۔سرخ پنکھڑیاں زعفران کہلاتی ہیں۔موسم کے ختم ہونے کے وقت تنے پر سبز پتیاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ایک پودے میں چھ سال برابر پھول آتے ہیں۔پہلے سال پھول کم ہوتے ہیں۔دوسرے سال پھولوں کی تعداد تین گنی ہو جاتی ہے اور تیسرے سال پودے کی نشوونما پوری ہو جاتی ہے۔

جنگل:

موضع ملتہانہ میں درختوں کا ایک جنگل ہے جو عقاب کا نشیمن بھی ہے۔یہاں عقاب کے پروں سے ٹوپیاں بنائی جاتی ہیں۔

اکبر نامہ اور کشمیر:

کشمیر پر اکبر کا تسلط ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں ہوا لیکن وہ خود پہلی دفعہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں کشمیر گیا۔اس کے روانہ ہونے سے پہلے قاسم خان کی سرکردگی میں راستہ ہموار کرنے کے لئے تین ہزار سنگ تراش اور کوہ کن اور دو

ہزار بیلدار بھیجے گئے۔ اس سفر کا حال ابوالفضل نے ''اکبر نامہ'' میں بہت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہے کہ اکبر کا یہ سفر لاہور سے شروع ہوا اور وہ راوی کو پار کرتا ہوا سرائے مادھو سنگھ پہنچا۔ پھر شاہدرہ ہو کر موضع جورا آیا۔ وہاں سے کوچ کر کے ایمن آباد میں قیام کیا۔ پھر سترام پہنچا۔ یہاں سے تلونڈی آیا۔ پھر سودھیرہ پہنچ کر چناب کے ساحل پر پڑاؤ ڈالا۔ دو دِن کے بعد سیالکوٹ کے پاس گوناچور پہنچ کر منزل کی وہاں سے چل کر ڈیکری میں قیام کیا۔ جس کے بعد جے پور کھیری میں ٹھہرا۔ یہ بھمبر کا علاقہ تھا۔ یہاں سے وہ سرائے جوگی اور نوشہرہ کے پہاڑی علاقے کو عبور کرتا ہوا غازی کوٹ سے گزرا اور راجوری کے پاس قاسم خان سے جاملا۔ یہاں سے آگے کشمیر کے راستے میں بکثرت برف ملتی تھی، اس لئے اس نے پیر پنچال کا راستہ پسند کیا اور رتن پنچال کے پہاڑی دامن تھنہ میں جا کر ٹھہرا۔ یہاں سے کشمیری بولی جاتی تھی۔ رتن پنچال کی وادی کو عبور کر کے بہرام گلہ پہنچا جس کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بڑی دِل کشا جگہ تھی۔ اس کی آب و ہوا اور یہاں کے پھولوں کی رنگا رنگی کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔ یہاں سے کوچ کر کے شاہی لشکر پوشیانہ میں قیام پذیر ہوا جہاں کے پہاڑ، درخت، پھول اور چشمے بہت ہی جان پَرور اور نشاط انگیز تھے۔ چشمول پر بہت سے پل بھی تھے جن کو کشمیری ''کدل'' کہتے ہیں۔ یہاں سے جو منزلیں تھیں وہ برفستانی ہونے کی وجہ سے بہت ہی خوفناک تھیں۔ لیکن اکبر نے اپنے لشکریوں کی ہمت بڑھائی۔ اس علاقہ کے رہ گزر شالی کے گھاس کی رسی بنائے ہوئے جوتے پہن کر راستے طے کرتے تھے۔ اکبر نے ان جوتوں کو پہننا پسند نہیں کیا بلکہ برف ہی پر چل کر پیر پنچال کی پہاڑی کو عبور کیا اور

ناری براری کے پاس پہنچ کر موضع دوند میں قیام کیا۔ راستہ کہیں بہت ہی دشوار گزار، کہیں بہت ہی بلند اور کہیں بہت ہی تنگ تھا۔ برف گر رہی تھی، بارش بھی ہوتی جاتی تھی لیکن شاہی لشکر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس علاقہ میں یہ مشہور تھا کہ اِس پہاڑی راستہ میں کوئی جانور مار دیا جاتا ہے یا نقارہ بجایا جاتا ہے تو سیاہ بادل چھا جاتے ہیں اور بارش کے ساتھ برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ اکبر ناری براری کو عبور کر کے ہیرہ پور پہنچا۔ اس کی مسافت صرف ساڑھے چار کوس تھی، لیکن درمیان میں ۲۴ پُل تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ بھمبر سے ہیرہ پور کا راستہ اپنی تنگی اور نشیب و فراز کی دشواری کے لحاظ سے بہت ہی تکلیف دہ تھا لیکن راستے میں درختوں کی رنگا رنگی، پھولوں کی شگفتگی، ہوا کی فرحت بخشی اور آبشاروں کی نغمہ سرائی سے سفر کی ساری صعوبتیں جاتی رہتی تھیں۔ اور جب یہ پہاڑی راستے طے ہو گئے تو یکا یک ایک نئی دنیا سامنے آگئی اور ایک نئی بہشت نے اپنے اُوپر سے نقاب اُٹھالیا اور اس کو دیکھ کر راستے کی ساری تکلیفیں ذہن سے جاتی رہیں۔

ابوالفضل نے لکھا ہے کہ لاہور سے سرینگر کل ۹۷ کروہ ۷ بانس تھا۔ لیکن ۲۴ منزلوں کے بعد یہ مسافت طے ہوئی۔ سرینگر میں دَم لے کر کچھ دنوں کے بعد اکبر دریائے بہت کے ساحل پر شہاب الدین پور (شادی پور) پہنچا۔ سرینگر سے متعلق ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا اقتباس پہلے گزر چکا ہے لیکن ''اکبر نامہ'' میں بھی اس کا قلم رقص کرنے لگتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ شہر بہت بڑا ہے اور بہت آباد بھی ہے۔ دریائے بہت (وتستا) اس میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہاں کی عمارتیں لکڑی کی ہوتی ہیں، لیکن پانچ منزلوں تک

بنائی جاتی ہیں۔ کوٹھوں کے اُوپر لالہ اور طرح طرح کے پھول کھلے رہتے ہیں جو موسم بہار میں رشک گلستان ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جب برسات شروع ہوتی ہے تو یہاں بھی بارش ہونے لگتی ہے۔ توران اور ایران کی طرح جاڑوں میں یہاں بھی برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ موسم بہار میں بھی یہاں بارش ہوتی ہے لیکن کم بارش کی وجہ سے کھیتی کو نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ شہاب الدین پور (شادی پور) کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہاں چنار کے بڑے بڑے دَرخت آسمان سے باتیں کرتے تھے اور سبزہ زار بھی بہت ہی نظر فریب تھا۔ واپسی پر چوگان کا ایک میدان تھا جس کی سرسبزی اور شادابی اپنی مثال آپ تھی۔ راستے میں مرغابیوں کا شکار بھی کھیلا گیا، جو بہت ہی پُر لطف تھا۔ شکاری کشتیوں میں بیٹھ کر باز کو ہوا میں چھوڑ دیتے تھے جو مرغابیوں پر جھپٹ کر ان کو پہلے پانی میں گراتے اور پھر کشتیوں میں لے آتے۔ اِسی سفر میں اکبر نے کشمیر کی اَراضی کے بندوبست کا حکم دیا پھر وہ کشتیوں میں سیر و تفریح کے لئے آگے بڑھا۔ کشمیر میں اس وقت کشتیاں تو تیس ہزار تھیں لیکن کوئی شاہانہ سواری کے لائق نہ تھی۔ مگر جب کشتیاں بنانے کے لئے حکم دیا گیا تو ہنرمندوں اور کاریگروں نے ایک ہزار کشتیاں آراستہ پیراستہ کر کے دریا کی سطح پر ایک شہر آباد کر دیا اور پانی میں چلتا پھرتا باغ نظر آنے لگا۔ اکبر اِن کشتیوں پر بیگمات کے ساتھ روانہ ہوا تو ۵¾ کوس چل کر پام پور پہنچا۔ راستہ میں دونوں طرف نظر فریب گلزار اور نشاط انگیز سبزہ زار تھا۔ دوسرے دن اکبر ۴½ چل کر بیج بہاڑہ پہنچا اور پھر وہاں سے ۵½ کوس چل کر نندی مرگ آیا۔ ابوالفضل اس کو دیکھ کر لکھتا ہے کہ یوں تو کشمیر کا ہر مقام خوش گوار ہے لیکن یہاں پہنچ کر آنکھوں کو بڑی تازگی پہنچی۔ یہ تین ہزار بیگھے کہ جگہ بہت ہی

شاداب، ہموار اور دل پذیر تھی۔ ایسی جگہ کم دیکھنے میں آئی۔ یہاں سے تین کوس کے بعد کھنہ بل تھا جس سے آگے کشتیاں نہیں جا سکتی تھیں۔ اس مقام پر اکبر کشتیوں کو چھوڑ کر حضرت واحد صوفی کی خدمت میں حاضر ہوا جو ایک زاوِیہ نشین بزرگ تھے۔ وہاں سے اکبر گھوڑے پر روانہ ہو کر اِنچ یعنی اننت ناگ کے چشمہ کو دیکھنے کے لئے پہنچا جو ایک بہت ہی نشاط انگیز جگہ تھی۔ اس میں پانی زمین کے اندر سے برابر اُبلتا رہتا تھا اور مشہور ہے کہ جب کبھی اس میں زرد مچھلی نمودار ہو جاتی ہے تو وہ سال نہایت ہی مبارک سمجھا جاتا ہے۔ اکبر یہاں سے وِتستا کے منبع پر جانا چاہتا تھا لیکن بارش کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس گلشن ہمیشہ بہار کی دِل آویزی، آب و ہوا کی خوش گواری، پھولوں اور پھلوں کی فراوانی سے اکبر بے حد متاثر تھا اور اس سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتا تھا لیکن مجبوراً وہ واپس ہوا۔ نندی مرگ چورس (یعنی موضع چڑسو) سرینگر، شہاب الدین پور (شادی پور)، سوپور، پٹن، نوپورہ ہوتا ہوا بارہ مولہ پہنچا جس کے بارے میں ابوالفضل رقم طراز ہے کہ یہ کشمیر کا دروازہ ہے۔ ایک طرف فلک آسا پہاڑ ہے اور دوسری طرف دریائے بہت جوش مارتا ہوا ہندوستان جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان ایک تنگ اور دشوار گزار راستہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے "اکبرنامہ" جلد سوم، ۵۴۲-۵۵۷، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

شعرا اور کشمیر:

اکبر کی معیت میں شعرا بھی ہوتے۔ فیضؔی تو اُس کا ہمدم و ہمراز رہا۔ اس لئے کشمیر کے سفر میں اس کا ساتھ رہنا ضروری تھا اور جب وہ کشمیر پہنچا تو اس کی رعنائی اور دل آویزی دیکھ کر مست ہو گیا اور ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں وہ

کہتا ہے کہ اس کی ہوا میں ایک نقاش کی خیال آرائیوں کا تنوع ہے۔ اس کی سرزمین میں صفحۂ تصویر کی رنگارنگی ہے۔ اس کی فطری بوقلمونی اور نقاشی کارخانۂ قدرت کے عجائب میں سے ہیں۔ اس کا غبار آنکھوں کی دوا ہے اور اس کی گھاس رُوح کے لئے اکسیر ہے۔ اس کا پانی بدن کے لئے ایسا ہی ہے جیسے گلاب اور اس کی شراب ہو! اس کی ہَوا روح کے لئے ایسی ہی ہے جیسے دُودھ کے ساتھ شکر ہو۔ اس کی نسیم سحری کے سامنے دمِ عیسیٰ بھی مسموم ہے۔ اس کے آبِ رواں کے نزدیک زلالِ خضر بھی تالاب کا جما پانی ہے۔ اس کے پانی آواز میں ارغنوں کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس کی صندلی زمین کافوری برف سے نم رہتی ہے اور اس میں گلاب و عبیر کی بھی آمیزش ہے۔ یہاں گھاس کی بجائے زعفران ہوتا ہے کیونکہ اس کی مٹی اور پانی یہی تاثیر ہے۔ قدرت کی فیاضی سے یہاں ہزاروں چشمے اُبلتے رہتے ہیں اور ہر جگہ قدرتِ ازلی کی صناعی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انگور کی یہاں بڑی کثرت ہے۔ سیب کی خوشبو سے رُوح تازہ ہو جاتی ہے۔ اَنار کی خوشبو سے فرحت ہوتی ہے۔ انجیر بھی بہت ہیں اور یہاں کے میوؤں اور پھولوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مُشک بھرے ہرنوں کے جلوے بھی یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ اِس خلاصہ کے بعد اَب قصیدہ کے اَشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ اس میں اکبر کی جو مدح ہے وہ حذف کر دی گئی ہے۔ کشمیر پر جو اَشعار ہیں، وہی نقل کئے جا رہے ہیں:

ہزار قافلہ شوق می کند شب گیر　　　که بار عیش کشاید بعرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصۂ کہ دیدن او　　　ورق نگارِ خیال است و نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش　　　زمین او متلون چو صفحۂ تصویر

بہ طرز ہائے گزین کارخانۂ ابداع　　　بہ نقش ہائے عجب کارنامۂ تقدیر
عبارِ او بتواں خواند چشم را دارد　　　گیاہِ او بتواں گفت روح را اکسیر
بہ تن موافقت آبِ او چو بادہ و گل　　　بہ جان مناسبت باد او چو شکر و شیر
بہ پیش فیض نسیمش دمِ مسیح مسموم　　　بہ نزدِ آبِ روانش زلا خضر غدیر
گرو بمیکدۂ عشق خانقاہِ ورع　　　بدل بہ نعرۂ مستانہ صیحۂ تذکیر
غریو کوس زِ جوش و خروش مے ایما　　　صدائے آب زِ آوازِ ارغنون تعبیر
زِ ہوش می برد اللہ اکبریں چہ صدا ست　　　فداش نعرۂ تہلیل و غلغلِ تکبیر
فضول او متشابہ زِ اعتدالِ ہوا　　　بہم یکے دی واردی بہشت و بہمن و تیر
زمین صندلیش نم زِ برفِ کافوری　　　بیاد دادہ زِ آمیزش گلاب و عبیر
نسیم او زِ سرِ آب تیزمی گذرد　　　کہ بادرانتواں داشت پائے در زنجیر
زِ سر جواں شود از یک نسیم صبح دمش　　　کنند قسمت بر جزو جزوِ عالم پیر
درو بجائے گیاہ زعفران ہمی دوید　　　کہ آب و خاکِ طرب را چنیں بود تاثیر
بہر طرف روی از بحرِ فیض مالا مال　　　ہزار چشمۂ جوشندہ چوں دِل تحریر
زِ اعتدالِ ہوایش شگفت نیست شگفت　　　کہ سر زند ہمہ عناب از نہال زدیر
بہ حیرتم کہ چہ آثار قدرت ازلی ست　　　بہر نظارہ بتاز و نظر بہ صنع قدیر
دریں دیار مغنّی ترانہ ساز مکن　　　بس است از لب مُرغانِ نغمہ سنج صفیر
شراب خوردہ حریفاں بجائے آب رُد　　　کہ تشنگانِ ہوس را ہمی بود تدبیر
خراب آن مے بنفش شوم کہ ہست چو عشق　　　بہ عقل در تگ و تاز و بہ صبر در زد و گیر
بعینہٖ زر محلول آیدت بہ نظر　　　اگر ازو فگنی قطرۂ بہ چشمۂ قیر
کند مشاہدہ نصف الہند جرم سہا　　　شعاع جوہر او گرفتہ بہ چشم ضرَیر

اگر دماغ لطافت شود گلاب طلب　　کنند از تف ایں بادہ برگ گل تقطیر

خروج کردہ عنب در چمن سپاہ سیاہ　　کش از میانِ فواکہ گرفتہ اند امیر

شجر سیب دہد مغز روح را تر طیب　　نسیم بہ فگند طبع ذوق در تعطیر

بسند نیسد مگر یکدلش چو من در عشق　　کہ باہزار دل آمد دریں چمن انجیر

بہ عجز معترفم در شمار میوہ و گل　　کہ ہست بر تر معنی لباس حرفِ قصیر

بہ جلوہائی فریب آہوان مشکینش　　کشیدہ شیر دِلاں را بہ دامِ عشق اسیر

زبسکہ مست کند نکہت ریاحینش　　کنند دست حمائل بہ گردن نخچیر

زمین او چو دِل بیغمان طرب انگیز است

سپہر کردہ مگر خاک او بہ بادہ خمیر

عرفیؔ نے بھی دل کھول کر کشمیر کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیر آ کر ایک سوختہ جان شخص بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اِس کی ہَوا میں کچھ ایسی لطافت ہے کہ چاشت کی ہوا بھی نسیمِ سحری معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کشمیر کے دروازہ پر آ گئی ہے۔ کشمیر کی رعنائی سے زال فلک میں بھی عشوہ گری آ گئی ہے۔ یہاں کے سبزے، چشمے، لالہ گل کی شرح کرنا آسان نہیں۔ یہاں لالہ کی پیداوار اتنی ہے کہ پتھر اور تیشے کے منہ سے بھی لالے ہی نکلتے ہیں۔ کشمیر میں اتنی طراوت اور رطوبت ہے کہ گرد و غبار بھی شبنم بن جاتی ہے۔ کشمیر کی رنگا رنگی طاؤس ایسی ہے اور اس کا جمال دُلہن کی طرح ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید　　گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

بنگر کہ ز فیضش چہ شود گوہر یکتا　　جانے کی خزف گردد و آن جا گہر آید

وآنکہ بچنیں فضل کہ در ساحت گلزار　　از لطف ہوا چاشت نسیم سحر آید

از بلبل خاموش دل باغ گرفت است　　او را پر گنہ محمل گل دیر تر آید

گل ہم چہ کند بادِ صبا خواست کہ عرفیؔ　　آید سوئے کشمیر و گلشن بر اثر آید

نشگفتہ گل اما بمثل بر رگ شاخے　　گر پائے نہم خون گلم تا کمر آید

فردوس بدروازۂ کشمیر رسید است　　کو مدعی گر نگرندۂ است در آید

زیبائی کشمیر گرش باعث عشوہ است　　من می فرم از زال فلک عشوہ گر آید

ایں سبزہ و ایں چشمہ و ایں لالہ و گل　　آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید

آن چشمہ کہ رضوان چو رود تشنہ بسویش　　کوثر بسرش تیز تر و تشنہ تر آید

آن لالہ کہ ہنگام تراشیدن خارا　　از رخنہ سنگ و دہن تیشہ بر آید

کشمیر بہشتی است فریندہ کہ شبلی　　آید چو در و صومعہ بروئے سقر آید

طاؤس مثالی کہ افشاندہ پروبال　　ہر لحہ برنگ دگر اندر نظر آید

زیبندہ عروسے کہ بیفر ددہ جمالش

ہر دم بہ نظر خوشتر و شاداب تر آید

عہدِ اکبر کے موّرخین اور کشمیر

پہلے ذکر آیا ہے کہ اکبر نے کشمیر کی قدیم تاریخ ''راج ترنگنی'' کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اِسی زمانہ میں متعدد موّرخوں نے کشمیر کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ قلمبند کی۔ اِن ہی میں خواجہ نظام الدین احمد بخشی (المتوفی ۱۰۰۳ھ) تھا۔ اُس نے اپنی ''طبقاتِ اکبری'' میں کشمیر کے ۲۵ سلاطین کے حالات لکھے ہیں جن سے کوئی موّرخ کشمیر کی تاریخ لکھتے وقت اِستفادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فرشتہ نے بھی جو اپنی مشہور تاریخ سترہویں صدی کی ابتدا تک لکھتا رہا، کشمیر کے سلاطین کے جامع حالات قلمبند کئے ہیں۔ ملا عبدالباقی نہاوندی نے ''ماثر رحیمی''

۱۰۲۵ھ میں لکھی۔ اِس میں بھی کشمیر کے سلاطین کے مفید حالات درج ہیں۔

سلطان زین العابدین کی مدح:

مذکورہ بالا تینوں مورخین نے سلطان زین العابدین کے اَوصاف ومحاسن بیان کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان اَپنا زیادہ تر وقت عمارتوں کے بنوانے، زراعت کو فروغ دینے اور نہروں کے جاری کرانے میں صرف کرتا ہے۔ ویری ناگ میں اُس نے جو عمارتیں بنوائیں اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان عمارتوں کے لئے اس نے زرخیز گاؤں وقف کئے۔ اس نے کئی شہر بھی آباد کئے۔ کوہِ ماراں کے قریب ایک نہر جاری کی اور ایک نیا شہر آباد کیا جو پانچ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر کاک پور اور دوسرے شہروں میں نہریں کھدوائیں اور ان پر پل بنوائے۔

یہی مورخین یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ سلطان نے ایک حکم جاری کر رکھا تھا کہ اگر کسی شخص کا مال چوری ہوجائے تو اس کا تاوان اس کے قریہ یا قصبہ والے اَدا کریں۔ اس طرح چوری بالکل ختم ہوگئی تھی۔ اس کا یہ بھی حکم تھا کہ چوروں کو تہہ تیغ نہ کیا جائے بلکہ ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر ان سے تعمیرات کے سلسلہ میں پتھر اور مٹی اُٹھانے کا کام لیا جائے۔ اس کا یہ بھی حکم تھا کہ سوداگر جو مال دوسری جگہوں سے لائیں اُن کو تھوڑے منافع پر فروخت کریں۔ اپنے گھروں میں پوشیدہ نہ رکھیں اور لین دین میں بددیانتی نہ کریں۔

ان مؤرخوں کا یہ بھی بیان ہے کہ سلطان بڑا ہی روادار حکمران تھا۔ وہ ہندو جوگیوں کی پوری تعظیم وتکریم کرتا اور کہتا کہ یہ صاحب مجاہدہ ہیں، ان کی عزت کرنا ضروری ہے۔ اس نے خود ہندوؤں میں پوجا کے اوقات مقرر کئے اور

برہمنوں کو دربار میں طلب کر کے ان سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولیں گے اور جو کچھ ان کی مذہبی کتابوں میں مرقوم ہے اس کے خلاف عمل نہ کریں گے۔ اس کے دربار میں ہندو اور مسلمان دونوں فضلا برابر سمجھے جاتے۔ سلطان خود فارسی، ہندی، کشمیری اور تبتی زبانوں کا ماہر تھا اس لئے ان زبانوں کو بڑی سرپرستی کی۔ کشمیری زبان کا ایک شاعر سوَم تھا جو ہندی زبان میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے سلطان کے حالات ''زین چرت'' نامی ایک کتاب میں قلمبند کئے۔ خود سلطان کی فرمائش پر سنسکرت میں ''راج ترنگنی'' لکھی گئی جو کشمیر کے ہندو راجاؤں کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ پھر اُسی کے حکم سے ''مہابھارت'' کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اسی طرح فارسی کی بہت سی درسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا۔

مذکورہ بالا مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ سلطان موسیقی کا بڑا ماہر اور سرپرست تھا۔ اس کی سرپرستی اور فیاضی کی وجہ سے دُور دُور کے سازندے اور گویے اس کے دربار میں آکر جمع ہوگئے تھے۔ خواجہ عبدالقادر خُراساں سے اس کے دربار میں پہنچا اور عود اتنا عمدہ بجایا کہ سلطان بے حد خوش ہوا۔ مُلا جمیل نامی ایک حافظ شعر پڑھنے اور گانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ جب وہ گاتے تو سلطان پر رقت طاری ہوجاتی۔ بعض باکمال گویے ایک راگ کو بارہ سروں میں اَدا کرتے۔ سلطان نے اکثر سازندوں کے عود، رباب اور طنبورہ کو جواہرات سے مرصع کردیا تھا۔ یودی بھٹ نامی ایک ماہر فن نے علم موسیقی پر ایک کتاب ''مانک'' لکھی اور سلطان کی خدمت میں پیش کی جس نے خوش ہوکر اس کو بہت سے انعام واکرام سے نوازا۔ اس کے زمانے میں ایک شخص حبیب نامی ایسا باکمال آتش باز تھا کہ اس نے طرح طرح کی ایجادیں کیں جن کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہتے

تھے۔ کشمیر میں تفنگ اُسی نے رائج کی۔

سلطان کے پاس بیرونی ممالک کے فرماں رَوا طرح طرح کے تحائف بھیجتے رہتے۔ خراسان سے خاقان سعید ابوسعید شاہ تیز رفتار گھوڑے اور بار برداری کے جفاکش جانور بھیجتے جس کے جواب میں سلطان نے کشمیر سے زعفران، قسطاس، مشک، عطرِ گلاب، سرکہ، بیش قیمت شالیں اور بلور کے پیالے وغیرہ بھیجے۔ تبت کے راجہ نے مان سرُور کے دُوہنس بھیجے جن کے سامنے دُودھ پانی میں ملا کر رکھا جاتا تو وہ پانی پی لیتے اور دُودھ چھوڑ دیتے۔ مکہ معظمہ، مصر اور گیلان سے بھی سلطان کے پاس تحائف آتے رہتے۔ گوالیار کے راجہ ڈونگر سین نے علمِ موسیقی کی دو تین مستند کتابیں اس کو تحفے میں بھیجیں (تفصیل کے لئے دیکھئے ''طبقاتِ اکبری'' جلد سوم، ص ۴۴۶-۴۳۵، ''تاریخِ فرشتہ'' جلد دوم، ص ۳۴۷-۳۴۲، ''تاثرِ رحیمی''، جلد اول، ص ۲۱۵-۲۰۸)

''تزکِ جہانگیری'' اور کشمیر:

جہانگیر اکبر کے ساتھ دو مرتبہ کشمیر گیا۔ پھر اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال کابل جاتے ہوئے دریائے بہت کے منبع ویری ناگ سے گذرا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''کسی زمانہ میں یہاں ناگ رہا کرتے تھے، اس لئے یہ ویرناگ کہلاتا ہے۔ یہ شہر کشمیر (سرینگر) سے بیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور بیس گز چوڑا اور بیس گز لمبا ایک مثمن حوض ہے۔ اس کے نواح میں بہت سے پتھر کے حجرے اور غار ہیں جہاں بیٹھ کر لوگ عبادت اور ریاضت کرتے ہیں۔ اِس کا پانی اس قدر صاف وشفاف ہے کہ اس میں پستہ کا

ایک دانہ اگر گرا دیا جاتا ہے تو یہ اس کی گہرائی تک جاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر بہت سی مچھلیاں بھی تھیں۔ میں نے اس چشمہ کے کنارے ایک باغیچہ لگانے کا حکم دیا تو اس کے ساتھ کچھ عمارتیں بھی بنائی گئیں...... یہ چشمہ بہہ کر کشمیر پہنچتا ہے تو یہاں ''بہت'' کہلاتا ہے۔ اس میں دائیں بائیں جانب سے نالے اور ندیاں بھی آکر مل جاتی ہیں۔ جس سے یہ دریا بڑا بن جاتا ہے۔ یہ شہر سے ہوکر گذرتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس کی چوڑائی بہت کم ہو جاتی ہے۔ کوئی اس کا پانی نہیں پیتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت کثیف ہوتا ہے۔ تمام لوگ ایک تالاب کا پانی پیتے ہیں جس کو وہ ''دل'' کہتے ہیں۔ دریائے بہت اِس ''دل'' سے ہوتا ہوا بارہ مولہ، پکلی سے گذر کر پنجاب میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمیر میں بہت سے چشمے اور ندیاں ہیں، لیکن درۂ ''لار'' جو شہاب الدین پور (شادی پور) کے نزدیک دریائے بہت سے آکر ملتا ہے، بہترین جھرنا ہے۔ شہاب الدین پور کشمیر کا ایک مشہور مقام ہے۔ اس کے ایک سبز قطعۂ زمین میں سو (۱۰۰) خوبصورت چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں جن کی شاخیں ایک دوسرے سے مل کر دُور تک گھنا سایہ دیتی ہیں۔ اس گاؤں کو سلطان زین العابدین نے بسایا جو باون سال تک حکومت کرتا رہا۔ وہ بڈشاہ (بڑا شاہ) کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ اُس کی بنائی ہوئی بہت سی عمارتیں کشمیر میں موجود ہیں۔ ان ہی میں ایک ''زین لنکا'' ہے جس کو اُس نے وولر جھیل کے بیچ میں بنوایا ہے۔ اس گہری جھیل کا طول وعرض تین چار کوس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مذکورہ بالا عمارت کی بنیاد پڑ رہی تھی تو پہلے کشتیوں پر بھر بھر کر پانی پتھر ڈالے گئے لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو ہزاروں کشتیاں پتھروں کے ساتھ پانی کے اندر غرق کردی

گئیں۔ اس طرح سو گز مربع جگہ پر بنیاد رکھی گئی۔ ایک طرف محل اور دوسری طرف عبادت خانہ بنایا گیا جن سے زیادہ خوبصورت عمارتیں کہیں اور نہیں ہیں۔ سلطان زین العابدین یہاں آ کر عبادت میں مشغول رہا کرتا تھا...... وہ برابر چلہ کشی کرتا رہا۔ اور اپنے آخری چلہ میں ایک لمحہ بھی نہ سویا۔ اور چالیسویں دن رحمتِ ایزدی سے جاملا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ ادہم خان، حاجی خان اور بہرام خان۔ وہ آپس میں لڑتے رہے، اس لئے کشمیر کی حکومت پر چک قبیلہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے افراد معمولی سپاہی تھے۔ اس قبیلہ کے تین حکمرانوں نے وولر جھیل میں زین العابدین کے محل کے ارد گرد تین طرف تین عمارتیں اور بنوائیں لیکن یہ زین العابدین کی عمارتوں کی ایسی مستحکم نہیں ہیں......"

آخر میں جہانگیر لکھتا ہے کہ کشمیر میں موسمِ خزاں اور موسمِ بہار دونوں دیکھنے کے لائق ہیں۔ موسمِ خزاں میں سیر کی تو جو کچھ سنا تھا اُس سے بہتر پایا۔ لیکن وہ اس کو موسمِ بہار میں بھی دیکھتا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

جہانگیر نے اُپنے چودہویں سال جلوس یعنے ۱۰۲۹ھ میں آگرہ سے کشمیر روانہ ہوا تو متھرا، دہلی سرہند، کری، حسن ابدال، پکلی، کشن گنگا، کہتائی، ایوند، وچہہ، بلتار اور بارہمولہ وغیرہ سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا۔ تنگ اور دشوار گذار راستوں کو آسان بنانے کے لئے بیلدار، سنگ تراش اور مزدور ساتھ تھے۔ اکثر مقامات پر بارش اور برف باری کی وجہ سے راستے بہت ہی دشوار گذار ہو جاتے تھے۔ کشن گنگا سے کشمیر تک راستہ دریائے بہت کے کنارے سے ہو کر جاتا تھا۔ دونوں طرف بلند پہاڑ تھے۔ درّہ کے درمیان میں پانی نہایت جوش و خروش کے ساتھ بہتا تھا جس میں ہاتھی کے پاؤں بھی مشکل سے جمتے تھے لیکن راستے کی

دشواری کے باوجود جہانگیر کئی بار کشمیر گیا۔ وہ ۱۰۲۹ھ کے بعد ۱۰۳۲ھ اور ۱۰۳۳ھ میں بھی وہاں پہنچا۔ اس کا مشاہدہ بڑا گہرا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی "تزک" میں یہاں کے جغرافیائی، نباتاتی اور معاشرتی حالات کی جزوی تفصیلات لکھی ہیں اور پھر یہاں کی رعنائی اور دل آویزی کی تصویر کھینچنے میں اس کا قلم رقص کرنے لگتا ہے۔ ہم علیحدہ علیحدہ عنوانات قائم کر کے اس کے بیانات کو "تزکِ جہانگیری" سے لے کر قلمبند کرتے ہیں۔

جغرافیہ کشمیر:

کشمیر اقلیمِ چہارم میں شامل ہے۔ اس کا عرض خطِ استوا سے ۳۵ درجہ اور طول جزائر سفید سے ۱۰۵ درجہ ہے۔ مدت سے یہ ملک ہندو راجاؤں کے قبضہ میں تھا جس کے تفصیلی حالات "راج ترنگنی" میں ہیں۔ اس کا فارسی ترجمہ حضرت عرشِ آشیانی (اکبر) کے حکم سے ہو چکا ہے۔ ۱۲۷ھ میں مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ ۳۲ حکمرانوں نے ۲۸۲ سال تک حکومت کی۔ ۹۹۴ھ میں اس کو عرش آشیانی نے فتح کیا۔ کشمیر کا طول "بھول یاس" سے نشیبی حصہ تک ۵۶ کوسِ جہانگیری ہے اور عرض ۱۷ کوس ہے۔ ابوالفضل نے "اکبر نامہ" میں قیاساً لکھ دیا ہے کہ کشمیر کا طول دریائے کشن گنگا سے نیچے تک ۱۲۰ کوس ہے اور عرض دس کوس سے کم نہیں اور پچیس کوس سے زیادہ نہیں ہے۔ میں نے بہ نظرِ احتیاط ماہرانِ فن کو مقرر کیا ہے کہ طول اور عرض کی پیمائش کریں۔ ابوالفضل نے جو ۱۲۰ کوس لکھے ہیں وہ کُل ۶۷ ٹھہرے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملک کی سرحد وہاں تک قرار دی جاتی ہے جہاں تک اس کی زبان بولی جاتی ہے۔ اس بنا پر "بھول یاس" سے کشمیر کی سرحد مقرر کی گئی ہے جو دریائے کشن گنگا سے گیارہ میل اس طرف ہے۔ اس حساب سے

۵۶ کوس طول ہوگا اور عرض میں دو کوس سے زیادہ فرق ظاہر نہ ہوا۔ کوس کا ضابطہ حضرت عرش آشیانی (اکبر) کا مقرر کردہ ہے۔ جس کے مطابق ہر ایک کوس پانچ ہزار درع اور درع دو درع شرعی کے برابر ہوتا ہے اور ہر درع ۲۴ رانگل کے برابر ہوتا ہے۔

سری نگر:

اس شہر کے بیچ میں دریائے بہت بہتا ہے۔ جس کا مخرج ایک چشمہ ہے۔ یہ ویرناگ کہلاتا ہے جو سرینگر سے ۱۴ کوس دور ہے۔ میرے حکم سے اس چشمہ پر ایک عمارت بنائی گئی اور اس میں ایک باغ بھی لگایا گیا۔ شہر کے درمیان لکڑی اور پتھر کے چار مضبوط پل ہیں۔ لوگ ان میں آتے جاتے ہیں ۔ پُل کو یہاں ''کدل'' کہتے ہیں۔ شہر میں ایک بڑی بلند اور شان دار مسجد ہے۔ جس کو سلطان سکندر نے ۷۹۵ھ میں تعمیر کیا تھا۔ ایک مدت کے بعد یہ آگ لگ جانے کی وجہ سے جل گئی۔ سلطان حسین نے اُس کو پھر سے بنوانا شروع کیا۔ اُس کی وفات کے بعد ۹۰۹ھ میں اس کے وزیر ابراہیم ماگری نے اِس کی تکمیل کرائی اور اس کو بہت آراستہ و پیراستہ کیا۔ اِس تاریخ سے اَب تک اپنی حالت پر ہے۔ محراب سے مشرقی دیوار تک ۱۴۵ درع طویل اور ۱۴۴ درع عریض ہے۔ اس کے ایوان اور بڑے بڑے ستونوں پر نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔ کشمیر کے سلاطین کی اس سے بہتر کوئی اور یادگار نہیں۔ میر سید علی ہمدانیؒ اس شہر میں کچھ روز ٹھہرے تھے۔ ان کی یہاں ایک خانقاہ ہے۔ شہر کے متصل دو بڑے تالاب ہیں جو برابر پانی سے لبریز رہتے ہیں۔ ان دونوں کے پانی کا مزہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ لوگوں کی آمد ورفت کشتیوں پر ہوتی ہے جن پر لکڑی اور غلہ بھی لاتے ہیں۔ اس لئے شہر

اِرد پرگنوں میں پانچ ہزار سات سو کشتیاں اور سات ہزار ملاح ہیں۔

ولایت کشمیر

کشمیر میں ۳۸ پرگنے ہیں اور اسکے دو حصے ہیں...... مراج اور کامراج۔ چاندی سونے سے لین دین کرنے کا یہاں رواج نہیں۔ لیکن دینؔ نقد وجنس خروار شالی سے کی جاتی ہے۔ ہر خروار تین من آٹھ سیر وزن کے برابر ہوتا ہے۔ کشمیری دو سیر کو ایک من اور چار من کو، جس کے آٹھ سیر ہوتے ہیں، تَرک کہتے ہیں۔ ولایت کشمیر کی آمدنی تیس لاکھ تریسٹھ ہزار پچاس خروار اور گیارہ ترک ہے' جو نقدی کے حساب سے سات کروڑ چھیالیس لاکھ ستر ہزار چار سو درم ہوتے ہیں۔

راستہ:

ہندوستان سے کشمیر کا راستہ دشوار گذار ہے۔ نسبتاً آسان راستہ بھمبر اور پکھلی کا ہے۔ لیکن کشمیر کی بہار دیکھنی ہو تو پکھلی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

غذا:

کشمیریوں کی اصل غذا چاول ہے۔ وہ خشکہ نرم پکاتے ہیں اور ٹھنڈا ہوجانے کے بعد کھاتے ہیں۔ اِس کو ''بھتہ'' کہتے ہیں۔ گرم گرم کھانا کھانے کا رواج نہیں۔ کم حیثیت کے لوگ تھوڑا بھتہ رات کو بچا لیتے ہیں اور وہی صبح کو کھاتے ہیں۔ نمک یہاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان سے آتا ہے۔ بھتہ میں نمک ڈالنے کا قاعدہ نہیں۔ سبزی پانی میں جوش دے کر پکاتے ہیں اور ذائقہ کے لئے نمک ڈال دیتے ہیں۔ جو لوگ اس کو اور مزیدار بنانا چاہتے ہیں تو وہ اس میں تھوڑا چارمغز کا تیل بھی ڈال دیتے ہیں۔ یہاں چارمغز کا تیل جلد کڑوا اور بدمزہ ہوجاتا ہے۔ گھی جلد خراب ہوجاتا ہے۔ اسی لئے مسکہ سے تازہ بتازہ نکال کر

کھانے میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کو کشمیری زبان میں سدا پاک کہا جاتا ہے۔
یہاں بھینس نہیں ہوتی۔ گائے بھی کمزور اور چھوٹی ہوتی ہے۔ یہاں کے گیہوں بھی چھوٹے اور کم مغز کے ہوتے ہیں۔ روٹی کھانے کا رواج نہیں۔ یہاں کی بکریاں ہندوستان کی بلیوں کی طرح ہوتی ہیں جن کو ہنڈو (یعنی بھیڑ بکری) کہتے ہیں۔ ان کا گوشت ملائم اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ مرغ، قاز، مرغابی اور سویہ وغیرہ بہت ہیں۔ مچھلی گردہ اور بغیر گردہ والی بھی ہوتی ہے لیکن اس میں مزہ نہیں ہوتا۔

لباس:

پشمینے کے لباس کا عام رواج ہے۔ عورت اور مرد دونوں کرتہ پہنتے ہیں اور اس کو پٹو کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر پٹو کا کرتہ نہ پہنا جائے تو ہوا اثر کر جاتی ہے بلکہ اس کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کشمیر کے لوگ سر منڈاتے ہیں اور پگڑی باندھتے ہیں۔ پٹو کا ایک کرتہ تین چار سال کام آتا ہے۔ ایزار پہننا عیب ہے۔ کرتہ ہی سر سے پاؤں تک جسم کو ڈھانپ لیتا ہے۔

شال:

کشمیری شال بہت مشہور ہے۔ عرش آشیانی (اکبر) نے اس کا نام پرم رکھا ہے۔ شال کی ایک قسم تھرمہ ہے جو شال سے زیادہ دبیز اور ملائم ہوتی ہے۔ ایک اور قسم ورمہ کہلاتی ہے جس کو فرش کی طرح بچھاتے ہیں۔ شال کے لئے اُون تبت سے آتا ہے اور اُن بھیڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے جو صرف تبت یا خراسان میں پائی جاتی ہیں۔ کشمیر میں شال کے اُون سے پٹو بھی تیار کیا جاتا ہے۔ شالوں کو باہم رفو کر کے سقرلات کی قسم کا ایک لباس تیار ہوتا ہے جو بارش

میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جانور:

پہلے کشمیر میں گھوڑا نہیں ہوتا تھا۔ سواری ٹٹو پر کی جاتی تھی لیکن عہدِ اکبری سے عراقی اور ترکی گھوڑیاں لا کر ان کی نسل بڑھائی گئی اور اَب کشمیری گھوڑے کی قیمت ایک ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں مشکیں ہرن بہت ہوتے ہیں، لیکن ان کا گوشت بے مزہ ہوتا ہے۔ ہرنی میں نافہ نہیں ہوتا، نر کے ساتھ مخصوص ہے۔ نافہ میں تازگی کی حالت میں کوئی بو نہیں ہوتی۔ خشک ہونے کے بعد یہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ تبت سے جو بیل یہاں آتے ہیں اُن کے جسم پر بھینس کی طرح بال ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھا کو یہاں گیل کہا جاتا ہے۔

پرندے:

مرغ، قاز، مرغابی اور سویہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ایک آبی پرندہ گلکر (ساج آبی) کہلاتا ہے۔ یہ بلبل کی طرح سیاہ ہوتا ہے لیکن اس کے سفید تل (خال) بھی ہوتے ہیں۔ اسکے پاؤں میں چمڑا بھی ہوتا ہے۔ پانی میں ایک جگہ غوطہ لگا کر دوسری جگہ نکلتا ہے۔ ایک اور پرندہ سوتلو کہلاتا ہے جو مورنی سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی پشت، دُم اور دونوں بازوؤں کا رنگ سیاہ ہے۔ جا بجا سفید تل بھی ہوتے ہیں۔ پیٹ سے سینے تک سیاہ ہوتا ہے۔ اس حصہ میں سفید اور سرخ تل ہوتے ہیں۔ بازُو کے پروں میں آگ کی ایسی سرخی ہوتی ہے سر سے گردن تک کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ سر کے اوپر دو سینگ (شاخ) ہوتی ہے۔ اس کے کان فیروزہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ آنکھ اور منہ کے حلقہ میں سرخ چمڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تولنے پر اس کا وزن ۵۲ تولے ہوا۔ مرغِ زریں کو یہاں

پوٹ کہا جاتا ہے اور لاہور میں رُثن کہلاتا ہے۔ اس کا رنگ مور اور جثہ قاز کی طرح ہوتا ہے۔

مذہب:

اس ملک کے سوداگر اور اہلِ حرفہ سُنی ہیں اور سپاہی شیعہ ہیں۔ بعض گروہ نوربخشی ہیں اور بعض فقراء ریشی کہلاتے ہیں۔ وہ علم اور معرفت تو نہیں رکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں ظاہرداری نہیں ہے۔ کسی کو بُرا نہیں کہتے ہیں۔ بُری خواہش اور لالچ نہیں رکھتے۔ گوشت نہیں کھاتے' شادی بھی نہیں کرتے۔ جنگلوں میں میوہ دار درخت لگاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ ان سے فائدہ اُٹھائیں۔ خود اس کے پھل نہیں کھاتے۔ ایسے تقریباً دس ہزار افراد ہیں۔ برہمنوں کی بھی ایک جماعت ہے۔ وہ یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ ان کی زبان وہی ہے جو تمام کشمیریوں کی ہے اس لئے ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے پاس سنسکرت کی کتابیں ہیں جن کو پڑھتے ہیں اور ان ہی عمل کرتے ہیں۔ سنسکرت ایسی زبان ہے جس میں ہندوستان کے اہلِ علم تصنیف و تالیف کرتے ہیں اور اس پر بہت اعتبار رکھتے ہیں۔

بُت خانے:

ظہور اسلام سے پہلے یہاں بت خانے تعمیر ہوئے تھے، اب بھی قائم ہیں۔ ان کی عمارتیں پتھروں کی ہیں۔ بنیاد سے چھت تک تیس بتیس چالیس چالیس من کے پتھر تراش کر ایک دوسرے پر رکھتے چلے گئے ہیں۔ شہر کے متصل ایک پہاڑی ہے جس کو کوہِ ماران کہتے ہیں۔ اس کا نام ہری پربت بھی ہے۔ اس کی مشرقی سمت میں ڈل تالاب ہے جس کا دور چھ کوس سے کچھ زیادہ ہے۔

سیرگاہیں:

پرگنہ پھاگ جھیل ڈل کے قریب واقع ہے۔ اس کے متصل شالامار ہے۔ یہاں سے ایک خوشنما آبشار پہاڑ سے نکل کر ڈل کے تالاب میں گرتا ہے۔ شہزادہ خرم نے اِس پر پتھر چونے کی منڈیر بنادی ہے۔ یہ آبشار کشمیر کی مشہور سیرگاہوں میں سے ہے۔ موضع چاڈورہ بھی ایک دِل کش سیرگاہ ہے۔ یہاں خوش گوار نہریں اور چنار کے بڑے بڑے درخت ہیں۔ یہاں ایک درخت کا نام "ہل تھل" ہے۔۔۔ اِس کی ایک شاخ پکڑ کر ہلائی جاتی ہے تو تمام درخت حرکت میں آجاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حرکت اِسی درخت کے ساتھ مخصوص ہے لیکن گاؤں میں ایک دوسرا درخت بھی نظر آیا جو اسی طرح متحرک تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے درختوں میں حرکت لازمی ہے۔ ویرناگ کے راستے میں دل کش سیرگاہیں، شیریں اور لطیف چشمے ہیں۔ بج بہاڑہ کی بھی سیرگاہ ہے جہاں ایک نہایت شفاف اور پاکیزہ نہر ہے۔ اس کے وسط میں چنار کے بڑے بڑے درخت ہیں۔ اس کے کچھ فاصلہ پر ایک اور نہر ہے۔ بج بہاڑہ سے آگے دامنِ کوہ میں انچ یعنی انت ناگ کا سرچشمہ ہے جس کے اوپر عمارتیں اور حوض ہیں۔ ان میں بڑی لطافت اور نفاست ہے۔ اس کا پانی بھی بڑا صاف اور میٹھا ہے۔ اس کے اندر مچھلیاں تیرتی ہیں۔ اِس چشمہ سے نصف کوس آگے مچھی بھون کا چشمہ ہے۔ اس کے اوپر ایک مندر بھی ہے۔ اس میں پانی انچ کے چشمہ سے زیادہ ہے۔ اس کے چاروں طرف چنار، سفید اور سیاہ بید کے بڑے بڑے پرانے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس چشمہ میں بکثرت مچھلیاں رہتی ہیں۔ اسی لئے یہ مچھی بھون کہلاتا ہے۔ مچھی بھون سے آگے اچھ بل ہے جو ایک

بڑا آبشار ہے۔ یہاں چنار اور سفیدوں کی وجہ سے ایک دل کش نشیمن بن گیا ہے۔ یہاں ایک صاف ستھرا باغیچہ بھی ہے جس میں جعفری کے پھول کھلے رہتے ہیں اور یہ گویا بہشت کا ٹکڑا ہے۔ اچھ بل کے بعد ویرناگ جو دریائے بہت کا منبع ہے اور دامنِ کوہ میں واقع ہے۔ یہاں اتنے درخت اور سبزے ہیں کہ زمین نظر نہیں آتی ہے۔ اس چشمہ کے کنارے میرے حکم سے ایک عمارت بنائی گئی ہے۔ اس کا حوض مثمن ۴۲×۴۰ درع ہے۔ اس کا پانی سبزہ اور پھولوں کی وجہ سے سبز معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے اندر مچھلیاں بہت ہیں۔ اِس کے اوپر محرابیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک باغ بھی ہے۔ لبِ حوض سے باغ کی آخری سرحد تک ایک نہر جاری ہے جو چار گز چوڑی، ۱۸۶ گز لمبی اور دو گز گہری ہے۔ اس کے دونوں طرف پتھر کی کیاریاں بنی ہیں۔ سبزہ کی کئی قسمیں ہیں جو ایک دوسرے سے مل کر بالکل دُمِ طاؤس کی طرح منقش معلوم ہوتی ہیں اور پانی کی موجوں میں متحرک رہتی ہیں۔ جا بجا پھول بھی کھلے رہتے ہیں۔ کشمیر میں اس سے زیادہ دِل فریب سیرگاہ کوئی اور نہیں۔ ویرناگ کے بعد لوکہ بھون بھی ایک اچھی سیرگاہ ہے۔ اس راستہ میں چشمہ اندوہناک بھی ہے جس کی مچھلیاں پانی کی تاثیر سے اندھی ہوجاتی ہیں۔ ہیرہ پور کا آبشار بھی عجیب وغریب ہے۔ اس کو دیکھ کر دِل اور آنکھوں کو سرور پہنچا۔

پھل:

کشمیر میں پہلے شاہ آلو نہیں ہوتا تھا۔ محمد قلی افشار نے اس کو کابل سے لاکر یہاں اس کا پیوند لگایا۔ اسی زمانے میں زرد آلو کا بھی پیوند لگایا گیا جو یہاں بکثرت ہونے لگا اور اب یہاں زرد آلو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کابل میں

میرزائی بہت عمدہ ہوتا ہے۔ لیکن کشمیر کا میرزائی بھی کم تر درجہ کا نہیں ہوتا۔ یہاں ناشپاتی کابل اور بدخشاں کی ناشپاتی سے بہتر اور سمرقند کی ناشپاتی کے برابر ہوتی ہے۔ یہاں کے سیب اپنی خوبی میں ہر جگہ مشہور ہیں۔ یہاں اُمرود نہ اچھے نہ بُرے ہوتے ہیں۔ انگور بھی ترشی ہوتی ہے اس لئے اچھا نہیں ہوتا۔ انار بھی اچھے نہیں ہوتے۔ لیکن تربوز بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ خربوزے بھی بہت میٹھے اور لطیف ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہ جائیں۔ یہاں شہتوت تو نہیں ہوتا ہے لیکن توت ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ گو یہ کھانے کے لائق نہیں ہوتا ہے۔ اس پر کرم پیلہ کی پرورش ہوتی ہے۔ کشتواڑ میں اعلیٰ قسم کے نارنج و ترنج ملتے ہیں۔

پھول:

موضع بلتار میں قسم قسم کے نرگس، بنفشہ، ارغوان اور عجیب خوشبودار پھول نظر آئے۔ کشمیر کے موسم بہار میں پہاڑوں، میدانوں، دیواروں، صحنوں اور کھوٹھوں پر گل لالہ مشعل کی طرح بزم افروز رہتے ہیں۔ کشمیر میں عمارتیں زیادہ تر لکڑی ہیں جو دو دو، تین تین اور چار چار منزلوں کی بھی ہوتی ہیں۔ کوٹھوں پر مٹی ہوتی ہے جہاں لالۂ چوغاشی موسم بہار میں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ باغوں اور مسجدوں میں بھی اس کی بہار خوب دکھائی دیتی ہے۔ اور لالہ کا ایسا خوشنما منظر کشمیر کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔ یہاں چنبیلی کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ نیلے رنگ کی چنبیلی کی بڑی فراوانی ہے۔ سفید چنبیلی میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ صندلی رنگ کی چنبیلی یہاں کی خاص چیز ہے۔ اس میں بھی خوشبو بہت ہوتی ہے۔

گلاب کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک کا رنگ بالکل سرخ ہوتا ہے۔ ان میں بڑی خوشبو ہوتی ہے۔ دوسرے کا رنگ صندلی ہوتا ہے جس میں بڑی لطافت اور نزاکت ہوتی ہے۔

سوسن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو باغ میں اُگتا ہے اور دوسرا صحرائی ہوتا ہے جس میں رنگینی تو کم ہوتی ہے لیکن خوشبو زیادہ۔ باغ میں اُگنے والے سوسن کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ گلِ جعفری بڑا ہوتا ہے اور خوشبودار بھی۔ اس کا تنہ آدمی کے قد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔

کشمیر کے پھولوں میں بادام اور شفتالو کے پھول بہترین ہوتے ہیں اور یہاں اِتنے پھول ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا ہے اور جب نادرالعصر منصور کو ان کی تصویریں بنانے کو کہا گیا تو وہ سو سے زیادہ کی تصویریں نہ بنا سکا۔

زعفران:

موضع پامپور میں جتنا زعفران ہوتا ہے، کہیں اور نہیں ہوتا۔ یہاں جدھر نظر اُٹھاؤ زعفران ہی زعفران نظر آتا ہے اور اسی سے چھن چھن کر ہوا دماغ تک پہنچتی ہے۔ اور اس کو معطر کرتی رہتی ہے۔ اس کے پھول میں چار پتیاں ہوتی ہیں اور اس کا رنگ بنفشی ہوتا ہے۔ پھول ہی کے بیچ سے زعفران کی تین شاخیں نکلتی ہیں۔ جس سال خوب پیداوار ہوتی ہے تو یہ چار سَو من تک پیدا ہوتا ہے۔ دس روپے میں ایک تولہ ملتا ہے۔ قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں کے باشندے نمک کے بدلے زعفران دیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں نمک نہیں ہوتا ہے۔ زعفران کا پودا زمین سے دو انچ اوپر ہو جاتا ہے تو اس وقت اس میں پھول ہونے لگتا ہے۔ اس کی کھیتی ایک ایک کوس تک پھیلی ہوتی ہے اور نظروں کو بھلی لگتی

ہے۔ اس کی خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ سر میں دَرد ہو جاتا ہے لیکن کشمیر کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

کشمیر کی رعنائی:

کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے۔ لوہے کا ایک قلعہ ہے۔ بادشاہوں کے لئے عشرت افزا گلشن ہے۔ درویشوں کے لئے ایک دل کشا خلوت کدہ ہے۔ اس کے خوشنما باغ اور دِل آویز آبشار شرح و بیان سے زیادہ ہیں۔ نہریں اور لطیف چشمے بے شمار ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ گل سرخ، بنفشہ، خودرو نرگس بکثرت ہیں اور خوشبودار چیزوں کا شمار کرنا مشکل ہے۔ بہار کے موسم میں جنگل اور پہاڑ پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ مکانوں کے درودیوار اور صحن و بام پر لالہ کی فراوانی ہوتی ہے:

شد جلوہ گر نازنینانِ باغ　　رُخ آراستہ ہر یکے چوں چراغ
شدہ مشکبو غنچہ در زیر پوست　　چوں تعویذ مشکیں بہ بازوے دوست
غزل خوانی بلبل صبح خیز　　تمنائی میخوار گان کردہ تیز
بہر چشمہ منقار بط آب گیر　　چو مقراض زریں بقطع حریر
بساط از گل و سبزہ گلشن شدہ　　چراغ گل از باد روشن شدہ
بنفشہ سرِ زلف را خم زدہ　　گرہ در دل غنچہ محکم زدہ

عام طور سے پھولوں کے کھلنے کی ابتدا ''اسفندار'' (وسط فروری تا وسط مارچ) میں ہوتی ہے لیکن کشمیر میں پھولوں کے کھلنے کا وقت اوائل فروردی ہے (مارچ اپریل) یاسمن کبود کے کھلنے پر پھولوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے تزک جہانگیری، ص۳۴۴-۴۵، ۲۹۸-۳۱۰، ۴۵-۴۶)

☆

محمد یوسف ٹینگ

وَالٹر لارنس اور کشمیر شناسی-۲

(اِس مضمون کا پہلا حصہ "شیرازہ" کے سفر نامہ نمبر ۲ میں شائع ہو چکا ہے)

"ویلی آف کشمیر" نہ کشمیر کی منضبط تواریخ ہے اور نہ ہی کوئی موضوعِ اظہار قاموس۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ لارنس نے اپنے وقت میں جب کشمیر کی لوک روایت اور اس کا تاریخی حافظہ ابھی اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن فلم اور بے سروَپیر کی اُن کتابوں کے نقار خانے میں گم نہیں ہوا تھا جو کاروباری اور اشتہاری فجبہ گری کے احساسات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اُس وقت یہاں کی لوک روایت کا ستی سر صدیوں سے ٹھہرا ہوا اور ساکت تھا اور اُس میں پچھلی سچائیوں اور صداقتوں کے جوہر چمکتے رہتے تھے۔ اور سب سے اہم بات کہ ہماری تہذیب کا اصل توشہ خانہ یعنی کشمیری زبان اپنی ستھری اور نتھری شکل میں قائم تھی۔ لارنس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دَربار کے گلیاروں میں مُفت کے لقمے توڑنے والے افسروں اور باتونی دَرباریوں کی چاپلوسیوں کو نظر انداز کیا۔ اُس نے کشمیری زبان میں دسترس حاصل کی اور حسن کھوئیہامی جیسے مستند لوگوں سے کشمیر کی تواریخ کے متعلق واقفیت حاصل کی۔ وہ خود گاؤں گاؤں گیا۔ عام طور پیدل چلتے ہوئے اور کبھی کبھار موسم کی خرابی یا راستے کی نا اُستواری کے باعث گھوڑے کی پیٹھ پر وہ

کِسانوں اور عام لوگوں کے دَرمیان اپنی محفل سجاتا۔ اُن کے دِلوں سے بیگانے پن کا احساس دور کرتا۔ پھر اُن کے ساتھ ٹھٹھول کرتا اور قہقہے لگاتا۔ اُس کے بعد اُن سے باتیں کرتا اور کشمیر کے ماضی، اس کی واردات اور اِس کے باشندوں کے ذہنی روّیوں کے بارے میں ایسی باتیں دریافت کرتا جو دَرباروں کے دسترخوانوں کی چبائی ہوئی ہڈیاں اُٹھانے والے پرَچہ نویس یا نام نہاد مورّخ کبھی نہیں جان سکتے۔ میں اِس قسط میں اُس کے ایسے ہی مشاہدات اور مطالعات کا جَستہ جَستہ ذکر کروں گا۔ اِن میں سے اَکثر کے بارے میں ابھی تحقیق اور چھان بین کی فرصت کسی کو نہیں ملی ہے۔

لارنس لکھتا ہے کہ کشمیر کے دیہاتی چین کی طاقت اور حشمت کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ کشمیر ایک وقت تاتارسے آئے ہوئے چینی شاہزادوں کی آماجگاہ تھا اور جس کا، کنشکا یہاں کے حکمران رہے۔ وہ کنشک کی بودھ کونسل کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ کشمیر کی زیارتوں، طرزِ تعمیر کو چینی پگواڑ طرز کی پیروی مانتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک، بیرونی حملہ آور مہر گل کی ستم رانیوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ حملہ آور سفاک وسطِ ایشیا سے آیا اور ۵۱۵ء میں کشمیر کا مالک و مختار بن بیٹھا۔ اس نے لاکھوں لوگوں کو قتل کیا۔ اِس حد تک کہ اس کے لشکر کے ساتھ رَوانہ ہوتے ہی گِدھ، چیلیں اور کوّے ساتھ ہو لیتے کہ آگے جا کر اِنسانی گوشت و پوست کی فراوانی کا لُطف اُٹھا سکیں۔ چنانچہ اِس سمت رہنے والے لوگ دُور سے ہی اِن آدم خور پرندوں کو آتے دیکھ کر بھاگ کر یا چُھپ کر جان بچانے کے جتن کرتے تھے...... اُس کے ساتھ وابستہ ایک عبرتناک کہانی ہمارے لوک روایت کا حصہ بن گئی ہے۔ اُسے چندر کُل کے نالے کی صفائی کا

خیال آیا لیکن اُس میں موجود ایک بھاری پتھر کو ہٹائے بغیر ایسا کرنا مشکل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے سپنے میں بتایا گیا کہ اِس پتھر کو صرف وہ عورت اُٹھا سکتی ہے جس کا دامن بالکل پاک رہا ہو۔ چنانچہ بے شمار عورتوں نے کوشش کی لیکن بے سود۔ کہتے ہیں کہ مہرکل اِتنی ساری عورتوں کے آبرو یافتہ ہونے پر بہت جھلایا۔ اُس نے تاؤ میں آکر ایسی عورتوں کے ساتھ اُن کے شوہروں اور بھائی بندھوں کے سر بھی کاٹ ڈالے۔ لارنس کی روایت کے مطابق اس مہم میں کوئی تیس لاکھ کشمیری مارے گئے۔ لیکن پھر ایک کمہار (Potter) کی جورو چندراوتی کے ہاتھ لگتے ہی یہ پتھر ہٹ گیا...... ہو نہ ہو کہ یہ لوک روایت فاضل کشمیری کے لاشعور میں بھی رہی ہو۔ جب اُس نے 'کرالہ کوُر' کے عنوان سے اَپنی کشمیری نظم لکھی جو بعد میں ساز و آواز کی لہروں پر سوار ہو کر لوگوں میں بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔

لارنس کشمیر کے سب سے بڑے حکمران للتادتیہ کا ذکر چٹخارے لے لے کر کرتا ہے۔ وہ اُس کے والد پرتاپ دتیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک سیٹھ ساہوکار کی داشتہ پر دِل دے بیٹھا۔ وہ خوبصورتی کے علاوہ دِلکش اَدائیں بھی رکھتی تھی۔ للتادتیہ اسی ناز پیکر کے بطن سے پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ یہ کارکوٹ خاندان کا بادشاہ تھا اور کارکوٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ناگ تھا جس نے ایک خوبصورت عورت سے مباشرت کی جس کے نتیجے میں کارکوٹ خاندان کا پہلا پُرکھ پیدا ہوا............ للتادتیہ تخت نشین ہونے کے کچھ ہی دیر بعد ہندوستان کی طرف تسخیر اور فتوحات کے لئے نکلا۔ ہندوستان کے بہت سے بادشاہوں کو اپنا مطیع بنا کر وہ وسطی ایشیاء کی طرف مُڑ گیا اور فتوحات کا شاندار سلسلہ مکمل کر کے وہ بارہ سال کے بعد تبت کے راستے واپس وطن آیا۔ اُس نے

مفتوحہ ملکوں سے مختلف پیشوں میں کمال رکھنے والے ہنرمند اور کاسب اپنے ساتھ کشمیر لائے۔ علماء اور فاضل بھی آئے اور...... اُس کے دربار کی زینت بنے۔ اُس نے عالیشان مندر اور معبد تعمیر کئے۔ اُن کی آرائش اُس بے اندازہ سونے سے کی' جو وہ ہندوستان کی فتوحات کے بعد اَپنے ساتھ لایا تھا۔ اُس نے رفاعِ عامہ کے بہتیرے کاموں کا بیڑا اُٹھایا۔ پَرسپور میں ایک عظیم ستون کھڑا کیا اور مارتنڈ کے مندر تعمیر کئے۔ لارنس اس مفروضے کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ یہ مندر پہلے تعمیر ہوئے تھے اور اُس نے صرف اُن کی مرمت کی۔ لارنس کی جزرسی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس مفروضے کو ایک اور بڑے انگریز ماہر آثار الیگزنڈر کننگھم کی ایک غلطی قرار دیتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ جب کننگھم نے ۱۸۴۸ء میں اس بارے میں اَپنا مضمون ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل کے لئے لکھا تھا تو وہ ''راج ترنگنی'' کے متعلقہ پیراگراف کو صاف طور پڑھ نہیں سکا اور غلط اَندیشی میں اس کی تعمیر کا سلسلہ للتادت سے بہت پہلے کے حکمران رینادتیہ کے ساتھ جوڑ دیا۔ وہ کہتا ہے کہ دوسری بار اَپنی فتوحات پر رَوانہ ہونے سے پہلے للتادت نے اَپنی رعایا کے لئے ہدایات کا ایک مجموعہ چھوڑا۔ (لارنس کے خیال میں اس میں بعض باتیں بعد کے مورخوں کی حاشیہ آرائیاں ہیں)۔

اُس نے اَپنے لوگوں کو اندرونی تنازعوں میں اُلجھنے سے گریز کرنے کی تلقین کی۔ اُس نے بتایا کہ اگر اپنے قلعوں کو مستحکم رکھو گے اور اُن میں کھانے پینے کی چیزیں اور اسلحہ وافر مقدار میں رکھو گے تو دشمنوں سے کوئی ڈر نہیں۔ ایک پہاڑی ریاست میں نظم و ضبط کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اُس نے کہا کہ کاشتکاروں کے پاس اُس سے زیادہ اَناج نہیں رہنے دینا چاہئے جس کی اُنہیں

سال بھر ضرورت ہو۔ کاشتکاروں کے پاس اُن کی ضرورت سے زیادہ مویشی یا جُتائی کے ہل نہیں رکھنے دیئے جائیں ورنہ وہ زمینوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ کسانوں کو دَبا کر رکھنا چاہئے اور اُن کے رہن سہن کا معیار شہر باشوں سے کمتر ہونا چاہئے ورنہ شہر باشوں کی خیر نہیں ہوگی۔ آخری بات یہ کہ دفتروں پر خاندانی برادریوں کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کلرک شاہی (کائیستھ یعنی منشی) کا طوطی بولنے لگے اور وہ ایک دوسرے کے کنبوں سے شادی کے سمبندھ اُستوار کر کے ایک جٹ ہونے لگیں تو جان لو کہ رعایا کی جان پر بن آئے گی۔

لارنس اپنی واضح رائے دیتے ہوئے للتادتیہ کو ایک عظیم الشان فاتح قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس کے مشوروں میں اُس کی رعایا کے مستقبل کے لئے پیش بینی مضمر تھی۔ کچھ غلط اَندیشوں نے کلہن کی 'راج ترنگنی' میں اُپنے تعصبات کی عینک لگا کر کیڑے نکالنے کی مہم جاری رکھی ہے جو بیسویں صدی میں اور تیز ہوگئی۔ لارنس اُن کی توجہ 'راج ترنگنی' میں انجینئر سُیا کے کارناموں کی طرف دِلاتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے:

> "ڈاکٹر آرل سٹائن نے لکھا ہے کہ کلہن نے سُیا کے بارے میں جو لکھا ہے وہ واضح تواریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ لیکن اُس شکل وصورت میں جو یہ اُپنے زمانے کے لوک حافظے میں اختیار کر گئے تھے۔ البتہ کلہن نے اُن نہروں، سینچائی کے بندھوں اور دیہات کے متعلق دُرست تفصیلات درج کی ہیں جو سُیا نے بنائے تھے۔ اِن کو خود مشاہدہ کرنے سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت بھی سُیا کا نام سوپور کے نام میں موجود ہے۔ جو دراصل سُیاپور تھا"۔

لارنس اپنے زمانے میں کشمیری برہمنوں کے اِنتظامی حلقے پر چھا جانے

کی بات بار بار اُٹھاتا ہے اور کبھی کبھی ماضی میں بھی اُن کے اقتدار اور شہہ زوری کا چرچا کرتا ہے۔ شنکرورمن کی بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ٹلہ مُل (کھیر بھوانی) کے برہمن ہمیشہ کی طرح اُس کے زمانے میں بھی طاقت ور تھے۔ اگرچہ وہ اُس کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے تھے لیکن وہ اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔ ٹل مُل کے اِنہی برہمن پجاریوں نے ۷۸۲ء میں راجہ جیا پیڈ کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ مہاراجہ یش آسکارا نے (۹۳۹-۴۸ء) میں اِن کو دربار سے دُور رکھنا چاہا لیکن آخر کار اپنی دولت اِن کو بھینٹ چڑھانے کے لئے مجبور ہوگیا۔ "راج ترنگنی" میں پال، ڈامر (ڈار) تانترے، لون گے (لون) کھاشے اور ٹھاکر وغیرہ جنگجو قبیلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا ذکر بھی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ جب کشمیر کے مہاراجے ہندوستان میں فتوحات کے لئے جانا بند کرتے تھے تو اُن کے سپاہی بے کاری سے تنگ آکر آپس میں لڑنا بھڑنا شروع کرتے تھے اور خانہ جنگی شروع ہوجاتی تھی۔

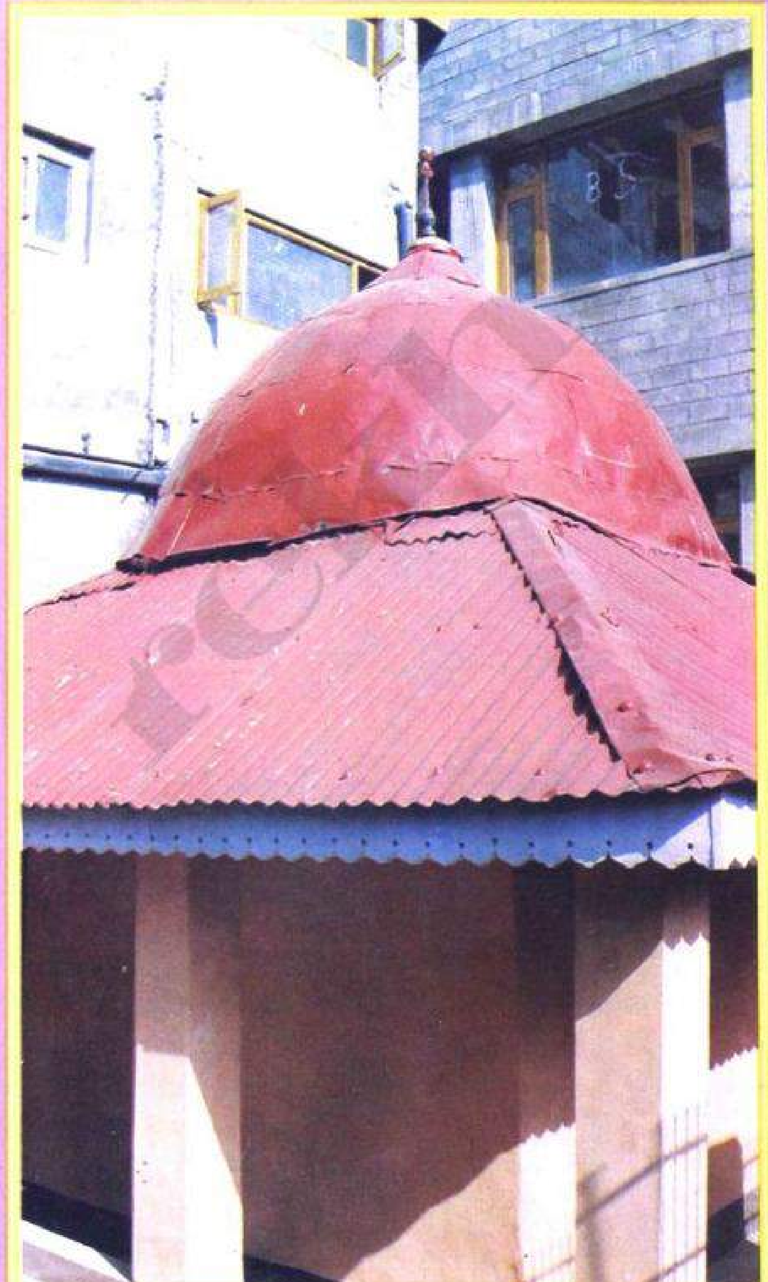
لارنس کشمیر کی سب سے زبردست مہارانی دِیدا کا خاص طور ذکر کرتا ہے۔ وہ اِسے ایک غیر معمولی شخصیت قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ کابل کے شاہی خاندان کے بادشاہ بھیم کی بیٹی تھی۔ وہ کشمیر کے راجہ کھیم گپتا سے بیاہی گئی۔ وہ اُس کے زمانہ حکمرانی میں اقتدار واختیار میں اہم حصہ نبھاتی رہی۔ اُس کی وفات (۹۵۸ء) کے بعد وہ اپنے نابالغ بیٹے ابھیمنیو کی سرپرست بنی اور آہنی پنجے سے کشمیر پر راج کیا۔ اُس کی مشکوک حالت میں موت کے بعد اُس نے اپنے تین پوتوں کو بھی یوں کہئے کہ یکے بعد دیگرے قتل کر ڈالا۔ اس خون خرابے کے بعد وہ ۹۸۰ء میں خود تخت نشین ہوئی۔ وہ تیئس[۲۳] سال تک بلا روک ٹوک دادِ

حکمرانی دیتی رہی۔ اُس نے بڑے حوصلے سے راج کیا اور ملک میں استحکام پیدا کیا لیکن اُس کے سوتیلے بیٹے سنگرام دیو اور اُس کے وارثوں کو کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بعد میں صورت بگڑتی گئی اور اُچل کے زمانے (۱۱۰۱-۱۱۱۱ء) میں اُس کے وزیروں اور منصب داروں نے ڈاکوؤں جیسا طریقہ اختیار کیا۔ کلہن کے زمانے (۱۱۴۹ء) میں ملک میں اَبتری اور اَفراتفری تھی اور ڈامر آگ لگانے، لوٹ کرنے اور خون بہانے میں خوب مہارت دِکھا رہے تھے۔ اُچل کا خیال تھا کہ کشمیر ہیضہ اور قولنج کے روگوں سے زیادہ کائستھ (کلرک) شاہی نے قریب المرگ بنا دیا تھا۔ یہ سب کچھ کشمیر میں صدیوں کے ہندو راج میں ضعف اور خلفشار کا واضح اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۱۸ء میں تاتار حملہ آور ذوالقدر خان (ڈلچو) نے چڑھائی کی تو یہاں کا راجہ سہادیو ڈر کے مارے کشتواڑ بھاگ گیا۔ اُس کے بعد ہی کشمیر کے اُفق پر دو اجنبی نمودار ہوگئے۔ جنہیں آنے والے برسوں میں یہاں کی تاریخ رقم کرنے میں اہم حصہ ادا کرنا تھا۔ چنانچہ رینچن شاہ اور شاہ میر نے بعد میں تاریخ کا مُنہ موڑ دیا۔ ہندو ٹیگ کا شٹر نیچے گرایا اور مسلمانوں کے عہد کا آغاز کیا۔ رینچن شاہ نے اپنے لداخی ہمدرد سپاہیوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اُس نے آخری ہندو حکمران رام چند کو ہلاک کرکے اُس کی بیٹی کوٹہ رانی کے ساتھ بیاہ رچایا۔ رینچن کے مذہبی اعتقاد کمزور تھے لہٰذا وہ کشمیر کے لوگوں میں رائج کسی مذہب کو اختیار کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہندو نہ بن سکا کیونکہ برہمنوں کے عقیدے کے مطابق برہمن جنم سے بنتا ہے اور باہر نہیں لایا جاسکتا۔ چنانچہ وہ مشہور بزرگ حضرت سید عبدالرحمٰن بُلبلؒ کے ہاتھ پر بیعت کرکے مسلمان ہوگیا۔

کشمیری خاندان کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالنے کے بعد لارنس، چک خاندان کے اُبھار کا ذکر کرتا ہے۔ اُس کے مطابق اُن کی ہمت اور حوصلے سے لگتا ہے کہ وہ کشمیری نسل کے نہ تھے بلکہ دَردستان سے آئے تھے۔ وہ شمال سے آئے اور لارنس ترہگام میں اُن کے ایک جد مدن چک کی بنائی ہوئی ایک جگہ کا ذکر کرتا ہے۔ ریگی پورہ، جو اِنہی نواحات میں ہے، ایک چک شہر کی کھنڈر ہیں۔ اس کے برعکس کشمیر کے شمال میں چک وابستہ جگہیں نہیں ہیں۔ لارنس ایک اسطور کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پانڈو چک ایک ایسے باپ کی اَولاد تھا جو ایک کشمیری عورت کے ایک عاشق مزاج عفریت Dewon کے اختلاط سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نسب کے چک ترہگام میں رہتے تھے اور بہت دراز قد کے مالک ہوتے تھے۔

لارنس چکوں کے دَور کی چرچا کرتے ہوئے ۱۵۸۰ء میں یوسف شاہ چک کے تخت نشین ہونے کی بات کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اُس (یوسف خان) نے ایک کسان عورت سے شادی کی اور عیش و عشرت میں گم ہوگیا۔ وہ پہلا کشمیری حکمران تھا جس نے گلمرگ کی زیبائیوں کا سراغ لگایا لیکن وہ نادان بھی تھا اور اُس نے اپنے وزیر سیّد مبارک خان بیہقی سے جھگڑا مول لیا۔ مُبارک خان نے اُسے کشمیر سے بھگا دیا۔ یوسف خان کا بیٹا یعقوب خان دوسری قسم کی مٹی سے بنا تھا اور جب ۱۵۸۲ء میں اکبر بادشاہ نے کشمیر پر پہلی چڑھائی کی تو یعقوب نے کھکھوں اور بومبوں کو اِکٹھا کرکے لشکرِ اکبری کو شکست دے دی۔ (کھکھے اور بمبے بارہمولہ کی جانب وادی جہلم کے باسی تھے) مغلوں کو بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن انصاف کی بات کی جائے تو کہنا پڑے گا کہ مغل لشکر کا نظام



مولانا آزاد روڈ سرینگر میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے سپہ سالار لکھپت رائے کی سمادھی۔ (یہ تصویر پہلی بار شائع ہو رہی ہے)



گاؤں کی سب سے خوبصورت اور پائیدار عمارت...... مسجد

رسد کمزور ہو گیا تھا اور پھر بارشوں نے ایسا اُودھم مچایا کہ راستوں پر قدم بڑھانا کٹھن ہو گیا اور اس طرح سے مغلوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

بہرحال ۱۵۸۶ء میں کشمیر مغلوں کے زیرِ نگین آیا۔ لگتا ہے کہ خود اکبر تین مرتبہ کشمیر کے دَورے پر آیا (پہلی بار وہ تاشوان کے قریب اُردو بازار میں خیمہ زن ہوا) اپنے پہلے دَورے میں وہ اپنے مشیر مال ٹوڈرمل کو ساتھ لایا (جو آج کل کے پاکستان کے چنیوٹ شہر سے تعلق رکھتا تھا)۔ لارنس اُس کی کارکردگی کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس نے یہاں کا بندوبست تیزی سے تو کرایا لیکن اُس میں بڑی خامیاں اور غلطیاں بھی رہیں۔ اِس دوران ٹوڈرمل نے پٹن میں اپنا کیمپ لگایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے پٹن کے اِردگرد کے بہت سے گاؤں کو محض غلطی سے مال گذاری کے نظام سے باقی رہنے دیا۔ اپنی تیسری آمد کشمیر میں اُس نے ہری پربت پہاڑ پر زبردست قلعہ بنایا[1] جس پر بہت بڑی لاگت آئی۔ قلعے کے متصل اُس نے ناگرنگر کا قصبہ آباد کیا جہاں اُس کے امیروں وزیروں نے باغ اور عمارتیں بنائیں۔

لارنس کے مطابق:

> کہا جاتا ہے کہ ہری پربت کا قلعہ اس لئے شروع کیا گیا تا کہ کشمیر پھر اپنے وطن لوٹ آئیں جہاں سے وہ چکوں کے افراتفری کے زمانے میں بھاگ گئے تھے۔ کام کاج کے لئے عورتوں اور مَردوں کو اپنے وقت کے حساب سے بڑی اُجرتیں دی گئیں۔ بیاہا عورتوں کو روزانہ چھ آنے اور مَردوں کو چار آنے"۔

لگتا ہے کہ اکبر کو کشمیر آنے کی نہ فرصت تھی نہ رغبت اور اِسی لئے اِس عظیم

۱؎ ہری پربت کی فصیل یا قلائے اکبر کی تعمیر کردہ ہے۔ اوُپر کا قلعہ افغان وقت میں بنا (م ی ث)

بادشاہ نے اِس تعمیر اور ٹوڈرمل کے بندوبست کے بغیر یہاں اپنی کوئی اور نشانی نہیں چھوڑی ہے۔

جہانگیر کشمیر کی زُلفوں کا گرہ گیر تھا اور اِس بات کی بہت سی مثالیں لارنس نے دی ہیں مگر اُس کی یہ بات صحیح نہیں کہ کشمیر میں چنار مغلوں کی ہی دین ہیں۔ حالانکہ اُس نے جس اَنداز سے یہ لکھا ہے کہ اُس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چنار اگرچہ یہاں تھے لیکن اُن کو مقبول اور عام کرنے میں اُن کے ہی ذوق کا حصہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہانگیر نے کشمیر میں شادی کی تھی۔ چنانچہ تزکِ جہانگیری کو نقل کرتے ہوئے وہ اُس کا یہ بیان درج کرتا ہے:

> "اُس کے بعد، کشمیر کے شہزادے، جو جوگیوں سے رسم وراہ رکھتا تھا، کی بیٹی کے بطن سے میری ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ جو ایک برس کی عمر میں مرگئی"۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے مغل بادشاہ ہماری شکرگزاری کے مستحق ہیں۔ اگر صرف اُن کی اِسی عطا کا ذکر کیا جائے کہ اُنہوں نے چنار کے اِس چھتنار درخت سے وادی کو اس طرح آراستہ وپیراستہ کردیا۔ مغل وقتوں میں صرف جھیلِ ڈل کے آس پاس مغلوں کے ۷۷۷ باغ تھے۔ اِن باغوں کے گلابوں اور بیدِ مُشک سے ایک لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ لگتا ہے کہ مغل بادشاہوں کی حکومت کشمیر میں عادلانہ بھی تھی اور آزاد خیال بھی۔ اور اُن کے قانون اور فرمان اپنے مطالب میں بے حد اعلیٰ تھے۔ جہانگیر کا ایک صوبے دار اعتقاد خان ظالم حکمران تھا لیکن اُس کی زیرکی کی بدولت چک شاہی حتمی طور کچل دی گئی۔ شاہِ جہاں کے ذکر میں لکھا گیا ہے کہ وہ ایک زبردست تعمیر کار تھا اور اُس نے

عشرت گاہیں بنوائیں۔ لیکن وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اُسے علی مردان (خان) اور ظفر خان (احسنؔ) جیسے صوبے دار ملے جن کے متعلق آج بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مہربان اور منصف مزاج حکمران تھے۔ ظفر خان نے اعتقاد خان کے لگائے ہوئے بہت سے ٹیکس ہٹائے۔ اُس نے ہانجیوں پر لگے ہوئے ٹیکس معاف کئے۔ اور اُس نظام میں بہتری لائی جس کے ذریعے زعفران اُگانے والوں سے مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اُس نے لکڑی اور بھیڑ بکریوں سے وصول کئے جانے والے ٹیکس بھی کم کئے۔ اور اُس رَسم کو بھی سختی سے دبا دیا جس کے تحت میوہ اُگانے والوں سے اُن کی عمدہ ترین فصل کا حصہ سرکاری اہلکاروں کے لئے وصول کیا جاتا تھا۔ لوگ اس زیادتی سے اِتنے تنگ آ گئے تھے کہ اُنہوں نے اپنے باغات کے پیڑوں کی کٹائی شروع کی تھی۔

لارنس کشمیر کی تواریخ پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ ہندو دَور کئی لحاظ سے شان اور شوکت کا دَور رہا ہوگا۔ اُن کے دَور میں کشمیریوں نے باہر کے علاقے فتح کئے اور وہاں سے حاصل کی ہوئی لُوٹ سے شاندار مندر اور رفاعِ عامہ کے غیر معمولی کام کئے۔ کریوہ اور دوسری جگہوں پر بکھری ہوئی بے شمار ٹھیکریوں سے پُرانے شہروں کا پتہ چلتا ہے اور اِس بات کا بھی کہ وادی اُن بہت گنجان آباد رہی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ اُس زمانے کے کشمیری ہندوؤں کی بہادری کے متعلق کوئی بات وثوق سے معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ اِمکان یہ ہے کہ اُن کی کمان کے نیچے لڑنے والے پنجاب سے لائے گئے بھاڑے کے سپاہی تھے۔ سُلطانوں کے زمانے میں زین العابدین کا روشن وقت ہے۔ لارنس کے خیال میں اس دَور کی بس یہی بات خوشگوار یا صحت مند ہے۔ چکوں کا طاقت پانا

کسی قومی پارٹی کے غالب آنے کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے پردیس سے آئے ہوئے لگتے ہیں۔ جیسے مغل اور پٹھان۔ اور تہذیب میں وہ اِن دونوں سے کم تر تھے۔

مغلوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ایک یا دو بُرے صوبیداروں کے وقت کے سِوا اُس زمانے میں عوام کی خوشحالی کے بہت عنصر موجود تھے۔ اُن کے وقت پر لوگوں کو ضرور مشکلات پیش آئی ہوں گی لیکن اُس وقت یہاں دولت بھی فراوانی سے آئی ہوگی۔ اُن کی تہذیب اور شوکت نے کشمیریوں کی زندگی اور اُن کے خیالات کو متاثر کیا ہوگا کیونکہ مشرق کے رہنے والے دُوسرے لوگوں کی طرح اُنہیں بھی زندگی کی باہری چمک دَمک پسند تھی اور اس غرض کے لئے وہ اَپنا حصہ اَدا کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ اگرچہ مغلوں کے باغات اور دوسری جگہوں سے وابستہ اَفسانوں کے پس منظر میں لارنس کہتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ کشمیر میں مغلوں کا زمانہ عیش و عشرت کا ایک مسلسل دَورِ طرب تھا اور انتظام و انصرام کا کوئی خیال ہی نہیں رکھا گیا ہوگا لیکن رفائی کام برابر جاری رکھے گئے۔ ٹوڈر مل کا بندوبستِ اَراضی اگرچہ جلدی میں کیا گیا لیکن اس میں بہت سی باتیں مستقل اہمیت کی تھیں (لارنس جیسے ماہرِ بندوبست کی زبانی یہ سند بہت معنی خیز ہے) گاؤں کے مقدم کا اِدارہ اُنہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ آرل سٹائن کو لارنس کی اس رائے سے جزوی اتفاق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ 'راج ترنگنی' میں گاؤں کے اہلکار کا ذکر آتا ہے مگر شاید مغلوں نے اس میں کچھ اچھی تبدیلیاں لائی ہوں۔

مغلوں کے بعد اَفغانوں کے دَور کا ذکر کرتے ہوئے لارنس کا لہجہ بہت تلخ ہو جاتا ہے اور وہ اِسے کشمیر کی تاریخ کا بہت ہی بُرا وقت قرار دیتا ہے۔ وہ

اسد خان جیسے ظالم صوبیدار کے بعد مدد خان کی تقرری کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے اُس وقت کا یہ جُملہ نقل کرتا ہے...... ''ظلم اسد رار سید مدد''۔ وہ بیربل در کے ساتھ لاہور جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ سے اِمداد مانگنے کے سلسلے میں کچھ باتوں کی چرچا کرتا ہے۔ بیربل در کھر نارہ واؤ کے ملکوں کی اعانت سے پیر پنچال پار کر گیا۔ اُس کا بیٹا راج کاک در اُس کے ساتھ تھا۔ بیربل کی بیوی نے زہر کھا کر خودکشی کی۔ لیکن اُس کی بہو کو پکڑ کر کابل لے جایا گیا۔ لارنس کا کہنا ہے کہ وہ حال حال تک وہاں زندہ تھی[1]۔ خالصاؤں کے زمانے کی بات کرتے ہوئے لارنس کہتا ہے کہ وہ کشمیریوں کو مویشیوں سے بالکل بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سکھ گورنر کرپا رام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک معتدل مزاج اور فرحتوں کا دِلدادہ آدمی تھا جِسے جھیلِ ڈل کی سیر بڑی مرغوب تھی۔ ہانجی عورتوں نے اُسکا نام ''کرِپہ شرونی'' رکھا تھا۔ شرونی گھنگھرو بندھے ہوتے تھے۔ اور جب بیک وقت ایسے کئی چپّو اُٹھ کر پانی میں لگتے تو یہ میٹھی جھنکار اطراف و اکناف میں گونج پیدا کرتی تھی۔ کرپا رام کا انجام غم انگیز تھا۔ وہ جھیل ڈل میں اپنی بزمِ نشاط سجائے ہوئے تھا کہ اُسے لاہور سے اپنی برطرفی کا پروانہ ملا۔ لاہور میں اُسے ذلیل کر کے نکالا گیا اور وہ سنیاس لے کر ہردوار میں چل بسا۔ اُس نے لکھا ہے کہ لاہور کے سکھ دَور کا کشمیر میں تاریک ورق ہر وقت تڑپاتا رہے گا۔ اِسی دَور میں سرینگر کی جامع مسجد پر تالے چڑھا دیئے گئے اور اذان پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۸۳۱ء میں شیر سنگھ

[1] یہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ دَر خاندان میں آج تک یہ بات یاد کی جاتی ہے کہ جب وہ پانی پیتی تھی تو باہر سے لگتا تھا کہ ایک صاف آئینے کی گذرگاہ سے نیچے اُتر رہا ہے۔ مجھے خود دَر خاندان کے ایک معزز فرد سے یہ بات سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ (م۔ی۔ٹ)

صوبیدار بن کر آیا لیکن عیش و عشرت کے گرداب میں غوطے لگانے لگا۔ کشمیر میں ایسا قحط پڑا کہ اُس کی یاد تواریخ کے صفحات پر آج بھی مرثیہ خوانی کرتی ہے۔ اِس دوران کشمیر کے بہت سے لوگ بھاگ کر جان بچانے کے لئے مجبور ہوگئے کہ اُنہیں واقعی روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔

۱۸۳۳ء میں کرنل میاں سنگھ کشمیر کا گورنر بن کے آیا اور اُس زمانے میں چند سال ظلمت میں چند جگنو چمکاتے ہیں۔ اُس نے پنجاب سے اَناج اور انڈے منگوا کر صورتِ حال کو سُدھارنے کی کوشش کی۔ کشمیر میں دھان کا بیج ناپید ہوگیا تھا اور مُرغوں کی نسل کا صفایا ہوگیا تھا۔ میاں سنگھ کی مساعی سے یہاں پھر کھیتوں میں خوشے لہرانے لگے اور آنگن میں مرغیوں کی چُوں چُوں سنائی دینے لگی۔ آبادی میں اضافہ کرنے کے لئے اُس نے شادی ٹیکس منسوخ کیا اور انتظامیہ کے حیوانی بُشرے کی سختیاں کم کرنے کے اقدام کئے۔ زراعتی قرضے جاری کئے گئے جن پر سُود کی چھوٹ تھی۔ ناپ تول کے پیمانے درست کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ میاں سنگھ خود رعیّت کی فریاد سنتا تھا اور مقدمات کو جلدی نپٹاتا تھا۔ اُس کی وجہ سے سکھا شاہی کی ترکیب ماند پڑنے لگی جس کے مطلب تھے کہ بلا تفتیش و تحقیقات فیصلے دیئے جائیں۔ چنانچہ بعض حلقوں نے اُسے نوشیروانِ ثانی کہہ کر بھی پکارا۔ لیکن اس منصف مزاج صوبیدار کو اُس کے اپنے ایک سپاہی نے ہی بے دردی سے ہلاک کر ڈالا۔

۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں نے سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد کشمیر کو گلاب سنگھ جموال کے ہاتھوں ۷۵ لاکھ روپے نانک شاہی روپے کے عوض بیچ ڈالا اور یہ سارا کچھ معاہدۂ اَمرتسر کے نام سے انجام دیا گیا۔ لیکن کشمیریوں نے

اِس اَندھیر گردی کی مزاحمت کی اور خود آخری سِکھ صوبے دار کی قیادت میں اُن کی فوجوں کو شکست دی۔ چنانچہ ڈوگرہ سپہ سالار وزیر لکھپت میدان مائسمہ میں کام آیا، جہاں اُس کی سمادھی ابھی تک موجود ہے۔ آخر کار گلاب سنگھ کی مدد کے لئے کرنل لارنس کی سرکردگی میں انگریزوں کی فوج کشمیر پر حملہ آور ہوئی اور لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔ جموال راجاؤں کی کشمیر پر قبضے کے بعد کشمیر پر جدید زمانے کے اَثرات کی کرنیں پڑنے لگیں۔ انگریز جلد کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کرنے کی حماقت پر پچھتانے لگے کہ کشمیر اَپنی قدرتی خوبصورتی، آب وہوا اور تہذیبی ورثے کی بدولت اُن کی طبیعت کے بہت قریب تھا۔ سیاسی لحاظ سے اُنہوں نے اَپنی مداخلت کے دَروازے کھولنے جاری رکھے لیکن وہ کشمیر کے حکمران نہ بن سکے۔ البتہ یہاں انگریز سیاحوں کی ریل پیل شروع ہوگئی اور اُس کے ساتھ ہی نئی تہذیب کے نقوش بھی اُبھرنے شروع ہوگئے۔ گلمرگ جیسی سیرگاہوں کی قسمت صدیوں کے بعد جاگ اُٹھی۔ سرینگر اور گلمرگ میں گرجا گھر تعمیر کیئے گئے۔ لارنس لکھتا ہے کہ یوروپی سیاح کشمیر آکر روپے پیسہ فراوانی سے خرچ کرتے ہیں جس سے قسم قسم کے پیشہ وروں کو اُجرتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اُس کے مطابق:

''ہندوستان کے کسی بھی حصے میں شاید برطانیہ کے اثرات نے اتنی تبدیلیاں نہیں لائی ہیں جتنی کشمیر میں''۔

وہ اس دَور کے بڑے کارناموں میں جہلم ویلی روڈ کی تعمیر کا خاص کر ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی بدولت اَب کشمیر ریل سے صرف دو دن کی مسافت پر رہ گیا ہے۔

لارنس آخر پر اِس بات پر تعجب آمیز خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ کشمیری اِتنے حکمرانوں کے ماتحت رہے جن کی بہت سی زبانیں، بہت سے مذاہب اور الگ الگ نسلیں تھیں۔ لیکن اُس کے باوجود اُن کی خاص قومیت (Nationality) پر غلبہ حاصل نہیں کیا جاسکا اور اُن کی الگ شناخت قائم ہوئی لیکن وہ ہندوستان کے ساتھ بڑھتے ہوئے رابطوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آگے کشمیر کو ایک اِنقلابی صورتِ حال درپیش ہے۔ وہ اِس تبدیلی کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں اُس کے لئے اُنہیں بہت دانشمندانہ رہنمائی اور احتیاط کرنے کی ضرورت ہوگی۔

لارنس کشمیر میں صرف چھ سال سے تک رہا لیکن اُس نے کشمیریوں کے مصائب کا ذکر جس دَردمندی سے کیا ہے وہ دِکھاتا ہے کہ اِنکی چوٹ خود اُس کے جگر پر پڑی تھی۔ شیر سنگھ خالصہ کے وقت ۱۸۳۱ء کی قحط سالی کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ اِس سے پہلے کی ۱۹ قحط سالی کی مصیبتوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ شیر سنگھ کے اس قحط میں کشمیر کی آبادی آٹھ لاکھ سے گر کر صرف دو لاکھ رہ گئی۔ ۱۸۷۷ـ۷۹ء کی قحط سالی میں بھی جان و مال کا نقصان بے اَندازہ تھا۔ لارنس نے ایک معتبر ذریعے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ صرف شہرِ سرینگر کی آبادی ایک لاکھ ستائیس ہزار سے گھٹ کر صرف ساٹھ ہزار رہ گئی۔ کچھ اور ذرائع کے مطابق وادی کی آبادی کے پانچ حصوں میں صرف دو حصے بچ پائے۔ لارنس کے مطابق اِس قحط پر اَب برس ہا گذر گئے ہیں لیکن کشمیری محاورہ ''دراگ ژلہِ مگر داغ ژلِہ نہِ (قحط چلا جائے گا مگر اُس کے داغ وہیں رہیں گے) ہر لحاظ سے صحیح لگتا ہے اور ملک ابھی اس قحط کی خانہ خرابیوں سے اُبھر نہیں سکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں جہاں میرے کیمپ لگتے ہیں اِس قحط کی تباہیوں پر بدستور گفتگو ہوتی

ہے۔ وہ چند باتوں کو نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں ایسا اِس لئے کر رہا ہوں کہ اِن سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ اُس کے مطابق اِن قحط سالیوں میں اِتنے لوگ مَرے کہ ندیاں اور نالے لاشوں سے اَٹ گئے۔ کتوں نے مُردہ گوشت کو ایسے کھانا شروع کیا جیسے کوئی ضیافت ہو رہی ہو۔ پہاڑوں پر رہنے والے گوجر زیادہ خستہ تھے اور یتیم لڑکیوں کو شہر کے خوشحال لوگوں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔ وہ بڑی حسرت سے کہتا ہے کہ سیر بھر چاول ایک آدمی کے دِن بھر پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتا لیکن مقدور رکھنے والے اِس سے دُگنا کھا کر بھی اَپنے آپ کو بھوکا محسوس کرنے لگے۔ لگتا ہے کہ اِنسانوں کے اَندر کوئی جن بھُوت داخل ہو گیا تھا اور اُسکا پیٹ بھرنے کے سِوا چارہ کار نہیں تھا۔ لوگ پنجاب بھاگنے لگے تو ناکوں پر پہریدار اُنہیں روکتے تھے۔ ایسی شرمناک کہانیاں سُننے کو ملتی ہیں کہ باپ اور خاوند پہرے داروں کو رشوت دے کر رہداری پاتے تھے۔ لیکن اُن کے بیوی بچے پیچھے رہ کر بھوکے مرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ خاص طور دیہات میں بُھک مریوں کا شمار نہیں۔ شہریوں میں شالبافوں کی حالت بھی کچھ کم خراب نہ تھی اور یہ بیچارے نصیبوں کے مارے فاقہ کشی سے ڈھیر ہوتے رہتے تھے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قحط سالی میں پنڈتوں میں موتیں نہیں ہوتی تھیں۔ مسلمان اِس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک خاص رُتبے کی قوم ہیں اور وہ اپنے سرکاری اِقتدار و اختیار سے سارے اُناج کو اُپنے لئے سمیٹ لیتے ہیں مگر یہ بات بھی سچی ہے کہ پنڈت کم خور ہیں اور زیادہ تر برت رکھتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ اگر چہ فاقہ کشوں کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے جھوٹی اطلاعات بھیجی جاتی تھیں کہ فاقہ کشی سے موتیں نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ کشمیر

کے سرکاری ملازم قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور جب مہاراجہ نے خیرات سے لوگوں کی مدد کرنی چاہی تو اِن لوگوں نے اِسے بھی اپنے لئے نفع حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قحط میں کشمیر کی آبادی کے پانچ حصوں میں تین حصے مر گئے۔ میں نے خال ہی کسی گاؤں میں ویران مکانات اور بِن جوتے کھیت نہیں دیکھے۔ اِن کے آباد کرنے والے ۱۸۷۸ء کے قحط میں فنا ہو گئے تھے۔ قحط اور آفتوں نے کشمیر میں بہت کم آبادی چھوڑی ہے۔ ایسے میں کھیت کھلیان کیسے آباد رہیں گے لیکن یہ بات بہت سے لوگوں نے مانی ہے کہ کشمیری عورتوں کی کوکھ غیر معمولی طور پر شاداب ہے۔ ایک مبصر نے تو اِس بیان کو حقیقت مانا ہے کہ کشمیری عورت کے بچوں کی اُوسط دس سے پندرہ بچوں تک ہوتی ہے۔ ہیضہ کے متعلق پہلا ذکر مجھے ۱۵۹۸ء میں ملا لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ اِس سے پہلے اِس کی تباہ کاریاں کشمیر کو زیر و زبر نہیں کرتی تھیں۔ تب اس کا نام دیا تھا اور اس میں خاندانوں کے خاندان مُرکھپ جاتے تھے۔ ۱۸۹۲ء کے کالرا کی بات لے لیجئے۔ تمام کاروبار بند ہو گیا صرف کفن بیچنے کی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ کوئی کسی کو قرضہ نہیں دیتا تھا اور گاؤں والے دِن بھر قبرستانوں میں چُپ چاپ پڑے رہتے تھے۔ شہر میں لوگ صبح سویرے دُور باغات وغیرہ میں جاتے اور جب شام گئے لوٹ آتے تو اُنہیں پتہ چلتا کہ اُن کے اور بہت سے رشتہ دار اور دوست موت کے ہتھے چڑھ گئے جو تابوت قبرستان کی طرف لئے جاتے تھے وہ ایک نہ ختم ہونے والی رجمنٹ کی قطار جیسے لگتے تھے۔ دریا میں کشتیوں پر کشتیاں مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں شمشان گھاٹ کی طرف لیجاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میرے پاس ایسے لوگ بھی آتے تھے جن کے کنبوں کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا تھا۔

وہ اپنی مصیبت بیان کرتے ہوئے دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگتے۔ میں نے ۱۸۹۲ء میں یہاں جو بھرپور نا اُمیدی اور بے کسی دیکھی وہ کہیں اور نظر نہیں آئی۔ جب یہ یاد رکھا جائے کہ یہ آفات کشمیریوں کے لئے کوئی نادر چیز نہیں ہے اور کہ آتشزدگیاں، قحط اور وبائیں اُن کا پیچھا کرتی...... رہتی ہیں تو یہ بات لگتی ہے کہ کشمیریوں کے مجموعی چال چلن پر نرمی اور رحم کی نظر کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ کشمیریوں کے کریکٹر میں جو افسوسناک باتیں نظر آتی ہیں اُن کا سرچشمہ وہ خوف اور ڈر ہے جو وہ قدرت کی خوفناک طاقتوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ وادی ضعیف الاعتقادی اور توہمات کے چنگل میں ہے جسے اِس ملک کے مذاہب نے اور زیادہ پروان چڑھایا ہے۔ ماضی کی حکومتوں نے لوگوں کے دِلوں میں اپنی مہربانی اور دیانت کا سارا بھرم ہلا کے رکھ دیا ہے۔ اور جب اِس کے ساتھ قدرت کی تباہ کاریاں بھی مل جاتی ہیں تو لوگوں کی کائنات کے نظم وضبط سے اعتقاد اُٹھ جانا کوئی اَنہونی بات نہیں ہے۔ اس طرح ایسے معاملات کا چکر پیدا ہوتا ہے جو ایک مضبوط اور قابلِ اعتبار قومی کریکٹر کی پرورش کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔ توہم نے کشمیریوں کو ڈَرو بنا دیا ہے اور ظلم وستم نے اُسے جھوٹا، آفات سماوی نے اُسے خودغرض اور نیکی کے وجود سے بیگانہ بنا دیا ہے۔

چند دلچسپ اعداد وشمار:

پہلے پہلے کمراز (شمالی کشمیر) مراز (جنوبی کشمیر) اور یمراز (سرینگر) میں ۴۳ پرگنے تھے۔ اگرچہ انتظامی ضروریات کے لئے ان میں تبدیلی کی گئی ہے لیکن ان کی یاد لوگوں میں موجود رہے گی۔ تحصیل رنبیر سنگھ پوری کے لوگ اپنے آپ کو شاہ آباد اور برنگ کے باشندے قرار دیتے رہیں گے۔ ۱۸۷۱ء میں وادی

کو پانچ وزارتوں میں بانٹ دیا گیا۔ سرینگر، پٹن، اننت ناگ، کمراز اور شوپیان۔ ان کو مزید ۳۷ تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا۔ ۱۸۸۷ء یعنی بندوبست شروع ہونے سے پہلے چار وزارتیں قائم تھیں...... سرینگر، ہری پور یا شوپیان، کمراز[1] اور اننت ناگ۔ اِن ضلعوں میں ۲۸ تحصیلیں اور روایت کے مطابق ۲۴۸۷ گاؤں تھے۔ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے اعداد وشمار قدرے قابلِ اعتبار بتائے جاسکتے ہیں۔ اس کے مطابق وادی کی آبادی ۸۱۴۲۴۱ ہے۔ اس میں سرینگر میں ۱۱۸۹۶۰ لوگ رہتے ہیں۔ دیہات میں ۶۹۵۲۸۱ لوگ ہیں۔ لیکن اِس پر ذہین کشمیریوں نے شک وشُبہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں اگرچہ سرینگر میں باشندوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مکانات کا صحیح شمار کیا گیا ہے۔ یہ تعداد ۱۸۸۷ء میں ۲۰۳۰۴ تھی لیکن اَب یہ تعداد ۲۲۴۴۸ ہے۔ تعداد بڑھ جانے کی وجہ یہ ہے کہ ۷۹-۱۸۷۷ء کے قحط کے بہت سے دیہاتی باشندوں نے شہر کا رُخ کیا تاکہ بیگار کی مار سے بچیں اور سُستی خوراک بھی حاصل کریں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وادی کی شہری آبادی ۱۷ فیصدی ہے۔ وادی کے حکمرانوں کی یہ پُرانے زمانے سے پالیسی رہی ہے کہ وہ شہر سرینگر کے لوگوں کے آرام وآسائش کے لئے زراعت پیشہ دیہاتیوں کو قربانی کا بکرا بناتے رہیں۔

آبادی میں ۴۲۹۴۶۴ مرد ہیں اور ۳۸۴۷۷۷ عورتیں۔ ہندوؤں میں ہر

---

[1] کمراز یا کامراج لارنس بارہمولہ کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ڈوگرہ راج میں بڈگام تحصیل کا نام پرتاپ سنگھ پورہ رکھا گیا تھا۔ لیکن واقعات کے بہاؤ میں وہ ایسا بہہ گیا کہ اب اُس کا نام بھی کسی کو یاد نہیں ہے۔

ایک ہزار مردوں کے ۸۱۷ عورتیں ہیں اور فی ہزار مسلمان مردوں کے لئے ۹۱۶ عورتیں۔ دیہات میں ہندوؤں کو اور بھی کم عورتیں ملتی ہیں کہ وہاں یہ تناسب ۷۱۲ عورتیں ہیں۔ کشمیر میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پیدا ہونے والوں بچوں کا پچاس فی صد جنم لینے پر ہی مر جاتا ہے اور باقی میں سے ایک تہائی اُن کی عُمر ایک سال ہونے کے اندر اندر۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ اگر چہ زنانہ بچے زیادہ جنے جاتے ہیں لیکن عورتوں کی تعداد مُردوں سے کم ہوتی ہے۔ شاید اِس لئے کہ بیماریوں وغیرہ کے وقت زنانہ بچے کو پوری توجہ نہیں ملتی۔

یہ بات بار بار کہی گئی کہ وادی کی آب وہوا اتنی خوشگوار ہے کہ مَردوں کو کوؤں کی طرح، ایک ہی بیماری کا اندیشہ لگا رہتا ہے...... بوڑھاپے کا۔ لیکن میرا اپنا تاثر ہے کہ یہاں پچاس سال کافی بڑی عُمر سمجھی جانی چاہیے۔ میں نے چالیس سال کے آدمی دیکھے ہیں جن کے بال سفید ہوگئے تھے۔ تازہ مردم شماری کے مطابق کشمیر میں اوسط عمر کا گراف کچھ یوں بنتا ہے۔

	شہر	دیہات
مرد	20.11 برس	21.30 سال
عورتیں	19.19 برس	20.35 برس

کشمیری صنعت وحرفت میں ماہر ہیں اور عمدہ چیزیں تیار کرنے میں اُنکا جواب نہیں۔ قدرت نے صناعوں اور فنکاروں کی کاریگری کے لئے فیاضی سے خام مال وافر رکھا ہے۔ لیکن تکنیکی تربیت کی عدم دستیابی سے یہاں کے شاندار کپڑے، بیدوں کی لکڑی، چمڑے اور وادی کی بے مثال مٹی ضایع ہو جاتے ہیں۔ مجھے کسی ایسی جگہ کا خیال نہیں ہے جہاں ٹیکنیکل تعلیم کی کرشمہ زائیاں کشمیر

سے زیادہ نکھر سکتی ہیں۔ شہر کے لوگوں کو جس طرح نصف قیمتوں پر راشن ملتا ہے اُس سے وہ کشکول برداری کی ذہنیت سے معمور ہوگئے ہیں اور اُس سے صنعت کاری اور ترقی کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے۔ اگر کشمیری ہنرمند کو کم معاوضہ ملتا ہے تو اُسے پریشانی نہیں ہوتی اور وہ اُپنے کارخانہ دار سے نہیں جھگڑتا حالانکہ بچولئے اُسکی اُجرت کا آدھا حصہ بیچ میں ہی ہڑپ کر لیتے ہیں لیکن اگر اناج کی سپلائی یا نرخوں میں کچھ بیش وکم ہوگیا تو وہ رونا بسورنا شروع کر دیگا۔

پُرانے حالات میں شالباف کو سستے چاول دے دے کر خوش کرنا اچھا تھا۔ کیونکہ اَناج کے داموں میں رعایت اُس کی بنائی ہوئی مصنوعات پر بھاری ٹیکس لگا کر وہ مقدور سے زیادہ پورا کیا جاتا تھا۔ لیکن اب شال کا کاروبار مر چُکا ہے اور ہنرمند سرکاری خزانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

جاگیریں اور اُنکا نظام:

لارنس کشمیر کی مالگذاری کا مہارت سے ذکر کرتا ہے خاص طور سے مُغل زمانے کا۔ اِس بارے میں وہ آئینِ اکبری کے صفحات بڑے اعتبار سے نقل کرتا ہے۔ وہ اَپنے زمانے کے نظامِ مالیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دُو بھائیوں اَمر سنگھ اور رام سنگھ کو وادی میں بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں۔ اِس سے پہلے ۱۸۷۲ء میں ستاون دیہات 'جو دیوسر اور شوپیان کی تحصیلوں میں واقع ہیں' جموں کشمیر کے یہاں راجپوتوں کو جاگیر کے طور دئے گئے اور اِنکا مالیہ اپنے زمانے کے حساب سے بہت خطیر رقم کا بنتا تھا۔ اسی طرح ۱۸۹۱ء میں دَھرم ارتھ کے لئے کسانوں سے ایک بڑی رقم وصول کی گئی۔ یہ رقم سرکاری خزانے کی بجائے اِن اشخاص اور اِداروں کے حساب میں

جاتی تھی۔ ''کشمیر میں میری آمد (۱۸۸۹ء) تک نقد قیمت اُدا کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ تنخواہیں جنس کی صورت میں اُدا کی جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے تیل کے بیجوں کی شکل میں تنخواہ لینے کے لئے کہا گیا۔ تیل کے بیج تنخواہ ادا کرنے کا قیمتی طریقہ اور مکّی وسنگھاڑے اِسکا کم پایہ طریقہ تصوّر کئے جاتے تھے۔ جنس مشاہرہ دینا سرکار کا ہی نہیں نجی کاروبار اور نوکروں وغیرہ کو اُدائیگی کرنے کا دستور ہے۔

جنس سے نقد:

لارنس نے جنس سے نقد رقم اُدا کرنے کے بدلتے ہوئے طریقے پر روشنی ڈالی ہے کہ اُس کے زمانے میں کشمیر اِس قدیم معیشت سے جدت کی طرف آرہا تھا۔ یہ سرکار کے اِرادے کا نہیں بلکہ زمانے کی رفتار کے تقاضوں سے ہو رہا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں سرینگر کو راولپنڈی سے بلانے والی جہلم ویلی سڑک کھول دی گئی۔ پہلے تو اِس سڑک کی تعمیر پر نقدی رقم خزانے سے نکل کر عام زندگی میں چلی آئی دوسرے اس سڑک کے کھلنے سے تجارت اور سیاحت بڑھنے لگی۔ کشمیر سے باہر کے بیوپاری اُپنے مال کی نقد قیمت وصول کرتے تھے اور دوسرے سیاح، خاص طور یورپین یہاں آکر انگریزی روپے خرچ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نقد روپیہ روزمرہ زندگی میں پھیلنے لگا جس سے قیمتیں بھی بڑھنے لگیں۔

لارنس لکھتا ہے کہ اُسے بڑھتی ہوئی قیمتوں کے لئے پنڈتوں نے خاص طور تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ کہتا ہے یہ بندوبست اراضی کے شدید ترین مخالف بھول گئے کہ وہ خود جاگیردار تھے۔ اُنہیں یہ بات تو یاد رہی کہ اُنہیں نوکروں کو زیادہ مشاہرہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات بھول گئے کہ اُن کی اپنی بڑھتی ہوئی پیداوار

کے لئے جو رقم وصول ہوتی ہے اُس سے اُن کی آمدنی کتنی زیادہ ہو جاتی ہے۔ پنڈتوں کو اِس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ قیمتوں میں اضافے کا بندوبست سے کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ یہ قیمتیں اُس وقت چڑھ رہی تھیں جب بندوبست جاری تھا اس لئے پنڈت اِسی کو لے کر شور مچاتے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ کچھ چیزوں کی قیمتوں میں اضافے کا نقشہ پیش کرتا ہے جو آج کل کے حالات میں دلچسپ ہی نہیں عبرت آموز بھی لگتا ہے:

ذکر ۱۸۸۷ء کی قیمتوں کے حوالے سے ہو رہا ہے:

اُونی چادر تین کی بجائے چار روپے۔

بیلوں کی قیمت میں ۱۸۸۷ء سے ایک روپے سالانہ بڑھ رہی ہے۔ گھی ایک روپے کا چار سیر ملتا ہے۔ اُب اِسی سکے میں تین یا اڑھائی سیر ملتا ہے۔ ٹٹو، پندرہ بیس روپے کے درمیان بیچے جاتے تھے۔ اُب گلگت روڈ کی تعمیر کے سلسلے میں ان کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے اس لئے پچیس سے پینتیس روپے تک بیچے جاتے ہیں۔ اُخروٹ تین روپے فی خروار فروخت ہوتے تھے۔ اُب فی خروار آٹھ روپے بیچے جاتے ہیں۔ اُون روپے کے دوٗ سیر ملتے تھے، اَب ڈیڑھ سیر ملتا ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں:

لارنس نے کشمیر کی زندگی کا جس باریک بینی سے مشاہدہ کیا وہ حیرت انگیز ہے اور جب تک کسی مبصر کو اُپنے موضوع سے گہرا شغف نہ ہو ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عورتیں کنویں یا گھاٹ پر نہیں ٹھہرتیں مگر پَن چکی پر آٹا پینے کے لئے جاتی ہیں تو اُن کی میٹھی اگرچہ معمولی باتوں کا نغمہ چھڑ جاتا ہے۔ سرینگر

کے باشندے اپنے اپنے محلوں سے آتے تھے اور نشانے باندھ کر ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے تھے۔ گلیل کے سے انداز میں۔ یہ ایک بہت سنجیدہ اور سخت کھیل ہوا کرتا تھا۔ گلاب سنگھ کشمیر آیا تو اُس نے فوجی اہمیت کے اس کھیل کو برداشت نہیں کیا اور اس پر پابندی لگادی۔ سزلونگ (Hop-Scotch) ایک پسندیدہ کھیل ہے۔ زمین پر سات خانے بنائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کا نام جہنم ہوتا ہے۔ چھوٹی بچیاں کپڑے لتّوں کے دُلہا دلہن سجاتی ہیں۔ انہیں پالکیوں میں گھما کر شادی کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ وہ سرینگر میں کرکٹ کے شوق کی پہلی پہلی اطلاع دیتا ہے اور پیش گوئی کرتا ہے کہ یہ اب پھیلتا چلا جائے گا۔ وہ کشمیر میں پہلوانی کی طاقت و روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے کبھی کسی دنگل کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لارنس کے مطابق کشمیری تفریح اور تماشے کے زیادہ خُوگر نہیں ہیں لیکن گھومتے گھامتے اداکاروں پر ریجھ جاتے ہیں۔ یہ اداکار جنہیں بھانڈ بھگت کہہ کر پکارا جاتا ہے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اُن کا جوش سے استقبال کیا جاتا ہے۔ وہ ایسی ذہین گفتگو اور نقالی بہترین گروہ دیکھتے جاتے ہیں، حالانکہ سویہ بگ میں رہنے والے یہ شاندار گلوکار ۱۸۷۷ء کے قحط میں جان گنوا بیٹھے۔ اب لوگ آہیں بھرتے ہیں اور اُنہیں یاد کرتے ہیں۔ بھگت گاؤں کی زندگی کا ہوبہو نقشہ کھینچتے ہیں۔ اُن کے ملبوس اور بناؤ سنگھار بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اور وہ گاؤں کی زندگی کا اندر سے دیکھا ہوا حال پیش کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے گاؤں کے انتظام و انصرام کی بہت قریبی جانکاری بھگتوں کے تماشے دیکھ کر حاصل کی۔ لارنس کا یہ کہنا بھگتوں کے لئے ایک بڑی سند ہے کہ میں نے خود اُن سے بہت سے نکتے ماخوذ کیے ہیں۔ مثلاً

گاؤں کے پٹواری یا حساب رکھنے والوں کے بارے میں...... وہ کشمیری دیہات میں فضا کی گھٹن کم کرتے ہیں۔ شاعر بھگتوں سے جُدا لوگ ہیں کیونکہ وہ اداکاری نہیں کرتے وہ یا تو گوّیئے ہوتے ہیں، جو طنبورہ بجاتے ہوئے تانیں اُڑاتے ہیں یا ایسے شاعر جو کسی کام وغیرہ کے وقت اچانک کھڑے ہوجاتے ہیں اور وہاں موجود سب سے زیادہ بااثر آدمی کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ میں ایسے بہت سے شاعروں کو جانتا ہوں اور میں نے اُن کے ساتھ گھنٹوں گذارے ہیں۔ میں نے اُن کی تانیں صبر و تحمل سے سُنی ہیں جن کا کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ ان لوگوں کو چند روپے دینا اچھی بات ہے کیونکہ وہ اکثر بے چارگی کی حد تک مفلس ہوتے ہیں۔ میرے ایسے جاننے والوں میں سے بہت سے معقول نہیں ہوتے۔ ایک ایسے مسلمان کو میں جانتا ہوں جو ایک بڑے افسر کا اُستاد رہا تھا۔ وہ شراب میں بدمست رہتا تھا اور اپنے اس شوق کا تاویل فارسی شاعروں کے اقتباسات سے کرتا رہتا تھا۔ جب میں نے اُسے وسکی دینے سے انکار کیا تو اُس نے مجھے کافی بُرا بھلا کہا۔ پھر یہ کہتے ہوئے کہ ہندوؤں کا لوہا یگ شروع ہوگیا ہے، میرے کیمپ سے آنسو بہاتے ہوئے چل دیا۔

سرینگر شہر میں رہنے کے مزے لیتے ہوئے لارنس نے کچھ ایسی چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو کشمیریوں کے مزاج کا آج بھی حصہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں ایک فائدہ ہے کہ کھانا پینا کسی خاص تکلیف کے بغیر مل جاتا ہے۔ دوسرے یہاں خواہ مخواہ کی جذباتی ہل چل بھی خوش رکھتی ہے۔ کشمیری، قدیم ایتھنز (یونان) کے باشندوں کی طرح نئی خبر کے لئے بھوکے ہوتے ہیں اور اس کی تسکین کے لئے ہر روز نئی افواہیں اُڑائی جاتی ہیں۔ کشمیر میں کوئی نمائندہ

اِدارے تونہیں ہیں لیکن شہر کا کوئی چالاک شخص ایک عرضی پر کئی لوگوں کے نام درج کرے گا (کیونکہ سرینگر میں دستخط نقل کرنے کے گُر باقاعدہ سیکھے سکھائے جاتے تھے) ایک معروف پروفیسر تو ایسا بھی تھا کہ جو دستخط میں لرزش کا اُثر پیدا کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی میں دیر تک کھڑا رہتا تھا۔ کشمیریوں کے گانے ناچنے کی رغبت کا ذکر بھی لارنس لُطف سے کرتا ہے۔ اُس کے مطابق کشمیری خوُب گاتے ہیں اور گانے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کھیتوں میں کاشت کاری کے مختلف کام کرتے ہوئے گاتے رہتے ہیں۔ کچھ گیتوں میں اَچھی شاعری کا رَس ہوتا ہے اور یہ فضاَ میں شیرینی پیدا کرتے ہیں۔ کشمیری قدرت کی خوبصورتی کا شوق رکھتے ہیں۔ جب بادام کے پیڑوں پر پھول کھِلتے ہیں تو شہر باش اَپنی چائے لے کر وہاں جاتے ہیں اور وہاں پہروں اِکٹھے رہتے ہیں۔ سرینگر کے نواح میں بادام کے باغات ہیں اور جب اُن میں پھول کھِلتے ہیں تو اُن کی خوبصورتی کا کیا کہنا۔ اِن کے شگوفے سفید ہوتے ہیں اگرچہ گلابی رنگ کے پھول بھی نظر آتے ہیں۔ کشمیری بنیادی طور ایک غم آشنا آدمی ہے۔ ایک اچھی خاصی گفتگو میں وہ بلا کسی وجہ کے آہیں بھرنا شروع کرے گا۔ وہ کہے گا کہ وہ اَپنے گناہوں کا خیال کر کے آہ بھر رہا ہے اور اس بات پر بھی کہ کشمیر کو کس کی بُدنظر لگ گئی ہے۔ مشکل سے کوئی دن گذرتا ہے جب اس بَددُعا کا ذکر نہیں کیا جاتا اور اُس پاپ کا جس سے یہ عذاب آیا۔ تمام بدنصیبیاں، مظالم، فصلوں کی خرابی، مویشیوں کے اتلاف...... سب کا رشتہ اسی سے جوڑا جاتا ہے۔ وہ گناہ کیا تھا جس نے یہ عذاب لایا، اُس کا مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کشمیری بہت کم مسکراتے یا قہقہے لگاتے ہیں لیکن وہ فوراً آنسوؤں کی جھڑی لگاتے ہیں۔ جب

میں نے پہلے پہل اَپنا بندوبست شروع کیا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بڑے بالغ لوگ بچوں کی طرح روتے ہیں۔ لیکن یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ آنسو جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں۔ ایک یا دو آدمیوں کو تیار کیا جاتا ہے کہ وہ ہمدردی کے جذبات اُبھارنے کے لئے ایسا کرتے رہیں...... شہر باشوں کی ذہنیت پر چھینٹے اُڑاتے میں لارنس بہت لطف اُٹھاتا ہے۔ اُس کے مطابق شہر باش سستی خوراک پر ہی مطمئن نہیں ہیں اور اَناج کو اُن کی دہلیز پر پہنچایا جانا چاہئے۔ دَریا کے گھاٹوں سے سرکاری اَناج کی کشتیاں قطار اَندر قطار لگی رہتی ہیں کہ یہ اناج اُن کے گھر پہنچے۔ ایک بار تجویز کی گئی کہ اَناج کو چند خاص جگہوں پر بیچا جانا چاہئے کہ نگرانی میں آسانی ہو لیکن شہر باشوں نے اِسے کھُلا ظلم قرار دے کر ہنگامہ کھڑا کیا۔ اور کیوں نہ ہو...... وہ شاہی محل کے قریب ہیں اور اَپنی آواز کو سُنانے، منوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ایک اور طبقہ لارنس کی مسلسل تیراندازی کا نشانہ بنتا ہے کشمیری پنڈت ہیں۔ ''گاؤں کا ہندو ایک سادہ، محنتی اور صحت مند شخص ہوتا ہے۔ لیکن شہر کے پنڈتوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی گزُر بسر کشمیری محاورے کے مطابق ''دَلم، قلم یا ہَلم'' (جھوٹ، منشی گری یا بھیک) سے کرتے ہیں۔ شہر کے پنڈت یوں کہئے کلیتاً سرکاری ملازمت سے روزگار حاصل کرتے ہیں۔ وہ بڑے زیرک اور فہمیدہ نسل کے لوگ ہیں۔ اُن کی عادتیں عمدہ ہوتی ہیں اور وہ بڑی کشش کے مالک ہونے کے علاوہ بہت دلنواز ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ ...... وہ شادی بیاہ پر بہت خرچ کرتے ہیں۔ گھر کے خانہ دار کو سبھی کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ خواہ وہ اَچھی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے سگے ہوتے ہیں۔ اپنے

سنگھٹن اور اس بات کی وجہ سے اُنہوں نے سرکاری ملازمتوں پر اجارہ قائم کیا ہے۔ اُن کی طاقت خاصی ہے۔ اگر چہ وہ روپے اور عہدے حاصل کرنے کے لئے کسی اُصول کی پابندی نہیں کرتے، لیکن اُنہیں اِس کا فائدہ اُٹھانا نہیں آتا۔ اَپنے چال چلن، مزاج اور قابلیت کے لحاظ سے وہ اِنفرادی طور پر کشمیری مسلمانوں سے بہت زیادہ بہتر ہیں لیکن سرکاری ملازموں کی حیثیت سے وہ راشی، تنگ نظر اور ظالم ہوتے ہیں۔

لارنس کا سجدۂ سہو:

والٹر لارنس نے کشمیر شناسی میں جو کمال پیدا کیا وہ کشمیری زبان سے نابلد کسی مورّخ، مسافر یا اَدیب کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کے یہاں غلطیاں ملتی ہیں۔ بلکہ کئی صورتوں میں تضاد آرائی بھی۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت کرنے والوں نے اُسے غلط باتیں بتائیں اور کئی صورتوں میں اُس کی توجہ تضاد کی طرف نہیں جا سکی۔ ایک اہم غلطی حضرت امیر کبیر شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں آمد سے تعلق رکھتی ہے۔ صفحہ ۲۰۱ پر وہ کہتا ہے کہ پیر دستگیر حضرت نقشبند مشکل کشاؒ اور ہمدان کے امیرِ کبیر میں سے کوئی بھی کشمیر نہیں آیا ہے لیکن دوسرے صفحے پر ہی وہ اس کی تردید کرتا ہے۔ اُس کے مطابق حضرت امیرِ کبیرؒ (سلطان) قطبُ الدین کے وقت میں کشمیر تشریف لائے اور عملی طور پر یہاں اِسلام قائم کیا (بانیٔ مسلمانی)۔ وہ امیر کبیرؒ شاہ ہمدان اور علی ثانیؒ کے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ لارنس کہتا ہے کہ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اُنہیں ایک ہندو خاتون للیشوری سے فیض ملا جو ہندوؤں کے مطابق دیوی کا اوتار تھی۔ مسلمان اس کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس خاتون کے نام کی بے حد عزت کرتے ہیں

اور اُسے لل دیدی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ لارنس کے بقول (دروغ برگردنِ راوی) جب شاہ ہمدان واپس ہمدان جا رہے تھے تو اُنہیں زہر پلائی گئی۔ یہاں اُس سے پھر چُوک ہوگئی ہے۔ ممکن ہے کہ زہر پلانے کی روایت اُس وقت کشمیر میں موجود رہی ہو لیکن اُنہیں بہر حال اِیران کے شہر ہمدان نہیں بلکہ ماوراء النہر کے قصبے ختلان جانا تھا۔ جہاں سے وہ تشریف لائے تھے اور جہاں وہ اَپنی وفات کے بعد آسودہ ہیں۔ حاشئے میں لل دید کے بارے میں لارنس لکھتا ہے کہ وہ حضرت شاہ ہمدان کے آنے تک عریاں حالت میں گھومتی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ کشمیری مَرد نہیں ہیں۔ لہٰذا اُن سے حیا کیسی؟ لیکن شاہ ہمدانؒ کے پیکر میں اُسے ایک مردِ کامل نظر آیا اور اُس نے اُنہیں پہچان کر فوراً کپڑے زیبِ تن کئے۔

کشمیریوں میں کس طرح انگریزوں کے اصل طاقت ہونے کا اندازہ ہوگیا تھا اُس کا ذکر لارنس دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اُنہیں گاؤں کے نمبردار سے کوئی شکایت ہو تو بلند آواز سے شور کرتے ہیں۔ اُن کا پسندیدہ اظہار یہ ہوتا ہے کہ وہ اُپنی فریاد کو اتنا اونچا کریں گے کہ یہ لندن میں بھی سنائی دے گی۔ اس سلسلے میں وہ ایک اور بہت دلچسپ اطلاع درج کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کشمیری پنڈت، شہر اور گاؤں دونوں جگہ ملکہ وکٹوریہ کی تصویر یا پتلے کی پوجا کرتے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ اُس وقت زندہ تھی جب لارنس کشمیر میں تھا اور اُس کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ اُس کے مطابق پنڈت اصل حکمران کی پُوجا کرتے رہے ہیں۔ صرف انہوں نے اورنگ زیب کے ساتھ ایسا نہیں کیا کیونکہ بقول اُس کے ''اُس نے ہندوؤں کو ستایا تھا''۔

کشمیریت کا اظہار:

پنڈتوں کے ذکر میں لارنس کشمیریت کے ایک خاص پہلو کا تقریباً نادانستہ طور ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پنڈتوں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ جب وہ ہندوستان میں ہوں تو وہ برہمن واد کے اُصولوں کی سختی سے پیروی کرتے ہیں لیکن کشمیر میں وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے کٹر ھندوؤں پر لرزہ طاری ہوگا۔ وہ مسلمان کے ہاتھوں لایا ہُوا پانی پیتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کی کشتی پر پکایا ہوا کھانا کھائینگے ۔ پنڈت بچوں کی رضاعی ماں عام طور مسلمان ہوتی ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے مسلمانوں کے ہاتھوں لائے ہوئے پانی کو پینے کی سخت مخالف کی اور پنیر کھانے پر بھی پابندی لگائی لیکن یہ سب بے سُود نکلا۔

جب یہ بات یاد رکھی جائے کہ پنڈتوں میں ماشکیوں کا کوئی الگ گوتر نہیں ہے اور اِسی لئے گلاب سنگھ کے ایسا منع کرنے کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ وہ حیرت کا اِظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اِتنے معقول ہونے کے باوجود پنڈت کشمیر کچھ اعلیٰ پایے کی سبزی ترکاری کھانے پر آمادہ نہیں ہوتے جس میں اِنسانی گوشت کی شکل کا ٹماٹر، پیلی گاجر لال Beans وغیرہ شامل ہے۔ یہ بات اور بھی حیرت کا باعث بنتی ہے جب یہ یاد کیا جائے کہ وہ بڑے زبردست گوشت خور ہیں۔ لارنس نے یہ بھی لکھا ہے کہ کشمیری پنڈت کشمیر سے باہر کے برہمنوں کیساتھ شادی نہیں رچاتے بلکہ اُن سے ملنے جلنے میں بھی پرہیز کرتے ہیں۔

کشمیری زبان وادب

لارنس اُن پہلے پہلے یورپی سیاحوں میں سے ہے جس نے کشمیری زبان کے متعلق لکھا ہے اور کچھ پتے کی باتیں بیان کی ہیں۔ وہ کشمیری کا اِسقدر شغف

رکھتا تھا کہ اُس نے کشمیری زبان بولنے اور سمجھنے کی استعداد بھی حاصل کرلی تھی۔

چنانچہ راقم الحروف نے آج سے ساٹھ سال قبل اُپنے بچپن میں اُن لوگوں سے بات کی ہے جنہوں نے 'لارن صاب' دیکھا اور اُس سے بات کی تھی۔ اُس وقت لارن صاحب کو کشمیر سے گئے پچاس سال سے کم عرصہ ہوا تھا اور اُس سے ملنے والے کچھ لوگ زندہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ لارنس بندوبست کے زمانے میں خود کھیتوں پر جاتا اور وہاں کسانوں سے دریافت کرتا رہتا اور یہ سب کچھ کشمیری زبان میں ہوتا۔ لارنس کے مطابق کشمیری ایک زمانے میں ناگری کے ایک اور طرز......شاردا میں لکھی جاتی تھی۔ مگر خود اُس کے زمانے میں اس کے لکھنے کے لئے فارسی حروف تہجی استعمال ہوتے تھے۔ کشمیریوں نے اِسے قلم بند کرنے کے لئے کچھ خاص اعراب وغیرہ بنائے ہیں جن کا اصل فارسی میں وجود نہیں ہے۔ مثلاً 'ژ' کی مشکل آواز اَدا کرنے کے لئے جس کے لئے انگریزی میں (TS) لکھا جاتا ہے۔ وہ کشمیری کے ماہرین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ہر سو الفاظ میں ۲۵ سنسکرت کے، ۴۰ فارسی کے، ۱۵ ہندی اُردو کے اور ۱۰ عربی کے ہوتے ہیں۔ باقی دس الفاظ میں تبتی، ترکی، ڈوگری اور پنجابی ہوتے ہیں[1]۔ کشمیری کا اپنا گرائمر ہے۔"

"مجھے عام بول چال کی کشمیری کی کچھ واقفیت ہے جس کا زیادہ تعلق گاؤں میں مُروّجہ ترکیبوں اور کاشتکاروں کی زندگی سے ہے۔ جو کچھ بھی میں نے

---

[1] میرا خیال ہے کہ یہاں لارنس کو پھر غلط اطلاع دی گئی ہے۔ کشمیری زبان کا اپنا CORE اور ذخیرہ الفاظ بہت وسیع اور شاندار ہے اور کچھ لوگ لاعلمی یا عصبیت کی وجہ سے اِن الفاظ کا رشتہ دوسری زبانوں سے جوڑتے ہیں۔

سیکھا ہے اُس کے لئے میں ایک اچھے عالم و فاضل پیر حسن شاہ کا مرہونِ منت ہوں"۔[1] اُس کی تمام زندگی کا تعلق گاؤں سے ہے۔ لارنس نے ایک تعجب انگیز بات لکھی ہے کہ ہندوستان میں کشمیر سے گئے ہوئے لوگ اپنی پرانی زبان سے بدستور جُڑے ہیں۔ حالانکہ اُنہیں کشمیر سے گئے ہوئے ایک زمانہ گزرا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں لارنس کی خوش فہمی تھی۔ کیونکہ نہ عملی طور اور نہ کسی اور حوالے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنگالی، دراوڑ یہاں تک کہ پنجابی بھی دوسری جگہوں پر جاتے ہیں تو اپنی زبان کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر لاہور، امرتسر، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ شہروں میں جہاں کشمیر سے جانے والوں کی بڑی تعداد رہتی ہے، کشمیری زبان کے رائج ہونے کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ لارنس نے اپنے پیشرو جرمن سکالر ڈاکٹر بہلر کا ایک خیال انگیز تحریر حاشیے میں درج کیا ہے۔

"کشمیری ایک پراکرت ہے۔ ایک ایسی زبان جو سنسکرت سے نکلی ہے۔ یا ایک ایسی بولی ہے جس سے سنسکرت زبان ترتیب پائی ہے......
لیکن یہ بہرحال ہندوستان میں اپنی رشتے دار بھاشاؤں سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ کوئی زبان اگر اس کے کچھ قریب لگتی ہے وہ سندھی ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے میں ایک بڑی بحث کے بیج موجود ہیں۔ اگر کشمیری باقی ہندوستانی زبانوں کی طرح سنسکرت کی ہی اولاد ہے تو خود بہلر کو کیوں لکھنا پڑا ہے کہ یہ باقی ہندوستانی بھاشاؤں سے اُس کے ہی شدت سے بیان کئے ہوئے الفاظ (Very Considerably) کے مطابق یہ کیوں

[1] مُراد تاریخ حسن کے لائق مورخ پیر حسن شاہ کھوئیہامی سے ہے۔

اتنی الگ اور مختلف ہے۔ کشمیری زبان میں داوڑ سے لے کر چینی زبان تک کے پرتَو ملتے ہیں۔ حال ہی میں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی قدیم زبان پر تحقیق نگاروں کا یہ عندیہ سامنے آیا ہے کہ اُن کے تصویری (Pictograph) ہجوں میں چینی رسم الخط کا اثر ملتا ہے۔ کشمیر۔ چین اور موہنجوداڑو کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے دونوں سرچشموں سے اثرات لئے ہوں گے۔ اِس کے علاوہ کشمیری زبان میں یہاں کے اصل آدی واسیوں ناگاؤں کی زبان کے نقوش کی بھی بات کی گئی ہے۔ خود بہلر صاحب نے سندھی کے ساتھ اِس کی مشابہت تسلیم کر کے ایک اور مشترکہ مصدر کی طرف اِشارہ کیا ہے اور وہ ہے سندھی کے ساتھ اِس کی مشابہت۔ اور کسے معلوم نہیں کہ سندھی زبان کے ساتھ عربی کا تعلق پورے چودہ سو سال کے عرصے پر محیط ہے۔ جب محمد بن قاسم نے دیبل کو فتح کیا تھا اور سندھی زبان پر عربی کے اثرات نمایاں تو ہیں ہی، وہ واحد ہندوستانی زبان ہے جس کا رسم خط عربی ہے[1]۔ لارنس نے ایک اور اَمر کی طرف معنی خیز اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"میں نے کسی اور جگہ شالبافوں میں رائج اُچھنبا کرنے والے

مان لیا کہ یہ نشانات صرف شال بُننے کی کاروائی سے ہی متعلق ہیں (لیکن) شالباف اپنی روزمرہ زندگی میں معمول کا "کوشُر" بولتے ہیں۔ تعلیم کے

[1] خود ہمارے ملک میں سندھ سے آنے والے پناہ گزین چند سال پہلے تک اِسی رسم خط کو استعمال کرتے رہے اور اپنی کتابوں کے لئے ساہتیہ اکادمی کے انعامات پاتے رہے۔ لیکن آٹھ سال سے اُنہوں نے اس کو ترک کر لیا مگر پاکستان میں اس کا (Main Streem) ابھی عربی برت رہا ہے۔

نشانات پر پہلی نظر سے آدمی کا دھیان موسیقی کے نوٹیشن (Notation) کی طرف جاتا ہے"۔

وہ اِس بات کا خاص طور ذکر کرتا ہے کہ اگر چہ دیہات میں نمبردار وغیرہ اہلکار بہت بُری اُردو، پنجابی یا ڈوگری بولنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن عام کشمیری اُن سے بار بار تقاضہ کرتا ہے کہ بات کشمیری (کأشرِ پأٹھی...... لارنس) میں کرو۔ وہ کشمیری زبان کے ساتھ رُوا رکھے گئے سلوک پر آہیں بھرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی حکمران حملہ آور وغیرہ نے اس کو برتنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اِسے افسوسناک قرار دیتا ہے کہ اس سے ایک تو علمی کوتاہی کا ارتکاب ہوتا ہے دوسرے کہ کشمیری (اپنی زبان کے معاملے میں) بہت فخر کرتے ہیں اور اُس شخص سے بہت خوش رہتے ہیں جو اُن کی مادری زبان سمجھ سکتا ہو۔ وہ پھر ڈاکٹر بہلر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس زبان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کا ملنا دوسری زبانوں میں انتہائی مشکل ہے۔ وہ سرینگر میں بولی جانے والی زبان کے سلسلے میں عیسائی مشنریوں کی کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ انُہوں نے اس کا گرائمر اور چھوٹا سا لغات بنایا ہے جو سیکھنے والی مبتدی کے لئے بہت معاونت کا کام دیتے ہیں۔ لیکن وہ ساتھ ہی کہتا ہے کہ وادی کی زبان کا صحیح تجزیہ کرنا ابھی باقی ہے۔ اُس کے مطابق "میرا مختصر اور نامکمل مطالعہ مجھے پوری طرح قائل کرتا ہے کہ اس کی لفظیات بہت باثروت ہے۔ اِس کے محاورے راست اور صاف ہیں اور اس کی بہت سی ترکیبات شاعرانہ خیال آرائی سے بھرپور ہیں۔ اس کے Proverb ذہانت اور دانشمندی کا اظہار کرتے ہیں۔ کشمیریوں کے گیت جسمانی لمس (Erotic) سے بھرپور ہیں اور اُن میں

خیالات کی وہی کروٹیں ملتی ہیں جو فارسی شاعری کا خاصہ ہیں۔ زبان کا لہجہ حیرت انگیز طور انگریزی سے ملتا جلتا ہے۔ جب میں کشمیری زبان میں گفتگو سنتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے انگریزی بولی جارہی ہے۔ جن اظہارات پر مجھے شاعری کا شائبہ ہوتا ہے اُن میں وفات کے لئے 'شو نگُن' (سوجانا) مجھے لبھاتا ہے"۔

لارنس آخر میں کشمیری زبان کے کچھ محاورے، کہاوتیں وغیرہ درج کرتا ہے اور اُس نے ایک چھوٹی سی فرہنگ میں انگریزی الفاظ کے کشمیری مترادفات بھی دیئے ہیں۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اُس نے جو چند ہی محاورے وغیرہ درج کئے ہیں اُن میں پنڈتوں سے وابستہ محاوروں کی تعداد زیادہ ہے۔ لگتا ہے کہ کشمیری پنڈت اُس کے اعصاب پر چھائے ہوئے تھے اور وہ کشمیر میں اُن کے خاص کردار اور اطوار پر تبصرہ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے۔ شاید اُس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اُس کے بندوبست کے دوران عیاں وجوہات کی بناء پر کشمیری پنڈت اُس سے بیزار تھے۔ دوسرے وہ ہی کچھ پڑھے لکھے اور سرکار میں نمایاں تھے۔ مسلمان تو کھیت کھلیانوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُن سے اُس کے معاملات کچھ کم ہی پڑتے رہے ہوں گے۔ بہرحال اُس کے دیئے ہوئے کچھ کشمیری محاورے ملاحظہ ہوں:

بٹہٕ یار، بے روزگار...... (پنڈت بے کار ہونے پر ہی دوست بنے گا)

بٹہٕ کار، گٹہٕ کار............ (پنڈت کا کام...... ظلمتِ مدام)

بٹہٕ چھُ گر بٹہٕ............ (پنڈت ایک پن کی چکی کی مانند ہے)

وہ کشمیری گاؤں کے ناموں کی بات کرتا ہے اور انہیں سے اکثر کو بے معنی قرار دیتا ہے (حالانکہ یہ بھی اُس کی غلط فہمی ہے) وہ لکھتا ہے کہ اگر کسی کو سنسکرت

کی اچھی شدھ بدھ ہوتو شاید اِن ناموں کا اصل رُوپ دریافت ہو سکے۔ وہ اس بات پر تان توڑتا ہے کہ اس وقت اِن ناموں کی جو دُرگت نظر آتی ہے وہ اکبر بادشاہ کے مشیرِ مال ٹوڈرمل کی کارستانی ہے جس نے سنسکرت ناموں کو مسخ کر کے اپنے آقا اکبر بادشاہ کے لئے اِن کی فہرست بنائی.......... افسوس یہاں پر لارنس پھر غلطی کرتے ہیں کہ کشمیری گاؤں کے ناموں کی تہیں (Layeres) کشمیر کی تاریخ کے مختلف اُدوار کی عکاسی کرتے ہیں اور اکثر نام خالص کشمیری زبان میں معنی دیتے ہیں۔

انجام پر یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ کشمیر پر کتابیں لکھنا ایک نفع بخش انڈسٹری بن گئی ہے لیکن اُن میں سے اکثر لکھنے والوں کے تعصبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوسرے اُن میں کشمیر کے دِل میں اُتر جانے کی وہ پُرخلوص لگن مشکل سے ملتی ہے جو لارنس کی کتاب کا خاصہ ہے...... یہ آج بھی کشمیر پر بصیرت افروز Original تحریروں میں ایک بے مثال قاموس کی حیثیت رکھتی ہے۔

..................☆..................

فدا محمد حسنین☆
مترجم: ہربھجن سنگھ ساگر☆☆

چارلس ایلیسن بیٹس اور "گزیٹیئر آف کشمیر"

کیپٹن چارلس ایلیسن بیٹس (Captain Charles Ellison Bates) نے ۱۸۷۳ء میں ہندوستان میں اُس وقت کی برٹش سرکار کی ایما پر کلکتہ سے ایک گزیٹیئر آف کشمیر (A Gazetteer of Kashmir) شائع کیا جو کہ وسطِ ایشیا سلسلۂ گزیٹیئر (Central Asia series of gazetteer) کا ایک حصّہ تھا جسے سیاسی اور فوجی مقاصد کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا۔ کیپٹن بیٹس نے یہ بہت بڑا کام ۱۸۷۰ء میں شروع کر کے تین سال کے عرصہ میں مکمل کیا۔ اُس نے گزیٹیئر میں شامل معلومات مندرجہ ذیل ذرائع سے حاصل کیا۔

1. Powell, Baden H., B.C.S. Handbook of the Economic Products of the Punjab, Vol-I
2. Powell, Baden H., B.C.S. Handbook of the Manufacturers and Arts of the Punjab, Vol-II
3. Ince, John, M.D. Kashmir Handbook manuscript, 1872, enlarged and revised

---

☆ پرے پورہ صنعت نگر۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۵
☆☆ آلو چہ باغ۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۱

edition.
4. Journal of the Asiatic Society Bengal, Vol-XXIX and XXX.
5. Knight, Captain, 48th Regiment, Diary of a pedestrian in Kashmir and Tibet, London,1863.
6. Montgomerie, Major T.G., Routes in the Western Himalayas, Kashmir.
7. Montgomerie, Major T.G., Memorandum on the pergunnash of Kashmir.
8. Moorcroft William, Travels in the Himalayan provinces of Hindustan and the Punjab, Londan, 1841.
9. Allgood, Lieutenant G. Cashmere Routes (MS).
10. Cunningham, Alexander, Brevet Major, Bengal Engineers. Ladakh,with notices of the surrounding countries. London, 1854.
11. Cunningham, Joseph Davey, Late Captain of Engineers in the Indian Army. A History of the Sikhs.
12. Elmslie, William jackson , A Vocabulary of the Kashmir Languages. London, 1875.
13. Forster, George, A Jurney form Bengal to England, 2-Vols.
14. Gilgit, Chitral and Kashmir. Notes by Manphul Pandit.
15. Growse, F.S. The Architectures of Kashmir, Calcutta Review, No. CVII.
16. Hervey, Mrs. Adventures of a Lady in Tartary, Tibet, China and Kashmir, 3-Vols

17. Historical, Sketch of Cashmere. Re-printed from Indian public Opinion.
18. Honigberger, John Martin. Thirty -five years in the East.
19. Hugel, Baron Chrles.Travels in Kashmir and the Punjab.
20. Prinsep, Henry T.B. C.S.Origin of the Sikh Power in the Punjab.
21. Roberts, Major Fred. Routes in the Bengal Presidency.
22. Smyth, Major G. Carmichael. A History of the Reigning of Lahore.
23. Steinbach, Lieutenant-Colonel, The Punjab.
24. Thornton, Edward. A Gazetteer of the Countries adjacent to India in the North-West, 2-Vols.
25. Thorp, Robert, Casmere Mis-government. London, 1870.
26. Torrens, Lieutenant-Colonel,23rd Royal welsh Fusiliers,Travels in Ladakh, Tartary and Kashmir.
27. Vigne, G.T. Travels in Kashmir,2-Vols. London, 1844.

چارلس ایلیسن بیٹس نے کشمیر کے اُن مقامی اِسکالروں کا ذکر نہیں کیا جن سے اُس نے کشمیر کے دیہات اور قصبوں سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُس کے لئے کشمیر، کشتواڑ، بھدرواہ، جموں، پونچھ اور گریز کی دوُر دراز بستیوں کا دورہ تین سال کے مختصر سے عرصہ میں مکمل کرنا ناممکن سا کام تھا۔ اَب چونکہ یہ کام اُسے رٹش سرکار نے سونپا تھا، اِس لئے مہاراجہ کی حکومت

پر یہ فرض عائد تھا کہ اِس کام میں اُس کی پوری پوری مدد کرے۔خوش قسمتی سے ہمارے ہاں چوٹی کے اِسکالروں پر مشتمل ایک ٹرانسلیشن بیرو اینڈ آرکیالوجی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ موجود تھا جس میں پنڈت ایشور کول، بابونیلمبر مکرجی، پنڈت گووند کول، حکیم نور الدین، بابو نصر اللہ اور پنڈت صاحب کول وغیرہ جیسے ذہین لوگ شامل تھے۔چنانچہ دیوان اننت رام کی ہدایات پر ٹرانسلیشن بیورو اینڈ آرکیالوجی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے اسکالروں نے کیپٹن بیٹس کو کشمیر کے گاؤں اور قصبہ جات سے متعلق یاداشتیں (NOTES) تیار کرنے کے لئے ضروری جانکاری فراہم کی۔لیکن اُس نے معلومات کے مندرجہ ذیل ذرائع کا قطعی ذکر نہیں کیا ہے۔

(i) Abual fazal -Ain-i-Akbri
(ii) Cole-Illustration of Ancient Buildings Kashmir
(iii) Wilson-Essay on the Hindu History of Kashmir
(iv) Cunningham-Ancient Geography of india.

گزٹیر میں درج گاؤں اور قصبہ جات کی جانکاری گریٹ ٹرگنو میٹریکل سروے میپ آف جموں وکشمیر Great trignometrical Survey Map of J&K سے لی گئی جب کہ ملحقہ اضلاع کے بارے میں معلومات کیپٹن ٹی۔جی۔مونٹگمری سے حاصل ہوئیں۔عرض بلد مدراس آبسرویٹری Madras Observatory کے پرانے فارمولے کی بنا پر ناپا گیا، جیسے 80^{o} 17' 21'' پر منفی -3'25''.5 کی دُرستی کا اطلاق کر کے ایڈمیرلٹی اینڈ رائیل اسٹرانومیکل سوسائٹی (Admiralty And Royal Astronomical society کے طے شدہ

میزان میں کیا گیا ہے۔یا "3'1.8 کے اطلاق سے ٹیلرز (Taylar's) کے مشاہدات میں 1845 تک کمی کی جاتی رہی۔یا "3'1.5 کے اطلاق سے حالیہ طے کی گئی کے میزان میں کمی گئی جو کہ 1873 تک شائع ہوئی۔

اُونچائیوں کا تعلق بیناگ آبسرویٹری (Benog Observatory) کے مطابق سطح سمندر کے وسط سے 7454 فٹ بلندی کیا گیا، جیسا کہ ٹرگنومیٹری کے مطابق کلکتہ کے نزدیک سمندر پر طے کیا گیا اور جس کی تصدیق بمبئی اور کراچی میں کی گئی، مشقوں سے ہوئی۔بیٹس نے ہجے (Spelling) نکالنے کا طریقہ کار ڈاکٹر ہنٹر کے گائڈ ٹو آرتھوگرافی آف انڈین پراپر نیمز (Guide to Arthography of indian proper names) سے اخذ کیا، جیسا کہ گریٹ ٹرگنو میٹریکل سروے آف انڈیا (Great Trignometrical survey of india) میں کیا گیا ہے۔

گزیٹیر آف کشمیر کئی اَبواب میں منقسم ہے، جیسے تعارفی باب، حروفِ تہجی (انگریزی) کی ترتیب سے جگہوں کے نام، وادیٔ کشمیر کی جانب اور وادی سے باہر جانے والے راستوں کی تفصیل، اور آٹھ گوشوارے۔یہ کام محققین، اسکالروں اور سرکاری ملازمین کے لئے حوالہ جات کے لئے بیش قیمت اور انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔

کشمیر کی ایٹمولوجی (Etymology):

چارلس ایلیسن بیٹس نے کشمیر کی ایٹمولوجی (Etymology) بیان کرنے کے لئے کئی ماہرین کے نظریات پیش کئے ہیں۔اُنکی رائے ہے:

اس مشہور خطہ کے اکیلے نام کے تواریخی پس منظر کو لیکر ماہرین تذبذب

میں رہے۔

وائلڈفوڈ نے یہ نام ایک پُرانے اور طاقتور قبیلے "کھش" سے لیا ہے، جو کہ ہندوستان کی مشرقی سرحدوں سے فارس (Persia) تک پھیلے ہوئے ہمالیہ اور ہندوکش میں رہتے تھے۔ اُن کا ذکر انسٹیچوٹ آف مَنو اور ہندؤوں کی مذہبی کتابوں کے علاوہ شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں میں آج بھی ملتا ہے۔ بابر نے اُن کا ذکر "کش" کے طور پر کیا ہے اور اُس کی رائے ہے کہ کشمیر کا نام "کش" سے ہی مستعار ہے۔

پٹولیمے (Ptolemy) کے جغرافیہ میں وادی کا ذکر کاسپیریا کے طور پر کیا گیا ہے، جس میں کاسپیرین رہتے ہیں یہ خطہ پانڈوئی (Pandoouoi) سرزمین واقع جہلم (وِتستا) سے مشرق کی جانب پھیلا ہوا ہے۔ لفظ کاسپیریا (Kaspeiria) دراصل کشمیرا اور کاسپیرین (Kaspeirians) کشمیری لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

بیٹس نے کشمیر کے نام کی ایٹولوجی سے متعلق دیگر ماہرین کے خیالات بھی پیش کئے ہیں:

کچھ ماہرین کے مطابق یہ نام براہمنوں نے "کس" (روشنی) اور "میرا" (سمندر) سے اخذ کیا۔ اِلومبولڈ (Illumboldt) کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام کاسیاپامار (Kasyapamar تھا یعنی "کشپ" Kasayapa کے رہنے کی جگہ...... ایک دیومالائی کردار جس نے وادی سے سارا پانی باہر نکالنے کا راستہ بنایا۔ اِس طرح پانی کی تہہ سے نکلی ہوئی زمین پر جو شہر بنا، اُسے رِشی کشپ پور یا کشپ کا قصبہ کہا جانے لگا۔ بعدازاں اس کا

تلفظ بگڑ کر کشپ پور ہوگیا جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ "کشمیر" بن گیا۔ ہیوگل (Hugel) کے مطابق رِشی کا نام "کشہ" تھا۔ جبکہ ہندؤوں کے مطابق "مر" باغ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی کشہ مر یا کشہ کا باغ۔ تب سے وادی کا یہی نام عام ہوگیا، جو بعد میں بگڑ کر "کشمیر" ہوگیا۔ مسلّم روائت کے مطابق وادی سے پانی باہر نکالنے کا نیک کام حضرت سلیمانؑ کے حکم کے مطابق کشپ نے انجام دیا تھا۔

یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ کشمیر کے فارسی شعراءِ کرام نے کشمیر کو "باغِ سلیمان" کہا ہے۔ تاہم لوگ کشمیر کو کشیر اور یہاں کے لوگوں کو کوشُر کہتے ہیں۔ یہ روائت اُنہیں یہودیوں سے جوڑتی ہے۔

کمراز اور مراز

چارلس ایلسن بیٹس کے مطابق کشمیر کی لمبائی، جسکی پیمائش جنوب مشرق سے شمال مغرب تک کی گئی ہے ۱۱۸ میل ہے، جس کا میدانی رقبہ تقریباً ۸۹ میل لمبا اور اوسطاً پونے سترہ میل چوڑا ہے۔ اس کے دو بڑے حصے کامراج یا کمراز اور مہاراج یا مراز مندرجہ ذیل پر ۴۳ پرگنوں پر مشتمل ہیں:

نمبر شمار	نام	تحصیل سٹیشن
	ضلع کامراز	
۱/	کروہن	بارہمولہ
۲/	تل گام	سوپور - پرگنہ سے باہر لیکن واقع تحصیل
۳/	کھوہی	
۴/	کھوئی ہامہ	بانڈی پورہ
۵/	زینہ گیر	ٹنوا

٦/	ہمل	ہاری پورہ
٧/	لولاب	لاپورہ
٨/	اُتر مچی پورہ	شالورہ
٩/	مچی پورہ	ہندواڑا
١٠/	پہال	شالورہی- پرگنہ سے باہر لیکن
١١/	نائے ہاری	واقع تحصیل

ضلع پٹن

١٢/	دانشو	برگام
١٣/	مچی ہامہ	سوئے بگ
١٤/	بیروہ یا بیرو	گسابیرو
١٥/	بانگل	لولپور
١٦/	پورس پور	کووا-
١٧/	میرے موزاہائن	سُمبل
١٨/	لار	ارانا

ضلع اننت ناگ

١٩/	اننت ناگ	اسلام آباد
٢٠/	شاہ آباد	ڈورو یا ڈور
٢١/	دیوسر	کُلگام
٢٢/	برنگ	بکرا
٢٣/	کُٹھار	اچھ بل یا صاحب آباد
٢٤/	مثن	مٹن
٢٥/	کھوور پارا	سیر
٢٦/	دچھن پارا	کانلوان

ضلع شوپیاں

٢٧/	بٹو	شوپیاں

٢٨/	سپرسمن	شوپیاں- ہرگنہ سے باہر لیکن واقع تحصیل
٢٩/	اردون	موہن پورہ
٣٠/	شورہ	لتر
٣١/	زین پور	سفانگر
٣٢/	شکرو	آری ہل-
٣٣/	چرت	مُرن
٣٤/	ساریموز بالا	بجبہاڑہ

ضلع شہر خاص

٣٥/	ولر	ترال
٣٦/	ہیہو	پانپور
٣٧/	ہیچ	کرالپورہ
٣٨/	ناگام	قصبہ ناگام
٣٩/	پلک	بٹپورہ
٤٠/	کھڑکھست	خاص شہر
٤١/	اتین	باغوان پورہ
٤٢/	بلدا	بہت چھوٹے اضلاع- تحصیل بزنس کا
٤٣/	آروے	کام سرینگر میں ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ ابوالفضلؔ، مؤرکرافٹ، ہیوگل اور وِنّی کی بنائی گئی پرگنوں کی تفصیل کے مقابلے میں پرگنوں کی اُوپر دی گئی فہرست مکمل ہے۔

آبادی

چارلس ایلیسن بیٹس نے وادی میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں صحیح تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ جیسے مذاہب کی بنا پر اُنکی تقسیم اور پیشے کے

لحاظ سے اُنکا سماجی رُتبہ-1885 میں وادیٔ کشمیر کی کل آبادی کا تخمینہ ۲۰۰۰،۰۰۰ سے زیادہ نہیں تھا، جو پچھلے ۲۰ برسوں میں عوام پر ڈھائے گئے مظالمٗ خوفناک بھونچالوں، بیماریوں اور قحط کی وجہ سے ۸۰۰،۰۰۰ سے کم ہُوا تھا اِس وقت (1870) صوبہ کی کل آبادی کا تخمینہ تقریباً ۵۰۰،۰۰۰ لگایا جاتا ہے۔

میجر منٹگمری (Majar Montgemerie) نے کشمیر کے سرُوے کے دوران یہ بات شِدت سے نوٹ کی کہ اِس دیس کے ہر مکان میں عموماً ۱۰-۳۰ مکین رہتے ہیں۔ ۲۳ دیہات کی خاص پڑتال کے بعد پایا گیا کہ ہر گھر میں اَوسطاً ۱۰:۴ بچے تھے، جبکہ مُردوں اور عورتوں کا تناسب ۴:۱ ہے۔ اَوّلذکر بہت جلد بیکار اور قبل اَز وقت بوڑھے ہو جاتے ہیں، جسکی وجہ اُنکی زندگی کا تقریباً ایک چوتھائی حِصہ پانی میں رہنا یعنی شالی کے کھیتوں کے پانی میں گھٹنوں تک ڈوبے رہنا بیان کیا جاتا ہے۔

مرحوم ڈاکٹر ایلمسلی (DR.ELMSLIE) کے حوالے سے بیٹس فرماتے ہیں کہ ایک نیک کرچن نے آبادی کا مندرجہ ذیل تخمینہ پیش کیا ہے، جس کے مطابق وادی کی کل آبادی ۴۰۲،۷۰۰ بیان کی گئی ہے اور اِس شمار میں مشتمل ہیں:-

مُسلم:

سُنی : ۳،۱۲،۷۰۰

شِیعہ : ۱۵،۰۰۰

ہندو : ۷۵،۰۰۰

ڈاکٹر بیٹس نے سری نگر کی آبادی یوں بیان کی ہے:

مُسلم

سُنی : ۹۵،۴۰۰

شِیعہ : ۷،۰۰۰

ہندو : ۲۵،۰۰۰

کل تعداد : ۱۲۷،۴۰۰

پیشہ اور پیشہ وروں کی تفصیل کافی دلچسپ دی گئی ہے:

شال بنگر

مُسلم:

سُنی : ۲۸،۱۱۵

شیعہ : ۱،۰۰۰

ہندو : ۳۱۵

کل میزان : ۲۹،۴۳۰

ٹیکس ادا کرنے والے

مُسلم

سُنی : ۵۰،۷۷۵

شیعہ : ۴،۰۰۰

ہندو : ندارد

کل تعداد : ۴۶،۷۷۵

مُلازمین

سُنی : ندارد

شیعہ	:	ندارد
ہندو	:	۵،۵۷۳
کل تعداد	:	۵،۵۷۳

جاگیردار

مُسلم:

سُنی	:	۲
شیعہ	:	۳
ہندو	:	۴۰
کل تعداد	:	۴۵

سرکاری کرمچاری (جونیر)

مُسلم:

سُنی	:	۲۵۲
شیعہ	:	۳۰
ہندو	:	۷،۵۰۰
کُل تعداد	:	۷،۷۸۲

اُوپر دئے گئے اعداد و شُمار سے مندرجہ ذیل نتائج اَخذ ہوتے ہیں:

۱۔ مہاراجہ کی حکومت میں کوئی بھی غیر مُسلم ٹیکس اَدا نہیں کرتا تھا جبکہ ۵۴،۷۷۵ مسلمان ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

۲۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرکار میں ۵،۵۷۳ غیر مُسلم سرکاری ملازمین ہیں جن میں ایک بھی مسلم شامل نہیں۔

۳۔ ۴۰ غیر مسلم جاگیرداروں کے مقابلے فقط ۵ مُسلم جاگیردار ہیں

۴۔ ۱۸۷۰ء میں ۷،۵۰۰ جونیر (چھوٹے) غیر مُسلم مُلازمین کے مقابلے میں فقط ۲۸۲ مُسلم مُلازمین تھے۔

کرنل ٹورنز (col.torrens) کشمیر کے پہلے ڈوگرہ حکمران کے ٹیکس وصول کے طریقہ کار پر یوں رقمطراز ہیں:

"گلاب سنگھ عوام پر غیر واجب ٹیکس لگانے کے سلسلے میں اپنے پیش رَو حکمرانوں سے بھی کئی قدم آگے نکل گیا۔ یہ سچ ہے کہ اُنھوں نے (پیشرو حکمران) عوام پر بھاری ٹیکس عائد کئے تھے لیکن اس نے تو عوام کا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ اُنھوں نے زمین پر اُگنے والے پھلوں اور کرگھوں (بُننے والی مشین) کے بیشتر منافع اور محنت کشوں کی کمائی پر آہنی پنجہ ڈالا تھا۔ ساتھ ہی اس نے تو اپنی تجوری بھرنے کے لئے اُنکی کھال کھینچنے سے بھی گریز نہیں کیا"۔

بیٹس نے ایڈمنسٹریشن میں کشمیری مسلمانوں کے حصّہ سے متعلق بھیانک اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ حقیقت کے قطع نظر کہ ہز ہائی نس مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی مُسلم پرجا جموں کشمیر کی کل آبادی کا ۹۵٪ حصہ تھے۔ لیکن ایڈمنسٹریشن میں اُن کا حصہ ندارد تھا۔

مذاہب

جہاں تک کشمیر میں مذاہب کا تعلق ہے چارلس ایلیسن بیٹس کا کہنا ہے کہ یہاں بعض لوگ مذہب اکثر بدلتے رہتے ہیں۔ بہت پُرانے وقتوں میں یہاں ناگ یا سانپوں کو ماننے والے لوگ ہوا کرتے تھے۔ اشوک نے ۲۵۰

قبل مسیح میں بُدھ مت متعارف کروایا۔ اشوک کے وارثوں نے ذات پات میں سُدھار لایا اور ناگ پوجا کے بعد تا تار شہزادوں کی قیادت میں بُدھ مت دوٗبارہ متعارف کرایا گیا۔ براہمن وادیا ہندو دھرمَ ابھیمنیوں نے ۸۷ قبلِ مسیح میں متعارف کیا اور گویندرا سوئم (Gonerda.III) کی کوششوں سے ناگ پوجا پھر سے دُہرائی گئی۔

کشمیریوں کا کہنا ہے کہ ۷۰۰ سال قبل یہاں کے لوگوں نے اِسلام کو لبیک کہا تھا۔ یہ وقت ہمیں بہت پیچھے شمس الدّین کے زمانے میں لے جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا مُسلم بادشاہ ہوا ہے۔ کشمیر کے براہمنوں نے ہیوگل کو بتایا کہ اِسلام کی آمد کے بعد، کچھ دَباو میں آکر اُنکی فقط گیارہ ذاتیں رہ گئیں اور یہاں دکن کے کالے رنگ ۴۰۰ براہمنوں کو بسایا گیا۔

بیٹس کا کہنا ہے کہ اَب یہاں کچھ ہندو ذاتیں رہتی ہیں جن میں پنڈت بھی شامل ہیں جو کہ سرکاری حیثیت سے حکومت کے ساتھ منسلک ہیں۔ ہندوؤں کا مُسلمانوں کے مقابلے میں بہت کم تناسب ہے گو کہ وہ حکمران طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں تقریباً سارے ہی سُنی ہیں، جبکہ شیعوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مسلم فلاح سے جُڑے ہوئے کچھ لوگ بھی ہیں جنھیں صوفی کہا جاتا ہے۔ چک پرانے اور مُعتبر لوگ ہیں، جن کے مقبرے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُنکی بہت آبادی تھی اور پُرانے وقتوں میں وہ صاحبِ ثروت ہوا کرتے تھے ہر دو مذاہب کے مبلغ مُلا اور پنڈت لاعلم (Ignorant) ہیں اور متاثر نہیں کرتے۔

رِیشی

بیٹس کا کہنا ہے کہ ریشی طبقہ عوام میں مقبول ہے اور یہ لوگ شادی نہیں کرتے اِس طرح سے وہ یوگیوں یا سنیاسیوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ کشمیریوں کا یقین ہے کہ اِس مت کا بانی ایک صوفی سنت تھا جس کا نام اُویس تھا۔ آپ پیغمبرِ اسلامؐ کے وقت یمن کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ رِیشی گوشت خور نہیں ہوتے۔ وہ جنگلوں میں رہتے ہیں اور جنگلی جڑی بوٹیوں خاص کر "وِل ہاک" پر ہی گذر بسر کرتے ہیں۔ مُغل بادشاہ اکبر نے اُنھیں اُس وقت زمینیں اور درگاہیں عطا کیں جبکہ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں رِیشی نہیں ہوا کرتے تھے اور جب اکبر نے کشمیر فتح کرنے کی کوشش کی تو چک بادشاہوں نے ریشیوں کی دعاؤں سے اُسے تین بار شکست فاش دی۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ اکبر کے زمانے میں اِس ملک میں ریشی سب سے زیادہ عزت دار لوگ تھے۔ گو وہ کسی روائت کے پابند نہیں ہوتے پھر بھی بے شک وہ خُدا کے سچّے عبادت گار تھے۔ وہ کسی دوسرے فرقے پر تنقید نہیں کرتے اور نہ ہی کسی سے کوئی سروکار رکھتے ہیں۔ وہ شاہراہوں پر پھل دار درخت لگاتے ہیں تا کہ انھیں کھا کر بھوکے پیاسے مُسافر کچھ تازگی محسوس کریں۔ وہ گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور عورت ذات سے کِسی قسم کا میل جول نہیں رکھتے۔ وہ مزید رقمطراز ہے۔ "کشمیر میں اِس فرقے سے تعلق رکھنے والے تقریباً دو ہزار لوگ ہیں"۔

کشمیری زبان

اپنے گزیٹر میں، چارلس ایلیسن بیٹس نے کشمیری زُبان کا بطورِ علاقائی زبان ہونے کے ناطے اِس کے تحریری زبان ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"کشمیر کی زبان اس صوبے کے لئے مخصوص ہے اور وادی کے ایک حصے میں بولی جانے والی زُبان دوسرے حصے میں بولی جانے والی بھاشا سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ یہ پارس کی پراکرت اور ٹھیٹھ سنسکرت ہے۔ یہ بات بحث طلب ہے آیا کہ کاشُر بطور علاقائی زبان کبھی تحریری زُبان بھی بنی ہے؟ ڈاکٹر ایلملی {Dr. Elmalie} کا کہنا ہے کہ پُرانے زمانے میں یہ بھاشا شاردا حروف میں لکھی جاتی تھی، جو کہ دیو ناگری کا ہی ایک انداز ہے۔ اس نظریئے کی تائید ڈاکٹر لٹنر {Dr. litner} بھی کرتے ہیں۔ سنسکرت اور پُرانے کشمیری حروف کسی زُبان میں لکھے گئے ہیں وہ وادی کے ہندو بھی نہیں سمجھ پاتے، ماسوائے پروہت طبقے سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کے۔ دوسری طرف بابو بیلمبر مکرجی فرماتے ہیں کہ کشمیری کے حروف کبھی شاردا میں لکھے ہی نہیں گئے۔ اَب جدید کشمیری عام طور پر فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے جن سے مختلف اور مبالغہ آمیز آوازیں جوڑی گئی ہیں۔ ایسی صورت حال میں حروف کو صحیح تلفظ میں بولنا ناممکن ہوتا ہے، جب کہ نہ وہ پہلے سُنا گیا ہو۔"

شال بافوں کی اپنی ایک الگ ہی زُبان ہے، جو گو کہ سُننے میں کشمیری ہی لگتی ہے لیکن معنوں میں جدید کشمیری سے کافی مختلف ہے۔ اِن میں فارسی الفاظ کی آمیزش بھی کافی حد تک شامل ہے۔ اِس کاروباری زبان ان

یور (UNYOUR) اوسطاً وزن ایک چھٹانک۔ رنگ سیاہ۔ موسم اور طور طریقے راماہ گاڈ جیسے ہی ہیں۔

ٹیٹ گاڈ (TET GAD)

اوسطاً وزن ایک چھٹانک یا کم۔ رنگ سیاہ۔ موسم اگست سے اکتوبر

تک۔ جب بہت چھوٹی ہوتی ہے تو اسے ٹیٹ گرو و کہتے ہیں۔ جب دریاؤں میں پانی کم ہو جاتا ہے تو یہ زبان کے حروف عام طور پر رنگوں، اشاروں اور دِشاؤں (directions) سے عبارت ہیں جو کہ شال بافی کے فن میں استعمال ہوتے ہیں۔

حیوانات

کشمیر میں پائے جانے والے جانوروں کی تفصیل بیان کرتے وقت بیٹس 'ہانگل' کو سرِ فہرست رکھتا ہے۔ اُس کے مطابق ہانگل 'یا ہونگل (بارہ سنگھا) لولاب، لار، وادی سندھ، گُریز، تلمل، دچھن بارہ، وڈون اور پنچال کے پورے سلسلۂ کوہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر ستمبر کے وسط سے قبل نہیں ملتا، گو کبھی کبھی اگست کے وسط میں بھی دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کے سینگ پوری طرح سے نکل آئے ہوتے ہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ ہندو اور مُسلمان دونوں ہی بارہ سینگھے کا گوشت کھاتے ہیں۔ وینے (vigne) بارہ سنگھا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے سینگوں سے گھوڑے کی کاٹھی کے کنارے مزیّن کئے جاتے ہیں۔ اسے چند دِنوں کے لئے پہلے پانی میں بھگو دِیا جاتا ہے، جس سے اس کی چکنائی نرم ہو جاتی ہے اور پھر اُنہیں استعمال میں لایا جاتا ہے۔

بیٹس نے ایک دوسرے جانور کستوری ہرن (Musk Deer) کا بھی ذِکر کیا ہے، جو کہ کشمیر کے ہر حصے میں بھوجپتروں کے جنگلوں کی مخصوص اونچائی میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر لار اور وادیٔ سندھ کے کنارے۔ اوڈر (Other) عام طور پر کشمیر کے دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔

یہ اکثر لکڑی کے پُرانے اور بڑے بڑے لٹھوں کے ارد گرد ہی رہتا ہے' جو اکثر قصبوں کے نزدیک پُلوں کو کھڑا رکھنے میں سہارا دیتے ہیں۔ پہاڑوں میں یہ اُوڈر کے نام سے مشہور ہے۔ اسے اُس کی قیمتی کھال کے لئے مارا جاتا ہے جو وسطِ ایشیا کے بازاروں میں بہت مہنگے داموں بکتی ہے۔

گلہری کی ایک قسم جسے پُووا (drum or pua) کہتے ہیں' اُونچی چٹانوں پر پائی جاتی ہے۔ یہ لومڑی جتنی بڑی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ ہلکا پیلا' پیٹ بھورے رنگ کا' سر، کمر اور دُم پر کالی دھاریاں جو دور سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہ جانور اکثر چیل کا شکار بنتا ہے۔ یہ کسی خطرے کے وقت بہت زور سے چیختا ہے۔

چیتا کشمیر کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے لیکن یہ چراگاہوں میں زیادہ نقصانات پہنچاتا ہے، وہاں یہ مویشیوں میں بہت تباہی مچاتا ہے۔

بیٹس کے مطابق' ریچھ کشمیر کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے' خاص کر لولاب اور نو ونگ کی وادی میں۔ پہلے کی نسبت اب بہت کم تعداد میں ہیں' لیکن ابھی بھی عام پائے جاتے ہیں۔ گو یہ بہت بھیانک قسم کا جانور ہے لیکن یہ عام طور پر آدمی پر اُس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ نہ پہلے اُس پر حملہ کیا گیا ہو۔ کالا ریچھ اگر چہ بھورے ریچھ سے چھوٹا ہوتا ہے' لیکن زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور عام طور پر نچلے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ پھلوں کے موسم میں کالا ریچھ اُن گاؤں والوں کے لئے باعثِ پریشانی ہوتا ہے جب سورج غروب ہونے کے فوراً بعد یہ باغوں اور فصلوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

بھیڑیئے' جنہیں کشمیری میں رام ہُون کہتے ہیں' کشمیر کے پہاڑوں میں

بہت پائے جاتے ہیں اور اکثر بھیڑ بکریوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر وادی میں دِکھائی نہیں دیتے۔ پہاڑی بکری دچھن پارہ اور وادیٔ سندھ کے پنڈالوں میں پائی جاتی ہے۔ تھار بانہال کے پنڈال رینج کے علاوہ وڈون اور کشتواڑ کے جنوبی حصے میں پائی جاتی ہے، جہاں اسے کرس (KRAS) کہتے ہیں۔

آج کل کشمیر میں پائے جانے والے ٹٹو' گو پست قد کے ہوتے ہیں' لیکن بلاشبہ سخت جان اور کبھی نہ لڑھکنے والے جانور ہیں اور آپکو کسی مُہم پر جلدی اور حفاظت سے پہنچا دیتے ہیں جہاں بڑے بڑے قد آور جانور بھی راستوں کی مشکلات کے سامنے ہار جاتے ہیں۔ دچھن پارہ کا علاقہ جو کہ لِدر کے دائیں کنارے پر واقع ہے' ٹٹوؤں کی نسل کے لئے مشہور ہے اور یہ کشمیر کی وادی میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں گائے اور بیل چھوٹی جسامت کے ہوتے ہیں۔ پہاڑوں پر بھینسیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن یہ کشمیر کا مقامی جانور نہیں۔ بکریاں کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ گدھے اور خچر بھی اَنگنت ہوتے ہیں۔ بھیڑیں لاتعداد پائی جاتی ہیں۔ حاجن گاؤں کے پڑوس میں بہترین نسل کی بھیڑیں ملتی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بھیڑوں کی یہ بہترین نسل نہ صرف وادی میں' بلکہ پورے ہمالیائی علاقوں میں ملنی مشکل ہے۔

مچھلیاں

وِگنی (Vigni) نے اپنی کتاب میں مچھلیوں کی صرف چھ قسمیں بیان کی ہیں، جو کہ ہمالیائی علاقے میں عام پائی جاتی ہیں۔ بیٹس نے دریائے جہلم،

جھیل ڈل، جھیل وُلر اور دریائے سندھ میں پکڑی جانے جانے والی مچھلیوں کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ اُس کے مطابق کشمیر کے پانیوں میں بے شمار مچھلیاں پائی جاتی ہیں، جن کی قسمیں یوں بیان کی گئی ہیں:

چری گاڈ (CHARRI GAD)

اس مچھلی کا اوسطاً وزن ۲ سے ۳ پونڈ ہوتا ہے۔ اس کی کمر پر ایک اور پیٹ کی جانب پانچ پَر ہوتے ہیں، مُنہ کا دہانہ بڑا، کمر پر کالے دھبے، نقرئی پیٹ اور ایک طرف آنکھ سے لیکر دُم تک لمبی لکیر، اس کی چمڑی نرم اور پتلی ہوتی ہے۔ چری گاڈ کا شکار اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں کیا جاتا ہے۔

ستار گاڈ (SATTAR GAD)

اس مچھلی کا اوسطاً وزن آدھ سیر بتایا جاتا ہے۔ اس کی کمر پر ایک اور پیٹ کی طرف پانچ پَر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں نقرئی طرفیں، دھبوں والی کمر اور پتلی جلد ہوتی ہے۔ یہ مچھلی کافی تعداد میں پائی جاتی ہے اور اس کا شکار سال کے سارے موسموں میں ہوتا ہے۔

کروَٹ گاڈ KROUT GAD

اِس مچھلی کا اوسطاً وزن آدھ سیر سے پونے سیر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کی کمر پر ایک علاوہ کالی کمر، سفید، پیلے رنگ پیٹ اور نرم جلد، اِس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پتھروں اور چٹانوں کے نیچے رہتی ہے اور سارا سال اِس کا شکار کیا جاتا ہے۔ یہ چری گاڈ اور ستار گاڈ کی ہی ایک قسم ہے۔

پکٹ یا پیکری گاڈ PIKUT or PEKRI GAD

اس کا اوسطاً وزن 8 تا 16 سیر ہوتا ہے۔ اس کے مُنہ کا دہانہ کافی

بڑا ہوتا ہے جس کے اوپر جلد کی ایک تہہ ہوتی ہے۔ رنگ سفید، یہ ڈراوَنی مچھلی نومبر سے جولائی تک مِلتی ہے۔

چش گاڈ CHASH GAD

اس مچھلی کا اوسطاً وزن آدھ سیر سے ایک سیر تک ہوتا ہے۔ اس کا سَر نوکیلا اور مُنہ چھوٹا ہوتا ہے، جلد نرم اور پتلی ہوتی ہے اور رنگ سفید ہوتا ہے۔ یہ مچھلی دسمبر سے مارچ تک کے دِنوں میں پکڑی جاتی ہے لیکن یہ بہت کم پائی جاتی ہے۔

حرج HARJ

اوسطاً وزن آدھ سیر یا کم، کمر پر ایک اور پیٹ کی جانب پانچ پَر ہوتے ہیں۔ اس کا مُنہ چھوٹا ہوتا ہے، کمر کالی، چاندی رنگ کا پیٹ اور جلد کی اوپری تہہ ٹھوس ہوتی ہے۔ یہ اکتوبر سے مئی تک دستیاب ہوتی ہے۔

راماہ گاڈ RAMAH GAD

اوسطاً وزن ایک چھٹانک، رنگ گہرا سبز۔ یہ مچھلیاں جہلم میں جوُن کے مہینے میں دستیاب ہوتی ہیں۔ جب پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو یہ جھیلوں یا دلدلوں کی طرف چلی جاتی ہیں۔

اَن یور (UNYOUR)

اوسطاً وزن ایک چھٹانک۔ رنگ سیاہ۔ موسم اور طور طریقے راماہ گاڈ جیسے ہی ہیں۔

ٹیٹ گاڈ (TET GAD)

اوٗ۔ طاؤزن ایک چھٹا نگ یا کم۔ رنگ سیاہ۔ موسم اگست سے اکتوبر تک، جب بہت چھوٹی ہوتی ہے تو اسے ٹیٹ گُروو کہتے ہیں۔ جب دریاؤں میں پانی کم ہو جاتا ہے تو یہ مچھلیاں کم گہرے پانی یا نالوں میں پکڑی جاتی ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لئے طشتری نُما گہرے گڈھے نالوں کے کنارے ریت سے بنائے جاتے ہیں۔

داس(DAS)

یہ مچھلی اگست اور ستمبر میں پکڑی جاتی ہے۔ یہ کہنا مشکوک ہوگا کیا یہ مچھلی کسی علیحدہ قسم کی ہے؟ بہت ممکن ہے کہ یہ نام جال میں پھنسنے والی چھوٹی مچھلیوں کو دیا گیا ہو۔

ایل گاڈ AIL GAD

یہ سفید رنگ کی چھوٹی مچھلی ہوتی ہے۔ یہ اُن چھوٹی ندیوں میں پائی جاتی ہے جو جہلم میں گرتی ہیں۔ دریا میں اُس وقت پہنچتی ہیں، جب پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے۔ متن جی، ویری ناگ یا دیگر مُتبرک تالاب کی پالتو مچھلیوں کا شائد کوئی خاص نام نہیں ہوتا۔ انہیں ناگ گاڈ کہا جاتا ہے۔

کشمیری نسل

بیٹس نے اپنے گزیٹیر میں کشمیریوں کے بارے میں کافی جانکاری بہم پُہنچائی ہے۔ جیسے اُنکے کھانے پینے کے طور طریقے، اُنکے لباس اور اُنکے اخلاق و آدابِ زندگی کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔ اُنکا کہنا ہے کہ جسمانی طور کشمیری ایک عمدہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرد دراز قامت، مضبوط ساخت کے ہوتے ہیں۔ اُنکا رنگ روپ عام طور پر خوبصورت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی

صاف اور گلابی، خاص طور پر ہندوؤں کا، اُنکے نین نقش مُناسب اور تیکھے ہوتے ہیں، جبکہ مُسلم فرقہ میں پٹھان نسل کے لوگ یہودیوں سے ملتے جُلتے ہیں۔

آس پاس ممالک کی عورتوں کے مقابلے میں کشمیری عورتیں، خاص طور پر پنڈتانیاں، بے شک خوبصورت عورتوں میں شمار کی جاسکتی ہیں اور خوبصورتی کی بہترین مثال کہی جاسکتی ہیں۔ اِس سچائی کا تعلق یہاں کی خوراک سے ہے، جس میں مچھلی اور دیگر تسلی بخش کھانے برابر شامل ہیں۔ کشمیریوں کی خاص غذا سبزیاں، چاول، شلجم، گوبھی، گاجر، چقندر اور پالک وغیرہ ہیں۔ یہ ایک قسم کے رَس (soup) میں نمک ڈالکر اُبالی جاتی ہیں۔ گکروندا (Dandelion) کے پتے، گوشت (dock) پلانٹین (plantain) اور میلو (Mallow) بھی کھائے جاتے ہیں۔ اخروٹ کے (Catkins) میں تھوڑا سا نمک ڈالکر اور سرسوں یا اخروٹ کے تیل میں بھونکر ایک ذائقہ دار غذا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کنول کے پھول کی جڑیں اُبال کر خوشبودار اور لذیز سبزی بنتی ہے۔ اِسے نُدرو کہتے ہیں۔ ندرو کا رنگ ہلکا پیلا ہوتا ہے۔ یہ سبزی غذائیت سے بھرپور تصور کی جاتی ہے۔

عورتیں عام طور پر زیورات کا خوب استعمال کرتی ہیں، جن میں کان کی بالیاں، نتھنی، پازیب، اور چوڑیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اُنکے بال سنوارنے کا طریقہ بھی کچھ اَنوکھا سا ہے۔ پہلے سارے بال سَر کے پیچھے لاکر گوندھے جاتے ہیں۔ گوندھے ہوئے بالوں کی پنڈھیاں اُونی دھاگے کے ساتھ بٹائی جاتی ہیں۔ انہیں مزید کافی لمبا بنایا جاتا ہے۔ آخر اسے ایک موٹے ربن (Ribbon) جسے گنڈھ پن کہتے ہیں، جس کے ساتھ کچھ اس ڈھنگ سے بٹایا جاتا ہے کہ

بٹے ہوئے بالوں کی یہ لَٹ عورت کی کمر تک جھولتی رہتی ہیں بال سنوارنے کے اس طریقۂ کار کو وانک پن کہتے ہیں۔

لباس

یہاں مرد اور عورتیں تقریباً ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں۔ یہ ایک لمبا لبادہ ہوتا ہے جسے پھیرن کہتے ہیں۔ پھیرن' جس کے آستین کافی کھلے ہوتے ہیں' دیکھنے میں نائٹ گاؤن (Nightgown) سے زیادہ مختلف نہیں۔ موسم کے مطابق یہ (سوت) کے یا اُونی ہوتے ہیں۔ پھیرن دراصل فارسی لفظ پیراہن کا ہی بگڑا ہوا روپ ہے' جس کے معنی لباس کے ہیں۔ روایت ہے کہ یہ لباس اکبر نے اس لئے متعارف کروایا تھا تاکہ کشمیری لوگ اپنا جنگجویانہ لباس تج دیں جس سے وہ اپنی خداداد جنگجویانہ صلاحیتوں سے خود بخود محروم ہو جائیں گے۔ یہ لباس سُرخ یا نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ عورتوں کے پھیرن کے آستین مَردوں کے پھیرن کے آستینوں کے مقابلے میں زیادہ کُھلے اور دامن زیادہ لمبے ہوتے ہیں' جو ٹخنوں تک چلے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ مَرد ایک جوڑا ڈھیلے قسم کے جانگیا کا بھی استعمال کرتے ہیں' جبکہ سر پر سفید دستار سجاتے ہیں۔ ہندو یہ دستار دائیں کنپٹی کی طرف اور مسلمان بائیں کنپٹی پر باندھتے ہیں۔ عورتیں سَر پر چپک کر بیٹھنے والی ٹوپی' جس کے سامنے سُرخ شنگار پٹی بندھی ہوتی ہے' کا استعمال کرتی ہیں۔ پنڈتانیاں اِس لمبی سُرخ اُونی پٹی کو' جو کہ وہ سَر کے گرد باندھتی ہیں' سرپوش کہتی ہیں۔

کشمیری خواتین جس معمولی سے کپڑے سے سَر ڈھانپتی ہیں' اُسے پُوژ (Pooch) کہتے ہیں۔ یہ سوتی کپڑے کا ایک لمبا سا ٹکڑا ہوتا ہے' جو سَر

ڈھانپنے کے بعد بھی کمر تک لٹکا رہتا ہے۔ اس کا استعمال مُسلم عورتیں ہی کرتی ہیں۔ پنڈتانیاں بندیوں والے کپڑے کا استعمال کرتی ہیں جسے تکی پوس (Tckiputs) کہتے ہیں۔ چند اُونچے گھرانوں کو چھوڑ کر عورتوں میں عام طور پر جسم کے خدوخال مخفی رکھنے کا رواج نہیں۔ عورتیں سوتی کپڑے کا ایک لمبا سا ٹکڑا جسے لنگی کہا جاتا ہے پھیرن کے اُوپر کمر پر تاندھ لیتی ہیں۔ پنڈتانیاں اِس کے بغیر کہیں باہر نہیں جاتیں۔

کردار

کشمیریوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے بیٹس رقمطراز ہے کہ کشمیری غریب ہونے کے باوجود بھی سخی قسم کے لوگ ہیں۔ گاؤں میں یہ لوگ ایسے ہر شخص کی مدد کرتے ہیں جو بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے جسمانی طور پر معذور ہو جائیں اور جنکی دیکھ بھال کے لئے کوئی نزدیکی رشتہ دار نہ ہو۔

شہروں' قصبوں اور دیہاتوں میں کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ ہر اُس شخص کو کھانا یا پیسہ دیتے ہیں جو ہر مہینے کی گیاراں (۱۱) تاریخ یا کسی مذہبی تہوار جیسے عید وغیرہ پورے ماہِ رمضان کے موقعے پر مانگنے آتے ہیں۔

بیٹس کو کشمیریوں کی ذہانت کا اعتراف ہے اور یہ بات کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ اُنکی (کشمیریوں کی) بہت سی ناکامیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سیاسی اور گردونواح کے حالات ہیں' نہ کہ قدرت کا قہر۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو لوگ بہت باشعور رہے ہوں جو جنگجو قوم کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں' اَب پورے برِصغیر اشیا میں سب سے زیادہ بُزدل کہلاتے ہیں، اُنکی انسانی قدر و قیمت کا ازسرِ نو تعین کرنے کے اہل ہے۔

''کشمیریوں کا قومی ہتھیار چھپن (Sling) اب شاذ و نادر ہی اُنکے ہاتھوں میں دکھائی پڑتا ہے۔ اُنہیں مشرق کے نپولین (Neapolion) کہا جاتا ہے۔ وہ محنتی، ہوشیار، حاضر جواب اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ صدیوں سے ظلم اور بے عزتی سہتے آرہے یہ لوگ غلاموں جیسے نقائص، جھوٹ بولنے اور دھوکہ بازی جیسی علتوں کی طرف مائل رہتے ہیں۔ سچ، بے شک اُنکے مفاد میں ہو لیکن بولنے سے ہر ممکن پرہیز کریں گے۔ وہ اپنا زیادہ وقت تفریحی کاموں میں صَرف کرتے ہیں۔

درآمد و برآمد

بیٹس کی رائے میں کشمیریوں کا تجارت میں قدرتی رجحان پایا جاتا ہے لیکن بد قسمتی سے یہ رجحان سیاسی حالات کی وجہ سے دب کر رہ گیا ہے۔ اُن کا زیادہ تر تجارتی لین دین پنجاب، لداخ اور افغانستان کے ساتھ چلتا ہے۔ کشمیر کا تجارتی مال جن راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے، وہیں سرینگر سے براستہ بانہال تا جموں اور امرتسر، براستہ پیر پنجال اور بھمبر تا گجرات، جہاں اکھنور اور بُدھل سے بھی جاتا ہے اور آخر میں سرینگر سے پشاور براستہ بارہمولہ، مظفر آباد اور منسیرا۔

پنجاب میں کشمیر کے مال کی سب سے بڑی منڈی امرتسر ہے۔ کتاب میں دیئے گئے گوشوارہ میں کشمیر کے ساتھ برٹش انڈیا اور کشمیر و لداخ کے درمیان تجارتی تخمینہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ مزید برآمد دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کا تخمینہ بہت کم دِکھایا گیا ہے۔ کشمیر سے پنجاب کی طرف برآمد کئے گئے مال کی قیمت درآمد سے زیادہ ہے، جبکہ لداخ سے درآمد کئے گئے مال

کی قیمت برآمد کئے گئے مال سے کہیں زیادہ ہے۔

پنجاب میں برآمد کیا گیا سب سے اہم مال پشمینہ اور اُونی کپڑا ہے، جبکہ کچے مال میں گھی سب سے زیادہ منافع بخش سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد چرس پھل، اناج اور چاول کی باری آتی ہے۔ لداخ کے لئے دوسری برآمدات میں قیمتی شال چھڑا، بیج اور تمباکو شامل ہیں۔ اس کے عوض شال میں استعمال کی جانے والی اُون (پشمینہ) نمک اور چائے منگوائی جاتی ہے۔

ہتھیار بنانا

چالیس ایلیسن بیٹس نے کشمیر میں ہتھیار بنانے سے متعلق بہت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اُس کے مطابق کشمیر بندوقیں، پستول کی نالیاں اور تلواریں بنانے میں زمانہ قدیم سے ہی مشہور تھا لیکن پچھلے چند برسوں سے اس کاروبار میں کافی گراوٹ آئی ہے۔ ملک میں پائے جانے والا لوہا اس مقصد کیلئے معیاری نہیں سمجھا جاتا۔ باجور (Bajour) سے درآمد کئے گئے لوہے سے سبھی قسم کی بندوقوں کی نالیاں (Gun barrels) بنائی جاتی ہیں، ماسوائے کچھ غیر معیاری بندوقوں (Sporting weapons) کے سرینگر میں معیاری قسم کے کھیلوں کے اوزاروں (Sporting weapn) بندوقیں (Gun Rifles) دمشق ٹوسٹ (Damascus Trouist) سے بنائی جاتی ہیں۔ انکی دو قسمیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی معیاری مال کیلئے سنکھیا (arsenic) استعمال کیا جاتا ہے جبکہ کم معیاری مال کیلئے سنکھیا میں قلائی (Kallai) کی ملاوٹ سے اوّل الذکر جیسے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

بھی لوہار اور بندوقیں بنانے والے جن کی تقریباً ۳۰ دکانیں ہیں ہاری پربت پہاڑی کے دامن میں رہتے ہیں۔ یہاں کام کرنے کا کوئی منظم ڈھنگ دیکھنے کو نہیں ملا اس لئے بنائے گئے ہتھیاروں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دکان میں جہاں چار یا پانچ کاریگر کام کرتے ہیں، ایک مہینے میں صرف ایک یا دو بندوقیں بنتی ہیں۔ اس کام میں سخت اوزاروں کے استعمال سے ہلکے، دستی اور خوبصورت ہتھیار تیار کئے جاتے ہیں۔ شاید یہ مکمل طور پر کارگر نہیں ہوتے، کیونکہ یہاں بورنگ (Boring) یا بندوقیں بنانے کا طریقہ کار بہت پرانا ہے۔ کشمیری لوہا، بندوق کا ہر حصہ بنانے کے کام آتا ہے۔ ماسوائے بندوق کی نالی (Barrel) کے، کچھ معیاری بندوقوں کی نالی کا استر باہر سے درآمد کی گئی دھات سے بنایا جاتا ہے۔

بیٹس کے مطابق کشمیری لوہے سے بندوقوں سے سنگین (Boyonets) بنائے جاتے ہیں جن پر درآمد کئے گئے سٹیل کا کور (Cover) چڑھا ہوتا ہے۔ سرکار کیلئے بندوقیں اور فیلڈ پیس (Field Pieces) بیرو پرگنہ کے گاؤں ذینی گام میں بنائی جاتی ہیں۔ فیلڈ پیس (Field Piea) کے موٹے اور بھاری کنارے (Stock) اخروٹ کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اور بندوق کا گھوڑا بھی بہت کاریگری سے فٹ کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذینی گام فیکٹری میں ایک مہینے سے پانچ بندوقوں سے زیادہ مال تیار نہیں ہوتا، گو کہ یہ تعداد ضرورت پڑنے پر بڑھائی بھی جاسکتی ہے۔

جگہوں کے نام

اس کام کا بڑا حصہ حروف تہجی (انگریزی) کی ترتیب سے جگہوں کے نام کی فہرست تھے۔ ہر جگہ کا نام انگریزی کے موٹے حروف (Capital letters) میں لکھا گیا ہے۔ وہ جگہ کہاں واقع ہے، اُس کا عرض بلد وطول بلد اور اُسکی مختصر سی جانکاری بھی درج ہے۔ جگہوں کے نام کی فہرست گزیٹیر کے ۳۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ گو کہ یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن اس میں چارلس ایلیسن بیٹس نے بہت قیمتی اور اہم جانکاری فراہم کی ہے جو کہ موجودہ دور میں بھی افادیت رکھتی ہے۔ اُس فہرست سے چند نمونے ذیل میں دئے جارہے ہیں جن سے اس مشہور مصنف کے ریسرچ کے کام کی اہمیت واضح ہوگی:-

اننت ناگ

عرض بلد=44 0 33 طول بلد=75013 اس جگہ کا کشمیری نام اسلام آباد کے مشہور چشمے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ چشمہ ایک پہاڑ کے دامن سے پھوٹتا ہے اور اس کے مغرب میں قصبہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا پانی پکے تالاب میں جمع ہوتا ہے جسے لکڑی کے منڈپ سے سجایا گیا ہے۔ اس پر بڑے بڑے چناروں کا سایہ رہتا ہے۔

اس چشمے کا نام اننت ناگ سے لیا گیا ہے یعنی اننت کا چشمہ۔ وشنو کا ناگ۔ اور زمانے کے تسلسل کا نشان۔ اسے ہندو متبرک مانتے ہیں۔ اس سے تقریباً ۱۰۰ گز کی دوری پر ایک دوسرا چشمہ واقع ہے جسے سونر پوکر (Sonur pookur) کہتے ہیں۔ اس کا پانی پینے کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک مزید دو چشمے سلک ناگ اور ملک ناگ بہتے ہیں۔

ان کا پانی بھی اسی تالاب میں جمع ہوتا ہے۔ سلک ناگ گندھک (Sulphar) کا چشمہ ہے جبکہ ملک ناگ کا پانی فوارے کی طرح اُوپر اُچھلتا ہے۔ یہ پانی صاف وشفاف ہے۔

بلہامہ

عرض بلد= 21 340 طول بلد= 591 740

ایک بہت بڑا گاؤں پانپورت سے تقریباً ۲ میل شمال مشرق کی جانب ایک پہاڑ (وُڈر) کے کنارے واقع ہے۔ اس گاؤں میں دو مسجدیں، ۲۵ مکانات ہیں، جن میں مُسلم زمیندار، ۳۰ شال باف، ۳ پنڈت، ایک مُسلم فقیر، ایک مُلا، دُوم دودھ بیچنے والا، ایک ترکھان اور ایک لوہار رہتے ہیں۔ اس گاؤں کے مشرق میں ایک ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے کھڑے درختوں کے نیچے پتھر ملے ہیں، جن پر ہندو دیوتاؤں سے مطابقت رکھنے والی نقاشی ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی طرح کچھ پتھر مندر میں بھی پائے گئے۔ گاؤں سے اُوپر کی سطح پر واقع پہاڑوں میں خشک فصل اُگائی جاتی ہے اور اس کے دامن میں واقع وادی میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیت ہیں۔

درنگ

عرض بلد= 57 330 طول بلد= 35 740

یہ گاؤں جنگل کے کنارے پہاڑوں کے دامن میں اور توسہ میدان کے مشرق میں بیرو پرگنہ میں واقع ہے۔ یہ راستہ درّے کے جاو پر جنگلوں سے نکل کر وادی کشمیر کے اس گاؤں میں داخل ہوتا ہے۔ درنگ براستہ ماگامہ، سرینگر کے جنوب مغرب میں ۱۲ میل کی دُوری پر ہے۔ درنگ میں ایک مسجد اور

۱۰ مکانات ہیں، جن میں زمیندار، ایک مُلا اور ایک پنڈت تعینات ہیں۔ اس گاؤں میں اُخروٹ کے بسیار درخت ہیں۔ ایک الھڑ ندی پہاڑوں سے اُتر کر گاؤں میں بہتی ہے۔ چاول اور خشک اناج دونوں کی فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔

کُلگام

عرض بلد= 39 330 طول بلد= 4 740

ایک چھوٹا سا قصبہ، دیوسر پرگنہ کا تحصیل سٹیشن جو کہ ایک پہاڑ (وُڈر) کے جنوب اور ویشو کے کنارے پر واقع بہت خوبصورت لگتا ہے۔ یہاں اس ندی ویشو کا تَل پھیلا ہوا ہے جہاں سے اس کی کئی شاخیں نکلتی ہیں۔ یہاں دو پُرانی زیارتیں بھی ہیں۔ بڑی زیارت سیّد حُسین سمنانی کی ہے، جبکہ چھوٹی زیارت شاہِ ہمدانؒ کی ہے۔ شمال مشرق میں کلگام اور شوپیان کے درمیان ویشو سے ایک نہر برائے آبپاشی نکالی گئی ہے۔ کسی زمانے میں یہ جگہ کھلونے (Wooden Toys) بنانے کے لئے مشہور تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے یہ مقام بیوپاریوں اور دوسرے لوگوں کی آماجگاہ، جو براستہ درّہ گلاب گڑھ سے پنجاب جاتے تھے۔ کلگام کے نزدیک ہی سو بڑے چناروں پر سارسوں (بگلوں) کے گھونسلے ہیں۔ یہاں سے مال حاصل کیا جا سکتا ہے۔

راستے (Routes)

چارلس ایلیسن بیٹس نے راستوں کی فہرست میں ۸۷ راستے درج کئے ہیں، جو وادیٔ کشمیر کی طرف یا وادی سے باہر کی جانب جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل ساتھ دیئے گئے گوشواروں میں درج ہے۔

No. of Marches	Names of Halting Places		Estimated distance in miles: Stage	Total	Remarks
9	Uri	...	16	109	A long march; road continues along the valley of the Jhelam, and in the first 10 miles there are about eight fatiguing ups and downs, five of which are deep ravines, like those in the previous march. At the end of about 14 miles, it passes over a bridge, which crosses a wide stream near its junction with the Jhelam; on the other side of this bridge there is a long steep ascent to the elevated plain, upon which Uri is built. Uri is a large village; supplies procurable. An old stone fort stands near the bank of the Jhelam, and just above it the river is crossed by a rope suspension-bridge. The road by Púnch and the Haji Pir pass joins the Marri road at Uri. Púnch is 31 miles distant.
10	Naoshera	...	14	123	Road continues up the valley of the Jhelam, whose average width is not more than a few hundred yards. About a mile from Uri, a long rough descent leads down to the Shah Kakuta, which flows in two branches, both of which are bridged. Urambú is about 10 miles from Uri. There is a bungalow, and it may be made the halting place between Uri and Baramúla. A ruined temple is passed on the right hand. Bhaniar is within three miles of Naoshera; near it is another fine ruin. From Bhaniar there is a path lying up the valley to the south, which leads directly to Srinagar over the mountains. Naoshera is a small village; just below it there are two old Sikh forts, one on each bank of the Jhelam; supplies procurable. There are two travellers' bungalows, both on the edge of the river. To the south of the village there is a wide gorge, up which lies a path to Gulmarg; it is a long march and steep ascent.
11	Baramúla	...	9	132	An easy march; near the village of Kechama, 5 miles; the valley opens out into a broad, oval, cultivated plain, surrounded by low well-wooded hills; the path continues straight on towards the low bridge in front, over which lies the Baramúla pass, about 500 feet above the plain, and about 8 miles from Naoshera. The ascent is about a third of a mile long. The road is tolerably smooth and easy, although in some parts narrowed by masses of rocks which rise steeply on each side; the top is covered with grass and jungle. The town of Baramúla is situated on the right bank of the Jhelam, which is crossed by the wooden bridge. Supplies are plentiful, and there is a travellers' bungalow in a square enclosure opposite the town, about 50 yards from the bank to the river. Boats are always procurable at Baramúla, and the journey to Srinagar may be accomplished by water; the passage up the Jhelam occupies about 20 hours.
12	Patan	...	14	146	Country level, open, and marshy; a good road. Patan, a large village at foot of table-land; supplies procurable; water from spring; ample space for encamping.
13	Srinagar	...	17		Leaving Patan, the path, which is smooth, broad, and level, passes the noted ruined temples on the east side of the road, and shortly afterwards the village of Gohilpur at

No. of Marches	Names of Halting Places		Estimated distance in miles: Stage	Total	Remarks
	Marri to				Marri is a convalescent depôt and civil station, distant about 40 miles from Rawal Pindi; the journey may be accomplished by government hill cart or dháli dák.
1	Dewal	...	12		A small village, with an old fort; supplies and water procurable; a good dák bungalow; country hilly and well wooded in parts; road good, descending almost the whole way from Marri. This route is practicable for laden mules throughout.
2	Kohála	...	9	21	A few huts inhabited by boatmen; supplies scarce; water plentiful; a good dák bungalow on the right bank of the Jhelam river, which is crossed by an iron suspension-bridge; there is also a ferry. Country and road as in last stage. By the old road from Kohála, the road lay through Danna 6, Mair 7, Chikar 6, Hatti 10 miles.
3	Chatrkalas	...	11	32	After crossing the suspension bridge over the Jhelam, the road enters Kashmir territory and turns to the north, following the course of the Jhelam throughout; it crosses the shoulders of the hills some distance above the left bank of the river, and is tolerably easy all the way. There is a travellers' bungalow at each stage.
4	Raba	...	12	44	Road as before, except that the ups and downs are somewhat steeper.
5	Tinali	...	12	56	About half way on this stage, the Kishen Ganga joins the right bank of the Jhelam. (From near this point there is said to be a road to Mozafarabad, which crosses the Jhelam by a rope suspension-bridge.) The road now makes a sharp turn to the south-east, following the course of the Jhelam, and the valley becomes narrower. There are some very steep and precipitous places on this march.
6	Ghari	...	10	66	An easy march.
7	Hatti	...	12	78	The valley contracts more, the mountains become higher, and the ups and downs steeper; the old road joins the new about 4 miles from Hatti; thence it is tolerably smooth, and only a little above the level of the river. Hatti is a very small village, high up on the mountain side; supplies procurable. The bungalow is on the right bank of a rocky stream, just as it enters the Jhelam.
8	Chakoti	...	15	93	Road continues along the left bank of the Jhelam, and is undulating, being sometimes nearly on a level with the river; at others many hundred feet above it. It is intersected by numerous small and five considerable streams, which latter flow in deep ravines, usually bridged, though the path leading down to them is rather steep and very rough. With these exceptions the road is tolerably smooth and level. Chakoti is a small village; supplies are scarce; water plentiful.

No	From	To	By
44	Mozafarabad	Marri.	
45	Mozafarabad	Srinagar	Nattishannar Galli and Sopur.
46	Nagdar	Manúr or Baddan Grám.	
47	Nowbúg	Inshin	Margan Pass.
48	Nowbúg	Petgam.	
49	Pampúr	Luddu.	
50	Pampúr	Shar.	
51	Púnch	Kotli	Súna and Nandheri Gallis.
52	Púnch	Marri	
53	Púnch	Uri	Parral.
54	Rajaori	Aliabad Serai	Darhal Pass and Nandan Sar lake.
55	Rajaori	Srinagar	Púnch and the Haji Pir Pass.
56	Rámband	Borkan.	
57	Rámband	Karoti.	
58	Siálkot	Kishtwár	Rámnagar and Badrawár.
59	Siálkot	Kishtwár.	
60	Siálkot	Srinagar	Aknúr and Rajaori.
61	Siálkot	Srinagar	Banihál Pass.
62	Sharidi	Chilás	Kankatori or Sargan River.
63	Shupian	Baramúla	[illegible]ár and Gulmarg.
64	Shupian	Jamú	Gúlabgarh or Kúri Pass.
65	Sonamarg	Gúrais	Krishan Sar and Tilail Valley.
66	Sopúr	Bandipúr	Lalpura and the Loláb Valley.
67	Sopúr	Gulmarg.	
68	Srinagar	Gilgit	Astor.
69	Srinagar	Jhelam	Tosha Maidán.
70	Srinagar	Kishtwár	Marbal Pass.
71	Srinagar	Leh	Drás Road.
72	Srinagar	Maru Wardwan Valley	Hoksar Pass.
73	Srinagar	Púnch	Firozpúr Pass.
74	Srinagar	Siálkot	Shupian, the Búdil Pass and Aknúr.
75	Srinagar	Skardo	Deosai.
76	Srinagar	Skardo	Drás Road.
77	Suedramman	Timmeran.	
78	Tali Lohát	Burawai	Jotári Pass.
79	Tilail Valley	Drás.	
80	Tilail Valley	Valley of the Shingo River.	
81	Tilail Valley	Srinagar	Cangarbal.
82	Titwal	Mozafarabad.	
83	Titwal	Sopúr	Tútmari Galli
84	Trál	Suipúra	Bugmar Road.
85	Tsúrus	Súrphrar	Mar Sar.
86	Vernág	Hanjipúr	Bringin Lannor.
87	Vernág	Nowbúg	Sof and the Bring Valley.

INDEX

TO

ROUTES.

No.	From	To	By
1	Abbottabad	Srinagar	Mozafarabad and Baramúla.
2	Awantipúr	Trál.	
3	Baramgala	Srinagar	Choti Galli Pass and Kachgal River.
4	Baramgala	Srinagar	Choti Galli Pass and Sang Sofed River.
5	Basaoli	Srinagar	Badrawár, Doda, and the Braribal Pass (or by the Nandmarg Pass.)
6	Basman	Súrú.	
7	Bhaniar	Srinagar	Salar Kadhar Pass.
8	Dalhousie	Srinagar	Chamba, Badrawár, and the Braribal Pass.
9	Dardpúra	Suedramman	Hairbal-ki-Galli.
10	Doda	Rámband.	
11	Dúdnial	Sopúr.	
12	Durrol	Battakúnd	Túrgalli Pass.
13	Durrol	Mandri	Bishla Pass.
14	Durrol	Manur	Shikara Pass.
15	Durrol	Palla	Sirsanga Pass.
16	Dworian	Burawai.	
17	Gujrát	Srinagar	Bhimber and the Pir Panjál Pass.
18	Gujrát	Srinagar	Kotli, Púnch, and Baramúla.
19	Gulmarg	Púnch.	
20	Gulmarg	Srinagar	Patan.
21	Gulmarg	Súran	Firozpúr Pass.
22	Gúrais	Astor	Dorus Shingar stream.
23	Gúrais	Bandipúr.	
24	Gúrais	Mozafarabad	Matsil, Sharidi, and the valley of the Kishen Ganga.
25	Gúrais	Sirdari	Valley of the Kishen Ganga.
26	Hanjipúr	Konsa Nág.	
27	Inshin	Achibal	Rial Pawas Galli.
28	Inshin	Saogam	Chúr Nág Pass.
29	Islamabad	Amrnáth.	
30	Jamú	Puthánkot.	
31	Jhelam	Srinagar	Chaomuk and Púnch.
32	Kaozalwan	Astor	Gugai stream.
33	Karen	Shalúra	Puthra Galli.
34	Kishtwár	Lahaul	Chandra Bhága River.
35	Kishtwár	Maru Wardwan Valley	
36	Kishtwár	Nowbúg	Chingám Pass.
37	Konsa Nag	Shupian.	
38	Kotli	Naoshera	Bán Nalla.
39	Kúri	Khágán Valley.	
40	Kurigam	Burawai	Ratti Galli.
41	Mandal	Bhúnja	Bhedri Galli.
42	Mari	Srinagar	Kohála and Baramúla.
43	Mozafarabad	Abbottabad.	



سرینگر.....۱۸۶۱ء

No. of Marches.	Names of Halting Places.	Estimated distance in miles. Stage.	Total.	Remarks.
				the foot of the wudar to west; it then lies across the morass and through the rice-fields to the village of Hansweir, situated on both banks of a considerable stream, which is crossed by a kadal bridge, 2 miles; road then lies along a raised band; just before reaching the village of Singpúr it turns in a northerly direction and crosses the Suknág by a kadal bridge of two spans at the hovel of Haritrat, 4 miles; (road to Shadipúr branches off to north-east), and lies along the right bank of the stream passing the village of Malpúra to south and Deoñi at foot of wudar to north; it then passes the villages of Bailheran, Tsanabal, and Meragúnd on the left bank of the river; the road then lies through the morass between the villages of Larwekpúra to the north and Gundibeshibat south, 9 miles, and on by the village of Zainakút at the foot of the Kashpúr Wudar; road then crosses the Maharáj Nalla by a kadal bridge and approaches the Jhelam, 13 miles, and passes between the Chownie, a garden enclosed by bank and poplar trees, on the north, and the village of Parimpúr to south; another nalla is then crossed by a bridge near the custom house; the road then passes the village of Arampúra to the south-west and further on to east the new village of Bágh Rámpúr and the garden of Nand Sing; the road then passes over the parade ground, and crosses the bridge over the Dúdh Ganga, near the suburb of Batmalu, and passes up the poplar avenue to the Amíri Kadal, which is at the south-east end of the city of Srinagar.
	13 marches : total		163	

This is the easiest of all the roads leading into Kashmír, and as it traverses the valley of the Jhelam throughout, it is practicable at all seasons of the year. [*Roberts—Montgomerie—Ince.*]

کے خیمے کے دروازے پر دُوسری صبح کو پورے اہتمام کے ساتھ دو بھیڑیں، دو مرغے، خورد و نوش کی تقریباً چودہ چیزیں، جن میں چاول آٹا، میوے، چینی اور شہد وغیرہ شامل تھیں، پہنچادی گئی تھیں۔ سری نگر میں انگریزوں کے لئے ایک الگ قبرستان رکھا گیا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ہر انگریز میت کے کفن کے لئے ایک قیمتی شال نذر کرتا ہے۔

محفل رقص اور عشائیہ:

۳ر جولائی کی شام کو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُپنے درباریوں، اعلیٰ افسروں اور انگریز سیاحوں کے اعزاز میں ایک محفل رقص اور عشائیہ کا اہتمام کروایا۔ مسٹر نایٹ نے اس محفل اور عشائیہ کا پورا حال لکھا ہے۔ مہاراجہ کے محل کے آنگن میں ساٹھ سپاہیوں اور چھ افسروں نے مہمانوں کے اعزاز میں گارڈ آف آنر پیش کیا۔ دیوان نے سواگت کیا، دریا کے ذرا اُوپر ایک کھلے چبوترے پر مہاراجہ چند انگریز افسروں کے ساتھ بیٹھا تھا، تقریباً بیس نوجوان رقاصائیں نیم دائرہ بنا کر دوسری طرف بیٹھی تھیں۔ مہاراجہ کے پیچھے فوجی رجمنٹوں کے کرنل اور زرق و برق پوشاک میں ملبوس مقامی معزز شخصیتیں بیٹھی تھیں، اکثر شخصیات کے سروں پر چمک دمک والی بڑی پگڑیاں تھیں، وہ سب شاید سکھ درباری تھے۔ داڑھیوں اور مُڑی مروڑی مونچھوں کی وجہ سے وہ بارعب اور شاندار دِکھتے تھے۔ رقاصائیں قوس قزح کے مانند مختلف رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس تھیں، ان کے عقب میں سفید خلعت در بر کئے ہوئے موسیقار تھے اور وہ صرف اشارے کے منتظر لگتے تھے۔ رقص و موسیقی شروع ہوگئی، ایسا پروگرام میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، دو دو لڑکیاں باہر آئیں، وہ اس طرح رقصاں ہوگئیں کہ مہندی لگائے

سرُخ ہتھیلیاں اور پاؤں کے نازک تلوے مہمانوں کو دِکھانے لگیں، کچھ رقاصائیں بہت حسین تھیں۔ رقاصاؤں کے سروں پر سنہری رنگ کی ٹوپیاں تھیں اور ٹوپیوں کے ساتھ گول خوب صورت زیور لٹک رہے تھے، سب جالی اور لہنگے پہنی تھیں، رقص کے دوران اُن کے سفید پاجامے صاف دکھائی دیتے تھے۔ نیچے سے پاجامے پاؤں کے ساتھ باندھے تھے اور اُن پر گھنگرو بھی۔ گھنگرو رقص کے لئے بہت ضروری سامان بھی ہے اور رقاصہ کا زیور بھی۔ کاندھوں کے ارد گرد بہت بڑا سکارف ڈال کر رقاصائیں ناچتی رہتی ہیں، لیکن رقص مکمل کر کے وہ غیر پسندیدہ طریقے پر تھم جاتی ہیں، فوراً دوسری جوڑی نمودار ہوجاتی ہے۔ سازندوں کے مکھیا کے آمادہ کرنے پر ایک عورت نے ہم کو فرانس کے قومی نغمے کے کچھ بول فرانسیسی زبان میں سُنا کر بہت محظوظ کیا، سازندروں کا مُکھیا مضطرب دِکھتا تھا۔ اس موقعے پر مہاراجہ کا آٹھ سال کی عمر کا بیٹا بھی موجود تھا۔ رقص کا لطف اُٹھانے کے بعد ضیافت خانے کا دروازہ کھولدیا گیا اور سب لوگ مہاراجہ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگئے، لوگ انگریزی طرز کی دعوت کھانے لگے تو میزبان باہر چلا گیا۔ طرح طرح کی انگریزی ضیافتیں کھانے کے بعد مہمان جانے لگے تو رنبیر سنگھ رقاصاؤں کے جھرمٹ میں پھر نمودار ہوگیا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر مہمانوں نے دیکھا کہ نئے، عمدہ اور اچھے جوتوں کے بدلے بوسیدہ، خستہ اور خراب جوتے رکھے ہوئے تھے۔ جوتے بدلنے یا چوری ہوجانے کا یہ کام کبھی کبھی بن ٹھن کے رہنے والے معزز لوگ بھی کرتے ہیں۔

سرینگر کے بارے میں:

مسٹر نایٹ نے لکھا ہے کہ سری نگر سے مراد ہے ''سورج کا شہر''۔ کہ واقعی

غلام نبی آتش

نائیٹ کا سفر نامۂ کشمیر و تبت

ڈیڑھ سال تک ہندوستان کے گرم و خشک میدانی علاقوں کی سخت گرمی میں کام کرنے کی وجہ سے اور ۵۸-۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی بغاوت کے نتیجے میں انگریز فوج کا ایک آفیسر مسٹر نائیٹ (Knight) تھکن اور اُکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ ۱۸۶۰ء میں اُس نے ایک اور انگریز فوجی آفیسر کے ساتھ مشورہ کر کے کشمیر، تبت اور لداخ کی سیر پر جانے کا منصوبہ بنایا۔ راجو نام کا ایک کشمیری ہندو خدمتگار اُن کا یار و مددگار تھا۔ وہ مہم جوئی میں بڑا تجربہ رکھتا تھا، کئی خامیوں کے باوجود وہ ہمیشہ ایک قابلِ بھروسہ شخص تھا۔ تمباکو نوشی اُس کی زندگی کا ایک ناقابلِ تنسیخ مشغلہ تھا، ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ حقہ گرما کر لمبے لمبے کش لگاتا رہتا تھا۔ مسٹر نائیٹ نے راجو کو انتظامات کی تمام ذمہ داری سونپ دی اور کوارٹر ماسٹر جنرل جیسا لقب دے کر وسیع اختیارات عطا کئے۔ عرضی دے کر دونوں فوجی افسروں نے چھ مہینوں کی رخصت حاصل کی۔ کان پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے، جہاں وہ تعینات تھے، ۲۱ مئی ۱۸۶۰ء کو بیل گاڑی میں بیٹھ کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جھنڈ در جھنڈ نفرت انگیز مکھیوں کے حملے، گرد و غبار کی دم گھٹا دینے والی ہواؤں، سڑک کی صعوبتیں اور شدت کی گرمی برداشت کرتے ہوئے وہ

لوگ ۲۵ مئی کو دلی اور ۲۹ مئی کو دِلّی سے شملہ پہنچ گئے۔ پنجاب کے گرم اور گرد آلود میدانی علاقوں سے ہوتے ہوئے وہ لاہور اور لاہور سے ۱۳ جون ۱۸۶۰ء کو مہاراجہ کشمیر رنبیر سنگھ کے علاقے کی حدود میں داخل ہو کر بھمبر میں پڑاؤ ڈالدیا، بھمبر سے قدیم مغل روڈ کے مختلف پڑاؤ طے کر کے سری نگر پہنچ گئے، ۲۷ اگست تک وادیٔ کشمیر میں اہم مقامات دیکھ کر تبت کی طرف روانہ ہو گئے۔ اِس سفر میں پیش آمدہ واقعات، مشکلات اور تجربات و مشاہدات کو مسٹر نائیٹ نے سپردِ قلم کیا ہے۔ ڈائری لکھنے کا طرز اپنا کر اس مہم جو نے روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ اس تحریروں کو یکجا کر کے یہ نام دیا:

"Diary of a Pedestrain in Cashmere and Thibet"

ہندوستان میں نوکری مکمل کر کے وہ لندن چلا گیا۔ جنت نظیر کشمیر اور پُراسرار تبت و لداخ کے بارے میں مشاہدات کو کتابی صورت میں شائع کروادیا، لیکن یہ کتاب لندن میں کب شائع ہوئی اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا، تاہم کتاب کا سرنامہ لندن میں جون ۱۸۶۳ء کو تحریر کیا گیا ہے، شائع شدہ اس کتابی صورت میں ان مشاہدات کا نام 'کشمیر اینڈ تبت' رکھا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ کتاب، جسے ڈائری کہئے یا سفرنامہ، پہلی مرتبہ ۱۹۸۴ء میں "متل پبلی کیشنز، تری نگر، دلی ۱۱۰۰۳۵" نامی ایک شائع کار ادارے نے شائع کی ہے۔ کتاب میں ۴۵ نادر قلمی تصاویر بھی ہیں۔

کشمیر میں نائیٹ کا ڈیڑھ مہینہ:

مسٹر نائیٹ نے کشمیر میں بعض خاص تواریخی اہمیت کے مقامات، یادگار عمارتیں، مغل باغات، شکارگاہیں، فرودگاہیں اور برف پوش پہاڑی چوٹیاں دیکھ

کراس جنت نظر قطعہٗ ارض کی بے تعصبانہ تعریفیں کی ہیں۔ اُس نے جو چیز، جو جگہ، جو عمارت یا جو عبادت گاہ دیکھی، اس کی قدامت، تاریخی پس منظر اور سیاحتی اہمیت پر خوب غور کیا ہے۔ تاہم وہ کئی مقامات کے کشمیری ناموں کے تلفظ میں، کشمیری زبان سے ناواقفیت کے سبب، غلطیاں کر گیا ہے۔ وہ ایک کامیاب شکاری بھی تھا اور انسان دوست افسر بھی، اُس نے کسی بھی جگہ کشمیریوں کی تضحیک نہیں کی ہے، مزدوروں اور نوکروں کے ساتھ اُسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ البتہ ایک کوتوال کی رشوت خوری اور دھوکہ دہی سے ایک بار اُسے رنج ہوا تھا۔

بھمبر سے سری نگر:

بھمبر پہنچ کر نایٹ اور اس کے ساتھی ایک شاندار بالا دری میں ٹھہرے، بالا دری سے مُراد وہ آرام دہ، دِلکش اور کُشادہ مکان ہے (جیسا کہ نایٹ نے لکھا ہے) جہاں سے حُسنِ فطرت کا بہ خوبی نظارہ کیا جا سکے۔ بھمبر میں موجود اِس بالا دری کے بارہ دروازے تھے۔ وہ باہر چار پائیوں پر لیٹنے لگے تو مکھیوں اور مچھروں نے نئے شکار پا کر حملہ شروع کر دیا، پھر بھی نایٹ نے لکھا ہے کہ یہاں پہنچ کر انہیں سفر کی صعوبتوں سے چھٹکارا مل گیا۔ شام کو نایٹ اور اس کے ساتھی نے مہاراجہ کشمیر کے فوج کی ایک چھوٹی ٹکڑی کا معاینہ کیا۔ ٹکڑی میں آٹھ سپاہی شامل تھے، ان سپاہیوں نے صبح سویرے، جبکہ نایٹ اور اس کے تمام ساتھی ابھی محوِ خواب تھے، منافقانہ جھوٹی نرمی ساتھ ہتھیاروں کی نمائش کر کے ان کو حیران اور خوف زدہ کیا تھا، حالانکہ سلامی دینے کا یہ موقعہ تھا نہ طریقہ۔ بہر حال شام کو جب وہ سپاہی کھانا پکانے میں مصروف تھے، نایٹ اور اس کے ساتھیوں نے پوری طرح اُن کے اسلحہ کو دیکھا۔ گولہ بارود اُن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اُن کے

پاس توڑے دار بندوقیں تھیں، ہر ایک سپاہی کے پاس ایک تلوار اور ایک سپر تھی۔ سارا جنگی سامان ناموزون اور بے ڈھول تھا۔ انگریز فوجیوں کے مقابلے میں بندوقیں بھر دینے کا ایک برتر طریقہ مہاراجہ کے اِن سپاہیوں نے اپنا لیا ہے۔ سپاہیوں کی اس ٹکڑی کا معاینہ کرنے کے بعد اُن کو "بخشائش" دی گئی۔ مسٹر نایٹ اور اس کا ساتھی وہاں سے جانے لگے تو گاؤں میں تعینات تھانیدار ایک اسپِ شب ریز پر سوار ہو کر اُن کی طرف آ گیا، قریب آ کر وہ سواری سے نیچے اُتر کر انکساری کے ساتھ سلام کرنے لگا، وہ ایک سکہ احترام کے طور پر دینے لگا جو اُسے واپس کر دیا گیا اور اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ دیا۔ تھانیدار اصل میں مہاراجہ نے انگریز سیاحوں کے استقبال کے لئے تعینات کیا تھا۔ بھمبر سے مسٹر نایٹ، اُس کا ساتھی آفیسر اور قلیوں کا کارواں علی آباد سرائے پہنچ گیا۔ اِس سرائے کے بارے میں نایٹ نے لکھا ہے کہ یہ ایک قدیم بُرباد شدہ جگہ ہے جہاں مٹی کا ایک فلیٹ بنا ہوا ہے یہاں ایک اور بار مہاراجہ کی ایک فوجی ٹکڑی نے انگریز سیاحوں کو سلامی پیش کی۔ یہ فوجی سُرخ اور زرد پگڑیاں باندھے تھے اور دھاری دار نیلے رنگ کے پاجامے پہن کر دِلکش لگتے تھے۔ راستے کے انتہائی مشکل نشیب و فراز طے کرتے ہوئے انگریز سیاح نوشہرہ پہنچ گئے۔ وہاں باہو باولی والے باغ میں موجود ایک بارہ دری واقعی دَم گھٹا دینے والی تھی کیونکہ زبردست گھنے درختوں کے درمیان یہ بے ہنگم بالا دری گویا قیدی بنا دی گئی تھی۔ یہاں پرندوں کے بے شمار جھنڈوں نے شور شرابا بپا کر کے سیاحوں کی نیند میں شام کو بھی اور مُنہ اندھیرے۔ میں بھی خلل ڈالا، یہاں ایک سادہ ننگ دھڑنگ باغبان نے نایٹ کو بتایا کہ مہاراجہ کے کاشتکار فی کس سالانہ پانچ ایکڑ زمین

کیلئے سات روپے ادا کرتے ہیں۔ کوتوال اور دوسرے حکام جو مہاراجہ نے انگریز سیاحوں کے لئے رسدات اور قلی دستیاب رکھنے کے لئے یہاں تعینات کئے تھے، اڑیل ٹٹوؤں کی طرح ''بخشش'' مانگنے پر بہ ضد رہے، حتیٰ کہ کوتوال بیچارے قلیوں کا استحصال کرکے فی کس ایک ایک آنہ وصول کرتا تھا۔

عبرت ناک سزا:

نوشہرہ سے چنگس جاتے ہوئے نایٹ اور اس کے تمام ہمسفروں نے ایک آدمی کو زنجیروں میں جکڑ کر دہشت ناک طریقے سے ایک درخت پر لٹکا ہوا پایا۔ اُس کے پاؤں بھیڑیوں اور گیدڑوں نے پھاڑ کھائے تھے، اُس کے جسم کا اُوپری حصہ سالم تھا اور ہوا میں ادھر اُدھر ہچکولے کھا رہا تھا۔ پوچھ تاچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شخص مہاراجہ کی فوج کا ایک سپاہی تھا، اِس نے کسی وجہ سے اپنے ساتھی سپاہی کو دریا میں پھینک کر مار ڈالا تھا۔ اُسے اس لئے ایسی سزا دی گئی تھی کہ ملک کے تمام مجرموں کو عبرت حاصل ہو جائے، مگر اس ملک میں انصاف کرنے کا یہ طریقہ ایک ناخوشگوار عمل ہے۔ یہاں سے قریب چالیس سیاحوں کا قافلہ میوہ دار درختوں کے باغات سے ہوتے ہوئے چنگس پہنچ گیا۔ چنگس میں ایک پہاڑی پر ایک پُرشکوہ سرائے میں ٹھہر کر وہ لوگ مطمئن ہو گئے، سرائے کے بیچ میں انہوں نے ایک شاندار مندر کی باقیات بھی دیکھیں۔

قافلہ راجوری میں:

راجوری میں سیاحوں کا یہ قافلہ ایک قدیم سرائے میں قیام پذیر ہو گیا۔ سرائے ایک خستہ حال باغ کے وسط میں تھی اور وہاں فواروں کی باقیات صاف دِکھائی دیتی تھی۔ نایٹ نے لکھا ہے کہ ''راجوری'' یا ''رام پور'' ایک پُرشکوہ اور

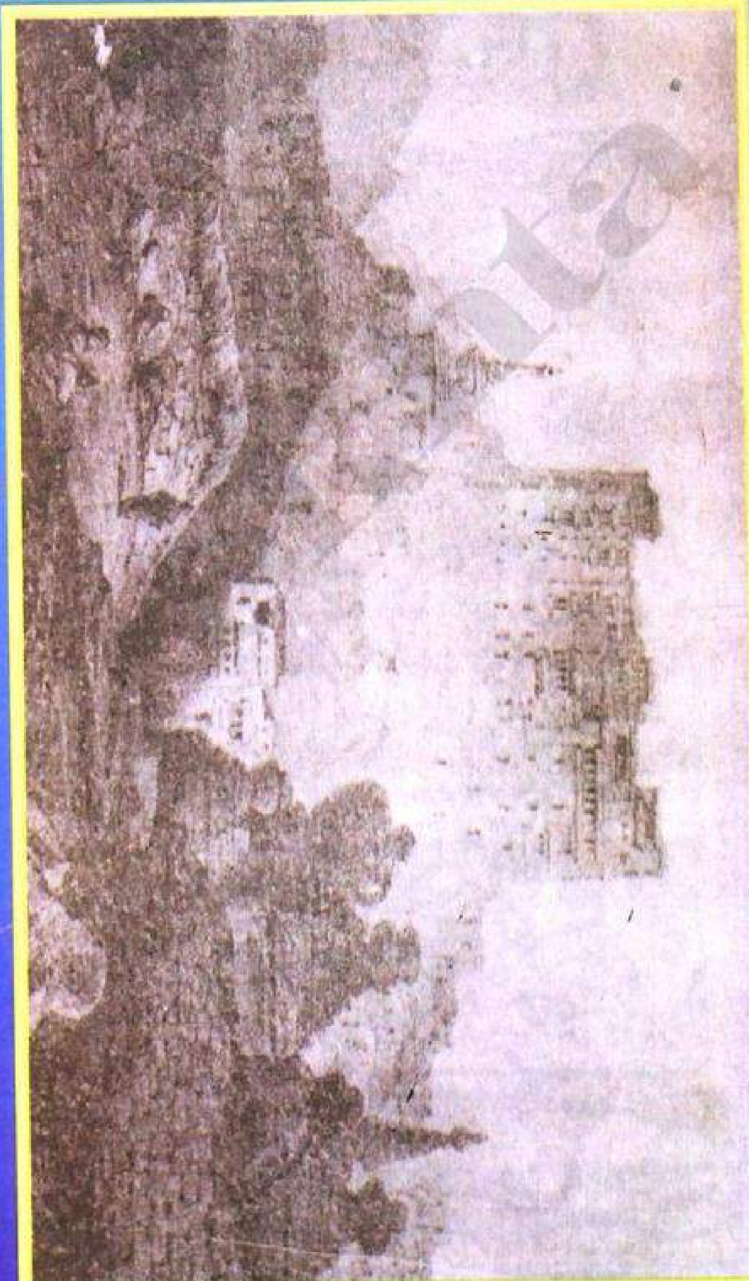
دِلکش قصبہ ہے، چونکہ سرائے قصبے سے ذرا اُونچائی پر واقع تھی اس لئے سیاحوں کے اِس قافلے نے قصبے کے لوگوں کے رہن سہن، وضع قطع، عادات اور رسموں وغیرہ کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بچے اور عورتیں تاتاریوں جیسا لباس پہنے تھے۔ عورتوں کے سر پر سرخ ٹڑ کی مربع ٹوپیاں تھیں، ٹوپیوں کے کونے قدرے مُڑے ہوئے تھے، ٹوپیوں کے اُوپر سے چوڑی پٹی پیچھے کی طرف آویزاں تھی۔ بعض خواتین خاکستری رنگ کی دھوتی پہنے تھیں جو قریب قریب پاؤں تک لمبی تھیں اور کچھ عورتیں نیلے رنگ کے دُھاری دار پاجامے پہنے ہوئے تھیں۔ چھوٹی لڑکیاں آرائش کی زیادہ چیزیں نہیں پہنتی تھیں۔ جوان عورتوں کی گردنوں کے گرد تین کونوں والا تعویذ تھا۔ نوجوان عورتیں تمام مصنوعی زیبائش کو تحقیر کی نظر سے دیکھتی ہیں، یہی حال نوجوان مَردوں کا ہے۔ راجوری میں نایٹ اور قافلہ کے دیگر افراد نے دُور دُور تک محنت کش کسانوں کو کیچڑ میں ہل چلاتے ہوئے دیکھا۔

آگے کا سفر:

قافلہ ۱۸ جون کو تھنہ پہنچ گیا جہاں تقریباً ایک سولنگوروں کے ایک جھنڈ کو درختوں پر گھومتا پھرتا، شور مچاتا، لکڑیاں توڑتا اور لڑتا جھگڑتا دیکھ کر مسٹر نایٹ حیراں رہ گیا، حیرانی اور شادمانی کا احساس لئے قافلہ بہرام گلہ سے ہوتے ہوئے پشیانہ چلا گیا۔ تھنہ میں اکثر لوگ ایسے تھے جن کی گردنوں کے آگے بڑے بڑے جھنگے آویزاں تھے۔ پانچ روز تک پشیانہ اور اس کے گردونواح میں شکار کھیلنے کے بعد مسٹر نایٹ کا قافلہ ۲۸ جون کو ہیرہ پورہ اور ۲۹ جون کو شوپیان پہنچ گیا، پہلی جولائی کو قافلہ سرینگر میں داخل ہو گیا، جہاں بابو اور منشی نے سکھوں کا



تبت کے گمپوں میں صدیوں سے محفوظ مخطوطات کے ایک صفحے کا عکس



قلعۂ لداخ اور لداخی گمپا...... قلمی تصاویر

استقبال کیا۔ مسٹر نایٹ نے لکھا ہے کہ پریڈ گراؤنڈ میں انہوں نے تقریباً چار سو کشمیریوں کا اژدھام دیکھا جو بھاری تھیلے تھامے ہوئے تھے اور گلگت جانے کے لئے تیار تھے۔ اصل میں گلگت نامی جگہ تک مہاراجہ کی فوج کے لئے رسدات لے جانے کے لئے ان لوگوں کو بزور لایا گیا تھا، اس لئے افراتفری کا ماحول تھا۔ مہاراجہ کی فوج دور پہاڑی قبیلوں کے ساتھ متنازعہ معاملات کو سلجھانے کے لئے گلگت میں فوج رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فوج وہاں جنگ میں مصروف ہے، مگر کسی کو حقیقت معلوم نہیں۔

فوجی پریڈ کا مشاہدہ:

مسٹر نایٹ اور اس کے ساتھی کو سرینگر کے پریڈ گراؤنڈ میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی فوج کی ایک دلچسپ تقریب دیکھنے کا موقعہ ملا۔ سپاہی قطاروں میں تھے۔ چار قطاروں نے گویا زمین پر انسانی دیواروں کی مدد سے ایک مربع تشکیل دیا تھا۔ مہاراجہ کے خیال میں سپاہی انگریز فوجیوں کا لباس پہنے ہوئے تھے مگر انگریزوں کی خاص فوجی وردی اور کشمیری سپاہیوں کے لباس میں خاص مماثلت نہیں تھی۔ ہر ایک کشمیری سپاہی کے سر پر پگڑی تھی۔ رسالہ فوج کے دستے ٹٹوؤں اور خچروں پر سوار تھے۔ اُن کے پاجامے سفید تھے اور پاجاموں پر چمڑے کی تنگ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کسی سپاہی کے پاؤں میں بوٹ، کسی کے سلیپر اور چند ایک کے پاؤں میں موٹے جوتے تھے جبکہ بہت سے سپاہی ننگے پاؤں تھے۔ کچھ سپاہیوں کے پاجامے گھٹنوں تک تھے، کچھ سپاہیوں نے عجیب وغریب فیتے باندھ کر آویزاں کر رکھے تھے۔ تمام سپاہیوں کے چہروں سے سستی اور کاہلت ٹپک رہی تھی۔ اسی اثنا میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تیز رفتار اور شاندار عرب نسل کے

گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لایا۔ وہ عبا پہنے ہوئے تھے جس پر سبز اور سنہری رنگ کی سوزن کاری کی گئی تھی، سر پر پگڑی اور پاؤں میں ریشمی پتلون نما پاجامہ پہن کر وہ اسٹیج پر بیٹھ گیا۔ اپنے باپ کی طرح ملبوس ہاتھ میں چھوٹی تلوار تھامے، چھوٹا مہاراجہ بھی نمودار ہو گیا، پریڈ شروع ہوگئی مگر یہ اس قدر نامعقول اور بے سرو پا تھی کہ ایسی تقریب جس شان وشوکت اور قدر ومنزلت کا مطالبہ کرتی تھی، وہ دیکھنے کو نہیں ملی، چھ انچ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سپاہیوں نے مارچ پاسٹ شروع کیا۔ بونے اور موٹے آفیسر پوری کوشش کر رہے تھے کہ اُن کے سلیپر لائین آف مارچ سے باہر نہ جائیں۔ وہ تلواریں اُوپر اُٹھا کر بے دلی اور سستی کے ساتھ سلامی دے رہے تھے۔ رسالہ فوج کی دو رجمنٹوں اور توپ خانے والی رجمنٹ کے علاوہ پیدل فوج کی پانچ رجمنٹیں بھی پریڈ میں شامل تھیں۔ کل دو ہزار سپاہی تھے۔ اس کے بعد بے قاعدہ فوج کی باری آئی، افسروں اور سپاہیوں میں کسی کی وردی کسی دوسرے کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتی تھی، ہر ایک سپاہی لمبی بندوق کاندھے پر لٹکائے پھر رہا تھا، خنجر بھی تھے، دقیانوسی بندوقیں بھی تھیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی عمر تقریباً ۳۸ سال لگتی تھی، وہ نمونے کا خوبصورت شخص تھا، اس کی داڑھی کالی تھی، اس کی مونچھیں مُنہ کے کونوں سے اُوپر کی طرف مُڑ کر تقریباً آنکھوں تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ فکرمند نظر آ رہا تھا، شاید خزانہ عامرہ کی کمزور مالی حالت کا خیال اُسے پریشان کر رہا تھا، انگریز سیاح کشمیر آ کر کافی پیسہ خرچ کر کے ملک کی آمدنی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، اس وجہ سے وہ انگریز سیاحوں کی دلچسپی اور دلجوئی کے لئے دعوتوں کا اہتمام کرتا تھا، نوجوان رقاصاؤں کی محفلیں منعقد کرواتا تھا اور اُن کی آمد پر انہیں نذرانے بھیجواتا تھا۔ مسٹر نایٹ

مشرق کا وینس ہے۔ یہاں دریا کے دونوں کناروں پر انبوہ در انبوہ لکڑی کے مکانات کھڑے ہیں، مکانوں کی چھتیں ڈھلوان ہیں۔ یہاں قدیم و جدید مندر بھی ہیں اور مسجدیں بھی۔ ایک مندر کے باہر دو گندے فقیر تھے، دونوں برہنہ تھے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ قلعۂ ہاری پربت اور ڈل کی سیر کے دوران نایٹ نے جیل خانہ بھی دیکھا، اُس میں کل ۱۱۰ قیدی تھے جو اُوکھلی اور موسل سے دھان کوٹنے کے صبر آزما کام پر لگے ہوئے تھے۔ شالمار باغ واقعی دیکھنے کی چیز ہے، باغ کے سات طبقے ہیں، تقریباً دو سو فوارے چھک چھک کر رہے ہیں، سری نگر میں کچھ شاندار عمارتوں کی باقیات موجود ہیں۔ پاندریٹھن میں ایک شاندار مندر موجود ہے، پری محل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ پریوں نے تعمیر کیا تھا، اصل میں یہ ایک پہاڑی قلعے کی باقیات ہیں۔ سرینگر کے گلی کوچے تنگ اور غلیظ ہیں، شہر میں داخل ہوتے ہی مہاراجہ کے محل کے پاس دریا کے بائیں کنارے نہایت ہی غلیظ بازار ہے جہاں سستے اور نقلی زیور اور تیزی سے ہلنے والی بندوقیں بیچی جاتی ہیں۔ سیف اللہ بابو سری نگر کا بڑا شال مرچنٹ ہے، سری نگر میں اچھے شال بُنے جاتے ہیں جن کی قیمت تین سو سے ایک ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ سیف اللہ غیر ملکی سکوں کے بدلے مقامی سکے بھی دیتا تھا۔ سری نگر میں زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، شال بھی بُنے جاتے ہیں، پیپر ماشی کا کام بھی کیا جاتا ہے، تاہم یہاں کے کاری گر پیپر ماشی کے کام میں بہت پیچھے لگتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں کو سات جگہوں پر لکڑی کے پلوں کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ ڈل کی سیر بہت دل کش ہے، دریائی ٹرانسپورٹ پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے، ہاؤس بوٹ اور شکارے دریا اور ڈل کے پانیوں پر ہر وقت تیرتے رہتے

ہیں۔ قدیم مزار میں پتھروں پر مرنے والوں کے نام اور بسم اللہ الرحمن الرحیم، یا اللہ، یا محمدؐ کندہ ہے، کہیں کہیں سنگ ہائے مزار پر لاالٰہ الا اللہ بھی کھدوا گیا ہے۔

چند صحت افزا مقامات کی سیر:

نایٹ ۱۳ جولائی کو اسلام آباد کی طرف چل پڑا، اسلام آباد کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ مقام مسلمانوں کا مسکن ہے، یہاں اُس نے کوتوال کے ذریعے قرآن مجید کا اچھا نسخہ دستیاب کروانے کی کوشش کی۔ اُس نے کئی نسخے بہم کئے اور یقین دلایا کہ وہ اصلی اور خاص تھے مگر سب صرف عربی میں تھے اور کوئی ترجمہ شدہ نسخہ نہیں ملا۔ مسٹر نایٹ نے لکھا ہے کہ میں حیران اور شادماں ہو گیا جب کوتوال نے ایک نسخے سے رقت آمیز، لمبی اور نازک آواز میں ایک پیرا یہ پڑھا، وہ ہر لفظ پر اُنگلی رکھتا جاتا تھا، وہ اپنے علم و فضل سے سامع کو اچنبھے میں ڈال رہا تھا کہ اچانک آواز کی گونج کو کم کر دیا۔ اسلام آباد کو قرار گاہ بنا کر نایٹ نے مٹن (بھوَن) اچھابل اور ویری ناگ کی سیر کی۔ اِن جگہوں کی خوبصورتی کے علاوہ اُس نے اُن کے بارے میں ہندوؤں کے قدیم عقائد کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اچھابل اور ویری ناگ کے تذکرے میں مغلوں کے ذوق جمال اور فن تعمیر کی تعریفیں کی ہیں۔ مشہورِ عالم مارتنڈ مندر دیکھ کر نایٹ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسلام آباد میں نایٹ نے شالبافوں اور قالین بافوں کو کام کرتے دیکھا۔ اسلام آباد سے واپسی پر اَونتی پورہ کے کھنڈرات بھی دیکھے۔ اُس نے جھیل وُلر کی سیر کا حال بھی ذرا تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وادی میں کئی جگہوں پر مکھیوں اور مچھروں کے

حملوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

پھل، پھول اور درخت:

نایٹ نے لکھا ہے کہ کشمیر میں متعدد اقسام کے پھل، پھول، دَرخت اور حیوانات پائے جاتے ہیں، توت، انجیر، کشمش، آڑو، شفتالو، سیب، خوبانی اور اخروٹ بکثرت ملتے ہیں۔ جنگلوں میں طرح طرح کے دَرخت ہیں اور میدانی علاقوں میں بھی کئی دَرخت پائے جاتے ہیں، چیڑ، دیودار، سفیدہ، اخروٹ، بید وغیرہ۔ جنگلوں میں اَن گنت خودرو پھول ملتے ہیں۔

تبتِ خورد[1] اور لدخ کا سفر:

۲۷ر جولائی ۱۸۶۰ء کو مسٹر نایٹ اُپنے ساتھیوں سمیت کرگل اور لاماؤں کے دیس لداخ کی اور سونہ مرگ کے راستے چل پڑا۔ کنزر سے سونہ مرگ اور سونہ مرگ سے قافلہ پاں دراس پہنچ گیا جہاں کے لوگ سیاحوں کے دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر آگئے۔ چھوٹے قد کے یہ لوگ لمبے اُونی کوٹ اور بھیڑوں کی کھالیں پہن کر تاتاری جیسے لگتے تھے، اُن کی کمر کے گرد دھاری دار اُونی پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ پاں دراس سے دراس جاتے ہوئے اُن کو رسیوں کا عجیب پل پار کرنا پڑا۔ درختوں کی چھال اور چھوٹی نرم ٹہنیوں سے بٹی ہوئی رسیوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ دونوں طرف پہاڑی میں بڑے بڑے درزدار پتھروں کے ساتھ باندھ کر یہ پل بنایا گیا تھا، کوئی کم ہمت آدمی ایسا پل دیکھ کر اور اس کے ذریعے دریا پار کرنے سے قطعی انکار کرسکتا تھا، ویسے یہ ایک دلچسپ چیز تھی، لوگ اپنا سامان پیٹھ پر باندھ کر ڈولتے، ہلتے، ہلاتے اور لطف اٹھاتے ہوئے اِس پل

۱۔ تبتِ خورد علاقہ کرگل اور تبتِ کلاں لداخ کو کہا جاتا ہے۔

کے ذریعے دریا پار کر لیتے تھے۔ یہاں کچھ چپٹی ناک والے چھوٹے قد کے آدمی، جو بھاری بھرکم دِکھتے تھے، گایوں اور گدھوں پر نمک لادے کشمیر کی طرف جاتے ہوئے مسٹر نایٹ سے ملے، وہ لوگ چینی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھے اور سرکارِ کشمیر نے اِس کام پر لگائے تھے۔ دراس سے چنگن جاتے ہوئے اس قافلے نے ایک حیرت انگیز حقّہ دیکھا، یہ حقہ راہ گیروں کے لئے بنایا گیا تھا۔ ایک درخت کے تنے میں بڑا چھید کرکے ایک بڑا گول سوراخ بنایا گیا تھا، سوراخ میں تھپتھپا کر مٹھی بھر کیچڑ داخل کردی گئی تھی، اُوپر اور نیچے دو چھوٹی چھڑیاں کیچڑ کے اَندر رکھ دی گئی تھیں، سوراخ میں تمباکو رکھنے اور اُس پر آگ ڈالنے کی پوری گنجائش تھی، لوگ آتے، تمباکو بھرتے اور اُس پر آگ رکھ کر کش لگا کر چلے جاتے تھے۔ چنگن سے ہُنداس اور ہُنداس سے پشکون پہنچتے پہنچتے قافلے میں شامل لوگ اپنے آپ کو عجیب وغریب ملک میں محسوس کرنے لگے۔ مسٹر نایٹ نے کرگل کے بارے میں کوئی قابلِ توجہ بات نہیں لکھی ہے بلکہ صرف کرگل میں موجود ایک قلعے کے پاس ایک بار ناشتہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

تبتِ خورد کی عورتیں:

مَردوں کی طرح عورتیں صفائی پسند نہیں ہیں۔ یہ عورتیں بھیڑوں اور بکریوں کے چمڑے کے چوغے اپنے کندھوں کے اُوپر سے لٹکا کر پہنتی ہیں۔ بٹے اور چٹیا کئے سر کے بالوں کی لمبی زنجیریں مثلِ دُم کے پرانے طرز کی چھوٹی گھنٹیاں بندھی رسیوں کی طرح لٹکانا اُن کی آرائش کا خاص حصّہ ہے۔ بالوں سے بٹی یہ رُسیاں ایڑیوں تک آویزاں رہتی ہیں اور رسیوں کو آخر پر ایک لچھے میں باندھ دیا جاتا ہے۔ لچھے میں فیروزہ پیوست ہوتا ہے۔ نایٹ نے ایک عورت

سے بالوں کی آرائش کے اِس مخصوص طریقے کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی تو وہ فوراً ہوا ہوگئی، اصل میں غیر ملکی خاص کر انگریز کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اپنی آرائش کو چھپا لیتی ہیں۔ تبّتی عورتیں خوب محنت مشقّت کرتی ہیں، تاہم یہاں ایک عجیب رواج ہے کہ ایک عورت کی شادی ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ رچائی جاتی ہے، بڑے بھائی کی بیوی سب چھوٹے بڑے بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے، اس عمل کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ نایٹ نے لکھا ہے کہ تبّتی لوگ قطعاً ضروری نہیں سمجھتے ہیں کہ ایک عورت کے لئے ایک خاوند ہونا چاہئے۔

آگے کا سفر:

قافلہ چنگن سے ہُنداس، ہُنداس سے پُشکلوم اور یہاں سے لزوم جاتے ہوئے شرگول پہنچ گیا۔ شرگول میں بودھ گونپا کا بغور مشاہدہ کیا، اس گونپا کے بارے میں نایِٹ نے تفصیلات درج کی ہیں۔ شرگول سے نکلتے وقت ایک چٹان کے بڑے بڑے سوراخوں میں بودھ گونپاؤں کی اِکا دُکا باقیات ملیں، چٹان کے دامن میں مٹی کے بنے مکانوں کے بوسیدہ کھنڈرارت بھی تھے، آگے اُونچے ستونوں پر چھوٹے چھوٹے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نایٹ کو بتایا گیا کہ آج سے بیس سال قبل (یعنی ۱۸۶۰ء سے پہلے) مہاراجہ گلاب سنگھ نے ایک حملے کے دوران یہ تباہی مچائی تھی، گلاب سنگھ معلوم ہوا تھا کہ بودھ خانقاہوں اور گونپاؤں میں' بلکہ اُن کی بنیادوں میں بے شُمار دولت چھپی ہوئی ہے اور لاما بہت دولت مند ہوگئے ہیں، مہاراجہ دیہ دولت حاصل کرنے کا خیال ہوا، دولت حاصل کرنے کے لئے اور لاماؤں کا غرور توڑنے کے لئے اُس نے حملہ کردیا تھا۔ اس حملے میں سینکڑوں بودھ قتل کئے گئے تھے۔ لداخ میں بھی سانکو اور تیسرو

کے اِرد گرد دُور دُور تک گلاب سنگھ کے حملے کے اُثرات موجود تھے، مکانات کھنڈروں میں تبدیل کئے گئے تھے، قلعے گرد کے ڈھیر بن گئے تھے، بعد میں زبیر سنگھ نے ایک نیا قلعہ بنوایا تھا۔ شرگول سے مُلوی، مُلوی سے ہوتے ہوئے کھربُو سے قافلہ لمیرو پہنچ گیا۔ لمیرو پہنچنے کے لئے قافلے کو فوتیلا نامی سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع درّے میں سے گزرنا پڑا۔ یہاں بھی ایک عجیب و غریب گونپے میں بیس لاماؤں سے ملے، انہوں نے "جو جو" کہہ کر قافلے کا سواگت کیا۔ نہ صرف یہ بودھ مونسٹری Monastery بلکہ سارا گاؤں چٹان پر بسا ہوا تھا۔ کلچی نامی گاؤں، جہاں صرف پندرہ گھر تھے، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں کی اوٹ میں آباد تھا، لوگ پورے تبت خورد کے لوگوں کی طرح سادہ مگر زندہ دل تھے۔ کلچی سے نُریلا، سسپول، بزگو اور انگیمو ہوتے ہوئے ریتلے میدانوں کو پار کرکے ۱۴ راگست کو قافلہ لداخ پہنچ گیا۔ تبت خورد کی راجدھانی لہاسہ کے بارے میں بھی نایٹ نے خاص تفصیلات درج نہیں کی ہیں، تاہم لکھا ہے کہ لہاسہ بودھ دھرم کا مرکز ہے، یہاں سے بودھ خانقاہوں اور گونپاؤں کی تعمیر کے لئے ساز و سامان اور لوازمات بھیجے جاتے ہیں۔

سونے کے ذرّوں کی تلاش:

مسٹر نایٹ نے لکھا ہے کہ میں کرُونامی گاؤں میں پانچ آدمیوں پر مشتمل ایک پارٹی سے ملا۔ یہ لوگ لکڑی کے اوزار ساتھ لئے برفانی علاقوں کی طرف جارہے تھے، اُن کی پیٹھ پر اناج کے تھیلے بھی تھے، اصل میں وہ سونے کے زرات کی تلاش میں نکلے تھے۔ پانی میں سونے کے زرّات ملے ہوتے ہیں، کچھ زرات ریت اور کنکروں کے ساتھ گھُل جاتے ہیں۔ یہ لوگ ریت، کنکر اور پانی

کو چھلنی میں ڈال کر چھان لیتے ہیں اور سونے کے زرّے اُلگ کر لیتے ہیں، یہ بہت صبر آزما کام ہے۔ سونے کے زرّوں کی تلاش میں نکلے ہوئے اِن لوگوں نے بتایا کہ اس کام سے اُن کو کچھ زیادہ آمدنی نہیں ملتی، دن بھر کام کر کے کچھ آنے ہی ملتے ہیں۔

تبتیوں کا مذہب:

مسٹر نایٹ نے کشمیر اور تبت خورد ولداخ میں پانے جانے والے مذاہب کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ اِن مذاہب کی پُوری جانکاری حاصل کرنے کے لئے اُس نے کافی کوشش کی تھی۔ ہندومت، بودھ مت اور اِسلام کے متعلق جزیات سمیت لکھتے وقت اُسے انگریز سیاحوں کے سفرنامے، جو اُس کی سیاحت کشمیر وتبت سے پہلے لکھے جا چکے تھے، زیرِ نظر رہے ہیں۔ اُس نے مسلمانوں، بودھ راہبوں اور ہندوؤں کے عقائد اور اُن کی عبادت گاہوں کی پوری طرح واقفیت حاصل کی تھی۔ اُس نے لکھا ہے کہ تبت خورد میں بودھ بھی ہیں اور مسلمان بھی، بودھ لداخ میں بھی ہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ سب علاقے بودھ مت کے مراکز ہیں، ہندومت کی طرح بودھ مت بھی بہت قدیم مذہب ہے۔ بودھ مت کے ماننے والے برما، سیلون، چین، تبت اور روس وغیرہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ گوتم یا شاکیہ منی، بودھ مذہب کا بانی، ساتویں صدی قبل مسیح میں[1] بنگال میں پیدا ہوا تھا۔ بودھ مت کے مطابق انسان کا عظیم مقصد نِروان حاصل کرنا ہے، اُسے تمام دنیاوی معاملات اور عیش وعشرت سے کنارہ کشی کرنی چاہئے۔ ہندوؤں کی طرح بار بار جنم لینے کا عقیدہ بودھوں میں

[1] نہ معلوم نایٹ نے بنگال کیوں لکھا ہے جبکہ گوتم بدھ گیا میں پیدا ہوا تھا۔

بھی پایا جاتا ہے۔ دنیا میں کئے جانے والے اعمال کی نوعیت پر اِنسان کو آخری انجام تک پہنچایا جائے گا، رُوحوں کے تناسخ کا عمل تب تک جاری رہے گا جب نیک اعمال کر کے آدمی فنائے کامل حاصل کر کے نِروان یعنی اَبدی آنند حاصل نہ کرے۔ یہ اعلیٰ ترین مقام پانے کے لئے مقررہ اُصولوں اور ربط وضبط کی پابندی کرنے اور مہاتما بدھ کی زندگی اور اُس کے اعمال کو پوری طرح نمونۂ عمل بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ایسا نہ کیا جائے تو نروان نہیں ملے گا۔ ایسا دِکھتا ہے کہ تبتیوں نے اُپنے بنیادی مذہبی نظام میں کچھ نئی چیزیں داخل کی ہیں۔ پھر بھی ساکیہ مُنی ہی کی تعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے۔ لہاسہ میں رہنے والے دلائی لامہ کو ساکیہ مُنی کا زندہ نمونہ مانا جاتا ہے۔ اُسے اعلیٰ ترین مذہبی رہنما مانا جاتا ہے جس کے ذریعے غلطیوں کے ارتکاب کا امکان نہیں ہے۔ نایٹ نے لکھا ہے کہ کوئی شخص برہمن نہیں بن سکتا اگر وہ ہندو کے گھر میں پیدا نہ ہوا ہو مگر کوئی بھی شخص لاما بن سکتا ہے جو بودھ دھرم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے اہل ہو۔ بودھ دُھرم کے پیشواؤں اور لاماؤں کے لئے آٹھ چیزیں لازمی قرار دی گئی ہیں، تین چیزیں لباس کے معاملات سے جُڑی ہیں، ان کے علاوہ لنگوٹی باندھنے کے لئے کمر بند، خیرات جمع کرنے کے لئے ایک برتن، پانی چھاننے کے لئے مخصوص چھلنی، سر منڈوانے کے لئے اُسترا، لباس میں حسبِ ضرورت مرمت کے لئے ایک عدد سوئی، پانی چھاننے کی چھلنی سب سے زیادہ اہم مانی جاتی ہے۔ اگر کوئی لاما بودھ ایسا پانی جس میں کیڑے ہوں پی جائے اُس کو پیشوائی سے فوراً بے دخل کیا جاتا ہے۔ ایسے اُستھاپن جن میں ساکیہ مُنی اور عظیم بودھ لاماؤں و پیشواؤں کے باقیات اور دیگر تبرکات محفوظ رکھے جاتے ہیں،

تبت اور لداخ میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اِن تبرکات میں برتن، زیورات، صندوقچے، مقدس پتھر، دھات کے ٹکڑے، سونے اور چاندی کی چیزیں، ہڈیوں کے ٹکڑے، چھوٹے جواہرات، سنہرے بٹن، مالائیں، مٹی کے مقدس ڈھیلے، منقش پتھر جن پر تصویریں کنندہ ہیں، حیوانوں کے دانت اور کپڑے وغیرہ شامل ہیں۔ بودھ مت کی اصل کو جاننے کے لئے بڑی تعداد میں اُن کی مذہبی کتب کا مطالعہ کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ کئی کتابوں میں متضاد خیالات بھی ہیں۔ مبادیات میں اِس قدر تبدیلی لائی گئی ہے کہ مختلف ملکوں کے بودھ باشندے ایک دوسرے سے مختلف سسٹم اپناتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مذہب عدم تشدد، جانداروں کے تحفظ، لوگوں کے اور نیکی، گناہوں سے پرہیز اور گناہوں پر پچھتاوا کر کے دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ، معاف کرنا اور معافی مانگنا نیز ظلم و جبر سے پرہیز کی تعلیم دیتا ہے۔

تبتِ خورد اور لداخ میں جگہ جگہ بودھ خانقاہیں اور وہار ہیں۔ شرگول میں نایٹ نے گنبد والی عمارتوں کا ایک سلسلہ دیکھا تھا، عمارتیں رنگین مٹی سے پوری طرح لیپ لی گئی تھیں، اندر آنے جانے کیلئے ہر طرف دروازے تھے، دیواروں پر خوبصورت تصویریں بنائی گئی تھیں، ایک چٹان میں دلچسپ وہار بنایا گیا تھا۔ اُس نے ملوی Moulwe میں ایک بڑی چٹان کے ایک طرف ایک عمارت دیکھی تھی، اُس پر چار بازوؤں والی ایک تصویر تراش لی گئی تھی، تصویر کے اُوپر ایک چھتری تراش لی گئی تھی، یہ تصویر تقریباً ۱۸ فٹ اُونچی تھی، اُس کے گھٹنوں تک کا حصّہ چٹان کی بنیاد میں عقب کی طرف سے گویا چھپایا گیا تھا۔ اِس تصویر کے قریب بے شمار چھوٹے بڑے پتھر اکٹھا کئے گئے تھے، سب پتھروں پر تحریرات دو

مختلف رسم الخطوں میں کنندہ کی گئی تھیں، ایک رسم الخط دیوناگری یا سنسکرت سے مشابہت رکھتا تھا۔ مسٹر نایٹ نے لکھا ہے کہ ایسے پتھروں کا انبار دیکھ کر اُس کا جی للچایا، اُس نے چھوٹا پتھر اُٹھا کر اپنی جیب میں چھپالیا۔ وہ لوگ ایسے پتھروں میں سے پتھر اُٹھا کر اُن میں کمی کرنے کو بڑا پاپ سمجھتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ ایسے پتھروں میں نئے نئے پتھر جمع کر کے انبار میں اضافہ کر دیں گے، وہ اجر پائیں گے۔ نایٹ کو بتایا گیا کہ آخر پر ایک خاص فرشتہ اِن یادگاری مقدس پتھروں کا معاینہ کرنے کے لئے یہاں سے گزرے گا، فرشتہ اُن تمام لوگوں کی فہرست تیار کرے گا جنہوں نے پتھروں کے انبار میں مزید پتھر ڈال کر اضافہ کیا ہوگا، اُن کو انعام سے نوازا جائے گا اور جو لوگ پتھروں کی تعداد میں کمی کرنے کے مرتکب پائے جائیں گے اُن کو سزا ملے گی۔ نایٹ نے اِس فرشتے کا نام Khurjidal لکھا ہے، یہ بات سُن کر اُسے جیب کا پتھر یاد آیا لیکن یہ سوچ کر کہ اس معاملے کو فرشتے پر ہی چھوڑ دینا چاہئے پتھر کو جیب میں ہی رہنے دیا۔ ہندوؤں کے فقیروں کی طرح لاما بھی لوگوں کی خیرات پر گذر بسر کرتے ہیں' وہ اپنے آپ کو مذہب کیلئے وقف کرتے ہیں' عمر بھر شادی نہیں کرتے' غصہ نہیں کرتے اور دنیاوی خواہشات سے مُبرا ہوتے ہیں۔ بزگو نامی جگہ سے اُلکیمو جاتے ہوئے نایٹ اور اُسکے ساتھیوں کو ایک صحرا میں سے سفر کرنا پڑا' جس میں ریت تھی اور پتھر تھے، صحرا کے بیچ میں مقدس پتھروں کی ایک دیوار دیکھنے کو ملی' اُس میں موجود پتھروں پر بھی تحریریں کندہ تھیں مگر عجیب طریقے سے۔ بودھوں کے مذہبی پیشوا اکثر ان الفاظ کا جاپ کرتے رہتے ہیں: ''اُم مانی پانی Um 'Mani Pani'' اور عام طور پر مقدس پتھروں پر یہی الفاظ

لکھے گئے ہیں۔ دریافت کرنے پر نایٹ کو بتایا گیا کہ اس کا مطلب ہے "The Supreme Being"

<u>نایٹ لداخ میں:</u>

بیس روز تک سفر کرتے ہوئے قافلہ لداخ پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی کاردار نے نذرانے کے طور پر ایک بھیڑ بھجوادیا، جسے قبول کیا گیا۔ لداخ ایک جاذبِ نظر قصبہ ہے تاہم کمرشل اہمیت کے اعتبار سے زیادہ قابلِ توجہ نہیں لگتا۔ یہ قصبہ چٹانوں کے کنگروں پر ایک عجیب ترتیب میں بسا ہوا ہے۔ قصبے کے باہر قریبی پہاڑوں میں متعدد عظیم یادگاری عمارتیں ہیں، جس خطۂ زمین پر یہ عجیب وغریب عمارات ہیں، اُس کو ''مُردوں کا شہر'' کہا جا سکتا ہے۔ ان عمارات میں زندہ لوگوں کی آبادی مُردوں کی تعداد سے بہت کم ہے۔ یہ عمارتیں جدید زمانے کی نہیں لگتی ہیں تاہم آثار سے لگتا ہے کہ ماضی قریب میں مُردوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ جلے ہوئے بال اور ہڈیوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ مقبروں کے طرز کی عمارتیں بڑی مقدس مانی جاتی ہیں۔ اِن کے نیچے مرنے والے لاماؤں کی ہڈیاں اور راکھ وغیرہ رکھ دی جاتی ہے، اس کے ساتھ فیروزہ جیسے جواہرات، روپیہ اور پشمینہ وغیرہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ ہر خاندان میں سے ایک لڑکے کو مذہب کے لئے وقف کیا جاتا ہے اور وہاروں اور گونپاؤں میں اُسے پوری طرح لامابنا دیا جاتا ہے، کسی خاندان میں اگر لڑکا نہ ہو تو لڑکی کو وقف کر دیا جاتا ہے، جو راہبہ کہلاتی ہے۔ وہ لاما کی طرح عمر بھر شادی نہیں کرتی، تاہم وہ کھیتوں میں کام کرتی ہے، ایک راہبہ مسٹر نایٹ کے قلیوں میں بھی شامل تھی، وہ مرد قلیوں کے مقابلے میں اپنا بوجھ اُن سے بہت پہلے کیمپ پر پہنچا دیتی تھی۔

لداخ کا بازار بہت چھوٹا ہے، جہاں آوارہ کُتے اور بے اُصول، بے کار لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس گندے بازار میں تجارتی مال بہت کم ہے، وہاں کشمیری، چینی، تاتاری، بنگالی اور ہندوستانی لوگ دیکھنے کو ملے مگر اکثر بے کاری میں وقت ضائع کر رہے تھے۔

۱۶/ اگست کو لداخ کے قصبے سے نکل کر دریائے سندھ پار کر کے نایٹ کا قافلہ ہیمس کی طرف جانے لگا۔ قصبے کے باہر مقدس پتھروں کا ایک اور اُنبار دیکھنے کو ملا، اُن پر بھی تحریریں کندہ تھیں۔ پتھروں کا یہ اُنبار ایک میل کے چوتھے حصے کی لمبائی پر پھیلا ہوا تھا، تقریباً اس میں تیس ہزار پتھر تھے۔ دریا کے دائیں کنارے دلکش گاؤں نظر آ رہے تھے جو عام طور پر چٹانوں پر آباد تھے اور مقبرہ نما مذہبی عمارتوں سے گھرے ہوئے تھے، اور جہاں کے پتھروں پر ''اُم مانی پانی'' کندہ تھا۔ قافلے نے رات چنگا نامی گاؤں میں گزاری اور صبح ہیمس کی طرف سفر شروع کیا۔

ہیمس پہاڑوں میں واقع ہے، یہاں تنگ گھاٹی میں، جہاں بودھ گونپے واقع ہیں، اندر جانے کا راستہ پوری طرح ''اُم مانی پانی'' والے پتھروں سے گھرا ہوا ہے، دیواروں میں بھی ایسے پتھر لگائے گئے ہیں۔ کچھ دیواروں میں اِنسانی کھوپڑیاں پیوست کر دی گئی ہیں۔ گونپے گھاٹی کے اندر ایک نہایت خوبصورت وادی میں ہیں، یہاں گھنے درخت ہیں۔ بنیادی طور پر ہیمس کی یہ مونسٹری Monastery چٹان کے چہرے پر اِستادہ کر دی گئی ہے، جو کہ وادی کے اندر موجود ہے۔ اس کا ٹاور ایک ہوادار قلعے کے ٹاور جیسا ہے، آرائشی شمع دان بھی لگے ہوئے ہیں۔ چھ لاماؤں نے نایٹ کو مختلف گانپاؤں میں موجود مورتیاں

دکھائیں، پہلے یہاں دوسو لامار ہتے تھے مگر اُن کی تعداد گھٹ کر صرف سولہ رہ گئی ہے۔اِس ساری مونسٹری میں اُن کے پاس تین لاکھ روپے مالیت تھی، مگر نایٹ نے لکھا ہے کہ معاینے کے دَوران اتنی بڑی رقم کے آثار کم ہی دکھتے تھے۔ کچھ Divinities یعنی بھگوان کی مورتیاں اور ٹھوس تصویریں تختیوں پر بٹھائی ہوئی تھیں۔اِن کو سنہرے کپڑے پہنائے گئے تھے، کئی مورتیوں کے پاس چاندی کے برتن تھے، جو کہ اُونچے بانسوں پر رکھ دیئے گئے تھے، یہ برتن گھی اور بدبُودار مکھن سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ نایٹ نے چار گونپوں کا بغور معاینہ کیا، جہاں چینی مورتیاں بٹھائی گئی تھیں، جن کے سامنے اَناج، آٹا، چاول اور گھی وغیرہ چینی مٹی کے خوبصورت قیمتی برتنوں میں رکھا ہوا تھا۔ اَندرونی چھتوں اور دیواروں پر چینی طرز کے خوبصورت طومار آویزاں تھے، تنگ لباس میں ملبوس اور تنگ آنکھوں والی عورتوں کی تصویروں کے علاوہ مَردوں کی تصویریں بھی دیواروں پر دیکھنے کو ملتی تھیں۔ کچھ طومار اِس طرح سجائے گئے تھے کہ اُن کی تعریف کرنے میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔ ایک اور عجیب چیز Praying Wheel تھی، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ڈرم، جو ہر طرف سے چمڑے میں بندھے تھے، جس کے بیچ میں تکلی کی طرح چرخی لگی تھی اور معمولی حرکت سے گھومنے لگتا تھا، یہ Praying Wheel بھی ''ام مانی پانی'' کے مقدس الفاظ سے سجائے ہوئے تھے۔ یہ بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی۔

پانچ روز تک لگاتار لداخ کے سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں شکار کھیلنے کے بعد مسٹر نایٹ ۲۱/اگست کو واپس سری نگر کی طرف نکلتا ہے۔ واپسی پر سسپول کے قریب اس قافلے نے ایک زیرِ تعمیر وہار دیکھا' اُس پر شد ومد سے کام جاری تھا۔

رقص اور پولو:

نایٹ نے لکھا ہے کہ واپسی پر پشکوم میں شور وغل اور دُھوم دَھام دیکھنے کو ملا، کیونکہ وہاں کاردار ہمارے سواگت کے لئے آیا تھا، کرگل کا تھانیدار بھی اُس کے ساتھ تھا، پہلے یہاں راجہ ہوا کرتا تھا، لیکن گلاب سنگھ نے اُسے صرف وزیر بنادیا۔اَب اُسے کاردار کہتے ہیں۔ اُسے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہاں نایٹ نے ایک دلچسپ رقص دیکھا، مقامی لوگ جمع ہوگئے تھے، کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے اور کچھ صرف اُپنے کولہوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام اپنی پوری آواز نکالتے ہوئے تالیاں بجارہے تھے۔ چھ یا سات فنکاروں کا جتھا بانسریاں اور طنبورہ بجا کر شیرین ساز پیدا کرتے جاتے تھے۔ ایک درجن عورتیں اُپنے بازو ہلاتی ہوئی، کبھی بدن کو ڈھیلا کرتی، کبھی بے قاعدگی کے ساتھ ناچتی اور کبھی متین اَنداز میں فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ سب کی سب نہایت دلکش لباس پہن کر اِس جشن کو زیادہ ہی جاذبِ نظر بنارہی تھیں۔ اُن کی پوشاک واقعی اُس رقص کے شایانِ شان تھی۔ سب رقاصاؤں کے سروں پر ٹوپیاں تھیں، ترکی ٹوپیاں، چھوٹی اور تنگ ٹوپیاں، کھلی اور ڈھیل ڈھال والی ٹوپیاں، اُن ٹوپیوں پر چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیورات لٹک رہے تھے۔ کچھ پر نیلے رنگ کے چھوٹے جواہرات بھی لگے تھے، اُن کے ماتھوں پر زیورات کے جھومر آویزاں تھے، کپڑے ایک سخت ٹکڑے پر سرخ منکے جڑے ہوئے تھے اور یہ کپڑا ہر ایک رقاصہ کی گردن کی گدی پر لٹک رہا تھا۔ عنبر اور چھوٹے چھوٹے جواہرات کے علاوہ بھیڑ کے چمڑے کی چادر بھی اوڑھی ہوئی تھی، یہ رقص نایٹ کو بہت پسند آیا تھا، اُس نے اس کی پوری تفصیلات درج کی ہیں۔ ویسے تو لداخ اور تبتِ خورد میں ایسے رقص بڑی تعداد میں

دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پولو یہاں کا مقبول کھیل ہے۔ نایٹ نے اسی پشلوم نامی جگہ ایک پولو میچ دیکھا جس میں پچاس یا ساٹھ گھوڑ سوار شامل ہوئے تھے، کھیل کے اختتام تک ایک بھی کھلاڑی گھوڑے سے نہیں گرا اور نہ کسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔

نایٹ اور اُس کا قافلہ دَراس، پاندراس اور سونہ مرگ کے راستے سری نگر واپس نہیں آیا بلکہ وہ کئی روز تک وادیٔ واڑون میں چلتا رہا، آخر اِس وادی کے سِرے پر ایک گاؤں میں پہنچ گیا، مڑوہ، دچھن سے ہوتے ہوئے نو بوگ، کوکر ناگ اور اچھابل سے ۱۵ ستمبر کو اسلام آباد پہنچ گیا۔ واڑون سے نو بوگ آتے ہوئے اُن کا باورچی راستہ بھول کر تین دن تک غائب رہا، بڑی مشکل سے بازیافت ہو کر قافلے میں شامل ہو گیا اور نایٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔

لداخ اور تبت خورد کی پیداوار:

ان علاقوں میں اگرچہ وافر مقدار میں غلہ پیدا نہیں ہوتا تاہم خوبانی بکثرت ملتی ہے۔ یہاں گندم، جَو اور کچھ بیش قیمت جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اِکا دُکا سیب بھی پیدا ہوتے ہیں، شلجم، مولی اور مٹر وغیرہ جیسی سبزیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، شہد خوب ملتا ہے۔ یہ چیزیں مختلف خطّوں میں پیدا ہوتی ہیں، کہیں ایک چیز اور کہیں دوسری۔ واڑون میں گنہ ہار اور ترومبہ نام کی دو اہم فصلیں اُگتی ہیں، گنہ ہار کے دانے چیونٹیوں کے انڈوں جیسے ہوتے ہیں۔

سری نگر سے واپسی:

قافلہ تیس ستمبر کو سری نگر پہنچ گیا، پہلی اکتوبر بعد دوپہر دریائی راستے سے بارہ مولہ کا رُخ کیا۔ نایٹ نے سری نگر میں کانگڑی دیکھ لی تو اُس کی بناوٹ، استعمال اور فائدے کے بارے میں بھی لکھا۔ بارہ مولہ، نوشہرہ، اُوڑی، چکوٹی،

بٹیاں، مری، راولپنڈی، گوجرانوالا سے جاتے ہوئے لاہور پہنچ گیا۔ ۲۱ اکتوبر کو انگریز سیاح لاہور سے اُمرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔

متفرقہ:

نایٹ نے کشمیر جانے والے تمام ممکنہ راستوں پر سفر کیا، وہ بھمبر شوپیان راستے سے، جو مغل روڈ کے نام سے مشہور ہے، کشمیر میں داخل ہو گیا، سونہ مرگ پاں دراس والے راستے سے کرگل و لداخ چلا گیا، لداخ سے وادیٔ واڑون سے ہوتے ہوئے واڑون نو بوگ جاتے ہوئے نو بوگ اسلام آباد راستے سے واپس سری نگر چلا آیا، سری نگر مظفر آباد راستے سے واپس چلا گیا۔ اُس نے ان راستوں پر واقع مقامات کی مسافت بھی درج کی ہے، مثلاً:

(ا) مغل روڈ:

مقام	پڑاؤ	مسافت
گجرات	بھمبر	۲۷ میل
سرائے سیدآباد	نوشہرہ	۱۱ میل
چنگس	راجوری	۱۲ میل
تھنہ	بہرام گلہ	۱۱ میل
پیر پنچال	علی آباد	۲۰ میل
ہیرہ پورہ	شوپیان	۶ میل
راموہ	سرینگر	۱۴ میل

مقام	پڑاؤ	مسافت
بھمبر	سرائے سیدآباد	۱۲ میل
نوشہرہ	چنگس	۱۱ میل
راجوری	تھنہ	۱۲ میل
پوشیانہ	پیر پنچال	۹ میل
علی آباد	ہیرہ پورہ	۱۳ میل
شوپیان	راموہ	۹ میل

(ب) لداخ کا راستہ

مقام	پڑاؤ	مسافت	مقام	پڑاؤ	مسافت
سری نگر	گاندربل	آبی راستے سے	گاندربل	کنزور	۱۱ میل
کنزور	گنڈ ایشر سنگھ	۱۲ میل	گنڈ ایشر سنگھ	سونہ مرگ	۱۴ میل
سونہ مرگ	پہاڑ کے دامن تک	۹ میل	پہاڑی دامن	پاں دراس	۲۴ میل
پاں دراس	دراس	۸ میل	دراس	ٹسگام	۱۴ میل
ٹسگام	پُشکوم	۱۰ میل	پُشکوم	واقا	۱۳ میل
واقا	کھربُو	۱۰ میل	کھربُو	لامیرو	۱۲ میل
لامیرو	نرولا	۱۶ میل	نرولا	سسپول	۱۴ میل
سسپول	اِکنیمو	۱۰ میل	اِکنیمو	لداخ	۱۸ میل
لداخ	چُنگا	۱۸ میل	چُنگا	ہیمس	۲ میل

(ج) لداخ سے وادئ وارڈون، نوبوگ اسلام آباد:

مقام	پڑاؤ	مسافت	مقام	پڑاؤ	مسافت
ہیمس	لداخ	۲۰ میل	لداخ	پتوک	۴ میل
پتوک	اِکنیمو	۱۴ میل	اِکنیمو	سسپول	۱۰ میل
سسپول	نرولا	۱۴ میل	نرولا	لامیرو	۱۶ میل
لامیرو	کھربُو	۱۲ میل	کھربو	واقا	۱۰ میل
واقا	پشکوم	۱۳ میل	پشکوم	تھامبس	۱۴ میل
تھامبس	سانکو	۱۶ میل	سانکو	سورو	۱۲ میل
سُورو	پہاڑوں تک	۱۱ میل	پہاڑوں سے	ڈتو	۱۴ میل

ڈتو	شکنیز	۱۱ میل	شکنیز	براگنن	۱۴ میل
براگنن	پیر	۱۶ میل	پیر	نوبوگ	۹ میل
نوبوگ	ککرناگ	۱۰ میل	ککرناگ	اچھابل	۸ میل
اَچھابل	اسلام آباد	۶ میل	اسلام آباد	سرینگر	آبی راستے سے

(د) سرینگر مظفر آباد راستہ:

مقام	پڑاؤ	مسافت	مقام	پڑاؤ	مسافت
سرینگر	بارہمولہ	آبی راستے سے	بارہمولہ	نوشہرہ	۸ میل
نوشہرہ	اوڑی	۱۵ میل	اوڑی	چکوٹی	۱۵ میل
چکوٹی	ہٹیاں	۱۴ میل	ہٹیاں	چوکار	۹ میل
چوکار	مہرہ	۶ میل	مہرہ	ڈنا	۶ میل
ڈنا	پُٹن	۶ میل	پُٹن	دیول	۹ میل
دیول	مُری	۱۱ میل	مُری	راولپنڈی	۳۷ میل
راولپنڈی	گوجر خان	۳۰ میل	گوجر خان	جہلم	۳۷ میل
جہلم	گجرات	۳۱ میل	گجرات	گجرانوالا	۳۰ میل
گجرانوالا	لاہور	۳۹ میل			

-•-

کانپور سے کشمیر اور کشمیر سے واپسی سفر کے دوران مسٹر نایٹ نے تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت طے کی، اِس سفر میں اکثر دشوار گذار راستوں پر چلنا پڑا، ایک بار وہ ایک خطرناک پہاڑی چٹان سے گرتے گرتے معجزاتی طور بچ گیا، ایک دفعہ گھوڑے سے گرتے وقت لٹک گیا اور ساتھیوں نے مشکل سے بچایا۔ اُس نے اپنی کتاب میں کشمیر کے مشہور مندروں جیسے مارتنڈ، پاندریٹھن اور تختِ

سلیمان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، لیکن کیپٹن اے۔ کننگھم کے ایک مضمون سے ان مندروں کے بارے میں تفصیلات حاصل کر کے الگ باب میں درج کئے ہیں۔ اِسی طرح ایم کلاپروتھ (M.Klaprothe) کا ایک مضمون بھی درج کیا ہے، جس کا نام "The Mystic Sentence of Tibet" ہے۔ اس میں Om Ma Ni Pad Me Houm بودھ منتر کی وضاحت کی گئی ہے۔ مذہبِ اسلام کے بارے میں بھی نایٹ نے لکھا ہے، کشمیر کے علاوہ اِس مذہب کے ماننے والے تبت خورد میں بھی ہیں۔ آخر پر کشمیر کی تواریخ کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

............☆............

ایاز رسول نازکی

فریڈرک ڈِرو اور
''جموں اینڈ کشمیر ٹیریٹریز''

فریڈرک ڈرو نے ۱۸۶۲ عیسوی میں برطانوی جیالوجیکل سروے کو خیر باد کہہ کر جموں دربار کی ملازمت اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈوگرہ راج قائم کرنے والے مہاراجہ گلاب سنگھ کا سورگباش ہوئے پانچ سال گذر گئے تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ گدی پر براجمان تھا۔ فریڈرک ڈرو کئی برس تک ارضیات سے متعلق چھان بین، بالخصوص معدنیات کی کھوج میں مصروف رہے۔ اپنے کام کے سلسلے میں انہیں مہاراجہ کی قلمرو کے طول وعرض میں جانے کا موقعہ ملا۔ کچھ عرصے کے بعد جنگلات کی دیکھ رکھ بھی اُن کے ذمے کر دی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے لداخ کے گورنر کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ وہیں سے وہ مہاراجہ کی ملازمت میں کل دس سال گذارنے کے بعد سبکدوش ہوئے اور واپس انگلستان چلے گئے۔

جموں وکشمیر میں اپنے قیام کے دوران وہ پہلی بار ۱۸۶۲ عیسوی میں دراس، کرگل اور شورو گئے۔ دوسری بار وہ ۱۸۶۹ء، تیسری بار ۷۳-۱۸۷۲ عیسوی میں

☆-E.5- باہو اپارٹمنٹس - پانامہ چوک، جموں۔

لداخ میں رہے۔ انہوں نے ۱۸۶۳عیسوی میں بلتستان کا پہلا اور ۱۸۷۰عیسوی میں وہاں کا دوسرا دورہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے ۱۸۷۰عیسوی میں ہی استور اور گلگت کے علاقے دیکھے۔ ریاست جموں وکشمیر کے باقی ماندہ علاقہ جات میں وہ بار بار آتے جاتے رہے اور اپنے مشاہدات اور حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر انہوں نے ۱۸۷۵عیسوی میں ''دی جموں اینڈ کشمیر ٹیریٹریز'' کے عنوان سے اپنی شہرۂ آفاق کتاب شائع کی۔ زیرِ نظر جلد ''کوسموس پبلی کیشنز نئی دہلی'' کی طرف سے پہلے ہندوستانی چھاپ کی حیثیت سے ۱۹۷۶عیسوی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کل ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے متن کے ساتھ کئی تصاویر (فوٹوگراف) اور کئی خاکے دیئے گئے ہیں۔ اِن کی مجموعی تعداد ۳۵ ہے۔ کتاب کا متن ۲۲/ابواب میں منقسم ہے۔ ۷ ضمیمے کتاب کے آخر میں موجود ہیں۔ پانچ نقشے (Maps) بھی کتاب کی زینت ہیں۔

پہلے باب تعارف کے عنوان سے فریڈرک ڈرو جموں وکشمیر ریاست کی سیاسی حیثیت کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان علاقہ جات کے جغرافیائی خدوخال اور یہاں آباد قومیتوں کی نسلی شناخت کے بارے میں اپنے مشاہدات پر مبنی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی شخصیت سے متعلق کئی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ فریڈرک ڈرو کے جموں میں وارد ہونے سے صرف پانچ سال قبل مہاراجہ گلاب سنگھ کا سورگباش ہوا تھا، اس لئے اُن کے بارے میں جو بھی جانکاریاں فریڈرک کی ملی ہیں وہ اگرچہ اُن کی اپنی ذاتی شہادت پر مبنی نہیں مگر اُن لوگوں کے عینی مشاہدے کی مرہونِ منت ضرور ہیں جنہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کئی

واقعات وحالات کا بچشم خود ملاحظہ کیا تھا۔ فریڈرک ڈرو نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو حتی الامکان طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہتا تھا اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے سازشوں اور سیاسی جوڑ توڑ پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔ اُس کا پہلا اور آخری مقصد اپنے اقتدار کی بقاء اور حصولِ زر تھا۔ اُس کی ذات کا سب سے منفی پہلو یہ تھا کہ وہ اچھا برا کوئی بھی حربہ استعمال کرنا جائز سمجھتا تھا اور بسا اوقات وہ اپنے مقاصد کے حصول میں ظلم وجبر سے بھی کام لیتا تھا۔ وہ اپنے ذاتی مالی مفادات کو اپنی رعایا کی خوشحالی پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ وہ اپنی رعایا سے ملنے اور اُن کی شکایات سننے اور اُن کا سدباب کرنے سے نہیں کتراتا تھا۔ کوئی بھی شخص ایک روپے کے نذرانے کے عوض مہاراجہ سے مل کر اپنی فریاد گوش گذار کر سکتا تھا اور جمِ غفیر میں بھی ایسا کرنا ممکن تھا، ہاتھ اوپر اُٹھائے اور اس میں ایک روپے کا سکہ دکھاتے ہوئے فریادی آواز دیتا تھا ''مہاراج......عرض ہے'' اور سکہ لے کر فریادی کی فریاد سنتا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے مہاراجہ کا دھیان ایک روپے کے سکے کی طرف کھینچ کر اپنی مٹھی سختی سے بند کی اور مہاراجہ کی مسلسل کوشش کے باوجود مٹھی نہیں کھولی اور کہا ''پہلے میری فریاد سن لو، پھر مٹھی کھولوں گا''۔ مہاراجہ نے بڑے صبر کے ساتھ فریادی کی پوری داستان سن لی اور جب وہ اپنی داستان کہہ چکا تو روپے کا سکہ اُس کی مٹھی سے لے کر متعلقہ احکامات صادر کیے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کی شخصیت سے قطع نظر فریڈرک ڈرو نے ایک اور دلچسپ معاملے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا انگریزوں کا مہاراجہ گلاب سنگھ کے ساتھ بیعہ نامہ امرتسر طے پانا اور اس طرح جموں وکشمیر ریاست کے تمام

معاملات اور حقوق گلاب سنگھ کو تفویض کرنا واقعی ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا؟۔ کیونکہ بنیادی طور پر یہ معاہدہ انگریزوں کا سکھ حکومت کو الگ تھلگ کرنے اور لاہور دربار کے تئیں گلاب سنگھ کی فرمانبرداری اور وفاداری کو ختم کروانے کی سازش کا حصہ تھا۔ کیا انگریزوں کو اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا ۱۸۴۶عیسوی میں بیعہ نامہ امرتسر پر دستخط ہو جانے کے صرف تین سال بعد ۱۸۴۹عیسوی میں لاہور دربار اور سکھ حکومت کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ شاید نہیں، اور اسی لئے انہوں نے اُپنے اقتدارِ اعلیٰ میں ایک اور شریک کی ساجھے داری قبول کی تھی۔ دوسری طرف یہ بات بھی دُرست ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے بعدازاں انگریزوں کے تئیں اُپنی وفاداری کا بیّن ثبوت دیا اور ۱۸۵۷عیسوی میں پہلی جنگِ آزادی کو کچلنے میں برطانوی حکومت کا ساتھ دیا اور اُپنی فوج کی بھاری جمعیت کو اُپنے جانشین رنبیر سنگھ کی سربراہی میں دِلّی کا محاصرہ کرنے کے لئے روانہ دیا۔ اِسی دوران مہاراجہ گلاب سنگھ فوت ہو گیا اور رنبیر سنگھ فوج لے کر پنجاب پہنچ چکا تھا۔ اُپنی فوج کی کمان دوسرے کمانڈر کو سونپ کر اور فوج کو دلی روانہ کر کے رنبیر سنگھ جموں لوٹا اور گدی نشین ہو گیا۔

تعارف کے باب میں فریڈرک ڈرو جموں و کشمیر کے علاقہ جات کو جغرافیائی نیز موسمیاتی خصوصیات کی بنیادوں پر چار طرح کے علاقوں میں تقسیم کرتا ہے۔

اوّل-جن علاقوں میں معیاری بارشیں ہوتی ہیں، ان میں بیرونی کوہستانی سلسلے اور درمیانی کوہستانی سلسلے میں شامل ہیں۔

دوم-جن علاقوں میں معیاری بارشیں کی رسائی نہیں ہوتی، مگر جہاں

مقامی بارشیں دھان کی فصل کو چھوڑ کر باقی اُگائے جانے والی فصلوں کے لئے کافی ہوتی ہیں اور دھان کی کھیتی کے لئے سینچائی کی سہولت ضروری ہو جاتی ہے۔ اس زُمرے میں وادیٔ کشمیر کے بیشتر علاقے آتے ہیں۔

سوم-ایسے علاقے جہاں کوئی بھی فصل سینچائی کی سہولیت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں کے پہاڑ برہنہ ہیں۔ اگرچہ قلیل تعداد میں دامنِ کوہ میں کچھ جنگلات دیکھے جا سکتے ہیں۔

چہارم-ایسے علاقے جہاں کوئی بھی فصل سینچائی کے بغیر ممکن نہیں اور سارے علاقے برہنہ پہاڑوں پر مشتمل ہیں۔ جنگلات اور چراگاہیں ناپید ہیں۔ یہاں بارشوں کا فقدان ہے۔

تیسرے زمرے میں اَستور، گلگت، اور بلتستان کے کچھ علاقے اور اسی طرح چوتھے زمرے میں گلگت بلتستان کے کچھ علاقے اور لداخ شامل کئے جا سکتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے اور تیسرے باب میں بیرونی کوہستانی سلسلے کے جغرافیائی حالات اور ان علاقوں میں بود و باش کرنے والی قومیتوں کے بارے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہ علاقہ پنجاب سے منسلک ہے اور ریاست جموں و کشمیر کی سرحد کے ساتھ لگا ہے۔ اِن اَبواب میں کنڈی، پہاڑ اور دامنِ کوہ، کا تذکرہ ہے اور علاقوں کے سطحِ سمندر سے اُونچائی کے تخمینے دیئے گئے ہیں۔ موسم، درجۂ حرارت، بارشیں، مسافتیں، دریا اور دیگر آبی وسائل کے متعلق جانکاری ملتی ہے۔ اَز خود اُگنے والے درختوں میں ''کیکر''، ''پھلائی'' اور ''بیر'' کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بیرونی کوہستانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو دُو قومیتوں

میں تقسیم کیا گیا ہے۔ایک ''ڈوگرہ'' اور دوسرے ''چھبالی'' ۔ڈوگروں کے آریائی ہونے اور لفظ ''ڈوگرہ'' کی توجیہات بیان کرنے کے علاوہ فریڈرک ڈِرو نے تب کے ڈوگروں میں مروّج مختلف ذاتوں کی نشاندہی بھی کی ہے جن میں ڈوگرہ برہمن، راجپوت، کھتری، ٹھاکر اور جاٹ گنوائے گئے ہیں۔ برہمنوں کو تب بھی لوگ زیرک مانتے تھے! جب کہ راجپوت پوری آبادی میں اکثریت میں بھی تھے اور زمامِ اقتدار بھی کئی صدیوں سے اُن کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ڈوگرہ راجپوتوں کے نسلی خدوخال، خصائل، عادات و اطوار کا تذکرہ کرتے ہوئے فریڈرک ڈِرو نے اِس بات کا بَرملا اِظہار کیا ہے کہ حکومت میں ہونے کے باوجود اُپنے اور اُپنی رعایا کے مفادات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے ہُنر سے نابلد ہیں اور اس طرح بیشتر قومیتیں جو اُن کی رعایا میں شامل ہیں ان سے ناخوش ہیں۔ذاتی سطح پر یہ لوگ باہمت ہیں اور نامساعد حالات کا کسی حد تک مقابلہ بھی کرسکتے ہیں۔ اُپنے مالک کے تئیں ذاتی وفاداری اُن میں بَدرجۂ اُتم موجود ہے۔

راجپوتوں کی ذیلی قومیتوں کے تذکرے کے بعد اُن میں پائے جانے والے رُسوم ورواج کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔راجپوتوں کی ذیلی قومیت 'میاں' میں نوزائیدہ بچیوں کو تلف کرنے کا رواج بڑے پیمانے پر موجود تھا۔ جوُں ہی بچی کا جنم ہوتا، اُسے اُپنی ماں سے الگ کرکے زندہ دفن کردیا جاتا یا پھر جنگل میں لاکر چھوڑ دیا جاتا۔فریڈرک ڈِرو کے زمانے میں یہ رسم حال حال ہی ممنوع قرار دی گئی تھی اور اِسی طرح مہاراجہ کی مملکت سے ''ستی'' کا رواج بھی ختم ہوگیا تھا۔ اگرچہ فریڈرک ڈِرو نے راجہ سچیت سنگھ (جو مہاراجہ گلاب سنگھ کا بھائی تھا) کی

ہلاکت کے بعد لگ بھگ تین سو عورتوں کے ''ستی'' ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ ان میں دو دُس یا گیارہ عورتیں اُس کی بیویاں تھیں جب کہ باقی عورتیں اُسکے محلات میں مختلف کارگذاریوں پر مامور تھیں۔اس طرح مہاراجہ گلاب سنگھ کے ایک بھتیجے راجہ ہیرا سنگھ کی ہلاکت پر لگ بھگ بائیس عورتیں ''ستی'' ہو گئیں اور فریڈرک ڈِرو نے اس بارے میں لوگوں کے چشم دید بیانات کا حوالہ دیا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ہندوؤں میں ذات پات اور چھوا چھوت کا چلن عام تھا اور اس ضمن میں فریڈرک ڈِرو نے کئی واقعات قلمبند کئے ہیں۔

چوتھے باب میں جموں اور جموں میں موجود راج دَربار کے بارے میں تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔ جموّں کو مستقل دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ دَربار کچھ ماہ کے لئے سری نگر منتقل ہوتا تھا مگر ایسا ہر سال ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ جموں شہر کی تفصیلات دَرج کرنے کے بعد مہاراجہ کے دربار میں نشست و برخاست، مسائل اور معاملات کی شنوائی، احکامات صادر کئے جانے کے طریقے، قبل اَز دوپہر اور بعدِ شام دَربار کی کارروائی، مہاراجہ کی شہر سیر، اِن سارے موضوعات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے اور اِس طرح مہاراجہ کے دربار سے متعلق تفصیلی نظارہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''خصوصی دربار'' چار موقعوں پر منعقد ہوتے تھے۔ ''بسنت پنچمی''، ''نوروز''، ''سیر'' اور ''دسہرہ''۔ ''بسنت پنچمی'' بہار کی آمد اور اس کے استقبال کا تہوار ہے اور تب بھی پیلے رنگ سے جڑا تھا۔ اُس دن سارے لوگ پیلے رنگ کے کپڑے یا پھر صرف پگڑیاں استعمال کرتے تھے۔ اُس روز اور اِسی طرح باقی تین 'خصوصی درباروں' کے موقع پر مہاراجہ کے ہاں ''نذر'' لے کر جانا ضروری تھا اور سرکاری اہلکاروں

کے لئے یہ نذر مہینے کی تنخواہ کا لگ بھگ دسواں یا بارہواں حصہ ہوا کرتا تھا۔ تقریبات جموں کے پریڈ میں منعقد ہوتیں اور مہاراجہ بہ نفسِ نفیس خود ''نذر'' وصول کرتا اور اُس کے سامنے سونے چاندی اور روپے کے ڈھیر لگ جاتے۔ جہاں جموں میں پریڈ میں یہ تقریب منعقد ہو رہی ہوتی وہیں کشمیر کے دربار میں بھی ایک خالی نشست کے سامنے سرکاری اہلکار اور دوسرے عمائدین مہاراجہ کی غیر موجودگی میں 'نذر' ادا کر رہے ہوتے۔!! جو لوگ غیر حاضر ہونے کے سبب اس 'نذر' کی رسم کو انجام نہیں دے پاتے، اُن کی تنخواہوں سے مقررہ رقم کاٹ دی جاتی اور مہاراجہ کے کھاتے میں داخل کر دی جاتی !!

اِن چار خصوصی درباروں کے علاوہ شاہی معاملات میں کئی اور تہوار بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے جن میں 'ہولی'، 'دیوالی' اور 'لوہڑی' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ دوسرے راجاؤں کی طرح شکار کا شوقین تھا اور فریڈرک ڈرو نے ایک شاہی شکار کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ اِس طرح شاہی خاندان میں ایک شادی کا احوال بھی درج ہے۔ شاہی خاندان میں لڑکیوں کی شادی کی روایت ہی نہیں تھی۔ کیوں کہ راجہ کا خاندان بھی راجپوت خاندان تھا اور روایتی طور پر یہ لوگ نوزائیدہ بچیوں کو تلف کرنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ ۱۸۴۶عیسوی میں رسم ترک کروانے کے بعد گلاب سنگھ کے خاندان میں اُس کی پوتی نے جنم لیا اور شاید یہ پہلی خوش قسمت بچی تھی جسے زندہ رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ فریڈرک ڈرو کے زمانے میں یہ بچی شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی اور اس کی شادی اور اِس میں پیدا ہونے والے مسائل کا ایک دلچسپ خاکہ اِس باب میں شامل ہے۔

پانچویں باب میں بیرونی کوہستانی علاقوں میں آنے والے مقامات کا ذکر ہے۔ چناب کے مشرق میں بسوہلی، بلاور، پاڈو، رام کوٹ، رام نگر، ادھم پور، کرمچی، پرمنڈل، سُرن سر اور مانسر کے مقامات کے جغرافیائی حالات کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ چناب کے مغرب میں آنے والے مقامات میں اکھنور، بھمبر، کشمیر شاہراہ پر سید آباد، نوشہرہ، چنگس راجوری، تھنہ منڈی، پوشیانہ، پنجل پاس، علی آباد سرائے (ہیر پورہ شوپیان کے راستے میں) جیسے علاقوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فریڈرک ڈرو راجواری میں مغل شہنشاہوں کی آرام گاہ کہ جس میں چنار کے درخت موجود تھے اور تھنہ کی مغل سرائے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ میرپور شہر کی بابت لکھتے ہیں کہ وہ اپنے پھیلاؤ میں جموں کے بعد پہاڑی علاقوں میں دوسرے نمبر پر تھا اور تجارتی سرگرمیوں کا شہر تھا اور گندم کی تجارت کا مرکز۔ پونچھ کا علاقہ اُس دور میں راجہ سنگھ کی قلمرو میں شامل تھا جو مہاراجہ کا رشتہ دار اور باج گذار تھا۔

چھٹے باب میں درمیانی کوہستانی سلسلے کے متعلق مشاہدات ہیں۔ یہ باب رام نگر سے بھدرواہ تک کے سفر کے حالات اور دورانِ سفر جغرافیائی مشاہدات سے شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں یہ علاقہ نہایت کٹھن اور دشوار گذار تھا، جہاں کئی ایسے مقامات بھی آتے تھے کہ گھوڑے بھی کام نہیں آتے۔ اس کوہستانی علاقے کے مشاہدات کے ساتھ ساتھ وہاں اُگنے والے درختوں کی اقسام اور سطح سمندر سے بلندی کے تخمینے بھی دیئے گئے ہیں۔ فریڈرک ڈرو اِن درختوں کی اقسام کا تذکرہ کرتے دیودار، کیل اور دیگر درختوں کی خوبصورتی کے گن گاتا ہے اور شاعرانہ لب ولہجہ اختیار کرتا ہے۔ بھدرواہ کی

وادی میں اُترنے کے ساتھ ہی اِس وادی کے طول و عرض، بلندی اور دیگر جغرافیائی کوائف کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ دَھان کی فصل کی بُوائی کے لئے زمین تیار کئے جانے کے دَوران عورتیں اور مرد دونوں شانہ بشانہ کام کرتے ہیں اور کام کرتے گیت بھی گاتے ہیں تا کہ زمین تیار کرنے کے کٹھن کام کی یک رنگی میں کچھ تنوّع پیدا ہو۔ بھدرواہ میں اُس زمانے میں بھی کشمیریوں کی خاصی تعداد آباد تھی اور یہ فریڈرک ڈرِو کے اندازے کے مطابق کُل آبادی کا نصف تھے۔ بھدرواہ کو اُس دَور میں بھی چھوٹا کشمیر کہتے تھے۔ دَرمیانی کوہستانی علاقوں میں بُود و باش اختیار کرنے والے لوگوں کو فریڈرک ڈرِو نے 'پہاڑی' کہا ہے۔ یہ مضبوط جسم کے مالک، پھُرتیلے لوگ ہیں۔ اُس زمانے میں صرف 'پٹو' پہنتے تھے جو لگ بھگ ہر گھر میں بُنا جاتا تھا۔ بھدرواہ کے ساتھ لگنے والے چمبا میں رہنے والے ''گدی'' بھی فریڈرک ڈرِو کے مطالعہ میں آئے اور اُن کے رہن سہن کے بارے میں بھی تفصیلات دَرج کی گئی ہیں۔ گوجر تب بھی اَپنی نصف زندگی بالائی علاقوں کے پہاڑوں میں گزارتے تھے۔ یہ لوگ دہلی اور سندھ کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے۔ اُن کے گھر میدانی علاقوں میں تھے یا پھر نسبتاً کم اونچائی والے پہاڑی علاقوں میں یا کبھی کبھار بالائی کوہستانی جگہوں پر۔ گوجر مال مویشی پالتے تھے اور اَپنے ریوڑ کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے تھے۔ فریڈرک ڈرِو، سر جارج کیمبل کے اس بیان سے اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ گوجر آریائی نسل سے ہیں۔

وادیٔ چناب کا تفصیلی جائزہ دریائے چناب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے شروع ہوتا ہے اور اِس دریا کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ علاوہ

اَزیں چھٹے باب میں کشتواڑ کے جغرافیائی حالات، اِس کی تاریخ اور پھر یہاں سے پاڈر تک کا کٹھن اور دشوار سفر اور پاڈر سے متعلق جانکاری موجود ہے۔ اِس باب کا اختتام پاڈر کی مختصر تاریخ اور اس کے بھُٹنا وادی سے ہوتے ہوئے زانسکار سے منسلک ہونے کے مضامین پر ہوتا ہے اور اِن علاقوں کے متعلق کافی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

ساتویں باب میں جموں سے سرینگر تک کے سفر کی روئیداد بیان کی گئی ہے اور آغاز میں ہی وادیٔ کشمیر کے بیرونی دنیا سے رابطے کی مختلف راہوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ فریڈرک ڈرِو نے جموں سے سرینگر کا سفر براستۂ راجوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جموں سے اَکھنور-ایک پڑاوٗ، اکھنور سے راجوری-پانچ پڑاوٗ، اور پھر راجوری سے سرینگر-آٹھ پڑاوٗ کا حال درج ہے۔ اِس سفر کی تفصیلات کافی دلچسپ ہیں۔ راستے میں اَکھنور میں دَریائے چناب سے شہتیروں کو حاصل کرنے کے مناظر سامنے لائے ہیں۔

آٹھویں باب میں کشمیر کا محلِ وقوع، جغرافیہ، طول و عرض، میدانی علاقے، کنارِ آب، مختلف آبی گذرگاہیں، ڈُل جھیل، مانسبل اور دیگر جھیلوں سے متعلق تفصیلات، کریوا، موسم، فصلیں، ایسے موضوعات ہیں جن پر پُوری توجّہ دی گئی ہے۔ کشمیر کے دیہات میں بودوباش کرنے والے لوگوں کے بارے میں فریڈرک ڈرِو اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مہاراجہ کی قلمرو میں شامل تمام علاقہ جات میں رہنے والے لوگوں میں سے کشمیری جسمانی اعتبار سے بہترین ہیں۔ وہ کشمیریوں کی جسمانی ساخت اور اُن کے خدوخال مدنظر رکھتے ہوئے انہیں تمام برِصغیر ہند میں رہنے والی قومیتوں میں سب سے اَرفع و اعلیٰ درجے پر

رکھتے ہیں۔ وہ انہیں ان کے مجموعی قومی کردار اور اُن کی منفرد زبان کے بل بوتے پر اپنے پڑوس میں رہنے والی قومیتوں سے ایک اُلگ منفرد اور ممتاز قوم کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

کشمیریوں کے جِسمانی خدوخال، اُن کے لباس وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ اُن کے کردار پر رائے زنی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ عام کشمیری کو جھوٹا، دَروغ گو اور بہانہ ساز مانتے ہیں اور ان کے مطابق ان اَوصافِ حمیدہ میں وہ ہندوستان میں آباد دوسری قومیتوں سے آگے ہے۔ کشمیری جھگڑالو ہیں، شور مچاتے ہیں، زبانی داؤ پیچ چلاتے ہیں مگر جسمانی سطح پر نہیں بھڑتے۔ اُن کے خلاف طاقت کا ہلکا سا بھی استعمال ہو یا اس کا شائبہ بھی ہو تو یہ بچوں کی طرح رونے بلکنے لگتے ہیں۔ اُن کے بارے میں عام یہ ہے کہ یہ بُزدل ہیں لیکن فریڈرک ڈرِو اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے ایسے کشمیری بھی دیکھے جنہوں نے دلِ جمعی سے خطرات کا سامنا کیا۔ وہ عقل و دانش میں کشمیریوں کو اپنے تمام پڑوسیوں سے بہتر مانتے ہیں خاص طور پر پنجابیوں سے وہ سمجھ بوجھ میں زیادہ تیز ہیں اور اسی طرح تب سے اپنے آقاؤں یعنی ڈوگروں سے بھی وہ ذہانت میں کئی قدم آگے ہیں۔ اِن میں مزاح کی حس موجود ہے۔ یہ باتونی ہیں اور خوش اخلاق بھی۔

کشمیریوں کی زبان یعنی کشمیری، پنجابی اور ڈوگری دونوں زبانوں سے مختلف ہے اور پنجابیوں اور ڈوگروں دونوں کی سمجھ سے باہر۔ یہ سیکھنے میں مشکل ہے۔ مہاراجہ کی حکومت کے افسران ایسی زبان پر دسترس حاصل نہیں کر پاتے۔ اِس کے برعکس کشمیری لسانی اعتبار سے باصلاحیت ہیں۔ تقریباً سارے ہی مرد

اور عورتوں کی اچھی خاصی تعداد پنجابی یا ہندوستانی یا دونوں کی امتزاجی زبان جانتے ہیں، ڈوگری بھی کسی حد تک سمجھی جاتی ہے، فریڈرک ڈرِو کشمیری دیہات کے خوبصورت مناظر کے گن گاتا ہے۔ کانگڑی کا تفصیل سے تذکرہ کرتا ہے اور کشمیریوں کی زندگی میں اِس کی اہمیت اُجاگر کرتا ہے، شہر میں رہنے والے لوگ کشمیری برہمن بھی ہیں اور کشمیری مسلمان بھی، کشمیری پنڈت جسمانی محنت اور مشقت سے کتراتے ہیں اور اپنی پوری زندگی لکھنے پڑھنے سے منسلک رہتے ہیں اور اسی کو اپنا پیشہ مانتے ہیں۔ ''فارسی نویسی'' میں مہارت کی بناء پر وہ سرکاری محکموں میں ملازمت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تجارت سے بھی وابستہ ہیں مگر کھیتی باڑی نہیں کرتے اور کوئی ایسا کام دھندہ نہیں اپناتے جس میں جسمانی مشقت کی ضرورت ہو۔ شہری مسلمان آبادی کی اکثریت شالبافوں کی ہے۔ یہ لوگ تنگ و تاریک کارخانوں میں کام کرتے ہیں جہاں تازہ ہوا مفقود ہوتی ہے۔ اُن کی صحت پر اس ماحول کا اثر پڑتا ہے اور لوگوں کا یہ طبقہ دوسرے صحت مند کشمیریوں کے مقابلے میں نحیف اور کمزور نظر آتا ہے۔ شہر میں شالبافی کے علاوہ پیپر ماشی اور چاندی پر کاریگری کا بھی چلن ہے۔

فریڈرک ڈرِو نے ڈل کے پانی کی سطح پر کشتیوں میں قیام پذیر ہانجیوں کی زندگی کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ انگریز سیاحوں کو اِس طبقے کے ساتھ براہِ راست سابقہ پڑتا تھا اور یہ لوگ اس لحاظ سے فریڈرک ڈرِو کے لئے خاصی اہمیت کے حامل تھے۔ اِن کی کشتیوں کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے فریڈرک نے ''بنگلے'' نام کی کشتی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شاندار کشتی صرف حکمرانوں کے استعمال کے لئے ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک اور طرح کشتی ''پرندہ'' کہلاتی اور یہ

تیز قسم کی سواری تھی۔ ''بہت'' یا کشمیری میں ''بہوہ'' مال برداری کے کام آنے والی ایک بہت بڑے حجم کی کشتی تھی۔ عام کشتی ''ڈونگہ'' تھی اور یہی ڈل کی سطح پر بود و باش اختیار کرنے والوں کے لئے گھر کا کام دیتی۔ آنے جانے اور عام آمد و رفت کیلئے ''شکاری'' تھی اور شکاری میں بھی سب سے چھوٹی مگر سب سے تیز رو کشتی ''بندوقی شکاری'' کہلاتی تھی۔ اس تذکرے میں ''ہاؤس بوٹ'' غائب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نام فریڈرک ڈرِو کے زمانے میں استعمال میں نہیں تھا۔

ہانجیوں کے بعد ''واتل'' (جنہیں فریڈرک ''باتل'' لکھتا ہے) طبقے کے بارے میں تفصیلات ہیں۔ اسی طبقے سے ناچنے گانے والی لڑکیاں آتی تھیں اور اِن کی مہاراجہ کے دربار تک رسائی ہوتی تھی۔ شہر کے دیگر طبقوں کی خواتین پردہ نشین ہُوا کرتی تھیں اور اُن کے بارے میں فریڈرک ڈرِو زیادہ نہیں لکھ پاتا۔

شہر کے محل وقوع، اِس کے پھیلاؤ، مکانات اور طرزِ تعمیر سے متعلق معلومات کے علاوہ نشاط باغ، شالیمار اور نسیم باغ جیسی خوبصورت جگہوں کا تفصیلی تذکرہ دیا گیا ہے۔ 'شالہ مار' کی ایک عجیب توجیہہ بھی درج کی گئی۔ فریڈرک ڈرِو کے کہنے کے مطابق ''شال'' - سنسکرت ''شالہ'' - یعنی ''گھر'' یا ''مسکن'' ("House" or "Aborde") اور ''مار'' نام ہے ''عشق'' کی ہندو دیوی کا (Hindu goddess of Love)۔ فریڈرک ڈرِو اس نوٹ کا اختتام یہ کہہ کر کرتا ہے کہ ''کشمیری'' عام طور پر ''شالیمار باغ'' کو ''شالہ باغ'' کی تخفیف کرتے ہیں!!! گرمیوں کے موسم میں بالائی علاقوں میں موسم خوشگوار ہوتا ہے اور اس کے سبب انگریز ان علاقوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان جگہوں میں گلمرگ سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ فریڈرک ڈرِو ''لولاب'' اور ''ژرار'' کا بھی

تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ ''ژرار'' میں حضرت شیخ نورالدینؒ کی درگاہ فیض پناہ کے ساتھ کشمیریوں کی عقیدت انہیں ہزاروں کی تعداد میں حاضری دینے کے لئے لے آتی تھی۔ جمعرات اور جمعہ کے دِنوں میں لوگوں کی بھاری تعداد یہاں پر دیکھی جاسکتی تھی۔ فریڈرک ڈرِو اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں کشمیری پورے تن من سے میلے میں شامل ہوجاتے ہیں اور بھرپور لطف اُٹھاتے، اَپنے عزیز و اُقارب کے لئے یہاں بِکنے والے تحفے لے جاتے جن میں ''ژرار'' کی کانگڑی کو تب بھی خاص مقام حاصل تھا۔

نویں باب میں وادیٔ کشمیر کے اِردگرد موجود کوہستانی سلسلوں کی بابت تفصیلات دی گئی ہیں۔ اِن میں جن علاقوں اور مقامات کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے اُن میں رنگا رنگ پربت، نُن کُن اور پیر پنچال کے ساتھ ساتھ بارہمولہ کے نشیب میں جہلم ویلی ہیں۔ اِن کوہستانی سِلسلوں کو شمالی اور مشرقی حد بندیوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دسویں باب میں کشمیر کی اَرضیاتی تاریخ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور وادی کے ماضی میں ایک عظیم جھیل ہونے کی تھیوری کے بارے میں منطقی اور سائنسی نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ فریڈرک ڈرِو چونکہ خود ماہرِ جغرافیہ تھا اس لئے وہ اِس مفروضے کو جغرافیائی سائنس کے مُسلّمہ اصولوں پر پرکھتا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ دیتا ہے۔

گیارہویں باب میں کشمیر سے لداخ تک کے سفر کی روئیداد بیان کی گئی ہے۔ شہر سے پاس (زوجیلا؟) کے چھ پڑاؤ، ''پاس'' سے ہوتے ہوئے ہوئے ''دراس'' تک دو پڑاؤ، ''دراس'' سے ''کرگل'' تین، ''کرگل'' سے ''کھلسی''

چار اور ''کھلسی'' سے لیہہ چار پڑاؤ ہوا کرتے تھے۔ سفر کی روئیداد کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات وواقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بارہویں باب میں لداخ میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں مفصّل مشاہدات اور معلومات دَرج کی گئی ہیں۔ عظیم کوہستانی سلسلے کے شمال مشرقی علاقوں میں آباد مختلف قبیلوں میں ''چمپا'' ''لداخی'' ''بلتی'' اور ''درد'' گنوائے گئے ہیں۔ اِن میں اَوّل الذکر تین قبیلے ''تبتی'' نسل سے ہیں۔ اِن لوگوں کے روزمرّہ کے حالات، بودوباش، پیشے، رسوم ورواج، کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہی عورت کے کئی مَردوں کی زوجیت میں ہونے کی رسم سے متعلق تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ اِس رواج کے سماجی اور معاشی محرّکات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ لداخی سماج میں عورت کو ہندوستان بھر میں رہنے والے باقی قومیتوں کی عورتوں کے مقابلے میں نسبتاً اُونچا درجہ حاصل تھا۔ انہیں لگ بھگ مکمل سماجی آزادی اور مرد کے ساتھ برابری میسّر تھی۔ وہ مَردوں کے ساتھ ہم پلہ ہونے کے سبب ہر کام میں اُن کی شریک ہوتی تھیں۔

فریڈرک ڈرِو لداخ میں موجود گمپاؤں کے فنِ تعمیر اور اُن میں موجود مذہبی لحاظ سے اہم نوادرات سے کافی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

کتاب کا تیرھواں باب وسطی لداخ، نوبرا اور زانسکار سے متعلق ہے۔

چودھویں اور پندرھویں ابواب میں لداخ کی بالائی وادیوں، ''رُپشو'' ''سالٹ لیک ولی'' ''پانگ کانگ جھیل'' اور ''چانگ چیمو'' کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔

سولہواں باب 'بلتستان' اور سترھواں باب ''دردستان'' کے جائزوں پر

مشتمل ہیں۔ بلتستان سے متعلق تفصیلات میں ''سکردو'' ''شگر'' ''باشا'' ''برالدُو'' ''رونڈو'' اور ''دیوسائی'' ذیلی اَبواب میں دیئے گئے۔ مواد کے علاوہ بلتی لوگوں کی نسل، اُن کے جسمانی خدوخال اور مذہب سے متعلق جانکاری موجود ہے۔ فریڈرک ڈرِو کے نزدیک بلتی بنیادی طور پر مُسلمان تبتی ہیں اور نسلی اعتبار سے لداخیوں میں ہی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ مُسلمان بننے کے بعد یہاں کے سماج سے عورتوں کے ایک سے زیادہ شوہر ہونے کے رواج کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ فریڈرک ڈرِو کے مطابق بلتستان میں آبادی کی کثرت موجود تھی۔ اِس باب میں ''پولو'' کے ایک کھیل کا تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے اور یہ کافی دلچسپ ہے۔

''دردستان'' باب کے تحت کشمیر سے گلگت میں ''استور'' ''پونجی'' پھر گلگت اور ''پونیال'' ذیلی عنوانات کے تحت مشاہدات اور تجربات کی تفصیل زیرِ بحث لائی گئی ہے۔ اِسی باب میں سندھ کے ''سیلابوں'' کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اُگلے باب یعنی اُٹھارھویں باب میں ''دَردستان'' میں رہنے والے لوگوں یعنی ''درد'' کا تعارف، اُن میں موجود ذاتیں، ''مسلمان درد'' اور ''بودھ درد'' طبقہ جات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان کی یا جسمانی خصائل، دونوں کی بنیاد پر فریڈرک ڈرِو ''درد'' قبائل کو آریائی نسل سے ہونے کی بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ''دردوں'' میں ذاتوں کی نشاندہی کرتے وہ ''رونو'' کو پہلے درجے پر ''شِن'' کو دوسرے، ''یاشکون'' کو تیسرے، ''کریمن'' کو چوتھے اور ''ڈوم'' کو آخری یعنی پانچویں درجے پر رکھتے ہیں۔

انیسویں باب میں دردستان، گلگت کی تاریخ سمیت دی گئی ہے اور اس کو سکھوں کی آمد سے قبل یعنی ۱۸۴۲ عیسوی سے پہلے اور پھر سکھ دَور جو ۱۸۴۲ء سے

۱۸۴۷ عیسوی تک قائم رہا اور ڈوگرہ راج کا قیام ۱۸۴۷، ڈوگروں کا ۱۸۵۲ میں انخلا، اور ۱۸۶۰ء میں ڈوگروں کا دوبارہ اقتدار حاصل کرنا شامل ہے۔ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۹ء کے دوران جاری یورش اور خلفشار کو الگ سے بیان کیا گیا ہے۔ ''یاسن'' میں ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۳ عیسوی تک آنے والی تبدیلیوں کو اِس باب کے آخر میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

بیسواں باب بھی ''دردستان'' سے متعلق ہے اور گلگت کے گرد و نواح کے علاقوں پر مرکوز ہے اور ان مقامات کے سیاسی اور سماجی انتظامات کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ ان میں ''ہرموش''، ''پونیال''، ''نگر''، ''ہترا''، ''اشکومان''، ''چترال'' اور ''مستوج''، پھر بدخشاں میں ''گوبجال'' اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستیں، ''داریل'' ''ٹنگیر''، ''گور''، ''تھلیچہ''، ''چلاس''، ''کولی'' اور ''پالس'' کی تفصیلات موجود ہیں۔

کتاب کا اکیسواں باب جموں و کشمیر کی مملکت میں بولی جانے والی زبانوں سے متعلق ہے۔ فریڈرک ڈریو کے نزدیک ریاست جموں و کشمیر میں بولی جانے والی تیرہ زبانوں اور بولیوں کی فہرست جن کو وہ ''آریائی'' اور ''تورانی'' میں تقسیم کرتے ہیں یوں ہیں:

آریائی۔(جنوبی)

ڈوگری، چھبالی، رام بنی، بھدرواہی، پاڈری، ڈوڈہ کی بولی، کشتواڑی، کشمیری، درد۔۔جس کے تحت۔ داہ کی بولی استور کی بولی، گریز اور دراس، گلگت کی بولی۔

تورانی۔(جنوبی)

تبتی۔۔جس کے تحت۔ بلتستان اور لداخ کی زبان چمپاؤں کی زبان۔

فریڈرک ڈریو کے نزدیک ڈوگری، ہندوستانی (ہندی، اردو؟) اور پنجابی دونوں سے مختلف ہے جب کہ ''چھبالی'' ڈوگری سے مختلف ہے مگر پنجاب میں جہلم کے مغربی علاقوں یعنی ''پوٹھوہار'' میں بولی جانے والی یا ''پوٹھوہاری'' سے بہت قریب ہے۔ اُس کا ایک دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ جموں سے پہاڑی علاقوں سے گزرتے کشمیر جاتے جاتے ڈوگری سے کشمیر تک کا سفر بھی بتدریج تبدیلیوں کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے اور دَرمیانی کوہستانی علاقوں میں بولی جانے والی زبان جسے وہ مجموعی طور پر ''پہاڑی'' کا نام دیتا ہے اصل میں مختلف مدارج میں کشمیر زبان کی ہی مختلف بولیاں ہیں۔ اِن میں ''رام بنی''، ''بھدرواہی''، ''پاڈری''، اور ''ڈوڈہ اور کشتواڑی'' بولیاں شامل کی جاسکتی ہیں۔ ''رام بنی'' کو وہ ڈوگری اور کشمیری زبانوں کے بیچوں بیچ والی زبان تصوّر کرتے ہیں اور دیگر زبانیں یا بولیاں کشمیر کے زیادہ نزدیک ہوتی چلی جاتی ہیں۔

اُس زمانے میں فارسی کا چلن تھا اور مہاراجہ کی حکومتی زبان بھی فارسی تھی۔ فارسی رَسم الخط صرف فارسی زبان لکھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اِس رسم الخط کے علاوہ تین اور خط رائج تھے، یہ تھے ڈوگری، کشمیری اور تبتی۔ رَسم الخط کے مسائل تب بھی تھے! اور فریڈرک ڈریو نے اِس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ فارسی (نستعلیق) رسم الخط ڈوگری اور دیگر زبانیں بولنے والوں کو شاید ناپسند تھا اور اِسی طرح دیوناگری، رسم الخط کشمیری اور کئی اور دیگر زبانیں بولنے والوں کو منظور نہ تھا۔ فریڈرک ڈریو نے اس مسئلے کا حل اپنے ایک ذیلی نوٹ میں پیش کیا ہے جس کی رُو سے وہ ہندوستان میں اور اِسی طرح جموں و کشمیر میں بولی جانے

والی ساری زبانوں کے لئے ''رومن'' رسم الخط اپنانے کی وکالت کرتے ہیں اور ایسا کرنے سے حاصل ہونے والے فوائد بھی گنواتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہندی بولیاں اور فارسی، عربی کے الفاظ ''رومن'' میں بطریقِ اَحسن لکھے جاسکتے ہیں اور یہ رسم الخط ''دیوناگری'' کے مقابلے میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے اور ''ٹائپ'' کی سہولیت سے بھی آراستہ ہے۔ رومن رسم الخط کو وہ لازماً عیسائی رسم الخط بھی نہیں مانتے اور اس طرح مذہبی احساسات کے مجروح ہونے کا بھی اندیشہ نہیں!!

آخری یعنی بائیسویں باب میں کتاب کے آخر میں شامل کئے گئے نقشہ جات کے حوالے سے تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ہندوستان کے نقشے کے بعد ایک عمومی نقشہ ہے اور اس کے ساتھ پانچ اور نقشے کتاب کی زینت ہیں۔ اِن کا تعلق اُونچائی، برف باری، آبادیوں کی نسل، زبان اور مذہب کے ساتھ ہے، ایک سیاسی نقشہ بھی موجود ہے جس کی رُو سے مہاراجہ کی قلمرو کے اِردگرد موجود ممالک کی تفصیل کے ساتھ سرحدوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

ضمیمہ جات میں ڈوگری گرامر، مختلف زبانوں کی لغات کا تقابلی مطالعہ، راستے اور گذرگاہیں اور مختلف مقامات کے درمیان مسافتیں درج ہیں۔

---☆---

گوردھن سنگھ

تاریخِ جموّں کا ایک گُم گشتہ بابؒ

اُٹھارہویں صدی جموں کی پہاڑی ریاست کی تاریخ میں ایک اہم تغیر کا زمانہ تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس وقت حالات کی زمام اِس سرزمین کے ایک لائق ترین حکمراں کے ہاتھ میں آئی جس نے اُس وقت اُپنے لئے ایک وسیع سلطنت کا وجود ممکن بنایا جبکہ باقی ملک میں اِنتشار اور بَدنظمی کا دَور دَورہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مغل سلطنت کے مرکزی نظام کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی یورش اور داخلی بغاوتوں سے یہ کمزور پڑ گئی تھی اور کامیاب باغی سرداروں اور فوجی مہم پسندوں نے اِس کے حصے بخرے کردیئے۔ اُورنگ زیب کے جانشینوں میں اِس وسیع اور بے قابو سلطنت کا اِنتظام چلانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اِس کے نتیجے میں چاروں طرف اِنتشار نظر آنے لگا۔ مرہٹہ سرداروں نے جلد ہی وسطی اور مغربی خطوں پر غلبہ حاصل کیا۔ دکن کی مطیع سلطنت جلد ہی نظام کے زیرِ اطاعت ایک آزاد راجواڑہ شاہی میں تبدیل ہوگئی۔ بنگال ایک افغان سرداری سرکردگی میں الگ ہوگیا۔ ایک طاقتور حاکم اَودھ میں ایک طاقتور خاندان کی بنیادیں استوار کررہا تھا۔ پنجاب میں سکھ اُبھر رہے تھے اور ملک کے دُور دراز حصوں میں بہت سے فوجی گروہ اُپنا تسلّط جمارہے تھے۔ جو سلطنت

سولھویں صدی عیسوی میں بابر کی قوت عمل اور انتظامی صلاحیت سے وجود میں آئی تھی، اَب موت کی ہچکیاں لے رہی تھی۔ افغانستان کی ہندوستانی میدانوں سے علیحدگی کے بعد وسطی ایشیا کے حملہ آوروں کے لئے دَروازے کھُل گئے۔ اَورنگ زیب کی وفات کے تیس سال بعد نادر شاہ نے دہلی کو غارت کیا۔ اِس طرح جب رُکاوٹیں ختم ہوگئیں تو نادر شاہ کے جنرل احمد شاہ اَبدالی نے افغانستان کی سرزمین سے ہندوستان پر حملہ کر کے ۵۱-۱۷۴۸ء کے دَرمیان سارے پنجاب پر تسلّط جمالیا۔ باہمی رَقابتوں میں اُلجھ کر ابدالی کے جانشین پنجاب پر ایک کمزور قسم کا قبضہ رکھنے میں کامیاب رہے۔ سکھ کسانوں کی ٹولیوں نے جلد ہی ایک منظّم قوت کی صورت اختیار کرلی اور وہ اَپنی ماتر بھومی کے اقتدارِ اعلیٰ کے لئے اُفغانوں سے سخت مقابلہ کرنے لگے۔ اُسی وقت جب کہ سکھ افغانوں اور مغلوں کے خلاف آخری اور فیصلہ کُن لڑائیاں لڑ رہے تھے جدید جموں کی ریاست جنم لے رہی تھی۔

عالمگیر کی وَفات کے بعد دکن میں مغلوں کی جنگی قوت شل ہوگئی اور جموں کی ریاست، جو مغلوں کے اقتدار کے ساتھ ساتھ زَوال پذیر ہوگئی تھی راجہ درھودیو کی محنت کی بدولت پھر پردۂ وجود پر اُبھرنے لگی۔ اِس راجہ نے کوہستان کے کچھ متضاد سَرداروں کو اَپنی متابعت میں لایا لیکن درحقیقت جس شخص نے جموں کی عظمت کی بنیادیں اُستوار کیں وہ مہاراجہ رنجیت دیو تھا۔ اُس نے روایتی بائیس پہاڑی راجوڑہ شاہیوں کو فتح کیا۔ مسٹر حشمت علی ریاست کے حدود کی وسعت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''رنجیت دیو ایک باعزم اور خوش نصیب سردار تھا۔ وہ ۱۷۰۰ء میں تخت نشین ہوا اور ۵۴ سال تک حکومت کر[illegible]۔ اس

نے سب سے پہلے اَپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی طرف توجہ دی۔ چار بڑے ہمسایہ سردار قطعی طور پر مطیع کرلئے گئے اور بہت سے اس کے باج گزار بن گئے جن میں بسوہلی کا امرت پال، بھدرواہ کا دیا دیال، مان کوٹ کا عظمت دیو اور کشتواڑ کے سید اللہ سنگھ اور کرم اللہ سنگھ شامل تھے''۔

اُس کی کانگڑہ کی فتوحات کا بڑا ہی خوبصورت بیان دتّو کی تحریر کردہ ''براج راج پنچاتیکا'' میں ملتا ہے۔ دتّو، رنجیت دیو کا درباری شاعر تھا۔ اُس کے عہد کی سب سے اہم مہم کشمیر کی تھی جو اُس نے لاہور کے صوبہ دار کی طرف سے شروع کی تا کہ کشمیر کے راجہ سکھ جیون کی سرکوبی کی جائے جس نے اَپنے آپ کو افغان اطاعت سے آزاد قرار دیا تھا۔ اس مہم میں جموں کی فوجوں کے قابل ذکر کماندار جموں کے میاں رتن دیو، گورہ سلاتھیان کے گھنو بھلوال اور وزیر کھنو تھے۔ راجہ سکھ جیون کو ہزیمت اُٹھانا پڑی اور اسے قید کر کے لاہور لایا گیا اور جموں کی افواج کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شاہ نے رنجیت دیو کو ''راجۂ راجان'' کے خطاب سے نوازا اور اُسے سالانہ ہزار ساٹھ خروار شالی پیدا کرنے والی ایک جاگیر بخش دی جس کی قیمت سَوا لاکھ روپے ہوتی تھی۔ اِسی سال صوبہ دار لاہور کابلی مل سکھوں کے دباؤ سے تنگ آ کر جموں میں پناہ گزین ہوا اور اُس نے رنجیت دیو کو کوہستان کے بائیس راجاؤں کا سردارِ اعلیٰ تسلیم کرلیا۔

ایک وسیع اور مالا مال ریاست قائم کر کے رنجیت دیو نے اِنصاف، انسانیت اور رُواداری کی بنیادوں پر حکومت کی بنیادیں اُستوار کرنے کی طرف توجہ دی، اُس نے عام انتظامیہ سے متعلق افسروں کے رَویے پر کڑی نگرانی شروع کی اور چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہتی تھیں۔

جن اَفسروں کے خلاف رعایا پر ظلم کرنے اور انہیں تنگ کرنے کا جُرم ثابت ہوتا تھا، انہیں سخت سزا دی جاتی تھی بلکہ انہیں ملازمت سے برطرف کیا جاتا تھا۔ اس نے زمین کی کاشت اور مالیہ کی وصولی کے نظام میں کچھ اصلاحات نافذ کیں۔ مالیہ کے علاوہ کاشت کاروں کو قانونگو، نمبردار اور چودھری کے لئے جو فالتو ٹیکس دینا پڑتے تھے، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نئی اصلاحات زمینداروں میں اتنی مقبول ہو گئیں کہ وہ نہ تو حکومت سے اپنی فصلوں کا کوئی حصہ ہی چھپاتے تھے اور نہ ہی حکومت کی واجب الاداء رقومات سے جی چُراتے تھے۔ اہلکاروں کو ان کا مشاہرہ باقاعدگی سے اَدا کیا جاتا تھا، اور انہیں کڑی تنبیہ کی جاتی تھی کہ وہ کسی قسم کی بے قاعدگی میں آلودہ نہ ہوں۔ Usvasy کا عمل بھی اصلاح پذیر ہوا، ایک دستورالعمل وجود میں آیا اور طے پایا کہ ایک ساہوکار زیادہ سے زیادہ قرضہ لی گئی رقم پر اس کا نصف حصہ بطورِ سُود لے سکتا ہے۔ ساہوکاروں کو منع کیا گیا کہ وہ قرضے کی بنیادوں پر قرضدار کے کنبے سے مُفت خدمت لے۔

سماجی اصلاح کے میدان میں اُس نے سَتی کی رسم پر پابندی عائد کی۔ اس نے اپنی رانیوں کو سمجھایا کہ اس کی وفات کے بعد انہیں سَتی نہیں ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ جب اُس کا انتقال ہوا تو اس کی دو رانیاں اُس کی چِتا میں بھسم ہونے کے لئے آمادہ نہ ہوئیں۔ لڑکیوں کو پیدا ہونے کے وقت دفن کرنے کی رسم اس وقت کوہستان کے راجپوتوں میں عام تھی! اسے ایک ذاتی مثال کے ذریعے بند کر دیا گیا۔ جب راجہ کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اسے پورے ناز و نعم سے پالا گیا اور بعد میں نور پور کے راجہ سے بیاہا گیا۔

کالے جادو اور ڈائنوں کے طلسم کی شکایت کی اس کے دربار میں شنوائی

نہیں ہوتی تھی کیونکہ راجہ خود ان توہمات سے بالاتر تھا۔ اس سلسلے میں اُن عورتوں جن پر جادو ٹونے کا الزام ہوتا تھا، کو شاہراہِ عام پر بال کاٹ کے روسیاہ کر کے گدھے پر پھِروانے کی پُرانی رسم بھی ختم کر دی گئی۔ پرَہ (Para) کی رسم جن کی رُو سے ایک شخص اپنی طلب کے پورا نہ ہونے پر اُپنے پیٹ میں خنجر گھونپ کے خودکشی کر لیتا تھا، بھی اُس وقت کوہستان کے برہمنوں میں عام تھی۔ برہمنوں کو عزت کا مقام دے کر اِس رسم کی بیخ کنی کی گئی۔ پرَہ کی اس عجیب رسم کے سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ پرَہ ظالم کی سیاہ حرکات کے خلاف کیا جاتا تھا جس کا مقصد بعض شکایات کی تلافی کروانا ہوتا تھا۔ اگر شکایات کی تلافی ہو جاتی تھی تو پرَہ کرنے والے اشخاص اس شخص کو دُعائیں دیتے جاتے تھے، جس نے اِن کی فریاد سن لی ہو۔ دُوسری صورت میں وہ برَت رکھتے تھے اور آگ میں کود کر ظالم کو بَددُعائیں دیتے ہوئے جان دیدیتے تھے۔ اِس تعلّق میں لاہور کے ایک برہمن کی کہانی عام طور پر سننے میں آئی ہے جس نے راجہ دھرودیو کے دَربار میں حاضر ہو کر انصاف کی استدعا کی۔ گھر سے نکلتے وقت اُس نے اُپنے کنبے والوں کو ہدایت کی تھی کہ اگر اُسے اِنصاف نہیں ملا تو وہ خودکشی کر لے گا اور شور سُن کر انہیں بھی آگ میں بھسم ہو جانا چاہئے۔ راجہ نے اُس کی فریاد سن لی اور وہ خوشی خوشی اُپنے گھر لوٹ گیا۔ اسی اثناء میں شہر میں ایک مکان سے آگ نمودار ہوئی، جس کی وجہ سے چاروں طرف شور بپا ہو گیا۔ یہ شور و شر سُن کر بے چارے برہمن کے گھر والے اِس کی دادرسی نہیں ہوئی ہے، چنانچہ انہوں نے لکڑیاں جمع کیں، مکان کو آگ لگائی اور اُپنے آپ کو اِسی میں جلا دیا۔ گھر پہنچنے پر برہمن نے یہ اَلمناک منظر دیکھ کر اَپنے آپ کو ہلاک کر دیا، ایسے واقعات کوہستان میں روزمرہ

کا معمول تھے مگر رنجیت دیو کے عادلانہ رویئے کے بعد یہ چیزیں ختم ہوئی گئیں۔

جموں کے اَمن اور استحکام نے بڑی تعداد میں دولت مند سوداگروں، ہنر مندوں اور مختلف عقیدوں اور نسلوں کے لوگوں کو اِس پہاڑی سلطنت میں کھینچ لایا، پرنسپٹ (Princept) لکھتا ہے کہ ''اس زمانہ میں جموں کا شہر بہت ہی خوش حال اور پُرامن تھا کیونکہ پنجاب کی اُتھل پتھل سے گھبرا کر بہت سے دولت مند تاجر یہاں پناہ لینے آتے تھے یا انہوں نے اپنی فرموں کی شاخیں یہاں قائم کی تھیں۔ اِس غرض کے لئے جموں کا محل وقوع بڑا موزوں تھا اور رنجیت دیو کے عہد میں اِس قسم کے لوگوں کو اَمن اور حفاظت سے رہنے کی ضمانت ملتی تھی''۔ اس وقت شہر کے سب سے دولت مند لوگوں میں لالہ پنڈی داس، جولا داس، شہزادہ مل، ملکھی شاہ، بہادر شاہ قابل ذکر ہیں۔ اُن کی فرموں کی شاخیں کشمیر، پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تھیں۔ فورسٹر اُپنا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اُس نے بنارس میں لی ہوئی ہنڈی پر بنارس کے کشمیری لال کے بھتیجے جموں کے جوالا داس کی کی دکان سے نقد رقم وصول کی۔

پنجاب کے سب سے زیادہ قابل ذکر خاندان، جنہوں نے جموں میں پناہ لی، رائے مہاراج راجہ گوان وتا مل اور لاہور کے ہندو گورنر رائے کابلی مل تھے۔ یہاں تک کہ دہلی کے مغل حکمران محمد شاہ کی ملکہ عصمت بیگم بھی جموں میں قائم پذیر ہونے کے لئے آگئیں۔ اُس نے توی کے کنارے ایک خوبصورت باغ لگوایا اور اَپنے رہائش کے لئے ایک شاندار کوٹھی بنوائی۔ یہ مقام اب بھی حویلی بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمان صوفیوں میں جو لوگ جموں آئے ان میں صوفی شاہ اور کھیری شاہ قابل ذکر ہیں، ان کے مقبرے پیر مٹھا کی متاثر کن آرام

گاہ کے نزدیک واقع ہیں۔ راج درشنی کا بیان ہے کہ عیسائی مشنریوں کی ایک بھاری تعداد نے شہر میں اپنی عبادت گاہیں بنائی تھیں مگر اِس دعوے کی صحت کے سلسلے میں ابھی اور تحقیقات کی ضرورت ہے۔

رنجیت دیو کی شخصیت اور جموں کی خوش حالی کو سب سے شاندار خراج تحسین جارج فورسٹر نے اُدا کیا ہے جس نے اپریل ۱۸۷۳ء میں جموں کی سیر کی۔ وہ شہر کی تجارتی اہمیت اس کی دولت اور عشرتوں کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ گو رنجیت دیو کی موت کے بعد یہ شہر زوال کی حالت میں تھا مگر پھر بھی یہ ملک کے اِس حصے میں یہ اوّلین اہمیت کی منڈی تھی۔ جموں کی خوشحالی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''نادر شاہ کے حملے سے قبل دہلی سے کشمیر کا راستہ سرہند، لاہور اور ہر پور سے ہو کر جاتا تھا —— سکھوں کی فتوحات کے بعد وہ راستہ غیر محفوظ ہو گیا تھا اور راجہ رنجیت دیو کے عہد میں اس کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ پنجاب کی بدنظمی کی وجہ سے کشمیر کی تجارت جموں کے راستے ہونے لگی کیونکہ پنجاب سے الگ تھلگ تھا اور پہاڑی سلسلے کی وجہ سے فوجوں کی آمد و رفت اِس میں ذرا کٹھن تھی۔ گو بار برداری کے اخراجات زیادہ تھے اور سفر پیچیدہ تھا مگر پھر بھی اسے لاہور والے رائے پر ترجیح دی جاتی تھی''۔

راجہ رنجیت دیو کی حکمرانی کی داد دیتے ہوئے وہ اُن مسلمان تاجروں کے ساتھ اُس کے روادارانہ برتاؤ کی مثالیں پیش کرتا ہے جنہوں نے اِس شہر میں اَپنے تجارتی ٹھکانے بنائے تھے، وہ بیان کرتا ہے:

''رنجیت دیو جو جموں کے موجودہ سردار کا باپ تھا اور جو ہر لحاظ سے ایک دانشمند اور انصاف پرور حکمراں تھا، نے جموں کی اہمیت اور دولت

میں سب سے زیادہ حصہ کیا۔ اُس نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمان تاجروں کے شہر میں قیام سے کیا فائدے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اور ان کے ساتھ نہایت باعزت برتاؤ کرتا تھا۔ ایک ایشیائی ظالم حکمراں سے فقط بُری خصلتوں کی توقع ہی ہوتی ہے اور اُس کے دور میں رہنے والی رعایا اُپنے کو خوش قسمت خیال کرسکتی ہے مگر جموں کا سردار نہ صرف ظلم سے ہی باز رہتا تھا بلکہ وہ اُپنے رعایا کی پرورش اور حفاظت کرتا تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں کی۔ جن کے لئے اس نے شہر کا ایک حصہ مخصوص کردیا جس کا نام مغل پور رکھ لیا گیا۔ کسی قسم کے امتیاز کی بُو ختم کرنے کے لئے اُس نے اس حصے میں ایک مسجد بنائی''۔

اُپنے مسلمان رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے وہ ان کے مذہبی جذبات کے تئیں بے حد احترام دِکھاتا تھا، جب وہ عبادت میں مصروف رہتے اور وہ جب وہاں سے گھوڑے پر گذرتا تو وہ اپنا گھوڑا روک لیتا، جب تک کہ نماز یا دُعا اختتام پذیر نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ ہندوؤں نے اُپنے راجہ سے شکایت کی کہ شہر کے تمام کنوئیں مسلمانوں کے ظروف کی وجہ سے صاف نہیں رہتے۔ لہٰذا اُنہیں صرف دریا کا پانی پینے کی ہی اجازت دی جانی چاہئے۔ مگر اس نے یہ شکایت فوراً مسترد کردی اور کہا کہ پانی ایک پَوتر شَے ہے جو اِنسانیت کے عام استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہے اور یہ کسی طبقے یا فرقے کے لمس سے ناپاک نہیں ہوسکتی۔

اُس نے ایک ایسے انتظامیہ کو جنم دیا جو بیک وقت باصلاحیت اور انصاف پرور تھا اِس کی وجہ جموں کے باشندے ایک بہتر زندگی گذارنے لگے، جموں ایک بھاری تجارتی مرکز بن گیا جہاں ہر قسم کی حفاظت اور خوشحالی میسر رہتی تھی۔

اقتصادی خوش حالی، سیاسی استحکام اور ہندوستان کے میدانی علاقے میں وسیع روابط کی وجہ بہت سے آرٹسٹ جموں آئے۔ رنجیت دیو کے دربار میں مَن سنگھ اور اس کے چار فنکار فرزند آئے۔ رنجیت دیو کے چوتھے بھائی راجہ بلونت دیو کی خوبصورت تصاویر جو مَن سنگھ نے بنائیں اور جو اَب لاہور اور برٹش میوزیموں میں ہیں، کی وجہ سے آرٹ کے ایک مرکز کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے سالانہ نمبر ۱۹۶۲ء میں ۸ آرکی بابکاؤں کی تصویریں دیکھ کر ان کی پورا منڈل کی تصویروں کے ساتھ مشابہت یکدم نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ پہاڑی مصوری کے طالب علموں کو چاہئے کہ وہ شملہ اور جسروٹہ کا ۱۸ ویں صدی کے ابتداء میں مکتبہ مصوری کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ اس کے امتزاج سے پہاڑی مصوری کا جموں اسکول اُبھرا ہے۔

..............☆..............

سیّد رسول پونپَر

"یہی کشمیر ہے"[1]

دیر ہی سے سہی جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ہمارے ادارۂ شیرازہ کی توجہ جموں و کشمیر کی قدیم و عظیم ثقافت کے تمدّنی نقوش کی طرف بھی گئی جس میں ثقافتی زیارت بھی اپنا اہم مقام رکھتی ہے۔ سارے برِصغیر میں کشمیر ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اِس کی اپنی منضبط اور مربُوط تاریخ ملتی ہے جس کے ناقابلِ تردید شواہد و مواخذ بھی مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ جہاں آثارِ قدیمہ کے ساتھ ساتھ لوک ورثہ، اور روایات و اُسطور کسی بھی ملک کے تہذیب و تمدّن کے اہم بولتے خدوخال ہیں، وہاں سیاحتی ذوق وشوق بھی تہذیبی روایات اور انسانی حیات کے نامیاتی رنگوں کو نہ صرف عکس بند کرتی ہے بلکہ اُن پر پَرتو فگن بھی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب ایک سیاح اور ثقافتی زائر تخلیقی فکر ونظر اور غیر متعصب فہم و اِدراک کا مالک بھی ہو جیسے پیرسے جروِس (Pearce Gervis) جو ایک مشفق اور غیر جانبدار تہذیبی زائر کی حیثیت سے ایک متجسس فرنگی کے روپ میں جموں، کشمیر، لداخ، کرگل، گلگت، پونچھ اور راجوری کے خطوں کی سیاحی کے ساتھ ساتھ دشت وجبل کے ذرّے ذرّے میں بکھرے حسنِ

1. This is Kashmir: By: Pearce Gervis

فراواں اور رنگ بدلتی زندگی سے اِتنے محظوظ ہوئے کہ اپنے تاثرات سلیقے سے "یہ کشمیر ہے" (This is Kashmir) نام کے سفرنامے میں قلمبند کر کے منظرِ عام پر لا کر ہی دم لیتے ہیں۔ وہ علامہ اقبالؔ کے اِرشاد کے مطابق لمحہ بھر ٹھہر جانے کو مرگِ مفاجات گردانتے ہیں۔

اے مسافر جاں بمیرد از قیام
زندہ تر گردد ز پرواز مدام

شاید وہ بھی اقبالؔ ہی کی طرح یہ دُعا کرتے ہوئے سفرِ مظفر اور منزلِ ناتمام پر نکلے ہوں۔

شگفتہ ہو کے کلی دِل کی پھُول ہو جائے
یہ اِلتجائے مسافر قبول ہو جائے

پیرسے (Pearce) اپنے سفرنامے کو اُنیس ابواب میں یوں پیش کرتے ہیں:

۱۔ شہرِ سرینگر : ایک تعارف
۲۔ دریائی سفر : بارہمولہ تک
۳۔ تاریخِ کشمیر : مُسلم عہد تک
۴۔ ہندو دَور سے آج تک:
۵۔ سرینگر کی سیر:
۶۔ دریائی زندگی:
۷۔ مغل باغات:
۸۔ ایک معالج: شالباف وقالین باف

۹/تجارتی فنون:

۱۰/گلمرگ: ایک گُل گشت

۱۱/اَمرناتھ یاترا

۱۲/لیہہ لداخ کو ایک جست میں

۱۳/بلتستان اور گلگت:

۱۴/جموں اور پُونچھ کے صوبے:

۱۵/کشمیر میں ہندو اور مسلمانوں کے تیوہار اور میلے:

۱۶/موت حیات اور شادی بیاہ: رسوم ورواج:

۱۷/کشمیر: علوم وفنون

۱۸/کشمیری لوگ: کردار کے خدوخال:

۱۹/دو قومی شاہراہیں:

اس کے علاوہ اس نے چالیس سے زیادہ نادر تصاویر سے اَپنے سفرنامے کو مزیّن کیا ہے، جن سے اس کی قدر ومنزلت میں بدرجہا اضافہ ہوا ہے...... اِس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تخلیقی ذہن رکھتا تھا اور اعلیٰ ذوقِ جمال کا مالک بھی تھا تا کہ آنے والے زمانے میں بھی اُس کے سفر کی رُوداد خزاں دیدہ نہ لگے کیونکہ وہ کوئی سرکاری کارندہ نہ تھا بلکہ ایک باذوق ثقافتی مہم جُو تھا جو خالقِ کائنات کی رنگا رنگ مخلوق کی تہذیبی، جغرافیائی اور نیرنگیوں کا قریب سے جائزہ لے کر حیرت زا زندگی سے حتی الوسع محظوظ ہو سکے...... اور یہ نادر تصاویر دیکھ کر ہم کشمیری بھی یہاں کی سماجی اور ثقافتی زندگی کو ماضی کے جھروکے سے دیکھ سکیں۔ شرط یہ ہے کہ زمانے دَستِ بُرد سے محفوظ رہ سکیں ۔

۱/آبی یا دریائی سبزی فروش: ص:۷

۲/مچھوا اپنا جال پھیلائے ہوئے: ص:۷

۳/قلعہ نما سکول عمارت:

سینٹرل مشن سکول، سرینگر دریا کی جانب سے سیڑھیاں: ص:۱۲

۴/بنڈ اور میوہ فروش: ص:۱۲

۵/پُرانا شاہی محل (دربار ہال) شیر گڑھی سرینگر: ص:۱۵

۶/ہاؤس بوٹ کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی خاتون: ص:۱۴

۷/ایک دوسرے پر جھکتے ہوئے پانی پر پرتو فگن مکانات: ص:۱۷

۸/رگھوناتھ مندر سرینگر: ص:۱۸

۹/شہرِ سرینگر آخری کینٹلیور (Contilever) پل: ص:۲۱

۱۰/خانقاہِ معلیٰ (شاہ ہمدان مسجد)،

نیچے ذرا مندر اور لکڑی کے بنے غسل خانے: ص:۲۰

۱۱/مغل پل (کدل) بارہمولہ: ص:۳۲

۱۲/دریائے جہلم پر غروبِ آفتاب کا منظر: ص:۴۲

۱۳/سرینگر کی ایک سڑک پر ایک ٹانگہ: ص:۴۳

۱۴/پھولوں سے لدی مندر کی مورتی: ص:۷۱

۱۵/ایک دیہاتی خاتون اپنی بیٹیوں کے ساتھ

۱۶/قلعہ ہاری پربت: ص:۷۴

۱۷/ایک پجاری تختِ سلیمان (شنکر آچاریہ) مندر کو پانی لیتے ہوئے: ص:۷۳

۱۸/گنجان آبادی زونٹھی کوہل: ص:۷۰

۱۹/کسی نالے پر: ص:۹۰

۲۰/ایک شکارا: کشمیر گنڈ والا

۲۱/درگاہ حضرت بل: ص:۹۴
۲۲/اونت (ووبتہ کدل) پل: ص:۹۲
۲۳/نہر میں بھیڑ نہاتے ہوئے: ص:۹۳
۲۴/چشمہ شاہی: ص:۹۹
۲۵/مچھوار پانی میں جال ڈالتے ہوئے: ص:۸۸
۲۶/دیہاتی خواتین دھان کی فصل کاٹتے ہوئے: ص:۱۰۲
۲۷/ڈل، پھرتے جھیل ڈل کے اراضی کے قطعات
جن پر سبزی وغیرہ اگائی جاتی تھی: ص:۹۱
۲۸/جھیل ڈل میں مچھوارا: ص:۱۰۶
۲۹/چار چناری: ص:۹۹: جھیل ڈل
۳۰/شالیمار: سیاہ رنگ مرمر کا چبوترہ: ص:۱۰۹
۳۱/دوکانات: بھانت بھانت کے: ص:۳۱
۳۲/لکڑی پر کندہ کاری کرنے والے کاریگر: ص:۱۰۱
۳۳/گاؤں سے سرینگر دودھ کا مٹکا (گڑھا) لانے والا: ص:۱۶۱
۳۴/دستہ کرگھوں پر پارچہ، ابریشم سے بنتے ہوئے: ص:۱۵۶
۳۵/کشمیری مسلم خاتون اپنے بچے کے ساتھ: ص:۱۵۸
۳۶/کھلن مرگ میں گڈریا بھیڑ بکریوں کے ساتھ: ص:۱۶۸
۳۷/امرناتھ یاترا کے دوران ایک سادھو ملبوسات کے بغیر: ص:۱۸۱
۳۸/ایک کسان ہل لیتے ہوئے اپنے بیٹے کے ساتھ: ص:۱۶۳
۳۹/گاؤں کی سب سے اعلیٰ عمارت مسجد شریف ہے: ص:۲۱۹
۴۰/مولوی صاحب گھوڑے کی سواری لے کر اپنے کام پر جاتے ہوئے: ص:۲۷۵
۴۱/بانہال میں دھان کے کھیت بیچ میں پتھروں سے بنے ہیں: ص:۳۴۴

پیرسے (Pearce) جدھر سے بھی گزرا، جہاں بھی گیا، اُس نے اپنے سفرنامے میں حتی الامکان جملہ تفاصیل کے ساتھ چلتے چلتے اپنے الفاظ میں بولتی تصویریں اُتارنے کی کوشش کی ہے اور اِس سفرنامے میں دی گئیں اُس کی خود اُٹھائی ہوئی تصویریں کشمیر کی بولتی تاریخ ہیں۔ نالہ مار ہو یا حبہ کدل، حضرت بل ہو یا خانقاہ معلیٰ، جھیل ڈل ہو یا وتستا (دریائے جہلم)، جھیل ڈل کا سبزی فروش ہو یا پری محل، تختِ سلیمان ہو یا اُمرناتھ یاترا، اَب سب کچھ بدلا بدلا ہے اور پیرسے (Pearce) کا سفرنامہ قصہ پارینہ ہی لگتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اگلے وقتوں کے اہلِ دانش دوسرے ملکوں سے علم و آگہی حاصل کرنے کے لئے یہاں آیا کرتے تھے، لیکن اَب یہی اہلِ علم و عرفان لوگوں کی پناہ گاہ ایشیاء کی تفریح گاہ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ شومت کا منفرد ذات پات سے پاک وحدت الوہی کا تصور کشمیر ہی میں پروان چڑھا۔ بودھ مت کے بنیادی افہام و تفہیم کے سوتے کشمیر ہی کے پھوٹے۔ اِس تہذیبی ثقافت کے لین دین کا ثمرِ لطیف کی صورت میں بدھ مت چین تک یہیں سے پہنچا۔

اَپنے سفرنامے کے دیباچے (Preface) کا آغاز ہی وہ یوں کرتے ہیں:

''یہ کہانی اُس ملک اور اُس میں رہنے والے باسکینوں کی ہے جو رقبہ کے لحاظ سے انگلستان اور سکاٹ لینڈ یا منے سوٹا (State of Minnesota) کی ریاست کے برابر ہے لیکن جس کی سرحدیں یخ بستہ برفانی تودوں، گرم اُبلتے چشموں اور تپتے ریگزاروں سے ملتی ہیں۔ اللہ نے اس پر اَپنی عنایات کی بارش کی ہے کہ یہاں کی زرخیز زمین سے

بہت زیادہ اَناج پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی یہاں کے بہت سارے لوگ بھوک سے نڈھال ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں دُنیا کی بہترین ریشم پیدا ہوتی ہے اور سب سے زیادہ نرم و ملائم اُون کی پیداوار بھی یہیں ہوتی ہے لیکن یہاں کے باشندوں کو تن ڈھانپنے کے لئے اَچھے اور عمدہ کپڑے میسر نہیں۔ یہاں کی سرزمین میں لعل و جواہر کے دفینے ہیں جن سے بھی لوگ مستفید نہیں ہوتے۔ اِس پہ لکھنے والوں نے اِسے "وادیٔ شادماں" (The Happy Valley) قرار دیا ہے جب کہ وہی لوگ خوش و خرم ہیں جو تفریحاً یہاں سیر کرنے کو آتے ہیں نہ کہ وہ جو یہاں رہتے ہیں"۔

بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے!
ہمالہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے!

اِسی دیباچے میں آگے بھی وہ یہی کہتا ہے کہ "اَپنے ہوائی سفر کے دوران جو دِلربا مناظر فلک بوس و برف پوش چوٹیاں اُس نے دیکھیں وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے لگا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ اگر رُوئے زمین پر کہیں جنت ہے وہ یہیں ہے، یہیں ہے اور یہیں ہے" میرے ساتھی ہمسفر نے زور کا قہقہہ مارا اور کہا کہ یہ مغل شہنشاہ جہانگیر کا ہی ایک شعر ہے۔

"وادیٔ کشمیر کے آثارِ قدیمہ، قدیم ورثے، اور ہم سے پہلے یہاں آئے ہوئے لوگوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تہذیب و تمدن

بہت قدیم بھی ہے اور عظیم بھی۔ ہاں تو یہ بات ضرور ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے اسلاف کی عظمت سے بے خبر ہیں"۔

پُراسرار طور پر پیرے کشمیر کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حالیہ دنوں میں ریاست جموں و کشمیر کے بارے میں بہت چرچے رہے ہیں۔ دونوں ہمسایہ ممالک کے تعلقات اِسی ایک مسئلہ کی وجہ سے کشیدہ رہے ہیں اور آپسی شکوک و شبہات کی بنیاد پر کروڑوں روپیہ دُور دراز اور دشوار گزار سرحدوں کی نگہبانی پر صرف کیا جاتا ہے۔ دنیا کی بُلند ترین سرحدی چوکیاں آکسائچن کے سرد ترین برفانی چوٹیوں پر واقع ہیں جہاں سال بھر دَرجۂ حرارت نقطۂ اُنجماد سے نیچے ہی رہتا ہے۔ یہ سرحدی چوکیاں دنیا کی بہت ہی بلکہ سب سے زیادہ مہنگی چوکیاں ہیں جو ایشیا کے ان دونوں مقابلتاً غریب ممالک کے لئے ناقابلِ برداشت بھی ہیں...... "یہی کشمیر ہے" اور یہی اُس سرزمین کی تصویر بھی کہ جس پہ آپس میں لڑائی بھی لڑی گئی۔ حقِ خود ارادیت حاصل کرنے کے لئے تاکہ وہ خود اُپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس میں، میں نے کئی بار یہاں آ کر رنگ بھر دیئے ہیں تاکہ کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پیشتر یہ جان سکیں کہ اِس اَرضی جنّت میں رہنے والے لوگوں کا ماضی اور حال کیسا رہا ہے اور یہ بھی کہ اُنہیں اپنے وطن مالوف سے کتنی محبت ہے اور یہ کہ اُن کا عظیم ماضی کیا تھا اور آگے کیا بن کر اُبھر سکتا ہے ؎

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

پیرے جرویس (Pearce Gervio) کئی بار کشمیر آئے ہیں اور

جب بھی آئے ہیں' ہوائی جہاز کے ذریعہ ہی اُپنے میزبان دوست بھارتی فوج کے بے نام 'جرنل کے ساتھ' آئے ہیں اُنہی کے نجی ہاؤس بوٹ میں رہنے کیلئے' جسکے ساتھ ایک ڈونگا مطبخ کے طور ساتھ ہی لگا تھا۔ اِسی سفرنامے میں کئی اور آرمی آفیسروں کے نجی ہاؤس بوٹوں کا پتہ چلتا ہے۔ پیر ستے نے کسی ایک آفسر کا نام نہیں لیا ہے اور نہ ہی کہیں اُپنی سیاحتوں یا کسی ایک ثقافتی زیارت کی تاریخ دی ہے۔ لداخ کے مُمتاز ادیب' صحافی' محقق اور دانشور عبدالغنی شیخ کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۹۵۴ء میں وارِدِ کشمیر ہوا جس کا صحیح اندازہ میں نے خود بھی پہلے ہی کیا تھا۔ نتیجہ کے طور اِس سفرنامے کی تاریخی اہمیت اور قدر و قیمت متاثر ہوگئی ہے یہاں تک کہ اِس کتاب کے سر ورق' پُشت یا اِس کے تین سو تیس (330) صفحات پر پھیلے متن میں کہیں بھی' سالِ اشاعت یا سیاحت کی تاریخ درج نہیں ایکسیشن نمبر (Acc: No.9102/ 17924) کے بغیر جو ایس۔ پی۔ ایس۔ میوزیم لائبریری میں دستیاب چھپی کتاب کے صفحہ نمبر 22 پر دیا گیا ہے۔ یہ بات عجیب سی لگتی لیکن کیا کیا جائے یہ ایک حقیقت ہے کوئی افسانہ نہیں' جس پر یقین کے بغیر کوئی چارہ نہیں کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی کہ پیئر سے نے کہیں کوئی تاریخ درج نہیں کی کشمیر آنے اور نہ جانے کی۔ اُس نے دوست کا نام لیا ہے، نہ دُشمن کا نہ اپنے میزبان آرمی کرنل کا اور نہ کسی قابلِ ذِکر کشمیری کاریگر مزدور کا، نہ کسی وزیراعظم کا تاکہ زمانے کا تعین کرنے میں مدد ملتی۔ پیرِ ستے پہلے بھی یعنی ۱۹۵۴ء سے قبل بھی کشمیر کی سیاست پر آچکا تھا' لیکن حال لکھا اسی آخری سیاحی کے اختتام پر ہی۔ پیرَ سے اپنا کشمیر کا واپسی کا سفر پیر پنچال کے بانہال کارٹ روڈ ہی سے کرتا ہے۔ جبکہ ابھی

جواہر ٹنل وجُود میں نہیں آئی تھی۔ اِس بات کا اعادہ کرنا یہاں بے جا نہیں ہوگا کہ جواہر ٹنل ۱۹۵۵ء میں ٹریفک کیلئے کھول دیا گیا۔ پیرَ سے کئی ممتاز انجینئروں کے جموں سرینگر شاہراہ کئی جگہوں پر ٹنل کھودنے کی تجاویز کا اعادہ کرتا ہے جس پر اگر عمل کیا جاتا تو یہ دقت طلب سفر آسان ہوتا اور وقت بھی یہ پہاڑی مسافت طے کرنے میں کم لگتا۔ چونکہ ایسے سفر نامے وقت آنے پر قاموس کا کام کرتے ہیں اس لئے سفر کی تاریخ وغیرہ دیگر تفصیلات کے ساتھ دی گئی ہوں تو اسکی اعتباریت میں اضافہ ہوتا۔ پیرسے کی نجی زندگی کے بارے میں کتاب میں کچھ درج نہیں اور نا ہی اُسکا کوئی سوانحی خاکہ کہیں دیا گیا ہے۔

وہ شہر سرینگر کی تاسیس کے ساتھ ساتھ دریائے جہلم (وِیتھ) کو کشمیری تہذیب کی شہ رگ قرار دیتا ہے۔ وہ کشمیری تہذیب کی علامت اس دریا پر لگے پُلوں کا تاریخی پس منظر کے ساتھ ذکر کرتے کرتے اُس کی تصویر بھی اپنے سفرنامے میں شامل کرنے سے نہیں چوکتا۔ وہ تحقیق و تجسس سے کام لیکر دریائی سفر کا ذکر کرتا ہے اور تفصیلاً لکھتا ہے کہ کس طرح اگلے وقتوں سے جہلم کی سطح آب پر جلوس نکلنے کا چلن تھا۔ سرینگر کلب کا ذکر کرتے ہوئے اُسے یہ بات ماننے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اِس میں وہ سبھی سہولیات دستیاب ہیں جو برتانیہ کے کلبوں میں شائقین کو فراہم کی جاتی ہیں۔ ہری پرتاپ میوزیم لائبریری کے لئے وقف ہونے سے پہلے شاہی نعمت کدہ (Banquet Hall) تھا۔ جسے اَب یعنی 2005ء میں ہری نواس منتقل کرنے کی تجویز ہے۔ سرینگر آرٹس ایمپوریم میں' پہلے برٹش ریذیڈنسی کا دفتر تھا' جہاں شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ کے دَور میں تہذیب محل کی تعمیر کا منصوبہ تھا' جس پر مختلف وجوہات کی



جہلم میں رہائشی کشتیاں



گوالے......جو میلوں پیدل چل کر شہر میں دودھ پہنچاتے تھے

بناء پر عمل نہ کیا گیا۔ پیرؔ سے کا کہنا ہے کہ کشمیر کے سمیت ہندوستان میں ضروریاتِ زندگی برطانیہ کے مقابلہ میں دُگنی قیمت پر ملتی ہیں' وہ یہاں کے مٹی کے بنائے چُولہے پر بنے کھانے کی بار بار تعریف کرتا ہے۔ چونکہ اُس نے زیادہ تر وقت ہاؤس بوٹ میں گزارا' اور ہمارے ہانجی بھائیوں کے یہاں مٹی کے بنے ایسے چولہے عام ہیں جس پر جہاں جی چاہے لیجا کر ہانڈی چڑھائی جاسکتی ہے۔' جو دریاؤں کے کنارے آباد ہیں۔

اُس نے صاف صاف لکھا ہے کہ کشمیری لوگ اُپنے گھروں کی گندہ نالیوں کا رُخ پاخانوں کے سمیت دَریائے جہلم کی طرف کرتے ہیں' اس بات کا خیال رکھے بغیر کہ ایسا کرنے سے مُہلک بیماریاں لگ سکتی ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ ہم اپنے آپ پر کتنا بڑا ظلم کرتے ہیں۔ پیرؔ سے شنکر آچاریہ کے بجائے تختِ سُلیمان کے مندر کا ذکر کرتے ہیں۔ سنٹرل مشن ہائی سکول کو دیکھ کر' اُسے ٹنڈل بسکو کی یاد ستاتی ہے جس نے یہاں جدید تعلیم کی بُنیاد ڈالی اور جسے تعلیم رائج کرتے وقت یہاں بڑی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خانقاہِ معلیٰ کا ذکر آئے یا سرینگر کی جامع مسجد کا پیرؔ سے تفصیلات میں جانے سے باز نہیں آتا۔ سرائے صفا کدل (بوٹہ سرائے) نالہٗ مار ہو' ژونٹھی کوہل ہو یا کٹہ کوہل۔ قلعۂ ہاری پربت ہو' ناگر نگر ہو یا بادام واری' جھیل ڈل ہو' جھیل وُلر ہو' مانسبل ہو' یا نشاط شالیمار اُچھ بل ہو کہ ویری ناگ' چشمہ شاہی ہو کہ پری محل وہ نہ صرف تاریخی جزئیات دیتے ہیں بلکہ اِردگرد کے ماحول زَبروَن اور ہرموکھ کی پہاڑی چوٹیوں کی اپنے الفاظ میں جیتی جاگتی تصویر بھی اُتارے ہیں۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ شہزادہ رینچن والئ تبت کا بیٹا ۱۳۲۰ء میں صدرالدین کے نام سے حضرت عبدالرّحمان شرف

الدین بلبل صاحب کے ہاتھوں دائرہ اسلام میں آکر یہاں کا پہلا نومُسلم حکمران بنا۔ پیرؔ سے غلطی سے جامع مسجد سرینگر کی تعمیر اُس کے کھاتے میں ڈالتا ہے جبکہ اسکی تعمیر شاہِ ہمدانؒ کی ایماء پر سلطان سکندر کے ہاتھوں ہوئی گو کہ بعد کے تاریخی اُدوار میں اسکی تجدید و ترمیم ہوتی رہی لیکن اسکی تاسیس کی سعادت اُسی کو حاصل ہے۔ اسی طرح شادی پور سنگم کو جہاں دریائے سندھ اور جہلم ملتے ہیں' پوتر استھاپن' اس معنیٰ میں کہنے سے رہ گئے ہیں کہ یہاں کشمیری پنڈت برادری سورگباشی احباب و اقارب کی پوتر آگ کی نذر کرنے کے بعد جمع کی گئی استھیاں' پانی میں بہادیتے ہیں' جیسا کہ ہردوار جاکر ہندو لوگ یہ مذہبی رسم پوری کرتے ہیں۔ عام لوگوں کے دریا میں یا کسی نہر میں عُریاں نہانے کو بیان کرتے ہوئے پیرؔ سے کہتے ہیں کہ کشمیری مرد کوئی پاسِ حیا نہیں کرتے وہ کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے نہاتے وقت پانی میں ناف تک ڈوبے رہنے کو ہی کافی سمجھتے ہیں جبکہ ہندوستانی لوگ لنگوٹی پہن کر ہی نہانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ سمبل سے حاجن جاتے ہوئے ایک بار پیرؔ سے (Pearce) نے سو کے قریب مچھلیاں پکڑ کر ڈونگا کھینے والے مانجھیوں کو پکانے کو دیں تو اُنہوں نے وہ دُھوپ میں سُکھا کے سردیوں میں کھانے کو رکھ دیں۔ اَپنے ہی دریائی سفر میں وہ سنگھاڑوں کا خوب ذکر کرتے ہیں' جنکی یہاں گئے دِنوں میں بڑی تجارت بھی ہوتی تھی اور جو خوراک کے طور بھی برتے جاتے تھے اور وہی عام لوگوں کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بھی تھا۔ زیارت بابا شکورُالدین پر بھی وہ حاضری دیتے ہیں اور زین دیپ کی یاد بھی تازہ کرتے ہیں۔ تاریخی کُتب کی موجودگی اور وہ بھی انگریزی میں ہوتے ہوئے' وادئ کشمیر۔ تاریخ کا باب اس سفرنامے میں شامل کرنے

میں کوئی جواز نہیں پھر بھی اُس کے ذوقِ تجسّس کی داد دیئے بنا نہیں رہا جا سکتا۔

جہلم اور نالہ مار وغیرہ کی انسانی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے وہ روایتی طور عمارتی لکڑی چیرنے، کشتی رانی اور کشتی سازی جس میں ہاؤس بوٹ بنانا بھی شامل ہے، دیگر فنون میں کشمیریوں کی تردستی اور تر دماغی کے قائل ہیں۔

ساری رُودادِ سفر میں پیر سے (Pearce) نے بہت کم لوگوں کا نام لیا ہے جن میں سے ایک ڈاکٹر عبدالرحمان کا ہے جو پیشے سے حکیم تھا اور ڈاکٹر کہلاتا تھا اور اُسے اور اُسکے میزبان دوست کرنل صاحب کو جھیلِ ڈل سے رینگر کلب جاتے ہوئے جہلم کے کنارے بنڈ پر ملے تھے۔ کرنل صاحب نے حکیم صاحب کا تعارّف کراتے ہوئے کہا کہ ''انہی کی بدولت مجھے نئی زندگی ملی ورنہ میں بیس سال پہلے ہی مَر چکا ہوتا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان نے ہمیں بڑے پُر تپاک سے دعوت دی اور ہم اُنکی نہایت ہی عمدہ ٹانگہ سواری پر بیٹھ گئے۔ یہ پہلی بار تھا کہ مجھے اس بات کیلئے شرمندگی کا احساس نہیں ہوا کہ میں ایک ایسے ٹانگہ پر سوار کیوں ہوا ہوں جسے ایک کمزور ادھ مُوا گھوڑا کھینچ رہا ہے۔ گلیوں کی بھُول بھلیوں کو پھلانگتے ہوئے ہم اُسکے گھر پہنچ کے فرش پر بیٹھ گئے جیسا کہ کشمیر میں چلن ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد منقّش چاندی کے گلاس نُما مگ میں ہم نے بغیر دُودھ کے (سیاہ کافی) نوش فرمائی۔ اسکے بعد کرنل دوست نے مجھے اپنا ایک واقعہ سُنایا کہ اُس کی بہن جوڑوں کے دَرد میں مُبتلا تھی، بہت علاج کیا بڑا ہی پیسہ خرچ کیا۔ کوئی اَفاقہ نہیں ہوا۔ اُسے اپنے ساتھ کشمیر لایا کہ شاید یہاں کے حیات اَفزا آبِ ہوا سے دَرد میں کمی واقع ہو جائے۔ میرے دوست ڈاکٹر نوا سے (Dr. Neve)، جو ایک جراح تھا اور اپنے ڈاکٹر بھائی کے

ساتھ دَوائی کی دوکان چلا رہے تھے نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ کوئی حرج نہیں کہ اگر تُم اسے ڈاکٹر عبدالرحمان کے پاس لیجاؤ گے وہ نہایت ہی مشاق اور ماہر حکیم ہیں اور جڑی بوٹیوں کے بے مثال ماہر ہیں۔ اُسی کے مشورہ پر تین ماہ کیلئے میں نے اَپنی بہن کا علاج کروایا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ وہ مکمل تندرستی کے ۱۵ سال بعد وفات پا گئیں۔

کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد اُسے خود بھی اپینڈ سائٹس کی شکایت ہوئی۔ دہلی کے آرمی اسپتال میں بھرتی ہوا ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اُسے اپینڈکس کے آپریشن کی ضرورت تھی۔ اُسے جراحی کے چاقو سے بڑا ہی ڈر لگتا تھا۔ وہ جوں توں کر کے سرینگر پہنچا اور سیدھا ڈاکٹر عبدالرحمان کے پاس گیا۔ اُسے سارا ماجرا سُنایا۔ اُس نے دیسی کہیئے، آیورویدک کہیئے یا یونانی، دَوائی کی ایک ہی شیشی دی جو اُس نے حسبِ ہدایات پی ڈالی۔ دَرد ختم ہوا۔ اسپتال میں داخلہ سے پہلے اُس کا مُلاحظہ ہوا۔ اپنڈکس (Appendix) کے دَرد کے ساتھ ساتھ اُسکی ساری علامتیں غائب تھیں۔ ڈاکٹر تھا اور اس کا بتایا ہوا اپنڈکس (Appexdix) کا روگ۔ وہ بجا طور پر ڈاکٹر عبدالرحمان (حکیم) کا احسان مند بھی تھا اور مشکور بھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمان کے ساتھ پیرسے کے بھی بعد میں روابط رہے جس نے اُس کے ساتھ مُلاقاتوں میں یہ بھی بتایا کہ علاج ومعالجہ اُس کا خاندانی پیشہ ہے اور اُسے خاندان کے شاہی دربار کے ساتھ اس سلسلہ کے تعلقات صدیوں سے رہے ہیں اور یہ کہ وہ اُس یوگی (شری بھٹ؟) کے خاندان کے ساتھ نسلی رشتہ رکھتے ہیں، جس نے زین العابدین بڈشاہ کا کامیاب علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر

عبدالرحمان نے پیرے کو فارسی زبان میں لکھے اور پانچ سو سال پُرانے مخطوطے بھی دکھائے۔ نہ معلوم اُس کے بعد اُن کا کیا ہوا۔ نہ گھر، نہ گلی کوچے کا کہیں نام ہے۔

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ شبنم نے کُچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

راقم الحروف جولائی۔ اگست ۱۹۸۸ء کو ٹنگمرگ کے سرکاری ڈاک بنگلے میں مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر لیگو کے ساتھ قومی یک جہتی کیمپ میں ریاستی کلچرل اکادمی کی نمائندگی کرتے ہوئے قیام پذیر تھا۔ دو ہندوستانی ڈاکٹر ایک جرمن دوا ساز کمپنی کیلئے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ایک کمرے میں مقیم تھے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ پچھلے پچیس سال سے فیروز پورہ ٹنگمرگ کے ایک معمر ماہر نباتات، دیہاتی کی خداداد صلاحیتوں کا فائدہ اُٹھا کر جڑی بوٹیوں کا اِنتخاب جنگلات میں گھوم پھر کر کرتے ہیں۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کرد
کہ نُورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زُلیخا را

کشمیری شال کا ذکر خیر کرتے ہوئے پیرے، رقمطراز ہے کہ کیسے ۱۷۹۶ء میں افغان گورنر عبداللہ خان نے بغداد سے آئے ایک بُزرگ یحییٰ کو ایک کشمیری شال واپسی پر تحفتاً پیش کیا جو اُس نے مصر کے سیّد شاہی دربار تک پہنچا دیا۔ فرانس کا مطلق العنان حُکمران اپنا فلیٹ (بحری بیڑا) لیکر مصر تک پہنچا تا کہ وہ ہند میں برطانوی حکومت کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کرے۔ نیلسن (Nelson) نے دریائے نیل پر اُسے شکست فاش دی۔ مصر خدیو (Khedive) کے شاہی دربار کی جانب سے، سید یحییٰ سے ملے

شال کو نپولین بونا پارٹ کو تحفہ کے طور دیا جس نے یہ نارنگی رنگ کا کشمیری شال اپنی چہیتی جوزفائن (Jose Phine) کو پیش کیا۔ اِس طرح کشمیری شال کی شہرت فرانس تک جا پہنچی اور اُسکی تجارت کو چار چاند لگ گئے۔ کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک اور ملکہ حبہ خاتون سے بجا طور پر قلوب گلمرگ کو دیکھ کے پیرے مسحور ہوتا ہے۔ یہاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے ریوڑ دیکھ کر یہاں کے نرم وملائم اُون کی وہ بڑی تعریف کرتا ہے لیکن اُسے افسوس ہے کہ یہاں اون کی تجارت کرنے والے لوگ اور بنکر یا جولا ہے اُسے اچھی طرح دھوتے نہیں جس کی وجہ سے اُسے فوراً دیمک چاٹ کر جاتے ہیں نیز یہ کہ بُنتے وقت اِس میں ڈھیلا پن رہتا ہے جس کی بنا، پر تھوڑی دیر پہننے کے بعد ڈول سا لگتا ہے۔

یہاں کی دستکاریوں جن میں کاغذ سازی، ریشم سازی، قالین بافی، پیپر ماشی، اسلحہ سازی، گبہ دوزی، شالبافی، نمدہ سازی، سوزن کاری، نقش گیری، کندہ کاری، لکڑی کی منقش سامان سازی و دیگر تجارتی فنون کا بھی وہ جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں کے زمین کی زرخیزیت اور پیداواریت کے وہ قائل ہیں۔ اُن کا یہ بھی ماننا ہے کہ کشمیری بہت ہی ذہین ہیں لیکن مناسب ماحول اور ذرائع میسّر نہ ہونے کی وجہ سے پیچھے رہنے لگے ہیں۔ انہیں صحیح رہنمائی اور نکاس کی بھی ضرورت ہے۔

وہ اُمرناتھ یاترا کو بھی گئے، پہلگام تک کا سفر گاڑی کے ذریعہ کیا۔ وہاں سے اُمرناتھ گپھا تک ۳۵ میل کا سفر گھوڑوں پر طے کیا۔ سردی اور بہت ساری دقتوں کا مقابلہ بڑی خندہ پیشانی سے کیا۔ خوش بختی سے انہیں ایک ایسا مرکبان

مل گیا جس کے گھوڑے چاک و چوبند تھے جس کی وجہ سے یاترا ٹھیک طریقہ
سے انجام پائی۔ اُسے دُگنی مزدوری دی اور اُس کے عوض اُس نے دُگنے رفتار
سے گھوڑے دوڑائے۔ گھوڑوں کے ساتھ وہ خود بھی سرپٹ دوڑے۔ وقت کم لگا
اور پورنماشی آتے آتے بھی درشن ہوئے۔ پہلگام سے آگے چونکہ بَرف اور یخ
کے تودوں کی وجہ سے پھسلن تھی اس لئے کچھ کشمیری لوگ، دھان کے گھاس کا
پاؤں کا پہناوا ''پُلہوز'' بنانا یاتریوں کو سکھاتے تا کہ وہ خوش و خرم طریقہ سے شِولنگم
کے درشن کی سعادت حاصل کریں۔ اَمرناتھ گپھا پر اُنہیں ایک انوکھا واقعہ پیش
آیا متن کا ہوبہو ترجمہ ہی بہتر رہیگا:۔

''میں نے زن و شوہر کا ایک جوڑا دیکھا۔ اُن کے سر کے بال سفید
ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ شوہر بوڑھا تھا۔ اُسکی داڑھی
بھی چِٹی تھی۔ جبکہ عورت کے چہرے پر متانت و انکساری تھی۔ دونوں ایک
نوجوان کے ہاتھوں کے سہارے شِولنگ کے سامنے کھڑے تھے، وہ نوجوان
آنکھوں کی بنیائی سے محروم تھا۔ وہ بوڑھے لوگ ابھی آگے دیکھ رہے تھے اور
اس نوجوان سے شاید کہہ رہے تھے کہ کیا تم بھگوان کو دیکھ سکتے ہو تو اس نے
سر ہلایا۔ ہاں! وہ آٹھویں بار یاترا پر آئے تھے۔ عورت جب دَرشن کر کے
اُٹھی۔ تھوڑی دُور چل کے گر پڑی۔ میں نے (پیر سے) اُسکے مُنہ میں تھوڑی
سی برانڈی ڈالدی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بیٹے کو بھگوان شِو کے چرنوں
میں جنم دیا۔ ایسا ایک سادھو کے کہنے کے مطابق ہوا۔ وہ عورت مرگئی لیکن
بھگوان نے اُس کے خاندان کی گود بھر دی تا کہ زندگی کا ناتمام سفر جاری
رہے''۔ اَمرناتھ یاترا سے ایمان وایقان کی بے بہا دولت سمیٹ کر پیر سے

لیہہ لداخ کی سیاحت پر نکلے۔ لداخ جسے ''اَرضِ قمر'' یا ''چندر ما کی بُھومی
(Moon land) کہا جاتا ہے، سیاحوں کے لئے اس لئے باعثِ کشش
ہے کہ یہاں کے باشندے بڑے ہی جفاکش، محنتی اور ایمان دار ہیں۔ وہ اس
بے آب و گیاہ وادی میں دشت نوَردی کرتے ہوئے، پولو (Polo) کے مقبولِ
عام کھیل سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ ستوپوں، گُمپوں کے طرزِ تعمیر، اُن کی
دیواری تصاویر، اُن کے رہن سہن، اُنکی ملبوسات، اُن کے میلوں تہواروں سے
بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ سرینگر سے لداخ جاتے ہوئے وہ راستے میں آنے
والے پڑاؤں کا ذکر کرنا نہیں بھولے جو اِس طرح ہیں۔ سرینگر، سونمرگ۔
بالتل۔ متائن، زوجیلا، دُراس، ہمبش، کرگل جو سُورُو دریا کے کنارے آباد
ہے۔ کرگل سے آگے، نامی کھالا نمک جھل، لامسری بودھ وہار، فوتو لا، لامایُورُو،
سپدل، آلچی گمپا، نی زیاپور، نیمو، بزگو، کھلسی، چمپس اور لیہہ لداخ، سائبریا
کے بعد یہ خطہ جو چھوٹا تبت بھی کہلاتا ہے دُنیا کا دوسرا بلند ترین و سرد ترین خطہ
ہے جہاں درجۂ حرارت نقطہ انجماد سے چالیس پینتالیس ڈگری نیچے تک رہتا
ہے۔ وہ لداخی گُر گُر چائے کا ذکر بڑے چاؤ سے کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ
یہاں بودھ آبادی میں تعدادِ شَو (Polyandry) پر سماج کی بنیاد ہے
اور یہاں کی عورتوں کو بڑی آزادی اور بہت سے اختیارات حاصل ہیں۔ لیہہ
سے آگے چانگ تھانگ اور چشول کے ایسے مقامات ہیں جہاں نمک کے جھیل
اور پشمینہ بکریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ عبدالغنی شیخ کی تحقیق کے مطابق پیر سے
(Pearce) ۱۹۵۴ء میں وارِدِ لداخ ہوئے جہاں کے لوگوں کے بارے
میں اُن کی رائے یہ ہے کہ:

’آج یہ اپنی قسمت پر قانع ہیں۔ ایک دن جب یہ نیند سے جاگیں گے اور اِس سنگلاخ، بنجر زمین غریب دیش میں دولت کی فراوانی ہوگی تو کیا یہ آج سے زیادہ خوش ہونگے؟ یہ خیال مجھے آتا ہے“ [1]

صوبۂ لداخ وادیٔ کشمیر کے شمال، جنوب اور مغرب و مشرق کے دامن میں پھیلا ہوا ہے شمالی سرینگر کی جانب بلتستان ہے، جبکہ لداخ اس کے مشرق اور ترکستان شمال کی طرف واقع ہے۔ پہاڑی سلسلے سے گھِری ہوئی بلتستان کی وادی لداخ کی بے آب وگیاہ وادی کا ایک حصہ ہے۔

اِنہی پہاڑی چوٹیوں کے دَرمیان ایورسٹ چوٹی کے بعد دوسری سب سے بُلند چوٹی کے ٹُو جو اَب ماؤنٹ گوڈوِن آسٹن (Mount Godwin austin) کے نام سے جانی جاتی ہے اور جس کی بلندی سطحِ سمندر سے ۲۸۲۵۰ فٹ ہے۔ دوسری دو اور بلند چوٹیاں جو علی الترتیب ۲۶۴۷۰ اور ۲۵۶۰۰ فٹ اونچی ہیں گاشر برم (Gasharbrum) اور مشر برم (Masharbrum) کے ناموں سے مشہور ہیں۔ بلتور (Baltor) جیسا بڑا گلیشیر یہی واقع ہے بلتستان کا سب سے اہم قصبہ بلکہ یوں کہئے کہ اس کی راجدھانی سکردو (Skardu) ہے۔ یہاں چھ ہزار فٹ کی بلندی پر دریائے سندھ (Indus) اور شگار (Shigar) دریاؤں کا سنگم واقع ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے بہادر اور جنگجو ہیں جنہوں نے چین کے توسیع پسندانہ عزائم کو آٹھویں صدی میں پسپا کیا۔ ڈوگرہ کمانڈر زورآور سنگھ کو (Zorawar Singh) یہیں پر بلتیوں کے ہاتھ شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

---

[1] شیرازہ: جموں کشمیر لداخ ایڈیٹر محمد اشرف ٹاک، لداخ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں عبدالغنی شیخ: جلد ۲۸۰: ۲۷۰: جلد ۴۲: شمارہ ۶ تا ۹: جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی۔

بلتستان کا بے آب وگیاہ میدان ۲۵ میل لمبا اور ۵ (پانچ) میل چوڑا ہے یہاں کے لوگوں کے خدو خال لداخیوں کی طرح منگول نسل سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان میں دردؔ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی آبادی زیادہ مُسلمان ہے۔ یہاں کی عورتیں لداخی عورتوں سے بالکل مختلف (polygamy) ہیں۔ یہاں لداخ کے مقابلہ میں تعدد زن (Polygamy) پر خاندان کی بنیاد ہے۔ گلگت شہر سرینگر سے دو سو پچیس (۲۲۵) میل کی دوری پر واقع ہے۔ راستے میں پندرہ پڑاو آتے تھے۔ راستہ بڑا ہی دُشوار گزار تھا اور یہیں پر فوج کے لئے سامان لانے اور لے جانے کیلئے کشمیریوں کو بیگار (froced labour) پر لگایا جاتا تھا جن میں اکثر و بیشتر جان سے ہاتھ دھوتے تھے۔

خاکِ پاک خطۂ کشمیر ہے جنت مگر
قہرِ دوزخ کا نمونہ ہے وہاں بیگار بھی

(محمد دین فوق)

رُوسی افواج کی پیش قدمی روکنے کیلئے ہی حکومتِ ہند کو گلگت صوبہ ہاتھ میں لینے کو اُکسایا اور ۱۸۹۲ء میں بانڈی پور گلگت روڈ تعمیر کیا گیا۔ اُس ساری مزاحمت کا حال نائٹ (knight) نے اپنی کتاب ”جہاں تین سلطنتیں ملتی ہیں“ (where three empires meet) میں بیان کیا ہے۔ استور (Astor) بنجی (Bunji) چلاس (chilas) ہنزا (Hunza) اور جگہوں کو ملا کر دردِستان بنا ہے۔ یہیں سے آگے پاکستان کو بھی راستہ جاتا ہے اور حمیت وغیرت کی علامت بھی۔

گلگت ہی کے جنوب مشرق میں پونچھ واقع ہے۔ پاکستان پنجاب اور

وادیِ کشمیر کے درمیان آتا ہے۔ پیر سے (pearce) کے یہاں کے لوگ اُپنے آپ کو مارشل نسل سے بتاتے ہیں اور ہندوستانی فوج میں اپنی پشت در پشت خدمات کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔ جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۸) کے دوران اُپنی خدمات کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً مُردوں کی فوج میں مُلازمت کے دَوران گھر سے باہر رہنا لازمی تھا جسکا مطلب یہ تھا کہ عورتیں اُپنی پاکدامنی کو بچائے رکھیں۔ پیر سے (pearce) اُپنی ذاتی واقفیت کی بناء ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک سپاہی جو گھر سے فوجی نوکری کی وجہ سے باہر ہی تھا تو اطلاع ملی کہ اُسکی بیوی کے کسی دوسرے مَرد سے جنسی تعلقات بڑھے ہیں اور یہ کہ وہ حاملہ ہوگئی ہے۔ وہ سپاہی چھُٹی پر آیا اُپنے سُسرال گیا اُپنے گھر آیا، بھائی بہنوں سے ملا اور بیوی سے باورچی خانے میں ملنے گیا۔ وہ اُسکا سُواگت کرنے کو اُٹھی اُس نے (سپاہی نے) اُسکی بدَلی حالت کا اندازہ کرتے ہی اُسپر سٹین گن (sten gun) سے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اُسکا کام تمام کیا۔ کسی نے اُف تک نہیں کی۔ سپاہی بہ سلامت واپس ڈیوٹی پر چلا گیا۔ ۱۹۴۱ء کی مُردم شماری کے مُطابق پونچھ کی نوّے فیصد آبادی مُسلمان تھی۔ کشمیر کی خاتونِ آہن دِدا (Didda) بھی پونچھ کے شاہی دَربار کی شہزادی تھی، یہاں کے لوگ ریچھ کے شِکار کا شوق رکھتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے جنوب میں ہمالیہ پہاڑوں کے اُس پار خطّۂ جموں ہے، جسکا سب سے بڑا شہر جموں ہی ریاست جموں و کشمیر کی سرمائی راجدھانی ہے۔ آج سے سو سال پہلے (Fredrik drew) یہاں کی ڈھلوانوں چھاڑیوں اور جنگلوں کا ذکر کرتا ہے۔ پیر سے کہتا ہے کہ یہیں جموں میں ہی وہ

ایک بہت ہی خوبصورت حسین و جمیل لڑکی سے ملا جیسکے حُسن کی نظیر میں نے اِس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں ایک مشنری (Missonary) کے بنگلہ میں قیام پذیر تھا۔ ساتھ ہی ایک گُردوارہ بھی تھا۔ ہمارے کانوں میں ایک رسیلی آواز، رَس گھولنے لگی، پہلے میں نے اندازہ کیا کہ کسی لڑکی آواز ہے اور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ شباب کی دہلیز پر پہنچی ہوئی ایک لڑکی کی آواز تھی، وہ ایک ساٹن فراک اور چوڑی دار پاجامہ مالاؤں اور سونے چاندی کی زیورات سے مزین حُسن پیکر تھی جو اُپنے والد کے سُر سے سُر ملاتی تھی وہ سیتار کو ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی ساتھ ہی اُس کا اُستاد (گورو) تھا اور سفید ساڑی میں ملبوس اُسکی آیا تھی جس نے بچپن میں اُسکو پالا تھا۔ ہم چارپائی پر بیٹھے تھے، اِتنے میں اِس معصوم بچی نے اُپنے باپ سے سیتار ایک طرف رکھتے ہوئے اور قہقہ لگاتے ہوئے کہا۔ کیا پاپا آپ میرا تعارف اُپنے دوست سے نہیں کرائینگے۔ اُسکا باپ ایک کامیاب اور بہت ہی خوشحال تاجر تھا۔ وہ زندگی کے دن خوش و خرم گزارتا تھا۔ اُسکی اکلوتی بیٹی جسے وہ بہت پیار کرتا تھا بیمار ہوئی۔ جب وہ رُوبصحت ہوئی تو اُسکے فالج زدہ ہاتھ پاؤں دھیرے دھیرے حرکت میں آنے لگے۔ سو فیصد صحت واپس کہاں آتی۔ بایاں پاؤں مفلوج ہی رہا۔ اُسکی ماں جو میرا ایک ہی سہارا تھیں ہم کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ گئیں۔ اُب یہی سنگیت کے سُر ہماری آرادھنا بھی ہے اور زندگی کی روح بھی۔ جب جموں کے اس پار کشمیر وادی لوٹا، اِسٹابری (straw berry) کا موسم تھا۔ جب تک کشمیر میں قیام کیا اُسے روزانہ اُس موسم میں ایک ٹوکری بھر بھیجا کرتا تھا اس اُمید کے ساتھ کہ وہ اس کے کھانے میں شریک ہوگی۔ یہی تسلی کیا کہ عبادت اور دِل کے سکون اور شانتی

سے کم ہے؟

ہم تیرے دیدار کو یُونہی ترستے رہ گئے
دیدہ مُشتاق کے بادل برستے رہ گئے

پیرؔ نے سب سے اہم تیوہاروں ، دیوالی ، دسہرہ ، ہولی ، عید الفطر ، عید الضحیٰ اور کرسمس کا ذکر اُن کے اساطیری اور مذہبی پس منظر کے ساتھ بڑی عزت و احترام سے کرتے ہیں ۔ کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں کے جنم ، مرن اور شادی بیاہ پر انجام دیئے جانے والے رُسوم و رواج کا تفصیلا جائزہ پیش کرنا وہ بھولتے نہیں ۔

ثقافتِ و فنون کے باب میں جہاں اِس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کشمیر میں قدیم زمانے سے عورتوں کو سماجی آزادی حاصل تھی ۔ یہاں ناٹک کو عروج حاصل تھا ۔ للتادتیہ اور زین العابدین کے زمانے میں یہاں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا جسکی وجہ سے فنِ تاریخ نویسی مربُوط اور منضبط فن کے طور آگے بڑھا ۔ صوفیانہ موسیقی یا صوفیانہ کلام کی ایجاد یہاں ہوئی ۔ سنطور جو اِس فنِ شریف کا بنیادی جزء ہے کا خلاقانہ استعمال تا حال جاری ہے ۔ اِسکی آب یاری کرنے میں کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک کا ہاتھ ہے ۔ چھکری ایک مقبولِ عام صنف اَب بھی ہماری موسیقی کا اہم حصہ ہے ۔ زبان و ادب کے ضمن میں لل دید اور حضرت شیخ العالم عرف نند ریشی ہمارے تہذیب کے روشن میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ شتی کنٹھ اور حبہ خاتون کا حوالہ بھی دیتے ہے لیکن سب سے اہم اور تاریخی شخصیت و تہذیبی علامت علمدارِ کشمیر عرف نند ریشی کا نام تک نہیں لیا ہے ۔ اِس بات سے سبھی واقف ہیں کہ حالیہ دنوں تک لل دید کا

کہیں کشمیر کی تواریخوں میں نام تک نہیں تھا جبکہ اُفغان گورنر عطا محمد خاں نے حضرت شیخ العالم اور سُلطان العارفین حضرت مخدوم حمزہ صاحبؒ پر ایک مشترکہ سکہ جاری کیا جو اُنکی عوامی مقبولیت کی بنیاد پر ہی ممکن ہو سکتا تھا ۔ پیر سے (pearce) غلطی سے لل دید کا داستانوی مقبرہ جامع مسجد سرینگر کے قریب بتاتا ہے جبکہ وہ جامع مسجد بیچ بہاڑہ کے شمالی گوشے میں واقع ہے ۔ پیر سے (pearce) یہ کہنے میں حق بہ جانب ہے کہ مُصوری کا ذکر خطاطی اور خوشنویسی کے بغیر ادھورا رہیگا ۔ مُغلوں کے دَورِ حکومت میں محمد حسین زرّیں قلم اور محمد مُراد شیریں قلم خطاطی کے دو بڑے کشمیری نام ہیں جنکا فارسی شاعری میں اپنا اُلگ نام اور مقام تھا ۔ تین سو تیں صفات پر مشتمل اِس سفرنامے میں وادیٔ کشمیر ہی پیر سے (pearce) کی توجہ کا مرکز رہی ہے اس لئے کشمیریوں کے کردار کے خدوخال اور امتیازی خطوط کی نشاندی بھی اُٹھارہویں باب میں کی گئی ہے ۔ چونکہ کشمیریوں کو مُسلسل بیرونی مزاحمت اور مداخلت کا سامنا کرتے ہوئے طویل غلامی کے بدترین تجربات سے گزرنا پڑا جسکی وجہ سے اُسکے کردار میں کچھ خامیوں کا پیدا ہونا کوئی اُچنبھے کی بات نہیں ۔ اِس پر مُستزاد یہ کہ اُسے صبر آزما ناگہانی آفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ ۱۵۵۲ء میں ایک بھونچال آیا جو تین ماہ تک جاری رہا ۔ اس سے پہلے ۱۵۰۰ء کا بھونچال دو ماہ تک آتا رہا ۔ ۱۶۶۲ء کا بھونچال بھی برابر تین ماہ تک وادی کشمیر کو جھولتا رہا ۔ ۱۷۳۵ء میں بھونچال کے جھٹکے تین ماہ تک اور ۱۸۷۸ء میں برابر ایک سال آتے رہے ۔ ۱۸۰۵ء کے ایک اور ہولناک بھونچال میں خانقاہ معلی ڈھہ گئی ۔ ۳۰ رمئی ۱۸۸۵ء سب سے بھیانک بھونچال آیا جس میں بے اندازہ مالی اور جانی

نقصان ہوا۔ جو کچھ کسر باقی رہتی وہ قحط، وبا اور سیلاب جیسی ناقابلِ تسخیر ناگہانی آفتیں پوری کرتی رہی۔ یورپی سیاح، مشنری دانشور اور معالج اور محقق اُسے عیار، بدمعاش فریبی اور جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُسکی تردستی، زُود دماغی اور ذکاوت کے قائل ہے۔ لارنس بے باکانہ اسباب کا اظہار یوں کرتا ہے کہ

"کشمیری وہی ہے جو اُس کے حکمرانوں نے اُسے بنایا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے اور اُمید کہ عدل و انصاف پر مبنی دو پیڑھیوں کا مضبوط انتظامیہ اُسے ایک مفید، ذہن اور ذہانت دار انسان میں تبدیل کر کے چھوڑے گا"۔

قدیم ہندوستانی فوج میں جموں کے ڈوگرہ نسل لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جنگجو، اور بہادر گردانتے ہیں۔ جموں کا باشندہ کبھی کبھی ہنسے گا لیکن گِلگت کا آدمی کبھی کبھار ہی خندہ جبیں ہوگا کیونکہ وہ سخت کوش و دقّت طلب آغوشِ فطرت میں پلا بڑھا ہے۔ پونچھ کا باشندہ زمینداری اور محنت کے ذرایع کے بدلے کسی کی نوکری ہی پسند کریگا کیونکہ جسمانی محنت کا پھل اُسے بہت ہی کم ملنے کی توقع ہے، وہ قابلِ اعتبار ہے' شرط یہ ہے کہ اُسے عیاری اور فریب کا شکار نہ بنائے۔ لداخی فوجی نہیں ہو سکتے۔ اُنکی آبادی کا چھٹا حصّہ رہبانیت اور گیان دھیان ہی نجات کا راستہ جانتا ہے۔ اُن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ عیار اور دھوکہ باز نہیں۔ ایمانداری اُنکے خمیر میں ہے۔ کشمیر کی سرحدی حدود کے رُوح فرسا واقعات و حادثات کے باوجود کشمیر کی حسین و جمیل وادی قائم و دائم ہے۔ اپنی گُم کردہ عزت و توقیر کو پا لینے کیلئے

کشمیریوں کو بہت محنت کرنا پڑیگی۔ اُسے صبر و استقامت کے اُپنے اعلیٰ کردار کی تعمیر کرنا ہوگی تا کہ آنے والی نسلوں کو کشمیری نژاد ہونے میں فخر محسوس ہو۔ اُسے زندگی کے عملی میدان میں اُپنی عظمتِ رفتہ کو پھر سے پانا ہوگا تا کہ ہمیں علامہ اقبال کا یہ شعر دہرانا نہ پڑے۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بُتے می تراشد ز سنگ مزارے

بَری ہوں یا بحری' راستے' درّے اور بندرگاہیں' انسانی تہذیب کے لین دین اور فروغ و ارتقاء میں اہم کیا' بلکہ کلیدی رول ادا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ پیرس (pearce) نے اپنے سفرنامے (This is kashmir) کے آخری اور اُنیسویں باب میں صرف دو شاہراؤں' بانہال کارٹ روڈ (Banihalcart road) اور سرینگر مظفر آباد۔ راولپنڈی روڈ ذکر کیا ہے۔ سرینگر۔ راولپنڈی روڈ کو جہلم ویلی روڈ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ جغرافیائی محل وقوع اور رسل و رسائل کے ذرائع پر ہی کسی ملک کی سیاسی مالی اور تہذیبی استقامت و اثبات کا دارومدار ہے۔ شمال مشرق کی جانب سے شاہراہِ ابریشم جو وادیٔ کشمیر کو تبت، چین، ترکستان، افغانستان، ایران، وغیرہ جوڑتی ہے اور شاہراہِ نمک (مغل روڈ) جنوب مغرب سے راجوری سے ہوتے ہوئے جموں اور پاکستان سے بھی جوڑتی ہے پیرس نے نام تک نہیں لیا ہے۔ اِسکے علاوہ توسہ میدان یوسمرگ کے روایتی درّوں سے بھی وادیٔ کشمیر پونچھ سے جڑتی ہے۔ اس ضمن میں اُوڑی کا درہ حاجی پیر بھی قابلِ ذکر ہے جو کشمیر کو مظفر آباد سے جوڑتا ہے۔ اصل میں

کولمبس زندگی کی لگن ہے جو رُوپ بدل بدل کر راہیں تلاش کرتے کرتے اِنسانی تہذیبوں کو جوڑتی ہے۔

پیرسے (pearce) کو کیا معلوم تھا کہ ۱۹۵۵ء میں جواہر ٹنل کے کُھلنے سے سرینگر جموں کا سفر آسان ہوگا اور اَب ہوائی اَڈہ بھی بین الاقوامی پَروازوں کے قابل بنایا جائیگا اور یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئے مَسدود راستے پھر سے کھل جائینگے جیسے کہ سرینگر مظفر آباد روڈ ستاوَن سال بند رہنے کے بعد جمعرات ۷ اَپریل ۲۰۰۵ء کو کھل گیا اور کاروانِ اَمن کی بسوں کا آنا جانا شروع ہوا جسکا خواب پیرسے نے وادیٔ کشمیر سے رُخصت ہوتے ہوئے یوں دیکھا تھا:

''حُسنِ خداداد سے آراستہ میزبان اِس الو ہی ملک نے ہماری جی جان سے خاطر تواضع کی ہمارے تھکے اور مُنفعل اعضاء میں پھر سے جان آئی۔ اسکے حُسنِ فطرت کی آغوش کسی بھی امتیاز کے بغیر ہمارے لئے وا رہی۔ اُس نے ہم سے بس یہی تمنا کی کہ اُسے اَمن شانتی سے رہنے دیا جائے تا کہ وہ لوگ' جو یہاں آئیں اور اِسکے جھولے میں جھولتے اور گنڈولے میں پلتے ہیں' خوش وخرم رہیں اور تا اَبد شادماں و کامراں رہیں۔ زندہ آباد! وادیٔ شادمان کشمیر پائندہ باد۔

''شیخ اور برہمن کو بغل گیر دیکھئے
اس آئینے میں صورتِ کشمیر دیکھئے''

☆☆☆

غلام نبی آتش☆

میجر سِونبورن کا سفر نامۂ کشمیر

میجر ٹی، آر، سِونبورن مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں اپنی بیگم جانی کے ساتھ کشمیر آیا تھا۔ دونوں پہاڑی مہم جوئی اور شکار کے بے حد شوقین تھے۔ کشمیر میں سات مہینے گذار کر وہ دِلی اور آگرہ چلے گئے۔ اُنھوں نے ۲۲ فروری کو انگلینڈ سے سفر شروع کیا تھا اور ۹ ا مارچ کو کراچی پہنچ گئے تھے۔ کراچی سے ہوتے ہوئے براستۂ ایبٹ آباد پہلے مظفر آباد پھر بارہمولہ اور بعد میں سرینگر آئے۔ انگریز سیاحوں کا عام طور پر اِسی راستے سے آنا جانا رہا ہے۔ دونوں سیاح سات اپریل سے دس اکتوبر تک کشمیر کی خوبصورتی سے محظوظ ہوتے رہے۔ میجر سِونبورن دن بھر کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات ہر شام قلمبند کیا کرتا تھا۔ انگلینڈ پہنچ کر اُس نے اِن مشاہدات و تجربات کو کتابی شکل دے کر شائع کروا دیا، اس کتاب کا نام ہے ''اے ہولی ڈے ان دِی ہپی ویلی'' (A Holiday in the Happy valley)۔ بھارت میں یہ کتاب ''ساگر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۷۔ جنپتھ کی طرف سے پہلی بار ۱۹۷۰ء میں شائع کی گئی۔ ۳۴۲ صفحات

☆ لیکچرر، گورنمنٹ بائز ہائر سیکنڈری اَنسٹی چیوٹ۔ بجبہاڑہ کشمیر

پر پھیلی اِس کتاب میں ۲۴ خوبصورت تصاویر بھی ہیں اور اِختتام پر کشمیر کا نقشہ بھی ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ میجر اور اُس کی بیوی کے وارد کشمیر ہونے کا سال کتاب میں دَرج نہیں۔ جبکہ مصروفیات، تجربات و مشاہدات کا اَندراج کرتے وقت خاص ترتیب کے ساتھ تاریخ اور دن درج کئے گئے ہیں۔ تاہم کتاب کا بغور مطالعہ کرکے معلوم ہوتا ہے کہ میجر ٹی آر سوِنبورن اُپنی بیگم کے ساتھ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں شاید ۱۹۰۳ء کے بعد واردِ کشمیر ہوا تھا، اُس نے مہاراجہ کے بھائی راجہ اَمر سنگھ کے ساتھ ملاقات کی تھی اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی طرف سے دی گئی شاہی دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ اِن واقعات کی تفصیل اُس کی زیرِ نظر کتاب میں موجود ہے۔ اُس نے اُس تباہ کُن سیلاب کا سرسری تذکرہ بھی کیا ہے جو مہاراجہ مذکورہ کے زمانے میں ۱۹۰۳ء میں آیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں آئے سیلاب سے متعلق بھی ایک واقعے کا ذکر اِس کتاب میں درج ہے۔ اصل میں اس کتاب کو بجائے سفر نامہ حسن کے شیدائی اور مہم جُو شکاری کی طویل اور مفصل ڈائری کہا جاسکتا ہے۔ اِس مہم جُو فرنگی نے بیوی کی معیت میں کشمیر کی مشہور پہاڑی سیر گاہوں، فرودگاہوں، شکارگاہوں اور عیش گاہوں کو دیکھا، دشوار گذار پہاڑی راستوں اور دیوقامت کوہستانوں کے دَرّوں سے ہوتے ہوئے میاں بیوی کشمیر کے حُسن و جمال سے محظوظ و مسرور ہوگئے۔ میجر نے سفرِ کشمیر کے دَوران راستوں، دَریاؤں، پھلوں، پھولوں اور چرندوں پرندوں کے متعلق معلومات حاصل کیں، جنگلی جانوروں اور پرندوں کے دیکھنے اور شکار کا وہ دلدادہ تھا، اس لئے اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کتاب کے پہلے صفحات میں کشمیر آنے کے خواہش مند انگریزوں کے

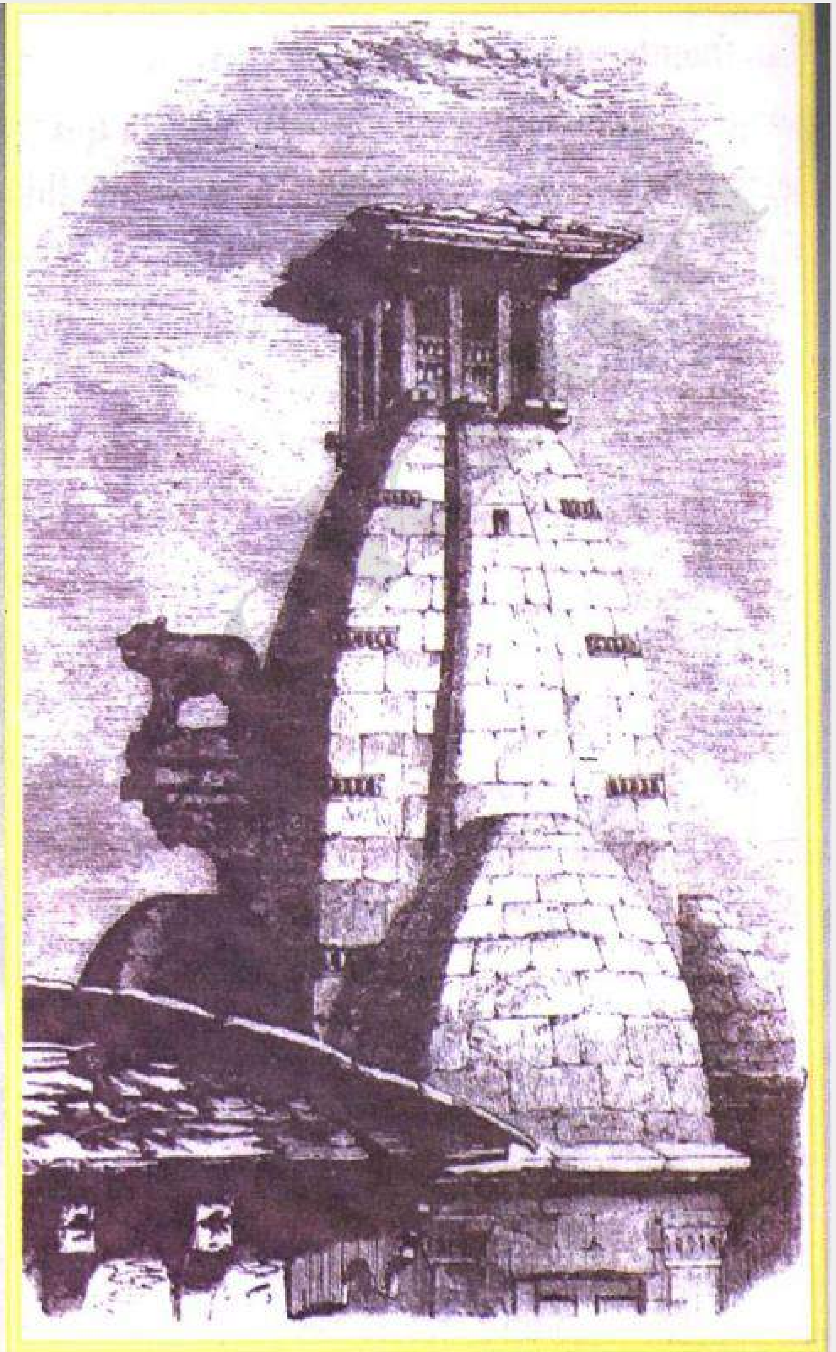
لئے ایک مفصل ہدایت نامہ درج کیا ہے تاکہ اُن کو سیاحت کے دوران مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کتاب کے مطالعے سے صاف ظاہر کہ میجر مذکورہ انگریزوں کی ایک غلام نوآبادی میں تحکمانہ غرور کے ساتھ قدم رکھ رہا تھا، محکوم کشمیریوں پر اُسے ہر طرح کا حق تھا۔ کشمیر کے فطری حُسن سے لُطف اندوز ہونا اور شکار کرکے سرور حاصل کرنا، اُس کے خاص مقاصد تھے۔ اس لئے اس نے کشمیر کی تواریخ اور تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی، حتیٰ کہ اس نے لکھا ہے کہ سری نگر کی کوئی قابلِ ذکر تواریخ نہیں، اِس شہر کے لوگ پہلے بھی ہر طرح سے مُفلس تھے اور آج بھی ہیں۔ اِس طرح کے بیانات اُس کی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ اُس کا سابقہ دیہاتی مزدوروں، کشتی بانوں، تانگہ بانوں، ڈونگوں کے مالکوں، انگریز حاکموں، ٹٹو والوں اور مقامی شکاریوں کے ساتھ پڑا تھا۔ اُن کی ناقص معلومات پر یقین کرکے اُس نے کشمیری کلچر کے بارے میں سرسری تذکرہ لکھا ہے، دِل آزار باتیں لکھنے میں غلام کشمیریوں کے تئیں اُس کا متعصبانہ رویہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

میجر، سری نگر میں

میجر ٹی آر سوِنبورن نے سری نگر کی فطری خوبصورتی کو خوب سراہا ہے، اُس نے لکھا ہے کہ سری نگر کو بجا طور پر مشرق کا وینس (Venice) کہا گیا ہے۔ وینس کی طرح سری نگر میں دلکش دریائی راستے ہیں، کشمیری شکارے وینس کے گنڈولاؤں کے متبادل کے طور دیکھے جاسکتے ہیں۔ سری نگر میں وینس کے مقابلے میں گندگی اور غلاظت کی مقدار قدرے کم ہے۔ برف پوش پہاڑی سلسلے



پاندریٹھن کا مندر...... سون بورن کی نظر میں



کشمیر کے مندر کا شکھر

دونوں شہروں میں دُور سے بہت شاندار دِکھتے ہیں۔ سری نگر میں اُچھا فنِ تعمیر دیکھنے کو نہیں ملتا، اس شہر کی کوئی قابلِ ذکر تواریخ نہیں ہے۔ سری نگر میں پولو اور گوالف کھیلنے کے لئے اُچھا انتظام ہے۔ سری نگر کے بیچوں بیچ بہنے والے شاندار دریا کے کناروں کو ملانے کے لئے سات جگہوں پر سات پل موجود ہیں۔ ہوٹل بھی ہیں، خاص طور نیڈوز صاحب کا نیڈوز ہوٹل یا بلو ہوٹل۔ مگر نیڈوز ہوٹل جس کی شاخ گلمرگ میں بھی ہے، زیادہ آرام دہ اور دلکش نہیں ہے تاہم عیش وعشرت پسندوں کے لئے غنیمت ہے۔ ویسے تو انگریز سیاح کشتیوں، ہاؤس بوٹوں اور ڈونگوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میجر نے سری نگر سے معمولی دُوری پر واقع حضرت بل میں ایک مذہبی تقریب بھی دیکھی تھی، اُس دن موئے مقدس کی زیارت کے لئے لوگوں کا جمِ غفیر قطار در قطار چھوٹی بڑی کشتیوں میں آکر درگاہِ حضرت بل میں جمع ہو گئے تھے، یہ عقیدت واحترام دیکھ کر میجر دنگ رہ گیا تھا۔ سری نگر میں میجر نے مغل باغات کی سیر کی، سلیمان ٹینگ دیکھا، بعض مساجد و منادر دیکھے۔ سری نگر میں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی، ایک اجنبی گاہک کے لئے سودا سلف خریدنا انتہائی ہوشیاری کا کام ہے، خرید وفروخت کے سلسلے میں کشمیریوں کے ساتھ معاملہ طے کرنا مشکل ہے، دوکاندار ناواقف خریدار کی جیب خالی کرنے میں ماہر ہیں۔

میجر ''مون'' میں

میجر سِونبورن نے عیاشوں کا ہوٹل ہوتے ہوئے بھی ''نیڈوز ہوٹل'' میں زیادہ دیر رہنا پسند نہیں کیا، اُس نے لکھا ہے کہ دلکشیوں کے مقابلے میں یہ ہوٹل زیادہ نقائص رکھتا ہے، اس لئے وہ ڈونگا ''مون-MOON'' میں چلے گئے۔

مون زیادہ آرام دہ تھا اور اس میں رہنے، کھانے پینے اور آرام کرنے کے عوض ماہانہ ایک سو چالیس روپے اُدا کرنا پڑتے تھے، اس رقم میں خوراک کی قیمت اور نوکروں کی مزدوری بھی شامل تھی۔ نیڈوز ہوٹل میں تین سو ساٹھ روپے ماہانہ خرچہ آتا تھا۔ گندمی رنگ داڑھی والا ایک سیانا بوڑھا ''مون'' کا مالک تھا اُس کا نام ستارا تھا، وہ عجیب طرح کا کوتاہ نائٹ گاؤن اور سفید کھلا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سبحانا اُس کا داماد تھا، وہ کام کرنے سے اکثر کتراتا تھا۔ ستارا کی تین بیٹیاں تھیں، جگری، نوری اور عزیزی۔ جگری سبحانا کی بیوی تھی، سب لوگ ستارا کو بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ مُون میں الگ الگ بیڈروم تھے، ایک ڈرائنگ روم تھا، ایک کھُردرا سا رائیٹنگ ٹیبل تھا، ڈائننگ روم بھی تھا، یہاں ضرورت کی تمام چیزیں تھیں، کمروں کی آرائش کا پورا انتظام تھا۔

دستکاریاں

کشمیر کا دستکار بے حد چالاک اور اچھا کاریگر ہے۔ یہاں جدید چوب کاری اور سوزن کاری کا کام خوبصورتی اور فن کاری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قدیم طرز کی شالبافی اَب دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اخروٹ کی لکڑی پر شاندار نقاشی کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے کشمیری دستکار قابلِ تعریف قدیم کشمیر ڈیزائن چھوڑ کر مغربی خیالات اور ڈیزائن اُپنا رہے ہیں۔ دستکاری کی اشیا میں مقامی رنگوں کا استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں پر چنار کے پتے، کنول کے پھول اور پرندوں کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں نمدے اور گبے اور قالین بھی بنائے جاتے ہیں۔ قالین بافی کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے، لیکن یہاں کے قالین اُونچے داموں پر بیچے جاتے ہیں۔ کشمیر میں بہت اچھے شال بُنے

جاتے ہیں۔ لکڑی پر کندہ کاری کے کام کی عمدگی اور دستکار کی اختراع پسندی کے باوجود یہ کام مجھ کو اپنی طرف زیادہ متوجہ نہ کر سکا، کیونکہ ان اشیا میں وافر رنگینی پیدا کرنے میں حد سے زیادہ عرق ریزی کی گئی ہے، اکثر اشیا ڈیزائن اور رنگینی کے بغیر رکھی جانی چاہئے تھیں۔ پیپر ماشی کی چیزیں بے حد خوبصورت ہیں، پیپر ماشی کے قدیم فن پارے نایاب ہیں، کہیں اگر کوئی قدیم چیز دستیاب ہو جائے تو بہت زیادہ قیمت اَدا کرنا پڑے گی۔ پیپر ماشی کی قدیم و جدید چیزوں میں خاصا فرق ہے۔ قدیم دستکار فنکارانہ مہارت اور عرق ریزی کا جذبہ رکھتا تھا مگر نئے بیوقوف اور ناکارہ کام کرنے والے لوگ پیپر ماشی میں لکڑی اور لاکھ کے روغن کے بدلے بازاری رنگ استعمال کر کے گھٹیا قسم کی چیزیں انگریز سیاحوں کو فروخت کرتے ہیں۔ چاندی، تانبے اور پیتل کی چیزیں بنانے والے کاری گر عام طور پر بھدی اور گڈ مڈ طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ چینی مٹی کے برتن، جو عموماً چھوٹے سائز کے ہوتے ہیں، اعلیٰ کوالٹی نہیں رکھتے۔ جواہرات سے زیورات بنانے کے کام میں کشمیری کاریگر بہت پیچھے ہے۔ زرد رنگ کے نیلم اور پکھراج سستے ہیں۔ عمدہ فیروزہ یہاں نہیں ملتا۔ یارقند سے بڑی تعداد میں ایک نرم لیکن بھدے رنگ کا قیمتی پتھر لایا جاتا ہے، اس کے علاوہ سنگِ سلیمانی وغیرہ بھی باہر سے آتا ہے، ان پتھروں سے ہار بنائے جاتے ہیں اور یہ ہار فروخت کرنیوالے جو قیمت بتاتے ہیں، بعد میں صرف اس کی نصف قیمت وصول کرتے ہیں۔ مقامی پاپوش ساز چمڑے کے کھردرے پاپوش اور چپل بناتے ہیں، لیکن وہ میدانی علاقوں میں آرام دہ ہوتے ہیں اور پہاڑی راستوں میں فائدہ مند نہیں رہتے ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں میں گھاس سے بنا ہوا کشمیری چپل مفید رہتا ہے، دیہاتی

لوگ کبھی اور کسی بھی جگہ دھان کے گھاس کی تیلیوں سے یہ چپل بن سکتے ہیں۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی طرف سے دیا گیا ظہرانہ

۲۷/اپریل کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے نئے ریذیڈنٹ Resident کرنل پیرس کے اعزاز میں منعقدہ شاہی ظہرانے میں شرکت کرنے کے لئے انگریز سیاحوں کو مدعو کیا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ دعوت میں شریک ہونے والے قبل اَز وقت مہاراجہ کے یہاں سیاحوں کی رجسٹر میں اپنا نام اور زاد و بود درج کرائیں۔ میجر نے لکھا ہے کہ:

"اس بہانے اُس کی ملاقات مہاراجہ کے برادرِ اصغر راجہ سر اَمر سنگھ کے ساتھ ہوئی۔ اس ملاقات کے لئے وہ نہایت چُست و چوبند ہو کر چلا گیا۔ شاہی محل سے ذرا اوپر بڑے پُل پر چہل قدمی کرتے ہوئے میجر نے دیکھا کہ نیچے پُر ہیجان لوگوں اور حیوانوں کی بھیڑ چلی جا رہی تھی اور اُن کے چلنے سے تیز بدبودار گرد و غبار کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ کوچے کے دونوں طرف رُوپیہ پیسہ بدلنے والے معمولی قسم کے کاؤنٹر سجائے خوبصورت ریشمی رومال سے طشتریوں کو ڈھانکے بیٹھے تھے، ان طشتریوں میں غیر ممالک کے سکّے وغیرہ رکھے تھے۔ سامنے مہاراجہ کا محل تھا، جو کہ بہت خوبصورت دکھتا تھا مگر لکڑی اور اینٹ گارے پر پلستر لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں نے گویا محل کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جنرل راجا امر سنگھ ایک پُرشکوہ فرنگی طرز کی کوٹھی میں رہتا تھا۔ کوٹھی کے دروازوں پر دراز قامت نگہبان تعینات تھے۔ کوٹھی کے بڑے کمرے اور سیڑھیوں کے زینے جنگلی جانوروں کی کھالوں، سینگوں، چمکدار موٹے گملوں اور شیشے کے لمبے پھولدانوں میں رکھے پھولوں سے آراستہ تھے۔

ڈرائنگ روم انگریزوں کے اچھے ڈرائنگ روموں کی قبیل سے تھا۔ راجا امر سنگھ ایک دلکش، غیر معمولی طور پر مضبوط اور انگریزوں کے ساتھ تکلف کے بغیر ملنے والا شخص تھا، وہ کبھی انگلستان نہیں گیا، پھر بھی پوری روانی کے ساتھ انگریزی زبان بول سکتا ہے۔ اس کا برادرِ اکبر مہاراجہ پرتاپ سنگھ (اپنے چھوٹے بھائی کے لئے جس کی کرم فرمائی زبان زد خاص و عام ہے)، بہت معاملات میں امر سنگھ سے مختلف ہے، وہ لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا، اکثر محل کے اندر محوِ عبادت رہتا ہے۔ امر سنگھ سے ملاقات کے بعد اس کے ایک چھوٹی رہنمائی میں میجر کو اس جگہ پہنچا دیا گیا جہاں سیاحوں کا رجسٹر تھا، میجر نے اپنا نام اور پتہ درج کیا اور چل دیا۔

۲۷ر اپریل کو مشہور مغل باغ نشاط میں دعوت کا انتظام تھا، نشاط تک جانے کے لئے میجر کو شکارے میں بیٹھ کر جھیل ڈل پار کرنا پڑا۔ میجر نے جھیلِ ڈل کی اس یادگار سیر کا تفصیلی حال لکھا ہے اور ڈل گیٹ کے بارے میں وہ انتہائی حیرت و سرور کا اظہار کرتا ہے، ڈل کا دروازہ عجیب چالاکی کے ساتھ واپس نہ مڑنے والے حیرت انگیز کھل مندن کے ساتھ بنایا گیا ہے، طغیانی کے موقعے پر یہ طلسماتی دروازہ خود بہ خود بند ہو جاتا ہے۔ ڈل کے پرسکون پانی پر شکارے میں بیٹھ کر چھک چھک چپو چلانا، چہچہنے چہچہانا اور ذوق و شوق کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنا یا پھر حسین مناظر سے لطف اندوز ہونا واقعی ایک خواب ہے، جو ہمیشہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ ڈل کے اندر آدمی زیرِ آب چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں، بید کی ٹہنیوں کے جھالروں، سرگوشی کرتے ہوئے نرسلوں اور قطار در قطار چھوٹی بڑی کشتیوں کی زبردست بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ کشمیر کے مشہور تیرتے ہوئے کھیت اسی ڈل جھیل کی سطحِ آب پر بنائے جاتے ہیں، ان کی افادیت سے قطع نظر یہ

کھیت محض ایک فراڈ ہیں۔

نشاط باغ میں مہمانوں کے استقبال کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ مہمانوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں تھی، سب کے سب انگریز تھے۔ نشاط باغ کے سات خوبصورت طبقے ہیں، ڈل کا پانی باغ کے دامن کو چوم رہا ہے، اس باغ کی خوبصورتی بے مثال ہے، چھپ چھپ کرتے اور سورج کی روشنی میں جگمگاتے فوارے اور بارہ دریاں وجد آفرین چیزیں ہیں۔ باغ کے وسط میں شامیانے کے اندر "بینڈ اسٹینڈ" (Band Stand) تھا، دوسرے شامیانے میں مطبخ تھا، فوارے کی اوٹ میں شاندار کرسیاں سجائی گئی تھیں۔ یہاں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے مہمانوں کا استقبال کیا، مہاراجہ کا قد درمیانہ تھا، اس کی ٹانگیں غیر معمولی طور پر سفید دکھتی تھیں، اس نے صاحب کرم ذی شان شخص کی طرح بھاری بھرکم روایتی مگر شاندار پگڑی سر پر باندھی تھی۔ ظہرانہ پیش کیا گیا تو مہاراجہ پوری توجہ کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا، مہمانوں سے ذرا دور رہ کر اس کی نگاہیں بار بار مطبخ کی اور جاتی تھیں، اس نے ہمارے ساتھ کچھ نہیں کھایا، مہمانوں نے پیٹ بھر کر کھایا تو مہاراجہ ایک چھوٹے خیمے میں چلا گیا، پہلے چھوت اور آلودگی دور کرنے کے لئے غسل کیا بعد میں خیمے کے اندر کچھ چائے پانی نوش کیا۔ مہاراجہ دوبارہ نمودار نہیں ہوا، اس کے مہمان واپس چلے گئے"۔

جبری مزدوری

ایک قابض و مسلط قسم کے فرد کی حیثیت سے میجر ٹی آر سونبورن نے لکھا ہے کہ مغربی ذہن کو یہ حقیقت جاننے میں کچھ وقت لگتا ہے کہ کشمیریوں کے ساتھ انسانی سلوک اور برادرانہ رویہ روا نہیں رکھا جا سکتا ہے اور ایسا کرنا بھی نہیں

چاہئے۔ کشمیری فطرتاً غلام ہیں۔ اکثر معاملات کے سلسلے میں اُن کے دماغ بچوں کی طرح بالیدہ نہیں ہیں۔ کسی بھی کشمیری کا دِکھاوے کا بچپنا اُس کی نہ سمجھ میں آنے والی خصلت کی پیچیدگی کو چھپالیتا ہے (شاید اس سے اُس کی مراد غیر فرنگیوں کی خصلت و عادت ہے)۔ اُنہوں نے محنت و مشقت کی عظمت کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ بے حد احسان ناشناس اور ناشکر گذار لوگ ہیں، کشمیری باتونی ہیں اور اکثر تیز کلامی بلکہ گالی گلوچ پر اُتر آتے ہیں۔ کشمیری دکاندار، ناواقف انگریز خریدار کی جیب خالی کرنے میں ماہر ہیں۔

دیہاتوں سے مزدوروں کا طلب کیا جانا، مُردم آزار یا ظالمانہ رواج نہیں ہے بلکہ چار سے چھ آنے روزانہ اُجرت پر سرکاری کام کرنا سرکار کے تئیں دیہاتیوں کی ذمہ داری ہے۔ گاؤں سے لایا جانے والا قلی اُس خودرو گھونگھے کی طرح، جو اُپنے خول سے باہر آنے میں ہچکچاتا ہے، کام پر جانے کے لئے زبردست غیر آمادگی اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کسی انگریز صاحب کے سامان کا معمولی بوجھ اور سامنے صرف تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع پہاڑی درّہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے خواہ مخواہ آنسو ٹپک پڑتے اور غشی کا بہانہ بنا کر گر پڑتا ہے۔ اونٹ کو اُٹھا کر کام اسٹارٹ کرنے کے لئے دُم تلے آگ جلائی جاتی ہے، پہلگام میں مجھ کو ایسے ہی ایک قلی سے سابقہ پڑا۔ پیٹ بھر کر دوپہر کا کھانا کھا کر میرے قلی سُستانے لگے، غل غپاڑے اور بَک بَک کرنے میں مصروف ہوگئے، بعد میں اُپنی اُپنی بقچی، جو زیادہ بھاری نہ تھی، پشت پر اُٹھا کر چند سو گز چلے تھے، ایک قلی نے بیماری کا بہانہ بنایا، آرام سے ایک پتھر پر بیٹھ کر، ہلنے اور چلنے سے صاف انکار کیا۔ بعدِ دوپہر کی چائے کا

وقت تھا، ایک نمبردار نے ہمارے پاس ایک بزرگ قلی کو، جو کہ پاس ہی بھیڑوں کا ریوڑ چرا رہا تھا، ہمارے لئے لایا، اُس کا عیال بعدِ دوپہر کی چائے پینے میں مصروف تھا، جب اُس کو خراب راستے پر چل کر ایک صندوق صرف سات میل تک لے جانے کے لئے کہا گیا تو وہ ایک بچے کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا، گویا وہ کسی حیوان کی طرح گردن زنی کے لئے لے جایا جاتا ہو! لیکن رونے بلکنے میں وہ حق بہ جانب تھا۔ پہلا آدھ میل دہشت ناک تھا، ہر سَو گز کے بعد قلی بیٹھ جاتے، بوجھ تلے کراہتے اور چلاتے رہتے تھے، دھکیلے اور مُکّے کھانے کے بغیر وہ دُوبارہ نہیں چلتے تھے۔ تنگ آ کر میجر نے مزدوروں کو سزا دینے کا حکم دیا، یہ سزا مار پیٹ کر کے یا کوڑے مار کر زدوکوب کرنے کی صورت میں نہیں تھا، بلکہ ایسے پَست دَرجہ کے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کی طرح اُن کو مرعوب کر کے ڈَرایا دھمکایا جائے۔ کوئی بھی کشمیری جبراً مزدوری کے بغیر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مغربی ذہن کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ کسی اَچھائی (جو کہ اُن میں نہیں ہے) کے عوض کشمیری کو کریڈٹ دے۔ اُس کی ناکامیاں بہت ناپسندیدہ اور نفرت انگیز ہیں۔ کبھی ایک بے شرم بُزدل ہے، اُپنی بزدلی کو تسلیم کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، کبھی سچ بولنا جانتا ہی نہیں۔ تاہم وہ مجموعی طور پر خوش باش، زندہ دل، حیوانوں اور بچوں پر مہربان لوگ ہیں۔

سُنی سنائی کہانیاں

(۱) ۱۹۰۱ء میں آئے ہوئے سیلاب نے کشمیر میں زبردست تباہی مچائی تھی۔ اسی سیلاب کے دوران ایک گاؤں ڈوبنے کو تھا، مکانوں، کھڑکی

فصلوں، مویشیوں اور انسانوں کو زبردست خطرہ لاحق ہُوا، گاؤں کے پاس سے بہنے والا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اِتفاق سے گاؤں کے قریب میرے ایک کرنل دوست کی کوٹھی تھی۔ کرنل موقعے پر چلا گیا، اُس نے دیکھا کہ پانی کی سطح بلند ہو رہی تھی، گاؤں کے مرد شامتِ اعمالی اور بے بسی کا رونا رو رہے تھے، بے عملی کی وجہ سے اُپنے سر پیٹ رہے تھے۔ کرنل نے اُن کو دِلاسا دیا، ہمت دی اور دوسرے گاؤں سے جو ذرا اُونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے سیلاب کی زد میں نہیں تھا، قُلی منگوائے، سیلاب کی زد میں آئے گاؤں کے مُردوں کو قُلیوں کے ساتھ، پانی کا رُخ دوسری اور موڑنے کے لئے روانہ کیا، کرنل کی قیادت میں بھاری پتھروں اور شہتیروں سے پانی کے حصّے کر کے طغیانی کا زور کم کر دیا گیا، اس طرح وہ گاؤں کسی قسم کے جانی اور مالی نقصان سے دوچار نہیں ہوا۔ آخر پر جب قلیوں کو مزدوری اُدا کرنے کا موقعہ آیا، گاؤں والے بھی مزدوری کا تقاضہ کرنے لگے۔ کرنل نے صاف انکار کیا کہ قلی تمہارا گاؤں بچانے کے لئے مزدوری پر لگائے گئے تھے، تمہارا گاؤں، تمہارے اُثاثے، تمہارے بال بچے بچانے کے لئے یہ سب کیا گیا، تم معاوضے کے حقدار نہیں ہو۔ کرنل حیران ہو گیا کہ وہ لوگ مزدوری مانگنے پر اڑے رہے۔

(ب) ایک شخص کو جو سینے کے عارضہ میں مبتلا تھا، ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا، یہ وہی ہسپتال ہے جو مسٹر Neve کی انسان دوستی کا نتیجہ ہے، گالف میدان کے دائیں اور ایک مناسب جگہ پر یہ ہسپتال کھڑا ہے، اسی مشن ہسپتال میں اُس بیمار شخص کی کئی ہفتوں تک طبی نگہداشت ہوتی رہی، اس کی ساری فیملی اِس دوران انگریز محسنوں کی مہربانی سے گذر بسر کرتی رہی۔ جب

اُسے صحت یاب ہو کر رُخصت کیا گیا، وہ زار و قطار رونے لگا کیونکہ اِتنا عرصہ ہسپتال میں رہنے کے عوض اُسے مزدوری نہیں دی جا رہی تھی!

حُسنِ کشمیر کی مدح سرائی

میجر ٹی آر سوئنبورن حُسنِ فطرت کا عاشق مُہم جو بھی تھا، مشاق شکاری بھی اور انگریزی زبان کا منجھا ہوا شاعر بھی۔ اُس نے زیرِ نظر کتاب میں شاعرانہ خیال آفرینی کے ساتھ کشمیر کی گھاٹیوں، پہاڑیوں، برف پوش پہاڑی چوٹیوں، گھنے جنگلوں، پھُولوں، موسموں، جھیلوں، ندی نالوں، دریائی راستوں، باغوں اور مرغزاروں کی نہ صرف تعریفیں کی ہیں بلکہ کئی جگہوں پر اُپنی نظمیں لکھ کر حُسنِ کشمیر کی خوب داد دی ہے۔ وادی لدر کی سیر کے دوران وہ پانپور سے ہوتے ہوئے اُونتی پور اور اُونتی پور سے بجبہاڑہ پہنچ گیا، بجبہاڑہ میں کوئی مذہبی تقریب ہونے والی تھی، میجر نے لکھا ہے کہ کوئی تماشہ ہونے والا تھا، لوگوں کا جمِ غفیر دریا کے کناروں اور خوبصورت پُل پر اکٹھا ہو گیا تھا، لوگ گپ شپ اور بک بک میں مصروف تھے، اتنا شور و غل تھا، گویا سارے کشمیر سے باتونی لوگوں کو یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں میجر کی کشتی ایک حادثے کا شکار ہونے کو تھی کہ کشتی بان کی پھُرتی اور چابک دستی سے حادثہ ہوتے ہوتے رُک گیا، مشہور مغل باغ کا بھی میجر نے ذکر کیا ہے جہاں قدیم مغل عمارت اور ایک پُل کے کھنڈر تھے اور تناور چنار بھی۔ دوسرے دن وہ اِسلام آباد چلے گئے، اِسلام آباد جانے کا اِرادہ کر کے کھنہ بل پہنچے، جہاں دریا تنگ ہے اور گرمیوں کے اس موسم میں طاقتور مکھیاں پریشان کر رہی تھیں۔ اِسلام آباد کے بارے میں میجر نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ کشمیر کا دوسرا بڑا ق... مانا جاتا ہے تاہم یہاں صرف نو ہزار لوگ بستے

ہیں، یہاں ایک اچھا بازار ہے، خوبصورت چشمے ہیں۔ اسلام آباد کے زنانہ مشن ہسپتال سے چھ میل پیدل چل کر میجر بھون پہنچ گیا جہاں ایک بڑے چنار کی چھاؤں میں دن بھر آرام کیا، پھر وہاں مندر دیکھا، سُرخ مورتی دیکھی اور عُش مقام کی طرف چل دیئے، عش مقام سے پہلگام پہنچ گئے، میجر نے پہلگام کی خوبصورت تعریفیں کی ہیں، آڑو سے ہوتے ہوئے لدروٹ کے راستے کولہائی گلیشروں تک میجر اور اُس کی بیگم نے حُسنِ فطرت کا مشاہدہ کیا اور سیکہ واس، کھیم سر اور کولن جیسے عجوبہ رُوزگار مرغزاروں کی سیر کے بعد واپس پہلگام پہنچے، پہلگام سے واپسی پر لنکن بل کے قریب لدر دریا پار کر کے براستۂ سلر واپس بجبہاڑہ کی اور چل دیئے، سلر سے بجبہاڑہ تک کا راستہ اوبڑ کھابڑ، اُجاڑ اور بے سایہ تھا۔ لدر وادی سے واپسی پر میجر اور اُس کی بیوی کو بے حد افسوس ہوا کہ بھون کے مقام پر ایک پورا دن گزارنے کے باوجود وہ شہرۂ آفاق مارتنڈ مندر دیکھنے سے رہ گئے، جو بھوَن سے تھوڑی دُوری پر ایک خوبصورت اور وسیع کریوہ پر تھا۔

میجر اور اُس کی بیوی نے گاندربل، گامرو، پابالن اور بارہمولہ کی سیر کا ذکر کرتے ہوئے چشمہ گنگہ بل اور کوہ ہرموکھ کو دیکھ کر ان پُر اسرار جگہوں کی خوب تعریفیں کی ہیں، گنگہ بل میں موجود مندر کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔ میاں بیوی گلمرگ بھی گئے، وہاں کی خوبصورتی کو خوب سراہا ہے، گلمرگ میں انگریز سیاحوں کے لئے ہر طرح کی سہولتیں موجود تھیں۔ گلمرگ میں کھلن مرگ تک متعدد مرغزار ہیں، جہاں بار بار پکنک منانے کو جی چاہتا ہے۔ علاقۂ مچھی پورہ کے سفر کے دوران سوپور، کاجی ناگ اور وادئ لولاب میں موجود تقریباً ساری خوبصورت جگہوں کو دیکھ کر میجر نے لکھا ہے کہ کشمیر میں قیام کے دوران یہاں

کے پہاڑ ہمارے لئے ایک دائمی مسرت کا باعث بنے رہے۔

چند دلچسپ واقعات

(ا) سُرخ بھڑوں کا حملہ:

مچھی پورہ کے سفر کے دَوران میجر اور اُس کی بیوی جب کاج ناگ رینج اور پُوہرو کے درمیان وادی میں پہنچ گئے تو بہت تھکے ماندے تھے، گرمی کی شدت اور سفر کی سختی سے پیاس لگی تھی۔ خوش قسمتی سے مسٹر بلنٹ نام کے فارسٹ آفیسر نے اَز راہِ کرم لولاب اور مچھی پورہ میں موجود فارسٹ ہٹ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ وہاں پہنچ کر چوکیدار غائب پائے گئے۔ اندر سے یہ ہٹ پوری طرح بند تھے۔ زبردستی دروازہ کھولنے کی کوشش کے دوران اَندر موجود بڑے بڑے سُرخ بھڑوں کی فوج نے حملہ کر دیا، شاید وہ زور زبردستی سے دروازہ کھولنے پر مدافعت کرنا چاہتے تھے، اِس پر میاں بیوی کے مزاج بگڑ گئے، وہ ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے، اسی اَثناء میں بے نیاز چوکیدار نمودار ہو گیا اور ایک بے تیغ کھڑکی کا سہارا لے کر میاں بیوی کی مسرتیں واپس کر دیں۔

(ب) بھینس کا حملہ:

لدر وٹھ میں رات گذار کر میجر اور اُس کی بیوی دوسری صبح کولہائی کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن ایک سفید رنگ کی ایک بدمست بھینس نے رنگ میں بھنگ ڈال دی بلکہ کشمیر میں چھٹیاں گزارنے کی ساری خوشیاں غارت کر دیں، سفید رنگ کے حیوان ویسے بھی میجر کو ناپسند تھے، جب وہ جاتی کا پیارا چھاتا اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا تو بھینس جیسا سفید حیوان میجر کے گرد اپنی سخت دُم ہلاتے ہوئے طوفان خیز لاتیں مارنے والا تھا، پھر بھی میجر کی ران پر حملے کا ایسا

نشان رہ گیا جو سخت دُم زور سے ہلا کر کیا گیا تھا کہ کچھ وقفے کے لئے نہ صرف یہ کہ میجر بھونچکا رہ گیا بلکہ بے حس و حرکت زمین پر پڑا رہا۔

ج) دُودھ نہیں تو گائے:

سیاحتی سیزن کے آخر پر گلمرگ میں اَشیائے خوردنی کی قلّت ہو جاتی ہے، دودھ گندے خانہ بدوشوں سے خریدا جاتا ہے، میجر اور اُس کی بیوی کے لئے صاف دُودھ کی دستیابی سنگین مسئلہ بن گیا۔ اسسٹنٹ ریذیڈنٹ صاحب کی مہربانی سے دُودھ کے بجائے انہیں ایک عدد گائے دی گئی جس کو روزانہ اُن کے دروازے پر دھویا جاتا، گائے بہت شریف تھی اور میجر کی ہٹ کے پاس چرتی رہتی تھی۔

میوے:

سونبورن لکھتا ہے کہ کشمیر میں مختلف قسم کے میوے وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر اُن کی پست درَجے کی کوالٹی مایوس کُن ہے، یہ میوے سستے ہیں اور بہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں سیب، آڑو، اخروٹ، ناشپاتی، اشابری، گلاس، خوبانی، انگور اور بادام پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر پھل دینے والے درختوں کی کاشت مناسب طریقے پر نہیں کی جاتی، ناشپاتی بڑھیا قسم کے ہیں اور سیبوں کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ کافی شاندار اور لذیز ہوتے ہیں۔ یہاں سبزیاں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں تاہم پھل دار درختوں کی طرح سبزیاں بھی اچھی طرح کاشت نہیں کی جاتی ہیں۔

کچھ سیلاب کے بارے میں

گلمرگ میں کئی روز کی لگاتار باراں باری کے نتیجے میں میجر اور اُس کی

بیوی پریشان کُن صورت حال سے دوچار ہو گئے۔ بارش ۱۲ ستمبر کی صبح سے ہونے لگی، بارش کا پانی اپھروٹ اور کھلن مرگ کی ڈھلوانوں سے چھم چھم گر کر گلمرگ میں جمع ہو گیا، دیکھتے دیکھتے ساری مرگ جھیل میں تبدیل ہو گئی، پولو گراؤنڈ اور گاف کھیلنے کا میدان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بازار سے کلب تک کا راستہ پانی کے نیچے آچکا تھا۔ سیاح بہت جلد سری نگر جانا چاہتے تھے، اَفواہیں اُڑائی جا رہی تھیں کہ کشمیر میں خطرناک سیلاب نے تباہی مچائی تھی، کام چور قلی اِدھر اُدھر چلے گئے تھے، میجر نے کئی روز کے بعد سری نگر کا رُخ کیا، بڑی مشکلات کے بعد ۲۵ ستمبر کو براستہ ٹنگمرگ و ماگام سری نگر پہنچ گیا، راستے کی دشواریاں بہت صبر آزما تھیں۔ آخر سری نگر پہنچ کر سیلاب کی تباہی کا مشاہدہ کیا، دھان کی فصل پک کر تیار ہوئی تھی، طغیانی نے یہ فصل تباہ کر دی، کئی مقامات پر لوگ مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے، سری نگر میں دو جگہوں پر بندھ ٹوٹ چکا تھا، نیڈوز ہوٹل کی پہلی منزل پانی سے بھر چکی تھی، فرنگیوں کے کوارٹر پانی میں ڈوب چکے تھے، آج کا سیلاب ۱۹۰۳ء کے بڑے سیلاب جیسا تھا، تاہم مالی اور جانی نقصان کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ کچھ انگریز سیلانیوں کو خاصی پریشانی اُٹھانا پڑی، اُن کی چیزیں پانی میں بہہ گئی تھیں، گزشتہ سیلاب کے بعد سری نگر میں بندھ (باندھ) کو تین فٹ اور اونچا کیا گیا تھا لیکن اُس کی چوڑائی میں اضافہ نہ کرنا بڑی غلطی تھی۔ پانی اُترنے کے بعد لوگوں کو پریشانیوں کا سامنا تھا۔

ذکر ریلوے کا

میجر نے لکھا ہے کہ دُنیا کے لوگ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے اور گویا دُنیا سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ سیاح اَب اسی دنوں میں دُنیا کے گرد گھوم پھر کر

محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہیں جبکہ ساری دنیا کے عجائبات اور حسین مناظر اُن کے لئے منتظر ہیں تا کہ وہ اُن کو دیکھ کر تعریفیں کریں اور قدر کریں۔ میں علی الاعلان اس مقصد کا معترف ہوں کہ کشمیر کی خوبصورتی کے بارے میں میرے اور میری بیوی کے دیئے گئے بیانات لوگوں کو بہ چشم خود کشمیر دیکھنے کی ترغیب دیں گے۔ افسوس ہمارے اُن آوارہ گرد خانہ بدوشوں کے لئے، جن کا سوقیانہ پن چرچوں اور تصویروں والی گیلریوں میں اُن سے جرم کا ارتکاب کرواتا رہتا ہے، اور ان میں یہ خواہش انگڑائی نہیں لیتی کہ کوئی قدیم یادگار عمارت یا مجسمہ دیکھیں اور اُس پر اپنا بدھا سا نام کندہ کریں۔ یہ لوگ ابھی کشمیر نہیں آئے، لیکن کسی دن جیسا کہ میرا خیال ہے کہ ایسا ضرور ہوگا، کشمیر اُن کے لئے بھی کھلی جگہ ہوگی، ریل، جس کے متعلق پہلے غور و فکر ہوا ہے، راولپنڈی سے سری نگر تک چلے گی، برلن اور برمنگم سے اکسکرشن جانے کے لئے سستی ٹکٹیں اجراء کی جائیں گی[1]۔

عورتوں کے بارے میں

کشمیری عورتوں کی خوبصورتی کے بارے میں مغالطہ آمیز باتیں کہی گئی ہیں، مسٹر مورے کی یہ احمقانہ بات کہ کشمیر میں ایک بھی پیاری اور حسین دوشیزہ نہیں ہے، حواس باختہ کرنے والا بیان ہے، حقیقت یہ ہے کہ مشرقی لڑکیوں کو مغربی ....کی طرح پوری طرح پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ مشرقی دوشیزاؤں کی عشوہ گری اور ہرزہ سرائی اُن کی بدبختی کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ مشرقی دوشیزائیں صرف دس یا بارہ سال کی عمر میں بیاہی جاتی ہیں اور

[1] آج ۲۰۰۵ کو راولپنڈی سے نہ سہی جموں اور اُدھم پور سے ریل سری نگر تک آیا چاہتی ہے۔

شادی شدہ عورتیں کہلاتی ہیں، اُن کے پیارے سَر بوریئے میں بندھ جاتے ہیں، ورنہ کشمیر میں حسین عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

مشاق شکاری کی ناکامی

میجر ٹی آر سوئنبورن مناظر فطرت سے محظوظ و مسرور ہونے کے علاوہ شکار کھیلنے کے لئے آیا تھا، وہ کشمیر کی مشہور شکار گاہوں میں پہنچ کر شکار کھیلا کرتا تھا، تجربہ کار کشمیری شکاری اور شکار کو ہانکنے والے قلی اُس کے ساتھ رہتے تھے، بڑی کوششوں کے باوجود وہ زیادہ کامیاب نہیں رہا، دن بھر اُوبڑ کھابڑ پہاڑی پگڈنڈیوں، اُونچی چٹانوں اور ڈھلوانوں پر چل کر اُسے خاطر خواہ شکار ہاتھ نہیں لگتا تھا، وہ مارخور اور بھورے ریچھ کی تلاش میں بہت دُور نکل جاتا تھا، کشمیری شکاریوں اور ہانکنے والے قلیوں سے سخت ناراض لگتا ہے۔ میجر کو شکار کھیلنے کی اپنی مہارت پر ناز تھا، پھر بھی ناکام ہی رہا۔ ہر ایک شکاری سیاح کو شکار کھیلنے کے لئے سرکار کی طرف سے لائسنس دی جاتی تھی، جو صرف ۱۵/ مارچ سے ۱۵/ نومبر تک جائز مانی جاتی تھی۔ لائسنس کے مطابق سال کے آٹھ مہینوں میں مندرجہ ذیل حیوانوں کا شکار کیا جا سکتا تھا،

ا/ کسی بھی قسم کے مارخور چھ عدد۔ ۲/ ہانگل ۲ عدد۔ ۳/ بھورے بھالو ۲ عدد۔ ۴/ سور، کالے بھالو اور چیتے، تعداد کی حد مقرر نہیں ہے۔ ۵/ باقی حیوان ۳۱ عدد۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ ☆

لداخ......مُلکی سیّاحوں کی نظر میں

''جموں کشمیر لداخ......قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں'' کی پہلی جلد میں جناب عبدالغنی شیخ لداخی صاحب کا ۱۲۰ صفحات پر مشتمل مربوط اور مبسوط مضمون ''لداخ......غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' شامل کیا گیا تھا اور ذیل میں شیخ صاحب کا ایک اور مضمون ''لداخ......ملکی سیاحوں کی نظر میں'' نذرِ قارئین کیا جارہا ہے..........﴿ادارہ﴾

دُشوار گذار راستوں، برَفانی درّوں، ناسازگار آب وہوا اور ضروری اشیاء کی کمیابی کی وجہ سے ماضی میں بہت ہی کم خاص کر ملکی سیاح لداخ آتے تھے۔ تاہم مبلغین، حَملہ آوروں، مہُم جو سیلانیوں، محققوں اور کارِ سرکار پر آنے والوں کی راہ میں یہ مشکلات کبھی مانع نہیں ہوئی ہیں۔ تبت، مشرقی ترکستان اور برِ صغیر ہند کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے بہت سارے مُسافروں، تاجروں، عازمینِ حج وغیرہ کے لئے لداخ سے گزرنا ناگزیر تھا۔

دَسویں صدی سے پہلے ہیُق سم جوزنگ کے مطابق بہت سارے کشمیری پنڈت لداخ آئے اور بدُھ مت سے متعلق کتابوں کا سنسکرت سے کلاسیکی لداخی میں ترجمہ کیا۔ کنشک نے پہلی صدی میں پانچ سو کشمیری عالم لداخ اور تبت بھیجے

☆۔معرفت، یاسمین گیسٹ ہاؤس۔فورٹ روڈ۔لیہہ لداخ۔

اور بدُھ مت کو فروغ ہو۔

اَکثر ملکی سیاحوں اور مُسافروں نے اَپنے سفر کی روئیداد نہیں لکھی ہے۔ اس لئے اس سے متعلق لوگوں کو بہت کم علم ہے۔ پہلا سفر نامہ، جو ایک ملکی مسافر نے لداخ سے متعلق لکھا ہے وہ میر عزّت اللہ کا ہے۔ میرؔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک مُلازم تھا اور ۱۸۱۲ء میں ولیم مُور کرافٹ کے سفر کی راہ ہموار کرنے کے لئے لداخ کے راستے بخُارا بھیجا گیا تھا۔ مُور کرافٹ کو بخارا میں نسل کشی کے لئے اعلیٰ نسل کے گھوڑے خریدنا مطلوب تھے۔ ڈاکٹر مور کرافٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نسل کشی کے لئے رکھے گئے جَانوروں کا سُپرانٹنڈنٹ تھا۔

میر عزت اللہ نے سونمرگ سے اپنا سفرنامہ شروع کیا ہے اور سونمرگ تا لیہہ اور لیہہ تا مشرقی ترکستان ہر پڑاؤ اور بستی کا تذکرہ کیا ہے۔ میر عزت اللہ کے سفرنامہ کو Journal of the Royal Society of Great Britain and Iseland میں Travels beyond the Himalaya کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

میرؔ لکھتا ہے (زوجی لا سے آگے) مٹائن سے ہی مکانات کھنڈرات میں بدَل گئے ہیں اور وِیران نظر آتے ہیں۔ پشتو بولنے والے دردیوں نے دراس پر حملہ کیا تھا۔ حملہ آوروں کی تعداد تین سو تھی۔ اُنہوں نے ۲۵۰ افراد کو اپنے ساتھ اغوا کر کے لے لیا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد کشمیر کے حکمران نے چند بندوق بردار دُراس میں رکھے تھے۔ دُراس کے قلعہ دار کو خرپون کہا جاتا ہے اور لیہہ سے نظر آتا ہے۔

میرؔ نے لیہہ (لداخ) کو تبت کہا ہے۔ لیہہ سے متعلق وہ رقم طراز ہے:

''لیہہ تبت کی راج دھانی ہے۔ میوہ دار درخت کم ہیں۔ بید کے

درخت کثرت سے ہیں۔ لیہہ میں بڑا اچھا شلغم اُگایا جاتا ہے۔ ستو عام خوراک ہے۔ بڑے لوگ چاول کھاتے ہیں۔ لوگ پٹو پہنتے ہیں۔ مَردوں کے بال بھی عورتوں کی طرح گوندھے جاتے ہیں اور چٹیا پیچھے گرتی ہے۔ کثیر الازواج Polyandry مروّج ہے۔...... مکانات پتھر اور کچی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں۔ چھتوں پر سفیدہ کی لکڑی کی کڑیاں لگائی گئیں ہیں۔ مکانات تین یا چار منزلیں اونچے ہیں۔ آبادی تبتیوں اور مُسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں میں شیعہ اور سُنی دونوں ہیں۔ لیہہ میں ایک مسجد ہے۔ اِمام کو ہر تاجر مال کی آمد پر ایک جٹو دیتا ہے۔ ۲۴ جٹو کا ایک رُوپیہ بنتا ہے۔ جٹو پر مغل بادشاہ محمود شاہ کا نام لکھا ہے۔...... مغلوں نے (لداخی) راجہ کو عاقبت محمود خان کا خطاب دیا ہے۔ کشمیر کے حکام راجہ کو اُسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ راجہ بدھ مت کا پیروکار ہے۔...... پولو مقبول کھیل ہے۔''

میر نے لوگوں کی تعریف کی ہے:

''لیہہ میں قیام کے دوران میں نے ایک آدمی کو بھی مسلح نہیں دیکھا۔ اگرچہ اُن کے گھروں میں بندوقیں اور دوسرے ہتھیار رکھے گئے ہیں۔ قتل، ڈاکہ زنی، تشدد اور خونریزی بالکل نہیں ہوتی...... لوگ بہت شریف ہیں۔ کسی کو زک نہیں پہنچاتے ہیں اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہیں۔ بودھ اپنی بیٹیوں کی شادیاں مُسلمانوں سے کراتے ہیں اور اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنے پر اعتراض نہیں کرتے۔ اگر عورتیں چاہیں، کسی بھی وقت وہ اپنا (آبائی) مذہب دوبارہ اختیار کر سکتی ہیں''۔

تُزکِ جہانگیری کے مطابق لداخ کے علاوہ بلتستان اور راجوری میں بھی دو فرقوں کے درمیان شادی بیاہ ہوتا تھا۔

دفاعی نقطۂ نظر سے لداخ کی فوجی کمزوری پر تبصرہ کرتا ہوا میر عزت اللہ

لکھتا ہے:

''چار سو یا پانچ سو گھوڑ سوار سارے ملک میں لُوٹ مار مچا سکتے ہیں''۔

میر کے مطابق لداخ میں بنایا ہوا بارود مشہور ہے۔ لیہہ سے تقریباً تین پڑاؤ پر گندھک کی کانیں ہیں۔

مصنف نے لداخ کی بہت ساری چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ تاہم بہت سارے بیانات سطحی مشاہدہ اور تحقیق پر مبنی لگتے ہیں۔ بدھ مت سے متعلق وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ اس ضمن میں خواجہ شاہ نیاز نے میر سے کہا تھا کہ مذہب سے متعلق وہ کسی سے کوئی سوال نہ کرے کیونکہ حُکام کو یہ بُرا لگے گا۔ خواجہ شاہ نیاز کی جاگیر کشمیر میں سکھوں نے چھین لی تھی اور لیہہ میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ ایک صوفی بزرگ تھے۔

میر عزت اللہ ۱۶ ستمبر ۱۸۱۲ء کو سرینگر سے لیہہ روانہ ہوا تھا اور ۳۱ روز کے سفر کے بعد لیہہ پہنچا۔ ۲۶/ اکتوبر کو وہ مشرقی ترکستان روانہ ہوا۔ جہاں سے وہ بُخارا گیا اور کابل سے ہوتا ہوا ہندوستان لوٹا۔

۱۹۲۰ء میں میر عزت اللہ مُور کرافٹ کے ہمراہ دوبارہ لداخ آیا۔ اس کی پارٹی میں تقریباً ساٹھ افراد تھے۔ ان میں چودہ ہتھیار بند گورکھے، آٹھ افغان اور کئی منشی اور قُلی تھے۔ اُن کے ساتھ ایک پاؤنڈ کی دو پہاڑی توپیں بھی تھیں۔

مور کرافٹ کے ہمراہ ایک فرد حاجی سید نجف علی تھا۔ وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک مُلازم لگتا ہے۔ سیّد نجف علی نے اِس سفر کی روئیداد لکھی ہے اور رقمطراز ہے:

''خواجہ نیاز احمد شاہ (شاہ نیاز) بڑے تاجر تھے۔ یارقند کے شاہی

خاندان کے ممبر اور صوفی شیخ تھے۔ وہ میر عزت اللہ پر مہربان تھے۔ عزت اللہ کی باتیں اور مشورے سینئر وزرا سنتے تھے۔ لداخی راجے سفارتی معاملات میں کشمیری مسلمانوں اور وسطِ ایشیا کے باشندوں کی خدمات حاصل کرتے تھے"۔

نجف علی کے مطابق لداخ اور تبت دونوں مغلوں کے باج گذار تھے۔ تمباکو نوشی کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے کہ اکبر اعظم کے دربار میں تمباکو پہنچنے کے بعد لداخی راجے تمباکو کا استعمال کرنے لگے تھے۔

نجف علی لکھتا ہے:

"میر عزت اللہ نے گورنر کاخان سترین کو کہا کہ لداخ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور رنجیت سنگھ اس کو اپنے زیرِ نگیں لائے گا"۔

نجف علی کے مطابق وُزراء سنجیدہ اور سمجھ دار تھے۔ عزت اللہ نے کہا۔ اگر آپ صاحب بہادر (مُور کرافٹ) سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اور ان کی بات مانیں گے تو وہ اپنے سے بڑوں کو لکھے گا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ لداخ کے راجہ کو کوئی گزند نہ پہنچائے اور وہ یقیناً نقصان دہ مطالبات نہیں کریگا"۔

میر نے لداخی حکومت کو لکھ کر دیا کہ مُور کرافٹ کا دَورہ محض تجارتی ہے۔ یہ کمپنی کی طرف سے حملہ کرنے کیلئے جاسوسی نہیں ہے۔

جامع مسجد کے امام سمیت دوسرے مسلمانوں نے مُور کرافٹ کی حمایت کی، تاہم زیادہ تر کشمیری تاجروں نے حمایت نہیں کی۔

کلون (وزیرِ اعظم) نے میر عزت اللہ کو بُلایا۔ اس میٹنگ میں نجف علی بھی موجود تھا۔ کلون نے پوچھا۔ انگریز صاحب کا ملک اور راجدھانی کہاں

ہیں؟ میر نے جواب دیا کہ یہ ساتویں Clime میں شمال اور جنوب کے درمیان ہے۔

کلون : صاحب کا ملک سرد ہے یا گرم؟

میر : سرد ہے۔

کلون : اس سرد ملک میں کون سے پھل پیدا ہوتے ہیں؟

میر : انہوں نے پودوں کو شیشوں والے حمام میں ڈھانپ رکھا ہے۔ میوہ دار درختوں کی ضرورت کے مطابق وہ انہیں گرم بناتے ہیں۔ اس طرح گرمیوں میں سرد ملکوں کے میوے پیدا ہوتے ہیں اور سردیوں میں گرم ملکوں کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔

میر کی معلومات کے مطابق انگریز اُنیسویں صدی کے شروع میں گرین ہاوس بروئے کار لاتے تھے۔

پھر کلون نے پوچھا کیا انگریزوں کی ملازمت میں گورکھے بھی ہیں؟ میر نے جواب دیا ہندوستان میں انگریزوں کی ملازمت میں بہت لوگ ہیں۔ یہاں صاحب بہادر کے ساتھ چودہ گورکھے ہیں...... اور الموڑہ سے آئے ہیں۔

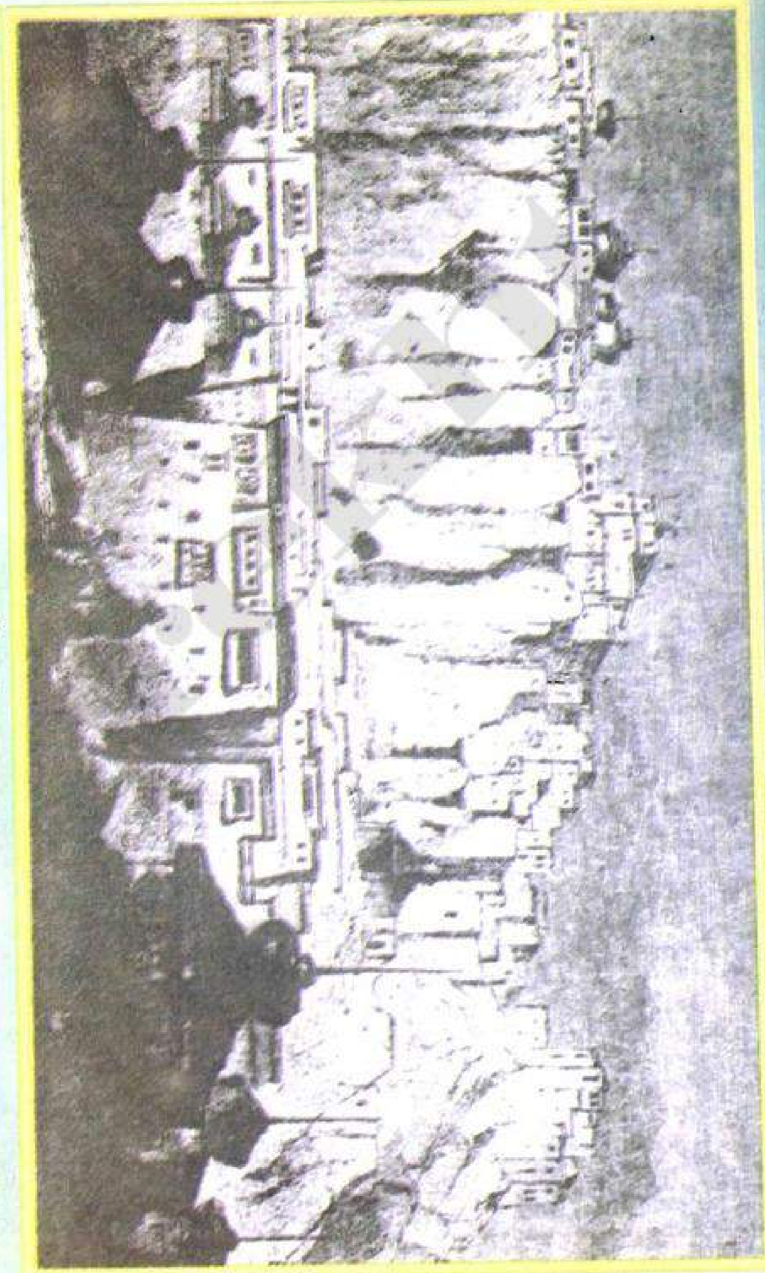
کلون : کیا سارے انگریز آرٹ اور سائنس میں ماہر ہوتے ہیں؟ یا ان میں چند ہی ماہر ہوتے ہیں؟

میر : تمام انگریز سائنس اور آرٹ میں ماہر ہوتے ہیں۔

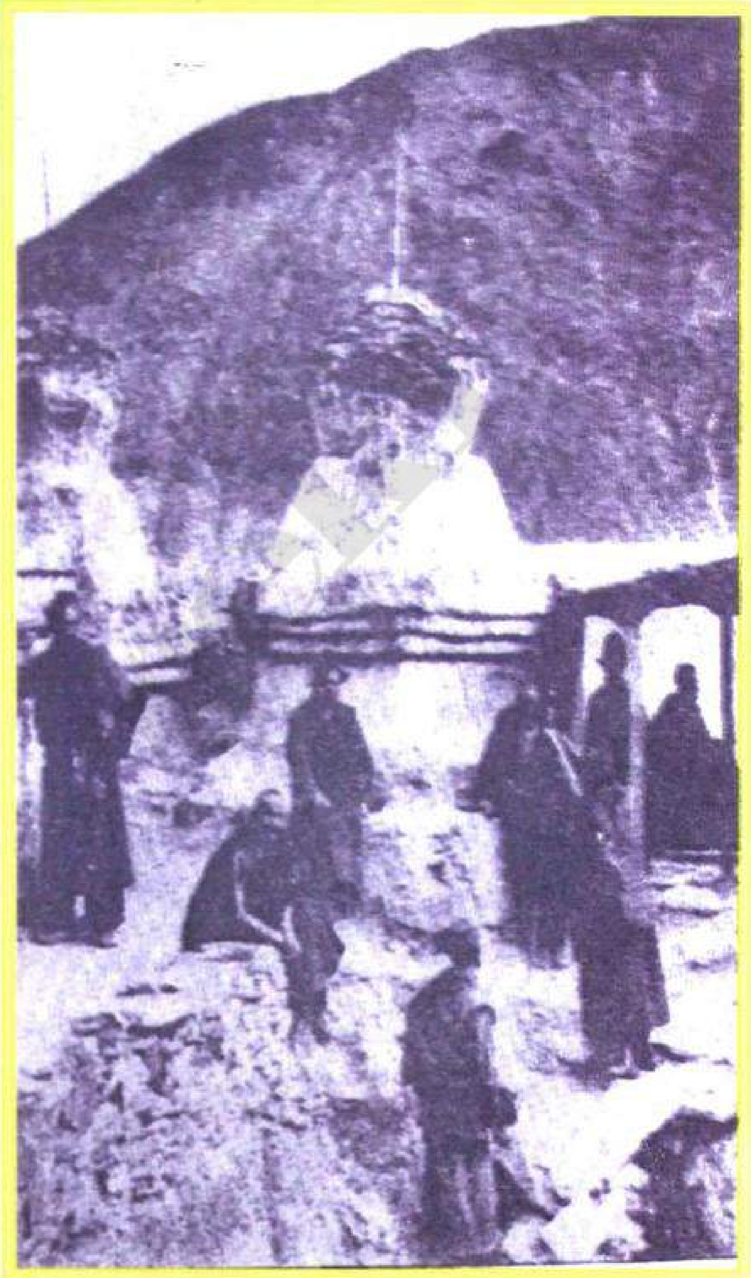
کلون : یہ صاحب جو یہاں آیا ہے کون سا ہُنر جانتا ہے؟

میر : یہ سچ مچ علم والے ہیں۔ خاص طور پر جراحی میں ماہر ہیں۔

اس زمانے میں ایک لداخی کیلئے گھڑی عجوبہ تھی۔ کلون بولا فرنگی گھڑی سازی



ہمیس گمپا...... قلمی تصویر



الچی گمپا اور لامے...... ایک قدیم تصویر

خوب جانتے ہیں۔ کیا ان کے بغیر دوسرے بھی ہنر جانتے ہیں؟ یا نہیں جانتے؟

میر : ترکی اور دوسرے ملکوں میں بھی گھڑی بنائی جاتی ہے اور مرمت کی جاتی ہے لیکن انگریز زیادہ ماہر ہیں۔ گھڑی بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

کلون : میں نے سنا ہے، انگریزوں کا بادشاہ ایک عورت ہے۔ کیا یہ سچ ہے یا جھوٹ؟

میر : اگر انگریز بادشاہ کو صرف بیٹے ہوں، تو ایک بیٹا تخت کا حقدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیٹا نہیں؟ صرف بیٹی ہے تو تخت نشین ہوتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں تخت و تاج کے وارث ہو سکتے ہیں۔

کلون، میر عزت اللہ کے فہم و فراست کی تعریف کرتا ہے۔

مورکرافٹ اور اس کے آدمیوں کی دیکھ بال اور انتظام کیلئے ایک کشمیری تاجر رسول جو کو رکھا تھا اور دوسرا کشمیری تاجر میر محسن علی راجہ اور وزیر اعظم سے مورکرافٹ کی ملاقات کا اہتمام کرتا تھا۔

نجف علی رقم طراز ہے:

> کلون کو بڑے اختیارات ہیں...... وزراء بیرونِ دنیا سے لداخ کے تعلقات اور ثالثی سے آرغون مسلم یا کشمیریوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ راجہ اجنبیوں سے ملنے کیلئے جھجکتا ہے...... آرغون سترھویں صدی سے یہاں آباد ہیں۔

نجف علی کے مطابق اُن دنوں لیہہ میں ۳۰۰ کشمیری مسلمان تھے۔ اُن میں بیس تاجر تھے۔ وہ پشمینہ اور چائے کی ٹکیوں کی خرید فروخت کرتے تھے۔

یارقند، کشمیر اور لہاسہ میں اُن ایجنٹ تھے۔ حکومت نے سارے تجارتی امور آرغون مسلمانوں کو سونپے تھے۔

نجف علی نے لوگوں کے رسم و رواج، لباس، خوراک، تفریحات اور بودھ مسلم تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مورکرافٹ، گلو کے راستے لداخ آیا تھا۔ اُن دنوں گیا میں چھ سے آٹھ کے درمیان سفیدہ کے پیڑ تھے اور بیس کے قریب مکانات تھے۔

۱۸۶۰ء کی دہائی میں رُوس کی توسیع پسند پالیسی کی وجہ سے سبوں کی نظریں لداخ اور گلگت کی سرحدوں پر لگی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہاں لداخ سروے ٹیمیں اور وسطِ ایشیا جاسوس بھیجے وہاں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انگریزوں کی ایما اور خود اپنی طرف سے جاسوس بھیجے۔ مہاراجہ صورتحال سے فائدہ اُٹھا کر مشرقی ترکستانی کو اپنے زیرنگیں لانے کا خواب دیکھتا تھا۔ چنانچہ مشرقی ترکستان کی سرحد کے پاس ایک مقام شہید ولہ پر قبضہ کر کے ایک فوجی چوکی قائم کی اور قلعہ تعمیر کیا۔ تاہم انگریزوں کی مداخلت پر مہاراجہ کو یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ مہاراجہ کے بھیجے گئے مخبروں میں محمد خان اور مہتہ شیر سنگھ نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ یہ مخطوطات میں نے سرینگر کی ریسرچ لائبریری میں دیکھے۔

محمد خان ۶۷-۱۸۶۶ء میں لداخ کے راستے مشرقی ترکستان روانہ ہوا اور اس کے سفرنامے کا نام 'احوالِ ملک لداخ' ہے۔ تاہم اس میں لداخ سے متعلق زیادہ مواد نہیں ہے۔ محمد خان رقمطراز ہے: ذکات خانہ صرف شہر ''لی'' میں ہے۔ (وہ لیہہ کو ''لی'' لکھتا ہے۔) دیوی دوارہ ہے۔ جسے وزیر زورآور سنگھ نے بنایا تھا۔ شیعہ اور سنی مسجدیں ہیں۔ شیعہ مسجد مہاراجہ صاحب (رنبیر سنگھ) کے

زمانے میں تعمیر کی گئی ہے۔ خاں نے گنپوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور پنگونگ جھیل میں بڑی بڑی مچھلیوں کی موجودگی کا ذکر بھی کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے: لداخ میں مہاراجہ کے تعمیر کردہ ہر قلعہ میں چشمۂ آبِ شیرین موجود رہتا ہے...... لیہہ میں ایک سرائے اور دھرم شالہ ہیں۔ علاقے میں مہاراجہ کے بنائے پانچ چھ باغات ہیں۔ اِن کے نام گلاب باغ، رنبیر باغ، پرتاپ باغ اور رام باغ ہیں۔ کچھ مدت پہلے حاکمِ لداخ نے ایک باغ بنامِ رام باغ، میاں رام سنگھ جی کے نام پر بنایا ہے۔

محمد خان کو رنبیر سنگھ کے زمانے میں جاسوسی کیلئے وسطِ ایشیا بھیجا گیا تھا، تاہم سفرنامہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں مکمل کیا گیا ہے جیسا کہ باغات کے ذکر سے ظاہر ہے۔

سفرنامہ میں یارقند، ختن، توقند وغیرہ کے احوال زیادہ دیے گئے ہیں۔ نیز جانسن، ہیورڈ، ڈیوس اور نجف شاہ کے سروے کا تذکرہ ہے۔

مہتہ سنگھ ۱۶/ماہ ساون ۱۹۲۳ مطابق ۲۸/جولائی ۱۸۶۶ء مہاراجہ کے حکم پر مخبری کیلئے کابل سے ہوتا ہوا توقند، بخارا اور یارقند روانہ ہوا تھا اور لداخ کے راستے کشمیر واپس آیا تھا۔ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت بعد وہ پنامیک پہنچا۔ لیہہ کو وہ لداکھ لکھتا ہے۔ لیہہ میں وہ صرف ایک روز رُکا۔ اپنے قلمی نسخہ "سفرنامۂ مہتہ خیر سنگھ" میں وہ لکھتا ہے: اچھا مکان، ایک چھوٹا خوبصورت شہر آباد ہے۔ یہاں مہاراجہ نے ایک کوٹھی بنائی ہے۔

سفرنامہ میں کرگل کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ پشکیوم کا ذکر ہے۔

واپس پہنچنے پر مہاراجہ مہتہ شیر سنگھ کو خلعت اور عطیات دیتا ہے۔

اُن دنوں لداخی مسلمان عمومی طور مذہب سے نابلد تھے اور ان کے معاشرے میں بہت ساری غیر اسلامی باتیں اور رسمیں تھیں۔ اِن کا انکشاف ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ لداخ میں تعینات وزیرِ وزارت سیدّ اکبر علی (۱۸۶۶-۷۱) نے ایک مرتبہ کیس کے مقدمہ کے سلسلے میں چند مقامی مسلمانوں کو لیہہ میں بطور گواہاں طلب کیا اور قسم اُٹھانے کے ضمن میں کلمہ پڑھنے کیلئے کہا۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن میں کوئی مسلمان کلمہ نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ وزیر نے لیہہ کے امام کو بلایا اور ایک مکتب کھولنے کی تجویز رکھی تاکہ دینیات پڑھائی جائیں۔

۱۸۷۹ء میں یہ مکتب کھولا گیا اور ۱۸۹۴ء میں اسے ایک پرائمری سکول کا درجہ دیا گیا۔

وزیر اکبر علی نے مُسلم عورتوں کیلئے سرپوش پیرق، سنکھ کے کنگن اور کنٹوپ پہننے تک غیر شرعی قرار دیئے۔

کشتواڑ وغیرہ کے تاجر لداخ میں آفیون فروخت کرتے تھے، کچھ یارقند لیتے تھے۔ مرزا سیف الدین نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں خاقانِ چین نے حکم جاری کیا کہ جو بھی شخص چین کی قلمرو میں آفیون لائے تو وہ لداخ واپس لے جا کر فروخت کرے۔ اگر کوئی چین علاقے میں آفیون رکھے گا یا پوشیدہ طور بھیجے گا تو سخت سزا دی جائے گی۔ اِس اعلان کے بعد آفیون فروشوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور برآمد شدہ آفیون جلا دی گئی۔ لالہ کوٹھی مل کو چھ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ یہ آفیون ترکستان کے تاجروں کے پاس رکھی گئی تھی۔

چودھری خوشی محمد ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۰ تک لیہہ کا وزیرِ وزارت رہا۔ وہ ایک بڑا

شاعر بھی تھا۔ ان کی مشہور نظم 'جوگی' لداخ میں لکھی گئی تھی جس میں لداخ کے قدرت کے مناظر کا دِلکش نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نظم اُنھوں نے گلگت میں کہی تھی۔ اِس نظم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے چودھری صاحب سے یہ نظم سُنانے کی فرمائش کی تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۱۶ء میں کشمیر کے پہاڑوں میں چند ہفتے گزارے تھے۔ وہ دراس تک آئے تھے۔ زوجی لا کی چوٹی سے لداخ کے ننگے پہاڑوں کو دیکھ کر وہ بڑے جذباتی ہوئے۔ چنانچہ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں: وہاں فقط ننگی چٹانیں، برف اور یخ تھا۔ کہیں کہیں دل آویز پھول کھلے تھے۔ تاہم مجھے قدرت کے اِن ویران اور ننگے گہواروں میں ایک عجیب اطمینان ملا اور میں نے ایک بھرپور طاقت اور طمانیت محسوس کی۔

پنڈت جی دراس کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے تھے۔ وزیٹرز بک میں ایک انگریز کپتان ماینگ وائٹ نے ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لکھا تھا "جس مقامی آدمی نے اِس بنگلہ کا نقشہ بنایا ہے اور لوگوں کا پیسہ ضائع کیا ہے اس سے یہ خریدوانا چاہئے۔"

پنڈت جی اس کے چند سال بعد آئے تھے اور انہوں نے ماینگ وائٹ کا نوٹ پڑھا اور اس میں اِن جُملوں کا اضافہ کیا۔ "کپتان وائٹس کی رائے زنی کی روشنی میں ریاست کے اُس انگریز انجینئر کو، جس نے یہ بنگلہ بنوایا کم سے کم ایک ماہ اس میں رہنے دینا چاہئے۔"

نہرو نے اپنا نام جے نہرو آلہ آباد لکھا تھا۔

۱۹۲۲ء میں ایک اور شخصیّت لداخ پہنچی۔ یہ سوامی راما کرشنا مشن کے

نائب صدر سوامی ابھیدا نندا تھے۔ وہ ایک بڑے عالم تھے۔ انہوں نے انگلینڈ اور امریکہ میں سوامی دیویکا نند کی طرح راما کرشنا مشن کے ایک ترجمان کی حیثیت سے ویدانت فلسفے کی توجیح کی تھی۔

سوامی ابھیدا نندا کی لداخ آمد کی محرک نکولس نوٹووچ کی کتاب The unkonown life of Christ تھی۔ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس نے ہمیں گنپہ میں ایک قدیم صحیفہ دِکھایا جس میں ہندوستان میں حضرت عیسیؑ کی آمد کا ذکر ہے۔ تاہم اُن دنوں لوگ نوٹووچ اور اس کی کتاب دونوں کو بھُول چکے تھے۔ کیونکہ پروفیسر میکس مولر، پروفیسر ڈوگلس اور موراوین مشن لیہہ کے پادریوں نے نوٹووچ کے دعوے کو غلط قرار دیا تھا جس کی تصدیق ہمیں گنپہ کے لاموں نے کی تھی۔ اِس کے باوجود سوامی ابھیدا نند الداخ آئے۔ بعد میں اُن کی ڈائیری کے ذیل کے مندرجات ایک کتاب میں چھپے تھے۔

"میں ۱۹۲۲ء میں کشمیر سے ہمالیہ عبور کرکے بودھوں کے رسم ورواج، عادات، فلسفہ اور تبتی لاموں میں مروّج لاما ازم کا مطالعہ کرنے کیلئے پیدل تبت روانہ ہوا........ لداخ کی راجدھانی لیہہ میں رُکا۔ میری منزل لیہہ کے شمال میں تقریباً ۲۵ میل دور ہمس گنپہ تھی"۔

سوامہ ابھیدا نندا نے اپنی تصنیف "In Kashmir and Tibet" میں لکھا ہے کہ ہمس میں انہوں نے لاموں سے پوچھا کہ حضرت عیسیؑ سے متعلق رُوسی مصنف نوٹووچ کی لکھی ہوئی کتاب میں کہاں تک صداقت ہے جس کے جواب میں لاموں نے کہا کہ اِس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ سوامی جی کی درخواست پر ایک لاما نے شلف میں ایک صحیفہ دکھاتے ہوئے کہا، یہ نقل ہے۔

اصلی کاپی جو پالی زبان میں ہے، لہاسہ کے ماربو آ گنپہ میں ہے۔ ہمارے پاس تبتی میں ترجمہ کیا ہُوا نسخہ ہے۔ بعد میں کچھ مدت تک ہمس گنپہ کے انتظامیہ کی طرف سے اس ضمن میں تردید اور تائید کا سلسلہ جاری رہا اور یہ برسوں تک محققوں کیلئے ایک متنازعہ سلسلہ بنا رہا۔

۱۹۳۰ء کی دہائی کے دَوران لداخ کے بودھوں میں جاگرتی لانے کیلئے ایک مُہم چلی۔ اِس کی شروعات سرینگر کے چند نَو بودھوں سے ہوئی جنہوں نے کشمیر راج بودھی مہا سبھا نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ پنڈت شمبو ناتھ اُس کا صدر مقرر ہوا۔ رسالہ ''مہا بودھی'' میں لداخی بودھوں کے مسائل اور مطالبات چھپتے تھے۔ جولائی ۱۹۳۳ء میں بودھ فرقہ میں تعلیم پھیلانے کیلئے لداخ بدھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ راجہ جگمت ڈاڈول نمگیل اس کا صدر، کلون بزانگ چھوانگ نائب صدر، نونو چھیتن پنچگ سکریٹری، منشی صنم چھوانگ اسسٹنٹ سکریٹری، ماسٹر موروپ گیالچن اسسٹنٹ سکریٹری اور نونو سکلنانگ شاہ خزانچی مقرر ہوئے۔

ہندی کے اَدیب راہول سنکرواتسائن اُنہی دنوں لداخ پہنچا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۳ء کو اُنہوں نے لیہہ سے اپنے بھائی آنند کو ایک خط میں لکھا ہے کہ آج لداخ بودھ شکشا سمیتی قائم ہوئی ہے۔ 'یاترا کے پنے' کے نام سے خطوط کے مجموعے میں اُن کا یہ خط شامل ہے۔ یہ خطوط ان کے ۱۹۳۳ء کے سفر سے متعلق ہیں۔ اِن میں لداخ سے متعلق تقریباً ۸۰ صفحات ہیں۔

اِسی سال راہول سنکرواتسائن نے بدّھ مت اختیار کیا۔ چند مقامی بودھوں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ ان کیلئے کچھ کام کریں۔ اُنہوں نے تین

لداخی ریڈرز اور گرامر تالیف کی۔ اِس سلسلے میں چھیتن پنچگ نے ان کی مدد کی۔ اسی دوران مہاراجہ کو ایک یادداشت بھیجی گئی جس میں لداخ میں اُردو کو انتخابی مضمون بنانے، بودھی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے، بودھ طلباء کے حق میں خصوصی وظیفہ منظور کرنے، لداخ میں بودھ اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی تقرری اور لیہہ مڈل سکول میں سنسکرت اُستاد کی تقرری شامل تھی۔

اِس سے قبل راہول سنکرواتسائن ۱۹۲۶ء میں لداخ آیا تھا۔ تب وہ آریا سماج سے وابستہ تھا۔ انہوں نے لیہہ میں لداخی لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔ وہ ہمس کے بڑے لاما کوشوق مستق منگ راسپا کے ہاں کئی روز مہمان رہا جنہوں نے ان کو لاہول پیتی کے سفر کیلئے 'لم ایگ' پروانہ رہداری دیا اور ایک آدمی اُن کی مدد کیلئے ساتھ بھیجا۔ پروانہ رہداری سے راستے میں کھانا، سواری کیلئے گھوڑا اور رہائش کیلئے کمرے کا انتظام ہو جاتا تھا۔

نوبراہ میں وہ ریزونگ گنپہ کے بڑے لاما داس وینکبو چھے سے ملاقی ہوئے۔ راہول سنکرواتسائن نے اُن کو لداخی بودھوں میں اصلاحات لانے کیلئے چند مشورے دیئے۔ اِن میں ایک Polyandry ختم کرنا تھا جس کی وجہ سے بودھ لڑکیاں دوسرے فرقوں کے لڑکوں سے شادی کرتی تھیں اور بودھ آبادی کم ہو رہی تھی۔ راہول نے صفائی کی خاطر مَردوں کو لمبے بال نہ رکھنے کا مشورہ بھی دیا اور لاموں کو الگ تعلیم دینے کی صلاح دی۔ ریزونگ کے کوشوق نے اِن مشوروں کی تائید کی اور کہا کہ وہ بھی اس ضمن میں اُن کے ہم خیال ہیں۔ یہی مشورے راہول سنکرواتسائن نے ہمس کے کوشوق کو بھی دیئے تھے۔

راہول سنکرواتسائن کے ۱۹۲۶ء کا سفرنامہ 'میری لداخ یاترا' کے عنوان

سے چھپا ہے۔

۱۹۳۳ء کے خطوط پر مشمل سفر نامہ، یاترا کے پنے، کے پیشِ لفظ میں دو شبد کے عنوان سے وہ لکھتا ہے۔

''بھارت اور تبت کے جن تہذیبی اَنمول خزانوں کو میں لداخ کے مُنھوں میں دیکھ آیا تھا' اَب وہاں ان کے قدر دان پیدا ہو گئے ہیں''۔

وہ سرینگر کے راستے لیہہ آیا تھا۔ مولبیک سے آگے کئی گاؤں میں مُسلم آبادی دیکھ کر واتسائن کو تشویش ہوتی ہے اور رقمطراز ہے:

''ادھر گاؤں میں بھی جگہ جگہ مسلمان پہنچ گئے ہیں۔ بودھ گاؤں میں ایک گھر بھی مسلمان کا بسنا، بودھوں کی تباہی کے لئے کافی ہے۔ جہاں بودھوں کی سب بھائیوں کی ایک ہی مشترکہ بیوی ہوتی ہے۔ وہاں مسلمان خدامیاں کے بھروسے سے ہر لڑکے کیلئے الگ الگ شادی کر کے دوسری ہی پیڑھی میں ایک گھر کا پانچ گھر بنانا چاہتا ہے۔ پھر لڑکوں کیلئے بہوئیں پاس پڑوس کی بودھ لڑکیاں ہیں''۔

ایسے ہی خیالات کا اظہار چند مغربی سکولروں نے بھی کیا ہے۔ اس پر اَپنے ردّعمل کا اظہار کرتا ہوا ہاورڈ یونیورسٹی میں پڑھا ایک لداخی سکالر صدیق وحید نے ایک جریدہ Himal میں لکھا ہے کہ مغربی نظریہ کے مطابق تبتی یا لداخی تہذیبی دَھارا میں لداخی مُسلم کو دخل نہیں ہے۔ اُنہوں نے اس طرح لداخ بودھوں اور مُسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

آگے وہ لکھتا ہے:

خلسے میں دو عیسائی کنبے ہیں جو پینتیس سال کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ بزگو میں سوّلہ مُسلم گھرانے ہیں' اِن کو آباد ہوئے چالیس سال

ہوئے ہیں۔

راہول سنکر واتسائن بودھ معززین Elite سے مایوس تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ لداخ بدھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے ممبران کاہل ہیں، فعال نہیں۔ انہیں اُپنے مشن کے طریق کار کا احساس نہیں۔ چنانچہ واتسائن بددِلی سے لکھتا ہے۔ مجھے بہت کم ہی اُمید ہے کہ سو سال بعد یہاں کوئی بودھ رہ جائیگا۔

واتسائن چھیتن پنچگ اور جوزف گیرگن کا مداح ہے' اور لکھتا ہے ان دونوں کے بغیر لداخ میں کوئی عالم نہیں ہے' یہی دو پڑھے لکھے ہیں۔ جوزف گیرگن سے اس کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں بھی ہوئی تھی۔ گیرگن لداخی تاریخ اور ثقافت پر تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ گیرگن عیسائی تھے۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں چھیتن پنچگ بھی عیسائی بنا۔

راہول سنکر واتسائن تخلیقی کام میں جُٹا رہتا تھا۔ وہ آنند کو ایک خط میں لکھتا ہے:

''میری قسمت میں آرام نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں ٹھنڈے پہاڑ پر آرام کرتا ہوگا لیکن یہاں ایک دو بجے اور کبھی چار بجے رات تک چراغ کے سامنے قلم لے کر بیٹھا رہنا پڑتا ہے''۔

لکھنے پڑھنے والوں کیلئے لیہہ کا ڈاک خانہ اہم تھا۔ دیر تو لگ جاتی تھی لیکن اخبارات، رَسائل اور کتابیں آجاتی تھیں۔

واتسائن کے علاوہ پنڈت نیلا کنٹھ، لیہہ مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر گوبندلال شاہ اور پنڈت شمبو ناتھ وغیرہ لداخی بودھوں کے حقوق کے حصول اور سماجی خرابیوں کے خاتمے کیلئے کوشاں تھے۔ گوبندلال شاہ نے پولینڈری کو غیر قانونی

قرار دینے کیلئے یادداشت لکھی جسے حکمت ڈاڈول نمگیل نے حکومت کو پیش کیا۔ بعد میں شری دھرکول' جوڈوکو کے نام سے جانا جاتا تھا، بودھوں کے ایک لیڈر کی حیثیت سے اُبھرا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں لداخ میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز تعینات ہوا۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۳۸ء میں ینگ مینز بدھسٹ ایسوسی ایشن قائم ہوا تھا۔

پرجا سبھا میں دو بودھوں کو نشستیں ملیں۔ لداخی نمائندے زبان نہیں جانتے تھے۔ سرینگر کے بودھوں نے اپنی طرف سے ایک نمائندہ نامزد کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔

کئی ملکی اور غیر ملکی مبصرین نے تیس کی دھائی میں بودھوں کی تحریک کا ذکر کیا ہے۔ تاہم بودھوں کی سماجی زندگی اور تعلیمی حالت میں معمولی سی پیش رفت ہوئی۔

پنڈت امرناتھ انیس سو تیس کی دھائی میں لیہہ کا تحصیلدار تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں An echo of the unknown یا Guide to Ladakh کے نام سے لداخ پر ایک گائیڈ بک لکھا ہے جس میں اُس دور کے لداخ سے متعلق کئی دلچسپ باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ مصنف نے جوزف گیرگن، اُن کے بیٹے سکیاپدن گیرگن، جو اُن دنوں لیہہ سکول میں اُستاد تھا، جے تھرچین اور چرس افسر خان بہادر مولوی غلام محمد کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے کتاب کی تصنیف میں مصنف کی مدد کی تھی۔

پنڈت امرناتھ نے لداخ کی سماجی، معاشی اور تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ لوگ پیتاوا باندھتے ہیں۔ ان کے بستر

بہت کم ہوتے ہیں۔ کم کپڑے اوڑھ کر اوندھے منہ سوتے ہیں اور لکڑی کا سرہانا استعمال کرتے ہیں۔

علاج معالجہ کیلئے لاما، لابا (Oracle) اور لدجے مقامی طبیب سے رجوع ہوتے ہیں۔ ان دنوں دردِ سر کے علاج کیلئے عموماً شیشے کے ٹکڑے سے کان کی لو تھوڑی سی کاٹی جاتی ہے۔ لابا مریض کے بدن پر جہاں درد ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی نالی میں رنگ دار پانی ڈال کر چوس لیتا ہے اور بقولِ مریض درد رفع ہو جاتا ہے۔

درد یا ڈوقپا قبیلہ رات کو چراغ نہیں جلاتا ہے اور روشنی استعمال نہیں کرتا ہے۔ ڈوقپا کہتے ہیں روشنی سے دیوتا ناراض ہونگے۔ پانی سے متعلق اُن کا کہنا ہے کہ پانی صرف پینے کیلئے بنایا گیا ہے نہانے دھونے کیلئے نہیں۔

بچہ پیدا ہونے پر زچہ کے ساتھ اس کا شوہر بھی ایک ماہ گھر میں مقید رہتا ہے اور بچے کی ماں سے زیادہ شوہر کی خدمت کی جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے ہیں۔

کسی مہمان یا بڑے آدمی کا استقبال کرنا ہو، تو دیہات کی بدصورت ترین عورتیں گاؤں کے داخلے پر توؤں میں ستو لئے جمع ہوتی ہیں۔ دمامہ والے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ جب مہمان اُن کے پاس آتا ہے تو ڈوقپا عورتیں جھک جاتی ہیں۔ پھر دستور کے مطابق مہمان کو راستہ دیا جاتا ہے۔

داہانو کے لوگوں نے قدیمی تہذیب اور معاشرت اب بھی قائم رکھی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

چنگپا قبیلہ میں جب کوئی سخت بیمار ہوتا ہے، تو اس کو ایک کھڈ میں رکھا

جاتا ہے اور پہلے مقام سے دُور خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔ دو یا تین آدمی بیمار کو دیکھنے اور تیمارداری کیلئے رَکھے جاتے ہیں۔ اگر بیمار ٹھیک ہوتا ہے، تو اہلِ خاندان سے آملتا ہے۔ اگر مَر جاتا ہے تو اس کھڈ میں پرندوں اور جانوروں کے لقمے بننے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مُصنّف کے زمانے میں لیہہ میں لوسر یا سالِ نو کا تیوہار اچھی طرح منایا جاتا تھا اور راجہ پُرانی رسم کے مطابق اِس میں شرکت کرتا تھا۔ بودھی تیسویں رات، راجہ دعوت دیتا تھا اور دوسرے روز لوگ راجہ کے پاس تحفے تحائف لے کر سلام کیلئے جاتے تھے اور راجہ کے سامنے ٹاقشوس ناچ پیش کرتے تھے۔ دوسرے روز راجہ کی قیادت میں سواریاں بازار میں آتیں۔ راجہ اَپنے بازار میں واقع قیام گاہ میں جاتا تھا اور گھوڑ دوڑ ہوتی تھی۔ اُس دن راجہ اَپنا تاج پہنتا تھا۔ تین روز گھوڑ دوڑ جاری رہتی تھی۔ پھر سارے گھوڑ سوار راجہ کو ایک جلوس میں محل لے جاتے تھے۔ وہاں ٹاقشوس دُوبارہ اَپنا رقص پیش کرتے۔ یہ ناچ تین بجے سے چھ بجے تک دَس روز تک جاری رہتا تھا۔ اِس طرح لوسر اختتام پذیر ہوتا تھا۔

اِسی طرح مذہبی تیوہار دسموچھے کے دوسرے روز راجہ کی قیادت میں گھوڑے پر جلوس نکالا جاتا تھا اور 'ستور مایا' بلا کی علامت ایک پتلا کو نذرِ آتش کیا جاتا تھا۔ اِس کے بعد تین روز تک بازار میں گھوڑ دوڑ رہتی تھی۔

اُن دنوں ستور لوق میلہ کو پوجا کنگیور ستنگیور کہا جاتا تھا۔ اِس موقعے پر لیہہ میں چار سو لامے جمع ہوتے تھے اور چار روز میں کنگیور اور ستنگیور کی ساری پوتھیاں ختم کرتے تھے۔ یہ پوجا پھیانگ کے بڑے لاما کی قیادت میں ہوتی تھی۔

مُصنّف کے زمانے میں پوجا، مہاراجہ کی دَرازی عمر اور حکومت کے بقا

کیلئے ہوتی تھی۔

لداخی شادی میں 'اوم رین' یعنی 'دودھ کی قیمت' لینے کی رسم ہے۔ ماں بچی کو اَپنی چھاتی کا دُودھ پلا کر پروان چڑھاتی ہے۔ اِس کے عوض دُلہن کی ماں دُلہا کے والدین سے تھوڑی سی رقم مانگتی ہے۔ مُصنّف نے اِس کا ذکر کیا ہے۔

مُصنّف رقمطراز ہے:

لداخ میں لاش گھر میں زیادہ سے زیادہ تیس روز اور کم سے کم چار روز رکھی جاتی ہے۔ یہ موسم اور کنبے کی حیثیت پر منحصر ہے...... ایک انوکھی بات یہ ہے کہ مُردے کو اس کے رشتہ داروں یا قریبی آدمیوں کو دیکھنے کی اِجازت نہیں ہے۔ یا شوہر ہے تو بیوی کو نعش دیکھنے کی اِجازت نہیں ہے۔ صرف پھس پُون ہی لاش کو دیکھ اور چھُو سکتے ہیں"۔ (پھس پُون برادری کے آدمی ہوتے ہیں۔ جو شادی غمی میں مدد اور کام کرتے ہیں۔)

اُن دنوں سرکاری مُلازموں سیاحوں اور تاجروں کی سہولت کیلئے ریس اور بیگار کا نظام تھا۔ جس کا بوجھ کسانوں اور عام لوگوں پر پڑتا تھا جس کے تحت ہر پڑاوٗ پر گھوڑے اور قلی رکھنے پڑتے تھے۔ مصنف نے ریس سسٹم کا یوں نقشہ پیش کیا ہے۔

پڑاوٗ کے نام	موسم گرما میں گھوڑے یا زو	گرما میں قلی	سرما میں گھوڑے یا زو	سرما میں قلی
دراس	۸۰	۲۰	-	۱۲۵
کرگل	۵۰	۲۰	۳۰	۳۰
مولبک سے نیموں	۴۰	۲۰	۲۰	۲۰
لیہہ	۵۰	۲۰	۳۰	۳۰

ہر پڑاؤ پر ریس رجسٹر تھا اور متعلقہ شخص کو تفصیل اندارج کرنا پڑتی تھی۔ جنوری اور فروری میں زوجی لا پر آمدورفت برائے نام تھی اس لئے اِن دُو مہینوں کے درمیان دراس میں قلی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

ہر شکاری کو درخواست دینے پر شکار کیلئے مخصوص بلاک فراہم کیا جاتا تھا۔ ایک شکاری کو نیان اور شاپو کا ایک ایک بلاک الاٹ کیا جاتا تھا۔ نیان کے ۱۴ر اور شاپو کے ۱۶ر بلاک تھے۔ شکاریوں کو لکھ کر دینا پڑتا تھا کہ وہ مشرقی ترکستان اور تبت کی سرحدیں پار نہیں کریں گے۔

برٹش جوینٹ کمشنر نے مجوئی سے پٹیک تک ہر ڈاک بنگلہ میں مسافروں اور سیاحوں کے پڑھنے کیلئے ناول رکھے تھے جو وہ عاریتاً ایک ڈاک بنگلہ سے دوسرے ڈاک بنگلہ میں لے جاسکتے تھے۔ اناج کی فراہمی کیلئے دراس، کرگل، لامایورو، سسپول پنامیک اور لیہہ میں سرکاری کوٹھیاں تھیں۔

شکایات کیلئے صرف برٹش جوینٹ کمشنر سے رجوع کیا جاسکتا تھا۔

ہمس گنپہ کے پاس یورپیوں کیلئے ایک بنگلہ بنایا گیا تھا۔ میلے پر یورپیوں اور مہمانوں کیلئے گنپے میں چھم دیکھنے کیلئے دریچے مخصوص کئے جاتے تھے، لیکن گرمیوں کا انتظام انہیں خود کرنا پڑتا تھا۔ اُن دِنوں بھی گنپہ کو نذرانہ دینے کی رسم تھی۔

مصنف نے کوشوق چھوٹیم نیاں کی سراہنا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ریزونگ گنپہ میں سخت ضابطے بنائے ہیں جن کے تحت گنپہ کے احاطہ میں گوشت، تمباکو اور شراب لانے کی اجازت نہیں ہے۔ جب کسی بیمار لاما کو طبیب گوشت تجویز کرتے تو ایک خصوصی قاصد کے ذریعے لیہہ سے منگایا جاتا ہے۔

گنپہ میں مساوات ہے۔ سب کا ایک لباس اور کھانا ہے۔ کھانا دن میں صرف ایک مرتبہ کھایا جاتا ہے۔ لوگ تحفے تحائف پیش کریں تو وہ گنپے کا مشترکہ ورثہ ہوتے ہیں۔

امرناتھ نے لیہہ قصبہ کے اہم مقامات اور یادگاروں کے احوال بھی دئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ لیہہ محل کا دربار ہال Court Room قابل دید ہے۔ لیہہ قلعہ میں ہندوؤں کے دُو مندر دیوی دوارا اور مہابیر مندر ہیں اور مسلمانوں کیلئے 'پنج پیر' مسجد ہے۔ وزیر کے بنگلہ پرتاپ بھون میں مہاراجہ کا جھنڈا لگا ہے جبکہ کرذو باغ میں جوینٹ کمشنر کی کوٹھی کے سامنے یونین جیک لہراتا ہے۔ نیا بازار وکٹوریہ بازار کہلاتا ہے۔ لیہہ قصبہ کے پُرسکون ماحول کیلئے وہ شیکسپیئر کے ذیل کے اشعار کا حوالہ دیتا ہے:-

درختوں کی زبانیں ہیں	Tongues in Trees
بہتی ندیاں کتابیں ہیں	Books in running brooks
پتھروں میں اُپدیش چھپے ہیں	Sermons in stones
یہاں کہ ہر چیز اچھی ہے	And good in everything

دوسرے سیاحوں اور مشاہدوں کی طرح مصنف نے بھی لداخی کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ نہایت ہی غریب ہیں لیکن اپنی قسمت کو کوسنے کے بجائے یہ لوگ اپنی خستہ حالی پر ہنستے ہیں۔ یہ خوش وخرم، خوش مزاج تعاون کیلئے آمادہ اور بڑے راست باز ہیں۔ جب تک سخت مجبوری نہ ہو یہ شاذ و نادر ہی مقدمہ بازی میں اُلجھتے ہیں۔

وزیر حشمت اللہ نے لداخ، بلتستان، گلگت اور چترال میں زندگی کا بڑا

حصہ گذارا اور اِس دوران خطّے کی تاریخ، تمدّن اور ثقافت پر ہمہ گیر تحقیقی کام کیا۔ بعد میں وہ لداخ کا وزیر بنا۔ ۱۹۳۷ء میں اُنہوں نے تاریخ جموں، کشتواڑ، تبت، لداخ بلتستان، گلگت وغیرہ کے نام سے ایک ہی ضخیم مجموعہ میں اِن خطوں کی تاریخیں قلمبند کیں جو اُپنے موضوع پر ایک مستند، مبسوط اور اہم تصنیف ہے۔

بودھوں کا رسم ورواج، کے ذیلی عنوان سے اُنہوں نے لداخی بودھوں کی وارثت، شادی، طلاق، پیدائش اُموات وغیرہ پر سیر حال تبصرہ کیا ہے۔ اِسی طرح گنپوں کے میلوں اور بودھوں کے تہواروں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک مقالہ میں اِن کا حوالہ دینا مشکل ہے۔ زمانۂ حال میں لداخی بودھوں نے وراثت، شادی وغیرہ میں کئی تبدیلیاں لائی ہیں۔ اِس لئے یہاں وزیر حشمت اللہ کی تحریروں کا اختصار سے حوالہ دیا جاتا ہے تا کہ ماضی کی رسومات کی جانکاری اور بصیرت حاصل ہو۔

وارثت:

بودھوں میں وراثت صرف بڑے بیٹے کو ملتی ہے۔ اگر بٹیا نہ ہو تو بڑی بیٹی وارث ہوگی۔ اگر اُس کی دوسرے گھر میں شادی ہو تو دوسری بڑی بیٹی حقدار ہوگی۔ اگر ساری بیٹیوں کی دُوسرے گھرانوں میں شادیاں ہوں تو بھی وراثت سے محروم ہوں گی اور وارثت دوسرے درجے کے وارث کو پہنچے گی۔ جو شخص لاوَلد ہوں تو عموماً اُپنے قریبی رشتہ داروں میں کسی لڑکے یا لڑکی کو گود لیتا ہے۔

شادی:

وہ شخص جس کا سلسلۂ نسب باپ یا ماں کی طرف سے سات پشت کے اَندر مل جاتا ہو، ایک دوسرے سے شادی نہیں کرتے۔ معزّزین مجبوری کی حالت

میں پانچ پشت سے زیادہ لحاظ نہیں کرتے اور راجوں کے درمیان پانچ پشت کا بھی بعض اَوقات لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ معمولی درجہ کے آدمی سات پُشت سے زیادہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ 'پھس پون' باہمی طور شادی نہیں کرتے۔

لداخ میں 'چوری' یا 'خفیہ شادی' کی رسم بھی ہے۔ عموماً فریقین کو اِس کا علم ہوتا ہے لیکن شادی کے اَخراجات وغیرہ سے بچنے کیلئے 'چوری' کی شادی ہوتی ہے۔ اِس کے مطابق لڑکی کے ایک عزیز کی وساطت سے لڑکے کیلئے گھر لے لی جاتی ہے اور دوسرے روز لڑکی کے ماں باپ سے رسمی طور معافی مانگی جاتی ہے اور باقاعدہ شادی کیلئے اُن کی منظوری اور خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔

طلاق:

اگر بیوی سے نباہ نہ ہوا تو شوہر کو ہر وقت طلاق دینے کا اختیار ہے۔ اسلئے ایک گائے یا اس کے برابر قیمت بطورِ معاوضہ دینا پڑتا ہے اور جس قدر جہیز بیوی کے ساتھ آیا ہے وہ واپس کرنا ہوگا۔ اگر بیوی طلاق کی خواہش مند ہو تو وہ اُس وقت تک شوہر کو طلاق کیلئے مجبور نہیں کر سکتی، جب تک شوہر کی بدسلوکی اور بدچلنی ثابت نہ کرے۔

کثیر الازدواجی:

مرد کو اختیار ہے کہ اُپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں اور بیوی یا بیویاں رکھے۔ مگر ایک وقت میں تین سے زیادہ بیویاں رکھنے کا دستور نہیں ہے۔ شوہر کو بیوی کی بہنوں پر بھی حقِ شوہری حاصل ہے۔

وصیت:

ہبہ اور وقف لداخ میں نفی کے برابر ہیں۔ وصیت کا بالکل رواج

نہیں ہے۔ ہبہ کا دستور بھی بہت کم ہے۔ وقف خاص حالات میں گونپوں کے حق میں کیا جاتا ہے۔

پیدائش:

جب اولاد پیدا ہو تو زچہ کے سرہانے ایک چھوٹی میز کے اوپر ایک برتن غلّہ سے بھر کر رکھ دیتے ہیں اور اس پر ایک تیر نصب کرتے ہیں اور میز کے اُوپر ایک ریشمی رومالِ 'خادقس' آویزاں کرتے ہیں۔ رشتہ دار اور ہمسایہ کھانے کے ساتھ مبارک باد دینے آتے ہیں اور خادقس، تہنیتی طور ریشمی رومال پیش کرتے ہیں۔

ذی حیثیت لوگ چھ ماہ یا ایک سال بعد بچے کی پیدائش کی تقریب مناتے ہیں۔ تب ناچ گانے اور ضیافت ہوتی ہے۔ لوگ تحائف لاتے ہیں۔ کچھ لوگ سال دو سال بعد کو شوق سے نام رکھواتے ہیں اور بعض خود ہی نام رکھ لیتے ہیں۔

موت:

جب تک میت گھر میں رہے' لامے مذہبی مقدس کتابیں پڑھتے ہیں۔ متوفی کے زیورات، لباس وغیرہ کا ایک حصہ اور دوسری اشیاء حسبِ حیثیت لاموں کو پیش کیا جاتا ہے۔ تین سال تک کی عمر کے بچّے کی میت کو جلانے کا دستور نہیں ہے۔ اِسے مٹی کے برتن میں رکھ کر پہاڑ میں دفن کر دیتے ہیں۔ بچہ بہت چھوٹا ہو تو گھڑے میں ڈال کر گھر کی دیوار میں چُنائی کر دیتے ہیں۔

وزیر حشمت اللہ نے سالِ نو 'لوسر' اور دوسمو چھے کی تقریبات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جب لداخ کا راجہ بذاتِ خود شامل ہو کر تقریب کی

رونق دُوبالا کرتا تھا۔ اَب یہ داستانِ پارینہ بنی ہے۔

وزیر کے مطابق لداخ کے قومی تہواروں میں 'لوسر' سب سے بڑا تہوار ہے۔ زمانۂ قدیم میں وہ واقعی نو رُوز کے دن منایا جاتا تھا...... معززین و ممتاز اشخاص گیالپو کی خدمت میں سالِ نو کی مبارک باد دینے اور اپنی عقیدت کے اِظہار کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ گیالپو اپنے اہلِ خاندان سمیت دَرجہ بُدرجہ کمرہ دوبار میں رہتا ہے...... جونگ سونگ لہاسہ کو بھی اسی موقع پر گیالپو کی خدمت میں شرفِ بازیابی حاصل ہوتا ہے اور تحفے پیش کرتا ہے۔

دوسمو چھے سے متعلق وزیر لکھتا ہے۔ لداخ کے بودھوں کے عقائد کے مطابق جب بھی کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کے رَفع کرنے کیلئے نجومیوں کے حساب کے مطابق ایک چیز تیار کی جاتی ہے جس کو دوس کہتے ہیں ...... تمام ملک لداخ پر جو تکالیف آئندہ سال آنے والی ہوتی ہیں، ان کے رفع کیلئے اِسی خیال کے مطابق دوسمو چھے یعنی بڑا دوس تیار کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں اے این سپر ولیہہ کا تحصیلدار تھا۔ انہوں نے لیہہ کا معاشی سروے کیا جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ سپرؔو کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ لداخ آنے والے دُوسرے سرکاری اَفسروں کے برعکس، وہ لداخیوں کا بڑا ہمدرد تھا اور سود خوروں اور سرکار کی زیادتی سے اُس کا دِل کڑھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> لداخ سے زیادہ قرضوں کے بوجھ سے دَبے ہوئے خطّے کا تصور کرنا مشکل ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ رُوئے زمین پر ایک غریب ترین خطّہ میں سود کی شرح سب سے زیادہ ہے...... ایک کسان مقروض پیدا ہوتا ہے۔ مقروض جیتا ہے اور مقروض مرتا ہے"۔

سپرو نے لداخی قرض خواہ کو چارلس ڈکنز کے ناول ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے کردار میکابر اور شیکسپیئر کے ڈرامے کے کریکٹر قدیم یہودی شائیلاک سے مثال دی ہے۔

سپرو کے مطابق حکومت خود کسانوں سے ۲۵/ فیصد سُود لیتی تھی۔ لداخ میں اِس کی ملازمت کے دوران گھٹا کر ۱۲ فیصد اور بعد میں ۶ فیصد لیا گیا۔

مُصنّف کی سروے کیمطابق لداخ کے متعدد گاؤں قرضوں کے بوجھ میں دَبے تھے۔ مصنّف نے اُن کے اعداد و شمار دیئے ہیں۔

دوسری بڑی جنگ کے دوران لداخ کی معیشت بہت خراب تھی' وہ لکھتا ہے:

''اس دوران یارقند سے کارواں آنا بند ہوگیا ہے اور لیہہ ''مُردوں کا شہر'' لگتا ہے۔ اُدھر جنگ کی وجہ سے یورپ سے سیاح بھی نہیں آرہے ہیں. اِس لئے لوگوں کی معاشی حالت پر بُرا اثر پڑا ہے''۔

شری دھر کول، جو لداخ میں ڈولو صاحب کے نام سے مشہور ہے، تقریباً دس سال لداخ میں رہا۔ ایک ماہرِ تعلیم اور تعلیمی اُفسر کی حیثیت سے لداخ میں اُن کا خاص مقام رہا ہے۔ ان کی تقرری گلانسی کمیشن کی سفارش کا نتیجہ تھی۔ لداخ میں ان کے دورانِ ملازمت متعدد پرائمری سکول کھولے گئے۔ ڈولو نے دوسرے چند کشمیری پنڈتوں کی طرح بدھ مت اختیار کیا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کی کتاب Ladakh through the Ages شائع ہوئی۔ مصنفین میں ان کے بیٹے ایچ - این - کول کا نام بھی شامل ہے۔ ڈولو صاحب نے کتاب میں اُپنے تجربات اور چشم دید واقعات پیش کئے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے لداخ اور زنسکار میں رشوت ستانی اور ملازموں کے مظالم کا ذکر کرتے

ہوئے وہ رقمطراز ہے:

''سرینگر سے جب ایک افسر وزیر کے عہدے پر تبدیل ہو کر لیہہ آیا تو اُپنے خاندان سمیت بارہ گھوڑوں پر آیا۔ چند ماہ بعد جب وہ سکر دو گیا تو چوبیس گھوڑوں پر صرف سامان لیا۔ سواری اور دفتری ریکارڈ کیلئے بارہ گھوڑے تھے۔ خاندان کے افراد کی نقل و حمل کیلئے سات پالکیاں لی گئیں۔ اُن کیلئے سو سے تین سو قلی لگائے گئے تھے''۔

زنسکار میں بُرے اور اَچھے سال دورے پر آنے والے ملازموں کی تعداد پر ناپے جاتے تھے۔ جس سال کم ملازم آتے تو یہ کہا جاتا یہ سال اچھا تھا کیونکہ کم ملازم آئے۔

کسی کے گھر میں باپ مر جاتا تو بیوی پر الزام لگایا جاتا کہ مرنے والے کو زہر دے کر مار دیا گیا ہے۔ بیوی کو ہتھکڑی پہنا کر کرگل لایا جاتا۔ رشتہ داروں کو جُرم میں ماخوذ کیا جاتا اور روپیہ بٹور کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب لداخ خبر آئی کہ گلگت پر حملہ ہوا ہے تو پریذیڈنٹ ینگ مینز بُدھسٹ ایسوسی ایشن کلون چھوانگ رگزین نے نیشنل گارڈز قائم کرنے کیلئے حکومت سے درخواست کی ...... بعد میں ۷۰۰ خچروں پر ہتھیار، گولہ بارود اور اشن لیکر ۱۵۰ گورکھے لیہہ پہنچے۔ تب حملہ آور ہمس شُو کپا چن پہنچ گئے تھے۔ پنڈت ڈولو نے نیشنل گارڈز قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۴۸ء کے پُر آشوب دور میں لداخ کے ایک سرکردہ انجینئر صنم زبو نے لیہہ کا ہوائی اڈہ تعمیر کیا۔ صنم زبو سرینگر کے ہوائی مستقر کا انچارج تھا۔ فروری میں اُنہوں نے زوجی لا عبور کیا اور لیہہ آ کر اپنا کام شروع کیا۔ اس کے روئداد صنم زبو نے ہندوستانی نژاد کے ایک امریکی اُدیب وید مہتہ کو سُنائی، جو لداخ آیا

تھا۔ ہم یہاں وید مہتہ کا انٹرویو اختیار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو اِس دَور کے لداخ پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ مہتہ نے یہ انٹرویو اپنی کتاب Portrait of India میں شامل کیا ہے۔

''میں ایک رات صنم نربو سے اُن کے دفتر میں ملا۔ میں نے نربو سے سوال کیا کہ لیہہ کے ہوائی اڈے کی تعمیر کی محرکات کیا تھے؟ نربو بولے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب قبائلی کشمیر پر قبضہ جمانے کیلئے آئے تو ریاستی سرکار کو تشویش ہوئی کہ لداخ پر حملہ ہوگا۔ میں اُن دنوں سرینگر کے ہوائی مستقر کا انچارج تھا جو کشمیر میں ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت کا واحد اڈہ تھا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا ایک دن ڈی پی درنے جو ہوم سکریٹری تھا، مجھ سے پوچھا نربو! کیا آپ لیہہ تک فوج کے افسروں اور جوانوں کی ایک پارٹی کی قیادت کریں گے؟ وہاں آپ کو ایک ہوائی اڈہ تعمیر کرنا ہے۔ اُس موسم میں لیہہ سفر کرنا انتہائی خطرناک تھا۔ تاہم میں نے ڈر کے کہا۔ میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔

میں ۱۷فروری کو فوجی گاڑیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ روانہ ہوا۔ کرنل عبدالعزیز ان کی قیادت کر رہے تھے۔ اِسکے ایک روز پہلے دُو فوجی افسر لیفٹینٹ کرنل پرتھو چند اور لیفٹینٹ کرنل ہو سا جن چند جوانوں کے ہمراہ زوجی لا روانہ ہوئے تھے۔ ہم سرینگر سے صرف ۱۸میل دُور گاندربل پہنچے تھے کہ سخت برف باری شروع ہوگئی۔ چنانچہ بڑی مُشکل سے ہم پندرہ میل آگے سفر جاری رکھ سکے۔

کرنل عزیز مجھ سے بولے۔ میری ساری گاڑیاں بَرف میں پھنس گئی ہیں۔ آپ کا کیا اِدارہ ہے؟ میں پیدل روانہ ہوتا ہوں۔ میں نے کہا میرا ہراَول نگہبان دستہ یہاں سے بارہ میل دور گونڈ میں میرا انتظار

کر رہا ہوگا۔

ہرَاول دَستہ حسبِ توقع گونڈ میں ہمارا منتظر تھا۔ زبردست برفباری ہو رہی تھی۔ ہم گونڈ میں سات دن اور سات راتیں پھنسے رہے۔ میں نے ۱۵۰ قلیوں کو مزدوری پر لیا تھا۔ آٹھویں روز ہم سونہ مرگ پہنچے۔ ریاستی ملیشیا کے بریگیڈیر فقیر سنگھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بریگیڈیر بولے آگے جانا ممکن نظر نہیں آتا۔

لیکن ہمیں جانا ہوگا! میں نے کہا۔

دوسری صبح میں ڈھائی بجے اُٹھا۔ میں نے تمام قلیوں کو جگایا اور اُن کو اپنا سامان اُٹھانے کیلئے کہا۔ اُنہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ کیا آپ ہم کو موت کے مُنہ میں دھکیلنا چاہتے ہیں؟

میں نے التجائیں کیں اور دھمکیاں دیں۔ برف بھر بھری تھی؟؟؟۔ ہم ایک قدم برف پر رُکھتے اور گلے تک بَرف میں دھنس جاتے۔ ہم اِس برف میں سفر کرتے رہے اور بالتال تک آٹھ میل کا سفر مسلسل سولہ گھنٹوں میں طے کیا۔ میں بالتال کے ڈاکیہ سے ملا اور اُس کو کہا کہ وہ ہمیں محفوظ ترین راستے سے زوجیلا پار کرنے میں مدد کرے۔ قلیوں نے ساری رات آہ وزاری میں کاٹی۔ تاہم ہم نے صبح ساڑھے تین بجے سفر شروع کیا۔ آندھی کے بگولے بار بار چلنے لگے۔ کئی دفعہ ہم ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے اور کبھی پیٹ کے بل رینگ کر چلے گئے۔ گیارہ بجے سب صحیح وسلامت زوجی لا کی بلندی پر پہنچے۔ پھر ایک بڑی پسی گری۔ جو قلیوں کے سامنے سے گذر گئی اور کسی قلی کو آنچ نہیں آئی۔

یہاں سے کچھ آگے میں نے کشمیر کی طرف سے آئے ہوئے قلیوں کو چھٹی دی اور قریب کے دیہات سے نئے قلی لئے''۔

آپ کب لیہہ پہنچے؟ میں نے نربو سے پوچھا۔

"۸ مارچ کو ہم لیہہ پہنچے اور ہم نے فوری طور ہوائی اڈے کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ڈیڑھ ماہ میں ہوائی اڈہ مکمل کرنا تھا۔ میں روزانہ مسٹر در سے پوچھتا تھا کہ وہ کب آزمائشی اُڑان کیلئے لیہہ طیارہ بھیج رہے ہیں؟ جب قبائلی لیہہ سے صرف ۱۵ میل دور رہ گئے۔ مجھے مسٹر در کا یہ پیغام ملا کہ اس روز ایک ہوائی جہاز ہوائی اڈے پہ اُترنے کی کوشش کرے گا۔ مئی کی ۲۲ تاریخ تھی۔ موسم سہانا تھا۔ ہوائی جہاز اُترا۔ دروازہ کھلا اور اُس میں سے ہوا باز ائرکموڈر مہر سنگھ اور جرنیل کے ایس تھمایا نکلے۔

۲۷ مئی کو ۵ جہاز اُترے۔ ہوائی جہاز لداخیوں کیلئے لوہے کے اڑان گھوڑے تھے۔ لداخیوں کے ایک ہجوم نے نوکریوں میں گھاس لائی تھی۔

وید مہتہ نے لکھا ہے: If we lose our air strips then we lose Ladakh۔ دوسرے لفظوں میں صنم نربو نے ہوائی اڈہ نہ بنایا ہوتا تو لداخ کا دفاع نہیں ہوسکتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں لیہہ کے فوجی کمانڈنگ افسر کرنل پرب نے لیہہ میں ایک وزارتی کونسل کی تشکیل دی تا کہ فوج اور سول آبادی میں رابطہ قائم رکھا جائے موراوین مشن کے پادری نارمن ڈرائیور کو وزیر اعظم بنایا۔ مسٹر ڈرائیور کو وزیر صحت بنایا۔ تین سرکردہ لداخی کلون چھوانگ رگزین، خواجہ عبداللہ شاہ اور ایلی ایرز جولان کو بالترتیب وزیر دفاع، وزیر داخلہ اور وزیر تعلیم بنایا۔ تاہم وزارتی کونسل نے عملی طور پر کوئی کام نہیں کیا۔

فروری ۱۹۴۹ء میں کرنل پی این کول ستائیسویں جے اینڈ کے ملیشیا کے

بٹالین کمانڈر کی حیثیت سے لیہہ پہنچا۔ کول نے Frontier Callings کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جو اُس زمانے کی سماجی زندگی اور سیاسی حالات پر مختصر روشنی ڈالتی ہے۔

جب شام کا دھندلکا ہوتا تو لوگ لیہہ بازار میں ایک گھنٹہ کیلئے پہنچتے۔ اندھیرا چھا جانے سے پہلے کچھ انسانی سرگرمیاں ہوتیں۔

قصبہ میں ملنے کی ایک اہم سماجی جگہ کرز وچھومیک (چشمہ) تھی۔ چشمہ جانے والی تنگ گلی Lovers lane "کوئے جاناں" کے نام سے جانی جاتی تھی۔ شام کو قصبے کی لڑکیاں گاگرے لے کر یہاں پانی لینے آتیں۔

کول لکھتا ہے:

"چین میں کمیونسٹ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مشرقی ترکستان سے کئی ہزار مسلمان بھاگ کر لیہہ آئے جنہیں بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر بھیجا گیا۔ جہاں سے وہ بعد میں مشرق وسطی اور ترکی چلے گئے۔

ہندوستانی کونسل جنرل ۱۹۵۰ء میں کاشغر سے لیہہ پہنچا۔ اسی طرح اوچھی سے امریکی کونسل جنرل اور کاشغر سے انگریز نائب کونسل لیہہ پہنچے۔

اگست ۱۹۵۰ء میں پہلی جیپ لیہہ پہنچی (یہ ہوائی جہاز میں لائی گئی تھی) پاکستانی فوج کا ایک پلاٹون زنسکار میں پھنس گیا تھا۔ کرنل کول نے اس پلاٹون کو جنگ بندی کے چھ ماہ بعد واپس سکردو بھیج دیا۔

۱۹۵۹ء میں مصنف بھارتی کونسل جنرل کی حیثیت سے لہاسہ روانہ ہوا۔ وہاں درجنوں لداخی لامے تھے جو زیادہ تر ٹھکسے اور پھیانگ گمپوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چینی وزارتِ خارجہ کو کئی احتجاجی مراسلے لکھنے کے بعد ان میں سے اکثر کو لداخ واپس جانے کی اجازت دی۔

۱۹۷۵ء میں لداخ کو سیاحت کیلئے واگذار کرنے کے بعد ملکی سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تاہم ملکی سیاحوں کی تعداد غیر ملکی سیاحوں کے مقابلے میں ہمیشہ کم رہی ہے۔ پہلے سال جہاں ۵۵۱ رغیر ملکی سیاح آئے، ملکی سیاحوں کی تعداد ۲۷ رتھی۔ دو سال بعد ۱۹۷۶ء میں ملکی سیاحوں کی تعداد ۲۵۳ رتھی۔ اِس کے برعکس غیر ملکی سیاحوں کی تعداد ۴۵۸۰ رتھی۔ وادیٔ کشمیر میں نقصِ امن سے پہلے ۱۹۸۸ء میں ۱۶،۲۵۶ رغیر ملکی سیاح لداخ وارد ہوئے۔ اُس سال گھریلو سیاحوں کی تعداد ۸۷۰۸ رتھی۔ تب سے ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے۔ اِس دَوران چند ملکی سکولر لداخ آئے جنہوں نے لداخ پر تحقیقی کام کیا، تھیسس لکھے اور لداخ کے عصری مسائل میں دلچسپی لی۔ اِن سکولروں میں چند اہم نام ڈاکٹر روینہ اگر وال، ڈاکٹر مُنیشا احمد، ڈاکٹر روہیت دوہرا، پرُوفیسر ہر جیت سنگھ اور ڈاکٹر سنیو گتا کوشل ہیں۔

ڈاکٹر روہیت دوہرا نے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے دَوران لداخی بودھ دَرد قبیلہ (ڈوقپا) پر ریسرچ کیا اور دو کتابیں لکھیں۔ دَرد، لائن آف کنٹرول کے ساتھ واقع وادی سندھ کے چند گاؤں میں آباد ہیں۔ اپنے منفرد رسم ورواج، اعتقادات، لباس، شکل وصورت اور نسلی اعتبار سے دَرد دوسرے لداخیوں سے جُدا ہیں۔

روہیت دوہرا کے مطابق دَرد ایک قدیم قوم ہے۔ مہابھارت، یونان اور ہندوستان کے قدیم سنسکرت ادب میں دَردوں کا ذکر ملتا ہے۔ یونانی مورّخ ہیروڈٹس نے جن کو دُنیا کا پہلا مورّخ کہا جاتا ہے، دَردوں کو ہندوستان میں سب سے جنگجو قوم قرار دیا ہے۔ کشمیر کے چَک حکمران دَرد نسل کے تھے۔

لداخ میں دَرد گلگت، چیلاس اور اِن کے آس پاس کے علاقوں سے آئے

تھے۔ آبادی میں اضافہ، کھیتی باڑی اور چرائی کیلئے زمین کم پڑنے سے وہ نئی زمین کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے۔ کئی گیت اُن کے سفر کے راستوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ روہیت دوہرا نے گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک گیت کہتا ہے:

ہم گلگت کے بُروکسل نالے سے نکلے
اور گلگت کے رقص گاہ پہنچے
پھر تورُمیک کے سردار کے محل کی کھڑکی کے پاس سے گذرے
پھر بسوبسو پہنچے......شکر کندب پہنچے
جہاں سے سکردو اور چلو پہنچنے کا ذکر ہے۔

دوسرے گیت میں مولبیک، لامایورو، ستیاہ تینگ موگنگ سے ہوتے ہوئے ہمس شوکپا چن پہنچنے کا ذِکر ہے جہاں سے وہ لیہہ اور شے تک آئے۔ دَردوں کے ایک پرانے گیت میں گلگت سے اُن کی آمد کا تذکرہ ہے۔ دَرد آج بھی یہ گیت گاتے ہیں۔ گیت کا بول ملاحظہ ہو:

آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟
ہم گلگت سے آئے ہیں۔
آپ کا مذہب کیا ہے؟
ہم دیوی دیوتاؤں کو پُوجتے ہیں۔
آپ کی نسل کیا ہے؟
ہم گالو، مے لو اور ڈولو کی اولاد ہیں۔
آپ کا پیشہ کیا ہے؟

ہم سونا جمع کرتے ہیں۔۔۔!

روہیت دوہرا کے ریسرچ کے مطابق دردوں کے سماج میں تین افراد اہم ہیں۔ایک پجاری، دُوسرا پُرانے بھجن یا گیت گانے والا اور تیسرا کاہن، جسے لہا کہا جاتا ہے۔ پجاری مذہبی فریضہ اَدا کرتا ہے۔گلوکار تقریبات میں پُرانے گیت گاتا ہے۔ لہا یا کاہن وَجد کے عالم میں پیشین گوئیاں کرتا ہے اور سائلوں کے مَسائل کے حل کیلئے وَسیلے بتاتا ہے۔ دَرد، اَرواحِ خبیثہ، بھُوت پریت' ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ 'لُو' نام کی ایک غیر مرئی ہستی کو مانتے ہیں جس سے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ یہ پانی میں رہتا ہے اور چشمے کے تازہ اور صاف پانی کا محافظ ہے۔ وہ لُو کو اشتعال دینے سے سخت گھبراتے ہیں۔

دَرد اصولِ آلودگی Principle of pollution پر گہرا اعتقاد رکھتے ہیں۔ باورچی خانے کا چُولہا ان کیلئے مقدس ہے۔ اس کے پاس اُن کے گھر کا دیوتا 'سب دق' رہتا ہے، جس کا بظاہر کوئی وجود نہیں۔ کسی اجنبی کو چُولھے کے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ آلودگی کا مسئلہ اُنکی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے۔ دَرد اکثر جونیپر کے پودے کی دُھونی سے اَپنے جسم کی تطہیر کرتے ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ کھانے کے ٹکڑے تین مرتبہ 'سب دق' کے مفروضہ جگہ کی طرف پھینکتے ہیں۔

روہیت دوہرا نے دَردوں کے تیوہاروں کا تفصیل سے ذِکر کیا ہے۔ بونونو تیوہار ہر تیسرے سال اَپنے آباء واَجداد کی یاد میں منایا جاتا ہے اور کئی روز تک جاری رہتا ہے۔ 'ساکا' بیج بوائی کا تیوہار ہے۔ سَتولا آغازِ بہار میں منایا جاتا ہے

اور اچھی فصل کیلئے دُعا مانگی جاتی ہے۔ نئی فصل ملنے پر فصل کٹائی کا تیوہار ہوتا ہے۔ مرنے والوں کی یاد میں ممانی تیوہار منعقد کیا جاتا ہے۔ کسی کی عمر میں بارہ سال پورا ہونے پر گاؤں میں ایک اجتماعی میلہ لگتا ہے۔ ناچ گانے، ہر تیوہار اور میلے کی خصوصیت ہے۔

پانسہ کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کئی دفعہ کوئی سنجیدہ کام کرنے سے پہلے وہ پانسہ پھینک کر دیکھتے ہیں کہ وہ کام کرنا چاہئے یا نہیں۔

دَردوں کی زندگی میں آج بھی چرائی اور زرعی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مرد اُون بٹتے ہیں۔ عورتیں تکلی پر اُون کاتتی ہیں تاکہ سردیوں کے لئے گرم اُونی کپڑے تیار کریں۔

روہیت دوہرا کی کتابیں اَپنے موضوع پر گہری اہمیت کی حامل ہیں۔

جہاں روہیت دوہرا نے دَرد قبیلے پر کام کیا ہے، منیشا احمد نے لداخ کا دوسرا قبیلہ خانہ بدوش چنگپا پر دُور رس کام کیا ہے۔ خانہ بدوشوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کیلئے وہ اُن کے ساتھ خیموں میں رہی ہے اور سفر کیا ہے۔ منیشا نے ڈاکٹریٹ کیلئے اَپنا تھیسس لکھنے کے علاوہ چانگپاؤں کی دَست کاریوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ذیل میں ہم منیشا کی نگارشات سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

لداخ کا چنگپا قبیلہ اَپنے تمدّن، پیشہ، رہن سہن اور تاریخی پسِ منظر کے لحاظ سے ایک روایتی قبیلے کی تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ چنگپا بڑے جفاکش ہیں۔ یہ کٹھن اور سخت زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ منیشا نے خانہ بدوش چنگپا کی روزمرہ زندگی، رہن سہن اور ثقافت کو اُجاگر کیا ہے جو لداخ کے سرد اور بلند

مقامات رُوپشو، کورزوق اور خرتق میں بستے ہیں۔

منیشا احمد کی تحقیق کے مطابق خانہ بدوش چنگپا ایک جگہ ایک ماہ یا اِس سے کم یا زیادہ مدت رہتے ہیں۔ اِس کا انحصار چراگاہ میں گھاس کی دستیابی اور نایابی پر ہے۔ سَردیوں کے تین چار ماہ وہ اُپنے خاندان کے تمام اَفراد کے ساتھ اِکٹھے گذارتے ہیں۔ اَپنے مال مویشیوں کیلئے سردیوں میں استعمال کیلئے گھاس کا سٹاک رکھتے ہیں۔

سفر میں وہ اُپنا گھریلو سامان ساتھ لیتے ہیں۔ یاک کو عموماً سواری اور بھیڑ بکریوں کو بار برداری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک بھیڑ عموماً دس سے پندرہ کلو تک بوجھ اُٹھاتی ہے۔

خانہ بدوش چنگپا تنبو میں رہتے ہیں۔ تنبو یاک یا بکری کے بالوں یا دونوں ملا کر بنایا جاتا ہے اور اِس کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ وہ اِس میں کھانا پکاتے ہیں، سوتے ہیں اور پُوجا کرتے ہیں۔ اِس کے اندر طاقچے بنے ہوتے ہیں جن پر مکھن، پنیر اور گوشت رکھتے ہیں۔ ہر تنبو کے اَندر پتھروں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوتا ہے۔ جس پر بُدھ کی چھوٹی مُورتیاں یا تصویریں رکھی جاتی ہیں۔ تنبو کو دھارمک جھنڈیوں اور یاک کی دُموں سے سجاتے ہیں۔ ایک تنبو کی اوسط لمبائی ۱۰ فٹ، چوڑائی ۴ فٹ اور اُونچائی ۶ فٹ ہے۔ آج کل روپشو میں سو تنبو ہیں۔ آج کل سفید رنگ کا تنبو بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ یہ پیراشوٹ کے کپڑے یا مضبوط سوتی کپڑے سے بنایا جاتا ہے۔

خانہ بدوش چنگپا پشمینہ بکریاں پالتے ہیں۔ پشمینہ کا اچھا دام پاتے ہیں۔ پشمینہ سے شالیں بنتی ہیں۔ کشمیر میں بنی پشمینہ کی شالیں بڑی عمدہ ہوتی ہیں اور ان

کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر پشمینہ کشمیر برآمد کیا جاتا ہے۔

بھیڑوں سے اُون حاصل ہوتی ہے اور گوشت کیلئے قصابوں کو فروخت کی جاتی ہے۔

بکری کے بال یا پشمینہ کاٹتے ہوئے ایک گیت بنا ہے۔ منیشا احمد نے اِس گیت اور دوسرے کئی گیتوں کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے:

اے بکری! ابھی تم نے جو گھاس کھائی
اس کیلئے ہمیں کچھ اچھا پشمینہ دو
اے بکری! اس پانی کیلئے جو تم نے بھی پیا
ہمیں کچھ اچھا پشمینہ دو۔
اے بکری! گھاس پر چُپ چاپ بیٹھ جاؤ
ہمیں پشمینہ حاصل کرنے دو

پشمینہ اور اُون کاٹنے سے پہلے جیوتش سے استدعا کرتے ہیں کہ کٹائی کیلئے ایک اچھا دِن بتائے۔ کٹائی کا کام عموماً مرد کرتے ہیں۔ اگر کسی کنبے میں مَرد کم ہو تو عورتیں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

چرواہے عام طور پر آٹھ نو سال کے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں۔ چرواہا سے وابستہ ایک گیت ملاحظہ ہو!

چرواہا! یہاں نہیں بیٹھو، چرواہا، اٹھو اپنی بھیڑوں کے ساتھ جاؤ
چرواہا! پہلے لاما کے پاس جاؤ اور آداب بجالاؤ
گرمیوں میں گرمی سے نہ گھبراؤ، سُرخ رنگ کا مہین سوتی کپڑا پہنو
سردیوں میں سردی سے نہیں گھبراؤ، موٹے، چمڑے کا لباس پہنو

مال مویشیوں کو پہاڑ گھاس چرنے کیلئے جانے کے بعد عورت مرد باڑے میں جمع ہوتے ہیں۔ دھوپ میں بیٹھ کر نمکین چائے خوب پیتے ہیں، گپ شپ ہوتی ہے، چھچہ میں ستو لے کر پھانکتے ہیں اور کتائی بنائی میں جُٹ جاتے ہیں۔ عمر رسیدہ عورتیں اُون دھنتی ہیں اور کتائی کرتی ہیں جبکہ جوان عورتیں پٹو بُنتی ہیں۔ مرد بٹائی کرتے ہیں۔ لڑکیاں کمسنی سے ہی کتائی اور دھنائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور پندرہ سولہ سال تک ٹھیک سیکھ لیتی ہیں۔ مرد عموماً سترہ اٹھارہ سال تک بٹائی سیکھتے ہیں۔ لڑکیاں پہلے پٹو بننا اور لڑکے تنبو بننا سیکھتے ہیں۔ مرد خورجین (Saddle bag) اور کمبل بُنتے ہیں جو یاک اور بکری کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔ بُنائی کے لئے ہاتھ کرگھا استعمال کیا جاتا ہے جو آسانی سے اُٹھایا جا سکتا ہے۔ عورتیں اِسے کمر سے باندھ کر بُنائی کرتی ہیں۔

رُوپشو میں کہا جاتا ہے کہ جو لڑکیاں بُنائی میں مصروف رہتی ہیں اُن کے دل و دماغ میں بُرے خیالات نہیں آتے۔ کرگھے کی تعریف میں خانہ بدوش چنگپاؤں کا ایک گیت سنئے۔

کرگھا کو انمول سمجھو، یہ اچھی بات ہے۔
کرگھا کو لاما کی مقدس عبادت گاہ سمجھو، یہ اچھی بات ہے۔
کرگھا کو بدھ کا تیرتھ سمجھو، یہ اچھی بات ہے۔
کرگھے کے پُرزے ایک ماں کے بارہ بچوں کی طرح ہیں۔
کرگھا کو دھارمک کتاب سمجھو، یہ اچھی بات ہے۔
کرگھے کی آواز کو ایک لامے کی آواز سمجھو، یہ اچھی بات ہے۔

ریوڑ کے ساتھ ایک محافظ کُتا جاتا ہے جو بھیڑوں کی حفاظت کرتا ہے۔

چرواہا اپنے ساتھ گوپھن لیتا ہے اور اِسے ہِلا ہِلا کر جانوروں کو ہانکنے کیلئے آواز پیدا کرتا ہے۔

ستمبر اور اکتوبر میں روپشو والے اکٹھے چھوکر یا سفید جھیل سے نمک نکالتے ہیں۔ کبھی کدال، بیلچے اور ایک ٹین لے کر جھیل میں جاتے ہیں۔ ٹین کے پیندے میں سُوراخ بنے ہوتے ہیں۔ جس میں سے فاضل پانی نکل جاتا ہے اور نمک موجود رہتا ہے۔ ایک دن نمک کو سُکھایا جاتا ہے پھر خورجین میں ڈالا جاتا ہے اور بھیڑ یا بکرا پر لاد کر منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔

یاک 'چنگ تھنگ' کا ایک اہم اور مفید جانور ہے۔ یہ یخ پر آرام سے چل سکتا ہے، گھاس چارہ کے بغیر برفانی علاقے میں کئی روز رہ سکتا ہے۔ اس کو بہت کم سردی لگتی ہے، اِس لئے یاک کو ہمالیائی اونٹ کہا جاتا ہے۔

چھولو یا پانسہ کا کھیل خانہ بدوشی میں مقبول ہے۔ وہ مختلف کاموں کیلئے بطور قرعہ اندازی پانسہ استعمال کرتے ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات خانہ بدوش چنگپا کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ سرکار نے اُن کیلئے گشتی سکول اور گشتی ڈسپنسری کا انتظام کیا ہے۔ پشمینہ اُون اور بھیڑوں کی فروخت سے اچھی خاصی آمدن ہے۔

۱۹۸۵ء میں اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ستیش بترا لداخ آئے۔ انہوں نے 'جوُ لے لداخ' کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔

کرگل سے متعلق وہ رقمطراز ہے:

"کرگل شہر کے بازار میں دو خوبصورت مسجدیں ہیں اور ایک امام باڑہ ہے۔ چار سو سال پرانی مسجدیں ایرانی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ اکثر

مُسلمان سیاہ قبا اور پگڑیاں پہنے گھومتے نظر آتے ہیں۔ مُسلم عورتیں برقعہ اُوڑھتی ہیں...... شہر میں داخل ہوتے ہی جس چیز نے ہمیں فوری متاثر کیا، وہ جگہ جگہ لگے ہوئے خمینی کے قدِ آدم پوسٹر تھے۔ بھائی صاحب کو 'جو اَپنے بحری سفروں کے دوران اِیران گھوم آتے تھے' یکا یک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک بار پھر ایران پہنچ گئے ہوں۔ ظاہر تھا کہ مقامی لوگوں کیلئے خمینی کی شخصیت بے حد پُرکشش تھی۔

کرگل سے وہ دَرّد گاؤں گئے۔ جہاں بقولِ مصنّف، سفید بھیڑوں کی کھالیں اُوڑھے بالوں اور ٹوپیوں میں جنگلی پھول سجائے، رنگین واسکٹوں اور کُرتوں میں ملبوس، کمر میں پٹکا باندھے دوشیزاؤں اور بانکے نوجوانوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اُن کے شاداب چہرے، اُجلی رنگت اور تیکھے نقش آریائی حُسن کا عمدہ نمونہ تھے۔ پچھلے زمانے کی کوہ قاف کی پَریاں اپنی خوبصورتی کے لئے بے حد مشہور تھیں۔ اَب وہی خوبصورتی یہاں موجود دوشیزاؤں کے اَنگ اَنگ میں رَچی معلوم ہوتی تھی۔

لیہہ قصبہ کے محل سے متعلق ستیش بترا لکھتا ہے۔ یہ محل لیہہ شہر کی پہچان بن گیا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے لندن کے ساتھ ٹاور برج، پیرس کے ساتھ آئیفل ٹاور یا دہلی کے ساتھ قطب مینار جیسی عمارتوں کی وابستگی طے شدہ اَمر ہے......

جدید لیہہ کے عنوان سے وہ رقمطراز ہے:

''آج لداخ میں ہر اَچھی کوٹھی، مکان و حویلی، ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہاں بڑھیا فور سٹار ہوٹل بھی ہیں...... لیہہ میں کوئی باقاعدہ سینما گھر نہیں ہے لیکن جگہ جگہ وِڈیو پارلر موجود ہیں۔ جہاں

دِن کے چار پانچ شو میں مختلف ہندوستانی، انگریزی فلمیں دِکھائی جاتی ہیں...... فلموں کی دُنیا سے آپ باہر آئیں۔ لیہہ کے دَربار روڈ سے لگتی چھنگ گلی آپ کی منتظر ہے...... چھنگ لداخیوں کا قومی مشروب ہے۔ (اَب اِس گلی میں چھنگ کی فروخت بند کی گئی ہے)

ہوٹل سے باہر نکلنے پر دو منظر دکھائی دیتے ہیں۔ بازار یا پھرنکوں پر پانی کے اِنتظار میں ٹین، المونیم، کانس یا پیتل کے ہر وضع کے برتنوں کی لمبی قطاریں ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دہلی میں کسی دُودھ کے ڈِپو کے کھلنے سے پہلے خالی بوتلوں کی قطاریں دِکھائی دیا کرتی تھیں''۔

لداخیوں سے متعلق مُصنّف کا تاثر:

لداخی بہت زندہ دِل ہیں۔ دراصل وہ زندگی کی اہمیت کو بہت اَچھی طرح جانتے ہیں...... موسیقی گانے اور رقص کے دِلدادہ، اُن کی جوشیلی آوازیں اور فراخ قہقہے اُن کی زندہ دِلی کا ثبوت ہیں۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ''اَلوداع لداخ! پھر ملیں گے'' ہے لیکن اِس سفر کے کچھ عرصہ بعد ستیش بترا نہیں رہا اور انہوں نے زندگی کو اَلوداع کہا۔

ڈاکٹر روبینہ اَگروال نے لداخی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا ہے۔ لداخی زبان اور اَدب کا مطالعہ کیا ہے۔ کئی گیتوں کا ترجمہ کیا ہے جو لداخی سماج اور لوگوں کے شعور اور میلانِ طبع کی عکاسی کرتے ہیں۔ روبینہ لکھتی ہے:

''ایک لداخی جب قسم اُٹھاتا ہے، تو ''آمے شا'' یعنی ماں کی قسم اُٹھاتا ہے۔ یہ اَمر ماں کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ اَپنے گھر کو آبائی گھر نہیں بلکہ 'ماکھنگ' یعنی ماں کا گھر کہتا ہے۔

روبینہ کے مطابق لداخی زبان کی کئی کہاوتیں سماج میں مرد اور عورت کی

روایتی پوزیشن کو اُجاگر کرتی ہیں۔ جیسے ایک کہاوت ہے۔ مَرد کیلئے سفر کرنا اور عورت کیلئے گھر پر رہنا بہتر ہے۔

ایک اور کہاوت ہے 'مَرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ عورت کیلئے بالکل نہیں'۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مَرد ہمیشہ سفر میں رہتا ہے اور عورت کی شادی کہاں ہوگی، اس کا کسی کو پیشگی علم نہیں ہوتا ہے۔ موت کہیں بھی ہوسکتی ہے۔

روبینہ نے اچی ناتھنگ گاؤں کے ایک مُسلمان ماسٹر کریم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ماضی میں کھربُو وغیرہ میں عید پر مسلمانوں کو گاؤں والے چھنگ سے تواضع کرتے تھے اور اِسے "عید چھنگ" کہا جاتا تھا۔ مُسلمان تیوہاروں پر بودھوں کے ساتھ ناچتے اور گاتے تھے۔

اِسی طرح کاچو سکندر خان نے لکھا ہے۔ اُس زمانے میں مرد بھی کان چھدایا اور پیتل کی بالیاں پہنا کرتے تھے۔ یہ کہاوت عام تھی کہ کان اگر دُنیا میں نہ چھدائے گئے تو قیامت میں لوہے کے بڑے اُوزاروں سے چھیدے جائیں گے اور سخت عذاب ہوگا۔ ایک دن ماں نے کاچو صاحب کو اُن کے بچپنا میں ایک بڑھیا کے پاس کان چھدانے لیا۔ بڑھیا نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور سوئی سے بڑی پھُرتی سے اُن کا دایاں کان چھید لیا اور سوراخ سے دھاگا گذارا اور ہدایت کی کہ دھاگے کو گاہ بگاہ کھینچتے رہنا۔ چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اچھا خاصا سُوراخ بن گیا۔ ماں نے چھدے ہوئے کان میں پیتل کی چھوٹی بالی پہنائی جو دس بارہ سال کان میں لگی رہی۔

صرف کوکشو میں ہی نہیں، کاچو سکندر کے مطابق چیکتن سوت وغیرہ میں ایسے بزرگ ہیں جن کے نام آدھے مسلمان اور آدھے بودھ ہیں۔

ناموں کا مفہوم ٹھیک ہے۔ جیسے چھرنگ کا مطلب دُرازیٔ عمر اور سکیت زدم سے مُراد خوشحال اور خوش نصیب ہے۔

ایک خاتون سمِرتی سرینواس نے لداخ سے متعلق اپنا تھیسس دہلی سکول آف اِکنامیکس کیلئے لکھا ہے۔ اِس سلسلے میں انہوں نے نوبراہ کے دُو گاؤں ہندر اور تاغر انتخاب کئے جہاں پہلے کبھی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ ہندر میں بودھ اور مسلمان دونوں بستے ہیں جبکہ تاغر میں خالص بودھ آبادی ہے۔ سمِرتی نے ۱۹۹۰-۹۱ء میں اپنا فیلڈ کام کیا جب ہندر میں بودھوں نے مُسلمانوں کیخلاف سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا اور دونوں فرقے الگ تھلگ ہوکر رہ گئے تھے۔

مصنفہ نے تاریخی پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ ایک دیرینہ نظام کے تحت لوگ کھیتی باڑی، شادی، غمی وغیرہ میں کس طرح ایک دُوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تاہم یہ نظام کم وبیش فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم تھا۔

سینوگتا کوشل نے انگریزی میں لکھی اپنی کتابوں سے غیر لداخیوں کو لداخی بول چال کی زبان سے روشناس کیا ہے۔ اُن کے خیال میں لداخی زبان میں ہر صنف میں اَدبی تخلیق کی صلاحیت ہے۔

وِبھا کرشن سود نے سیاحت سے لداخ کے سماجی، معاشی، کلچر، ماحولیات وغیرہ یہ جو منفی اُثر پڑا ہے، اس کو اُبھارا ہے اور اس کے مداوا اور پائیدار سیاحت کیلئے اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔

محمد اَمین پنڈت نے اپنی نئی کتاب Ladakh; Land of Possessive powers and charm میں لکھا ہے کہ لداخ ایک نئے دور میں داخل ہوا ہے۔ یہ خطہ اَب ویرانی کا نقشہ پیش نہیں کرتا، بلکہ یہ

زندگی اور سرگرمیوں سے بھرپور ہے......دشوار گذار راستے واگذار ہونے کے بعد نئی تہذیب یہاں پہنچی ہے......صدیوں تک الگ تھلگ رہنے کے بعد لداخ میں اَب رسائی آسان ہوگئی ہے۔

کتابیات

- Travels Beyond the Himalaya — Mir Izzet-ullah
- History of Buddhism in Kashmir — Sarla Khosla
- An Echo of Unknown Guide to Ladakh — Pt. Amar Nath
- Ladakh (Economic) — A.N.Sapru
- Ladakh Through the Ages — Shri Dhar Koul and H.N. Koul
- I was on the Kashmir Front — Mohinder Bhal
- Frontier Callings — P.N. Koul
- Portrait of India — Ved Mehta
- Ladakh; Land of Possessive Powers and charm — M.Amin Pandit
- An Ethrougraphy-The Buddhist Dards of Ladakh — Rohit Vohra
- The religion of the Dards in Ladakh — Rohit Vohra
- Living Fabric- Weaving Among the Nomads of Ladakh Himalaya — Monisha Ahmad
- We are warp and weft — Monisha Ahamd
- The Voice of People, the voice of God (Buddhists and Muslims in a frontier community of Ladakh) — Smriti Srinivas
- Yatra Key Panne (Hindi) — Rohul Sankrtyaryana
- Dynamics of Tourism Development And Aspects of sustainality-A Case study of Ladakh, — Vibha Krishen Sood

- In Kashmir and Tibet — Swami Alhedananda
- Rahula Sankrtyayana and the History of Buddhirst organisation in Ladakh (Article) — Martijn van Beek
- Riots in Ladakh and the Genesis of a Tragedy (Article) — Sidiq Wahid
- محمد خان — احوالِ ملکِ لداخ (قلمی نسخہ)
- مہتہ شیر سنگھ — سفرنامہ مہتہ شیر سنگھ (قلمی نسخہ)
- ستیش بترا — جوُلے لداخ
- کاچو سکندر خان سکندر — افکارِ پریشاں (یادوں کی دوش پر)
- مولوی حشمت اللہ — تاریخ جموں، کشواڑ، تبت لداخ بلتستان وغیرہ
- انور احمد — خوشی محمد ناظر (مضمون) مطبوعہ شیرازہ۔
- عبدالغنی شیخ — لداخ اور غیر ملکی سیاح (مضمون) مطبوعہ شیرازہ۔
- مرزا سیف الدین — آفیون، ماخوذ از خلاصۃ التواریخ

............☆............

غلام نبی خیال☆

اُردو اَدب میں کشمیر کی غلط تصویر کشی

سرزمینِ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے اُردو ادیبوں اور قلم کاروں نے سالہا سال تک بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔ اِن تخلیقات میں ناول، افسانے، تاریخ، سفرنامے، ڈرامے اور تذکرے شامل ہیں۔

ایک طرف اگرچہ اس سلسلے کی بدولت کشمیر کو اُردو دنیا میں مزید مقبولیت اور توجہ نصیب ہوئی ہے لیکن دوسری جانب کئی سنجیدہ اور معتبر ادیبوں نے اپنی تصانیف میں کشمیر کے گونا گوں پہلوؤں اور حقائق کو بہت حد تک مسخ کر کے چھوڑا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کشمیر کو دُور سے ہی دیکھتے اور ذہن نشین کرتے رہے اور اُنہوں نے یہاں آ کر اس میں موجود حقیقتوں کا بعینہٖ مشاہدہ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اِس غیر حقیقی اور تصوّراتی عمل کی وجہ سے کشمیر کے بارے میں غلط اندازوں اور غلط فہمیوں کو تشہیر دی گئی۔

اِس افسوس ناک سلسلے کی داستان نہایت طوالانی ہے اور اس مقالے میں اس کا پوری طرح احاطہ کرنا مشکل ہے کیونکہ اس قبیل کی بہت سی مطبوعات اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں لہذا ہم نے اِس تعلق میں صرف چند دستیاب

☆15-راولپورہ ہاؤسنگ کالونی بیر نگر ۱۹۰۰۰۵

کتابوں تک ہی اپنے تجزیاتی خیالات اور تبصرے کو محدود رکھا ہے۔

اِس کے برعکس یہ ایک حوصلہ افزا حقیقت ہے کہ ہند سے باہر بالخصوص مغربی ممالک سے جو مُصنّفین اور مستشرقین بہ نفسِ نفیس کشمیر آئے انہوں نے جاں فشانی اور محنتِ شاقہ کے بعد ہی کشمیر پر قلم اُٹھایا۔ اپنی تحقیق اور خیالات کو وہ بار بار حقائق کی کسوٹی پر پرکھتے رہے اور یہاں کے حالات اور کوائف کا بغور مشاہدہ کرنے کی سعادت حاصل کر کے اُنہوں نے اپنی نگارشات کا موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۹۵ء میں شائع شدہ سر والٹر لارنس کی ''کشمیر کی وادی'' اور ۱۹۲۱ء میں طبع شدہ ٹینڈل بسکو کی ''کشمیر-دُھوپ چھاؤں میں'' آج بھی ہمیں ہم عصر کشمیر کی کہانی معلوم ہوتی ہیں۔

پرُوفیسر محمد مجیب کا ڈرامہ ''حبہ خاتون'' جو اپریل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا فرضی اداکاروں اور تخیلاتی واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ اِس مختصر ڈرامے میں حبہ خاتون کو ایک رُومان پرور مغنیہ اور شاعرہ کے برعکس آزادی کی مجاہدہ کے رُوپ میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یوسف شاہ چک کو مکّار مغل بادشاہ اکبر کے ہاتھوں کشمیر سے دعوتِ گفتگو دے کر قید خانے میں دھکیلنا اور بعد میں اُسے جلاوطن کرنا حبہ خاتون کے دِل میں بھی اِس بیرونی حملہ آور کے خلاف جذبات خیزی کا باعث بنا ہوگا لیکن وہ بہر صورت ایک بے بس اور لاچار کشمیری عورت تھی اور اپنے مُلک کو غیروں کے تسلّط سے آزاد کرنے کی اُس کے پاس نہ کوئی سبیل تھی اور نہ ہی مطلوبہ وسائل اُسے حاصل تھے۔

کتاب کے پیشِ لفظ میں مجیب صاحب نے غلام احمد مہجور کو ''مولانا مہجور صاحب'' کا خطاب دے کر حبہ خاتون کے بارے میں یہ غلط بیانی کی ہے کہ

"میرا اندازہ یہ ہے کہ حبہ خاتون کے سیاسی خیالات تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اُس کی نظر میں مادّی قدریں نہیں تھیں بلکہ وہ اِنسانیت، جس کو پیدا کرنا مذہب، اخلاق، سیاست سب کا مقصد ہونا چاہئے"۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ حبہ خاتون کی شاعری میں کہیں پر بھی قاری کو سیاست یا تصوّف کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے۔ ڈراما نگار نے یہ عجیب وغریب اور بعید از حقیقت خیالات ظاہر کر کے بھی اپنے اِس مشورے کو ابہام کی نذر کر دیا ہے کہ "حبہ خاتون نے مغلوں کو کشمیر سے نکال کر اپنی حکومت قائم کی ہوتی تو اس کی عظمت بڑھ جاتی لیکن اس وجہ سے وہ ہم سے دُور بھی ہو جاتی"۔[2] حیرت ہے کہ پرُوفیسر صاحب جیسا صاحبِ فکر وفن، مورّخ اور ماہرِ تعلیمات کشمیر کی تاریخ کے اُس قابلِ توجہ تغیر اور سیاسی تبدیلی کی اصل وجوہات سے بے خبر ہی لگتا ہے جس کی بناء پر ملکِ کشمیر پہلی بار بیرونی تسلّط کے دام میں پھنس گیا اور اِس طرح سے غلامی کے ایک طویل دَور میں جیتا رہا۔

ڈراما نویس نے یہاں پر حبہ خاتون سے منسوب ایک کشمیری نغمہ بھی درج کیا ہے جس کے مصرعۂ اوّل کا مفہوم یوں ہے:

بتا تو سہی تیرے بغیر دن کیسے گذاروں گی

نہ جانے اس نغمے کا ماخذ کیا ہے کیونکہ یہ شعری فن پارہ حبہ خاتون کے کلام میں کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

قاضی ابو محمد نام کا ایک کردار دیکھئے حبہ خاتون کو کیا مشورہ دیتا ہے۔

"آپ کے گیتوں نے یوسف شاہ کے قصور معاف کروائے اور اس کو مغل دربار سے یہاں کھینچ کر لے آئے۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری

ہوتی تو شاید آپ کی شخصیت شہنشاہ اکبر کو بھی مرعوب کر کے کشمیر کی آزادی کو بچا لیتی لیکن یوسف شاہ نے پھر شہنشاہ اکبر کے دَربار میں پناہ مانگی ہے"۔

تاریخ کے واقعات کو توڑ مَروڑ کر پیش کرنے کی مثال دے کر مجیب نے تاریخ کشمیر کے اَوراق پر سیاہی پھیر دی ہے۔

جب حَبہ خاتون کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ کوئی قاضی ابو محمد اکبر کے دَربار میں جا کر اس کی درخواست کریں گے تو وہ کشمیر میں سُنّی حنفی مذہب کو بچانے کے لئے یہاں اُپنی حکومت قائم کرے تو حَبہ خاتون حبُ الوطنی کے جذبے سے سرشار یہ جواب دیتی ہے کہ "ہاں۔ سُنّی حنفی مذہب کو بچانے کے بہانے سے مغلوں کی فوج آئے گی، بستیوں کو لُوٹے گی، ہزاروں مَردوں عورتوں کی آبرو کو خاک میں ملائے گی اور آخر میں جب ہمت والے کشمیری سب مَر مِٹ جائیں گے تو کہا جائے گا کہ کشمیر میں مغل بادشاہ کے اِقبال سے اَمن قائم ہو گیا"۔

اِس موقعے پر ایک کشمیری نوجوان اُپنے وطن پرست جذبات کا یوں اِظہار کرتا ہے:

"ہم اُپنوں سے بیزار ہوں تب بھی ہم غیروں کی حکومت نہیں چاہتے۔ ہم آزادی اور خودداری کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں"۔

یہ ساری عبارت ایک مفروضے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دراصل اکثر مورّخوں نے اِس سلسلے میں جن اصل واقعات کو اپنی تصانیف میں قلمبند کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہیں:

"اکبرِ اعظم نے ۳۰ دسمبر ۱۵۸۵ء کو راجہ بھگوان داس کی کمان میں پانچ ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل فوج کو اٹک سے ہوتے ہوئے وادیٔ جہلم کے راستے کشمیر پر یلغار کرنے کے احکامات صادر کئے۔ اُدھر شہزادہ

یعقوب اور دیگر درباریوں نے یوسف شاہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ سختی کے ساتھ مقابلہ کرے لیکن یوسف شاہ غالباً اپنی کم ہمتی کے سبب اِس معرکے کے منفی انجام سے خوف زدہ تھا۔ شہزادہ یعقوب نے اُپنے والد کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے مغل حملہ آوروں کا بے جگری سے مقابلہ کیا جب وہ کشمیر کی وادی کے دَروازے پر دستک دے رہے تھے۔ یعقوب شاہ نے حب الوطنی سے سرشار اُپنے جذبات کو اُپنی جوان مردی کی آنچ دے کر مغل فوج کا ایسا مقابلہ کیا کہ راجہ بھگوان داس کو اپنی ہزیمت سامنے نظر آئی اور اُس نے یوسف شاہ اور اُس کے محبِ وطن فرزند سے مصالحت کی پیش کش کی۔

اس صلح نامے کی رُو سے مغل اُپنی ساری فوج واپس لینے پر آمادہ ہوئے۔ یوسف شاہ کو بدستور تاج وتخت کا والی تسلیم کیا گیا لیکن مغلوں کو یہ مراعت دینا قرار پایا کہ سکّوں پر اور خطبات میں شہنشاہ اکبر کے نام کا استعمال کیا جائے گا۔

بھگوان داس نے یوسف شاہ کو ترغیب دی کہ وہ اِس کے ساتھ شہنشاہ سے ملاقات کی غرض سے اٹک جائے جہاں اکبر نہ صرف اس کی تعظیم وتکریم کرے گا بلکہ اس عہد نامۂ مصالحت کی توثیق بھی کرے گا۔ یعقوب شاہ نے اُپنے والد کو اِس سفر کے خلاف مشورہ دیتے ہوئے اُسکے تشویش ناک انجام سے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔

بہر حال یوسف شاہ کو ۲۸ مارچ ۱۵۸۶ء کو اٹک میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا لیکن ایک مکّار مغل بادشاہ نے نہ صرف یہ کہ عہد نامہ پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے اِنکار کر دیا بلکہ اُس نے سلطان یوسف شاہ کو بھی قید خانے میں ڈال دیا۔

ایک غیرت مند راجپوت ہونے کے ناطے راجہ بھگوان داس نے

اکبر کی اس فریب کاری کو اُپنے لئے زبردست توہین تصوّر کر کے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ جب اکبر لاہور پہنچا تو اس نے یوسف شاہ کو ٹوڈرمل کی تحویل میں دے دیا۔ ڈھائی سال حراست میں رہنے کے بعد راجہ مان سنگھ کی مداخلت سے یوسف شاہ کو رہائی نصیب ہوئی۔ مان سنگھ، یوسف شاہ کو اُپنے ساتھ بہار کے صوبے میں لے گیا جہاں کشمیر کے اِس آخری سلطان نے اپنی محبوبہ حبہ خاتون کی یاد اور جدائی کا کرب سہتے سہتے ایک عالمِ بے بسی میں ۱۴ ذی الحجہ ۱۰۰۰ ہجری مطابق ۲۲ ستمبر ۱۵۹۲ء کو وفات پائی اور اُسے پٹنہ ضلع میں بسوکؔ نامی ایک ویران گاؤں میں سپردِ خاک کیا گیا۔[۲۲]

ہندوستان کے پنجابی اَدیب کرتار سنگھ دُگل کا ڈراما ''دیا بُجھ گیا'' کشمیر پر ۱۹۴۷ء میں کئے گئے قبائلی حملے کی پیداوار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اَدبیت کم اور جذباتیت زیادہ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جذباتی رَو میں بہہ کر ڈراما نگار نے کشمیر کے واقعات کو صحیح صورت میں پیش کرنے کے برعکس غیر حقیقی تصوّرات اور مفروضات کا سہارا لے کر بیان کیا ہے۔ کشمیری سماج میں جس طرح راجؔی، نوُراںؔ اور علیاؔ غیر معروف نام ہیں اُسی طرح بڑے بھائی کو علی جوؔ اور چھوٹے کو سلطان میر کہہ کے پکارنا بھی مقامی طور پر بعید اَز قیاس ہے۔[۲۳]

ڈرامے میں بوڑھی ماں نوراں اُپنے بندوق بردار بیٹے سلطان جوؔ کو ایک ذہنی تذبذب کے عالم میں اُپنے ہاتھوں سے شراب پلاتی ہے جو کشمیر میں تصوّر سے بھی بعید ہے اُلبتہ پنجاب کے ماحول میں بدمستی کا یہ عمل برسوں سے وہاں کے سماج کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔

واقعات کو محض اَفسانے کی شکل میں پیش کرنے کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی سونے کے بٹن استعمال کرتی ہے اور جس گھر

میں روشنی کے لئے تیل کا دِیا جلتا ہو وہاں پلاؤ اور کباب اور قورمہ اور دُو پیازہ جیسے شاہی پکوان نہیں پکائے جاتے۔

چھیاسٹھ صفحات کا یہ ڈراما پڑھ کے محسوس ہوتا ہے کہ مصنّف نے ایک ہنگامہ خیز صورت حال کو نہایت جذباتی لہجے میں بیان کر کے اپنا وہ قومی فریضہ اَنجام دینے کی کوشش کی ہے جو برِصغیر کی تقسیم کے بعد کشمیر پر قبایلی یلغار کے خون آشام دنوں میں ہندوستان کے قلم کار دانستہ یا غیر دانستہ طور پر پاکستان کی مخالفت کر کے اَدا کرنے کا سہرا اپنے سر باندھنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔

ملک راج آنند کو جہاں ''شہید'' میں سرینگر سے بارہ مولہ جاتے ہوئے گلمرگ کے پہاڑ اپنی دائیں طرف نظر آئے وہاں خواجہ احمد عباس نے غالباً وہ تیرہ گولیاں خود گن لی تھیں جو اُنہوں نے قبایلیوں کے ہاتھوں مقبول شیروانی کے جسم میں پیوست ہوتی ہوئی دیکھ لی تھیں۔ اور انہوں نے شیروانی پر اَپنی تصنیف کا نام بھی ''تیرہ گولیاں'' ہی رکھا تھا یا دُگل ہی کا ڈراما، کشمیری قارئین کے سامنے کشمیری سماج کے اُس غیر موجود پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے جس کی جھلک بھی آج تک ہمیں نہیں دکھائی دی ہے۔

سلیم خان گمی کی ''کشمیر-اَدب اور ثقافت'' پاکستان میں کشمیر کے ایک غیر سیاسی لیکن ایک اہم موضوع پر تحریر کی جانے والی اوّلین کتاب ہے جسے اِدارۂ مطبوعات پاکستان کراچی نے حُسنِ اہتمام کے شائع کیا تھا۔

لیکن یہاں بھی بدقسمتی یہ ہے کہ جب بھی پاکستانی ادیبوں اور اہلِ قلم کو بھی کشمیر کے حوالے سے کسی بھی اَدبی، ثقافتی یا تاریخی موضوع پر طبع آزمائی کرنے کا موقعہ فراہم ہوا تو اُن کے ذہن میں بھی پیچ در پیچ اُلجھا ہوا مسئلہ کشمیر

بہر حال موجیں مارتا ہوا نظر آیا اور وہ ہر مضمون کو اِسی تناظر میں دیکھ کر اِسے خواہ مخواہ سیاست کی گتھی میں اُلجھا کر اصل مضمون سے بے انصافی کرنے کے خطا کار بن گئے۔

''کشمیر-اَدب اور ثقافت'' جہاں ایک طرف حُسن و جمال کے دلکش پیکر کی شکل میں منظرِ عام پر آئی ہے وہاں ادبیاتِ کشمیر پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مُصنّف نے نہ صرف گریرسن کی لنگوسٹک سروے آف انڈیا، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کی ''کشمیر'' اور پریم ناتھ بزاز کی ایک دو تصانیف سے ہی اِستفادہ کیا ہے حالانکہ اِس وسیع اور جامع موضوع کا بھرپور اَحاطہ کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی بھی مکمل طور پر ممد و مددگار ثابت نہیں ہو سکتی، وہاں دوسری طرف گمی کی کتاب بھی ایک بے راہ روی کے عالم میں قلمبند ہو کر بے شمار غلطیوں اور کوتاہیوں سے بھری پڑی ہے۔

نسخ رسم الخط میں ٹائپ شدہ اِس خوبصورت کتاب میں کئی ایسی فاش غلطیاں موجود ہیں جنہوں نے اِس کے معنوی حُسن کو بدصورتی میں بدل دیا ہے۔ مثلاً ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر کے جیل کے کارندوں نے مسلمان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جس سے ہجوم بے قابو ہو گیا اور پولیس اور فوج نے گولی چلا دی۔ اُنیس مسلمان شہید ہو گئے[5]۔ پنڈت پیتامبر ناتھ درفانی کاشیری نہ صرف جنگِ حریت کا سپاہی بلکہ ستم رسیدہ بھی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں نیشنل کانفرنس نے سیاسی وجوہات کی بناء پر اُسے گرفتار کر لیا۔ دس مہینے رُسوائے عالم سری نگر جیل میں قید رہا اور پھر اُسے دہلی میں جلاوطن کر دیا[6]۔ اُردو زبان کے رسالوں میں کونگ پوش بھی شامل ہے[7]۔ وادیٔ گریز، آزاد کشمیر کے صدر مقام سے کوئی

ایک سو میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی جانب ہے[8] بچہ نغمہ اور حافظ نغمہ ایسے لوگ گیت رائج ہوئے جن میں سے حافظ نغمہ اب معدوم ہو چکا ہے[9]۔

کشمیر کی لوک کہانیوں میں چراغِ خانہ (اکہ نندن) کے علاوہ گل ریز اور عیارِ عشق کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ گل ریزؔ ضیائی نخشبی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے جو مقبول کرالہ واری نے کیا ہے اور عیارِ عشق بھی کشمیری لوک ادب میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتی ہے۔ اِس کے برعکس یہاں پر ہی مال ناگرائے کا ذکر موزوں اور برمحل ہوتا۔ شمس خان کے پہاڑی زبان میں تحریر کردہ رزمیہ لالۂ خودرَو کو اُردو ترجمے کے ساتھ شامل کتاب کیا گیا ہے لیکن اِس منظوم تخلیق کا تنقیدی تجزیہ نہیں کیا گیا جس سے اِس کی اَفادیت اور اہمیت واضح ہو جاتی۔ اِس منظوم فن پارے کو ایک رزمیہ کا درجہ دے کر گمیؔ نے یوں ہی ہومر، ارسطو، عبدالقادر سروری اور مولانا شبلی کے متعلقہ اقتباسات شاملِ کتاب کئے ہیں۔

اِسی طرح یہ خیال کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیری زبان کے جن شعراء نے کشمیری اَدب میں گراں قدر اضافے کئے اُن میں احمد شمیم کا نام سرِ فہرست ہے، صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر میں اُردو کے اُن ادیبوں میں جنہوں نے مڈل اور اُونچے درجوں کی درسی کتابیں لکھیں میر غلام رسول نازکی، تنہا انصاری، پردیسی، پروفیسر شرما، غلام احمد کشفی، پروفیسر فاضلی اور مسٹر کول کے نام شامل ہیں[10]۔

اِس ساری کتاب میں احمد بٹواری، احد زرگر، حیرت پاندانی، صمد میر، غلام نبی عارض، فاضل کشمیری، رسا جاودانی، سیف الدین تارہ بلی، محی الدین مسکین، اور ایسے ہی کئی سرکردہ نام کہیں نظر نہیں آتے۔ کئی اسماء غلط اِملا کے ساتھ

لکھے گئے ہیں مثلاً اَرمانی (اَرنہِ مال) واک للہ (للہِ واکھ) رُوبانی بھوانی (روپہ بھوانی) شیخ منان (شیخ صفان) مالا نامہ (ملہ نامہ) ولی اللہ متو ولی اللہ متو رحمان صدر (رحمان ڈار) ہتری گام (متری گام) بیدرس (بہارس) مُلا حامد شاہ آبادی (ملا حمید اللہ شاہ آبادی) پاندرتھان (پاندریٹھن) وغیرہ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب کشمیری اَدب اور ثقافت کے طالب علم کے لئے چراغِ راہ بننے کے برعکس اُسے کسی حد تک گمراہ ہی کر سکتی ہے۔

گمیؔ نے اِس تصنیف میں کئی اور جگہ اختراعی واقعات اور تصوراتی بیانات سے کام لے کر کشمیر کے تئیں اپنی لاعلمی اور رَواروی کا ثبوت دیا ہے۔ مہجورؔ کے بارے میں یہ افسانوی واقعہ جس طرح سے اُس نے بیان کیا ہے وہ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ گمیؔ لکھتا ہے کہ ۱۹ جولائی ۱۹۳۱ء، یہ وہ دن تھا جب سرینگر کے مُسلمانوں نے ایسا بیج بویا جس سے حریت کا پودا پھوٹا اور اُس پر آزادی کا ہفت رنگ معطر پھول آیا۔ وہ پھول جسے پانے کی آرزو میں مہجورؔ کا شمیری جیل میں "میرا دل پاکستان کے لئے ہے" کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مہجورؔ ہی کی اِس فرضی موت کے بارے میں ایک اور جگہ اِس کی توضیح یوں کی گئی ہے "۱۹۴۷ء میں مہجورؔ نے ڈوگروں کی "سنگینوں تلے کھڑے ہو کر میرا دل پاکستان کے ساتھ ہے کا نعرہ لگایا۔ ڈوگرہ حکومت نے اُسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور وہ جیل ہی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا"۔[11]

حقیقت یہ ہے کہ مہجورؔ نہ تو پاکستان کا حامی تھا اور نہ ہی اُس نے کشمیر کی عوامی تحریکِ حریت میں کوئی قابلِ ذکر حصّہ لیا۔ اُس کی سیاسی دُورنگی کا پردہ اِس شعر سے فاش ہوتا ہے کہ:

زُوجان وَندِہاہندوستانس ☆ دِل چھِم پاکستانس سیٚتؠ

(میں اپنی جان ہندوستان پر نچھاور کروں گا اگرچہ میرا دل پاکستان کے ساتھ ہے)

مہجورؔ فی الحقیقت ایک ذات پرست شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۶ء میں ہری سنگھ تختِ کشمیر پر براجماں ہوا تو مہجورؔ نے چند مفادات کے حصول کی خاطر اِس ڈوگرہ مہاراجہ کی شان میں ایک طویل اُردو قصیدہ تحریر کیا جس کے یہ چند اُشعار شاعر کی ابن الوقتی کا بیّن ثبوت ہیں:

آج کس تقریب پر یہ احتشام و دُھوم دَھام
ساکنانِ باغ ہیں مستِ مئے شوقِ نگار
خسروِ گل مایۂ نازِ چمن شاہِ فن
مالکِ باغِ ارم، والا حشم، عالی تبار
یادگارِ جامبولوچن راجۂ کیوانِ حشم
معدنِ عدل و شجاعت بانیٔ جموں دیار
ہاں مہاراجہ بہادُر مالکِ اورنگِ زر
سر ہری سنگھ تہمن خسروِ گردونِ وقار
کوچہ و بازار تیرے غیرتِ گلزار ہیں
جگمگاتے ہیں درودیوار دشت و کہسار
ابرِ رحمت لائی شہ کشت رعایا کے لئے
عدل واحساں پر ہے نظمِ مملکت کا انحصار
اے ہمالہ! تجھ کو ہے اپنی بڑھائی کی قسم

آج تک دیکھا ہے تو نے کوئی ایسا شہریار
تیری سنسان وادیوں میں اَب بہار آنے کو ہے
چپہ چپہ تیرا بن جائے گا رشکِ شالامار
دیکھ کر یہ عدل و انصاف و رعیت پرَوری
بھُول جاتا ہے ہمیں نوشیرواں تقویٰ شعار
یا الٰہی جب تلک دَورِ مَہ وَانجم رہے
جب تلک باقی رہے گا گردشِ لیل ونہار
سرمہاراجہ بہادر تا اَبد پائندہ باد
زندہ و پائندہ و تابندہ تاروزِ شمار[۱۴]

اِسی طرح مہجورؔ نے جو ۸/اپریل ۱۹۵۲ء کو اچھی خاصی عمر پا کر طبعی موت مرا' کشمیر چھوڑ دو تحریک کے دوران بارہ مولہ کے وزیرِ وزارت پنڈت بلہ کاک در کی بھی ثنا خوانی کی جو تحریک کو سختی سے دبانے کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے تحریک کشمیر کے ہمدردوں میں خاصا بدنام تھا۔ اس قصیدے میں مہجور نے تحریک کشمیر چھوڑ دو کے قائدین شیخ محمد عبداللہ، غلام محمد صادق، مرزا افضل بیگ، کشیپ بندھو اور مولانا محمد سعید مسعودی وغیرہم کو "چوروں اور رہزنوں" کا خطاب دیا۔ بلہ کاک در کے نام اِس قصیدے کے چند اُشعار یُوں ہیں:

اے سرِ سرورانِ عالی جاہ　　یادگارِ قبلۂ درہا
آمدی با ہزار جاہ و حشم　　ما فگندیم در رہت سرہا
از وجود گروہِ راہ زنان　　بُوداین زمین پُر از شرہا
سوئے زنداں بحکمِ تو رفتند　　این ہمہ سارقان ولیڈرہا

اس پر مولانا مبارک شاہ فطرت گیلانی کی حمیت جاگ اُٹھی اور اُس نے مہجور کی مذمت میں اُسی سے مخاطب ہو کر یہ اَشعار موزون کیئے:

آہ ازیں شاعرانِ بے زرہا　　گل بدستار و لیک بے سرہا
ہر کجا نانِ وغنی یابند　　مے نویسند لغو دفتر ہا
"اے سرسرورانِ عالی جاہ"　　مدحِ مُسلم بہ شانِ آذرہا
تُف برایں شاعرانِ ہرزہ سرا　　عار بر ایں چُنیں سخن ور ہا
مابہ میخانہ دیدہ ایم بسے　　کاسہ لیسانِ جام و ساغر ہا
فطرت اَز بادۂ غنی شُد مست　　بسَت بر روئے خویشتن در ہا[13]

رسول میر کے بارے میں بھی سلیم خان گُمی رقم طراز ہے کہ اِس نغز گو شاعر نے کشمیری عوام کو سب سے پہلے حرکت میں برکت کا فلسفہ سمجھایا اور قسمت بدلنے کے لئے عمل کا درس دیا[14] یا یہ کہ مہجور مُسلمان عوام کا شاعر ہے[15]۔

یہ بیان بازی بھی اُسی ذہنی اُپج کی مظہر ہے جس کے پیش نظر پاکستان کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر کشمیر کے شاعروں کو یا تو مجاہدِ آزادی بنا کر پیش کرتے رہے ہیں یا انہیں مسلمان شاعر کہہ کر پاکستانی قوم کے تیئں نام نہاد ہمدردی کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی دُو سو صفحات پر مشتمل کتاب "اقبال اور کشمیر" ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اُس سال آزاد کو اُس سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا جس کی رُو سے وہ حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات میں سرینگر میں اِس شعبے کے سربراہ تھے۔ اقبال اور شیخ محمد عبداللہ کے حوالے سے اِس کتاب میں آزاد نے ایک ایسی اَدبی غلط بیانی کا ارتکاب کیا ہے جس کے لئے اُردو دُنیا انہیں کبھی

معاف نہیں کر سکتی۔ اقبال اور شیخ عبداللہ کے موضوع پر آزاد کی غلط بیانی کو اگر حقیقی تناظر میں بے نقاب نہ کیا جائے تو اقبال کے خوشہ چینوں اور اقبالیات کے طالب علموں کو کسی بھی وقت اِس مفروضے سے گمراہی کا شکار ہونا پڑے گا۔

اصل میں جگن ناتھ آزاد کی اپنی مجبوری اور غرض مندی تھی جس کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی کتاب "اقبال اور کشمیر" کے ذریعے شیخ عبداللہ کو شیشے میں اُتار ہی لیا۔

شیخ عبداللہ ۱۹۷۷ء میں کشمیر میں جنتا پارٹی کو شکست فاش دینے کے بعد پھر ایک بار انتخابات میں ایک طاقت ور سیاسی شخصیت اور حکمران کی صورت میں اُبھرے تھے اور آزاد نے بھی یہی وقت اپنی تصنیف کی اشاعت کے چُن لیا جس میں بقولِ آزاد اقبال نے شیخ عبداللہ کو اپنی ایک نظم میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے[16]۔

اقبال کے "جاوید نامہ" میں ایک باب کا عنوان ہے۔ زیارتِ امیرِ کبیر حضرت سید علی ہمدانی و ملا طاہر غنی کشمیری"۔

اس باب میں غنی اقبال سے کہتے ہیں:

ہیچ مے دانی کہ روزے در وُلر　　موجۂ مے گفت با موجِ دِگر
چند در قلزم بہ یک دیگر زنیم　　خیز تا یک دم بہ ساحل سر زنیم
زادۂ ما یعنے آں جوئے کہن　　شورِ او در وادی و کوہ و دمن
ہر زماں بر سنگِ رہ خود را زند　　تا بنائے کوہ را بر می کند
آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت　　پرورش از شیرِ صد مادر گرفت
سطوت او خاکیاں را محشرے است　　ایں ہمہ از ماست نے از دیگرے است

زیستن اندر حد ساحل خطا است   ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ماست
با کراں در ساختن مرگِ دوام   گرچہ اندر بحرِ غلطی صبح و شام
زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
اے خشک موجے کہ از ساحل گذشت

(کیا تو نہیں جانتا کہ ایک دن جھیل وُلر کی ایک موج نے دوسری سے یہ کہا، اِس سمندر میں ہم کب تک ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی رہیں گی۔ ہماری اولاد (یعنی پُرانی نہر تو ایسی ہے کہ اِس کا شور و ہنگامہ کوہ و دمن میں بَرپا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو راستے کے پتھر پر پٹختی ہے یہاں تک کہ پہاڑ کی بُنیاد ہلا دیتی ہے۔ وہ دخترِ جواں سال (آزاد نے اسے "جوان" لکھا ہے) جو شہر و دشت پر چھا گئی۔ اس کی پَرورش تو سَو ماؤں کے دُودھ سے ہوئی ہے۔ اِس کا سطوت اہلِ زمین کے لئے ہنگامۂ محشر سے کم نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ ہمارا اپنا ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ ساحل کی حدود کے اندر جینا خطا ہے کیونکہ ہمارا ساحل ہماری راہ کا پتھر ہے۔ کنارے سے سمجھوتہ کر لینا تو حقیقت میں مرگِ دَوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ تم صبح و شام دریا میں غلطاں کیوں نہ رہو۔ زندگی تو نام ہے کوہ و دشت میں گردش و جولانی کا۔ میں اُس موج کو سَلام کرتا ہوں جو ساحل سے نکل گئی)۔

ڈاکٹر صابر آفاقی نے اپنی کتاب "اقبال اور کشمیر" میں "آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت" کا ترجمہ "وہ دخترِ جواں سال جو شہر و دشت پر چھا گئی" کیا ہے جس سے اُن کی مُراد یہی ہے کہ "زادۂ ما" یعنی ہماری یعنی وُلر کی موجوں کی پیداوار یا اَولاد ایک "جوئے کہن" ہی ہے جسے آفاقی نے آگے چل کر "دخترِ جواں سال" کہا ہے[17] اور آزاد اِسے "ایک جوان" کہہ کر پکارتے ہیں[18]۔

جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں "اقبال کے الفاظ میں وُلر کشمیر کی جدوجہد بلکہ خود کشمیر کے لئے ایک علامت کا کام دے رہا ہے۔ اَب یہ علامت یعنی سرزمینِ کشمیر اپنے دُو فرزندوں کی طرف اِشارہ کرتی ہے۔ اِن دُو میں ایک معمر اور ایک نوجوان ہے۔ واضح رہے کہ یہ ۳۲-۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ گویا سرزمینِ کشمیر کا معمر فرزند واعظ مولانا ہمدانی ہے اور نوجوان فرزند شیخ محمد عبداللہ ہے اور یہ دونوں حضرات اُس وقت تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے قائد تھے[19]۔

تاریخی واقعات اور حقائق زمانہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱-۱۹۳۲ء کے دوران شیخ محمد عبداللہ یا میر واعظ ہمدانی سیاست کشمیر میں اُس مقام کو ہرگز نہیں پہنچے تھے کہ اقبال جیسا عالمگیر شہرت کا مالک سخن وَر اُنہیں اپنے کلام میں خراج تحسین پیش کرتا اور اُن کے حق میں ایسے استعارے اور تشبیہات استعمال کرتا جو تاریخِ اسلام کے عہد ساز مجاہدوں، سپہ سالاروں اور رہنماؤں کیلئے برحق ہیں[20]۔ یعنی وہ "جوئے کہن" جس کا وادی اور کوہ و دمن میں شور برپا ہے اور جو ہر لمحہ اپنے آپ کو رَستے کے پتھروں سے ٹکرا رہی ہے تا کہ پہاڑ کو جڑ سے اُکھاڑ دے" یا "وہ جوان جس نے شہر و دشت و در پر قبضہ کر لیا ہے اُس نے ایک سو ماؤں کا دودھ پی کر پرورش پائی ہے۔ لوگوں کے لئے اس کی سطوت محشر کا حکم رکھتی ہے"۔

بقول آزاد "جوئے کہن" سے مُراد میر واعظ ہمدانی اور نوجوان سے مطلب شیخ محمد عبداللہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ انہی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے آئے تھے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی

سرکار میں ایک سکول میں مدرّس ہو گئے تھے۔اِسی طرح میر واعظ احمد اللہ ہمدانی سے زیادہ کشمیر کی سیاسی زندگی کے قافلہ سالاروں میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ، خواجہ سعد الدین شال، غلام احمد عشائی اور غلام نبی گلکار کا نام سرِ فہرست تھا۔میر واعظ ہمدانی کے بارے میں تو خود شیخ محمد عبداللہ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ کشمیر چھوڑ کر لاہور گئے تو اقبالؔ نے وہاں انہیں لاہور میں پناہ لینے پر زبردست جھاڑ پلائی اور یہاں تک کہا کہ اگر تم وہاں گولی کھا کر شہید ہو جاتے تو بہتر تھا۔اِس پر ہمدانی نے اقبالؔ کے بارے میں بعد میں یہ کہا تھا کہ ''وہ جری قسم کا ایک آدمی ہے''۔کیا اِس مفروضہ کو قابلِ اعتبار کہا جا سکتا ہے اقبالؔ اُنہی دنوں اس ہمدانی کو اپنے ایک شعری فن پارے میں خراجِ تحسین پیش کرے؟۔

''جاوید نامہ'' کی اِشاعت فروری ۱۹۳۲ء میں ہوئی جب کہ اس کے بعد بھی اقبالؔ اَپنے خطوط میں شیخ محمد عبداللہ کو کسی خاص القاب و آداب کا درخور نہیں سمجھتا تھا۔۲/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اُس نے جو خط عبداللہ کو لکھا اُس میں انہیں صرف ''ڈیئر شیخ عبداللہ صاحب'' کہہ کر پکارا[21] اور پھر ۲۲/جنوری ۱۹۳۳ء کے مراسلے میں سید نعیم الحق وکیل کے نام خط میں عبداللہ کا ذکر اِس عام انداز میں کیا ''میں نے شیخ عبداللہ صدر کانفرنس سے بھی تذکرہ کیا ہے''۔[22] میر واعظ ہمدانؔی کا اقبال کی طرف سے ہزیمت خوردہ ہونے کا واقعہ ۱۹۳۶ء میں پیش آیا جبکہ ''جاوید نامہ'' اس سے پورے چار سال قبل شائع ہو چکا تھا[23]۔

۱۹۷۷ء کے آس پاس جب جگن ناتھ آزادؔ نے اپنی کتاب شائع کر لی وہ کشمیر میں بھارت سرکار کے محکمہ اطلاعات میں اُپنی عمر کے لحاظ سے ملازمت کا عرصہ پورا کرنے کے بعد ریٹائرمنٹ کی دہلیز پر کھڑے تھے۔لیکن وادیٔ کشمیر

چونکہ ''درآمدی'' افسروں کے لئے ہر لحاظ سے ایک منفعت بخش جگہ رہی ہے لہٰذا انہوں نے بھی ریاستی حکومت کے زیرِ سایہ باقی ماندہ زندگی سرکاری نوکری میں گذارنے کی سبیل کر لی۔جس میں سب سے زیادہ کارگر یہی ثابت ہوئی کہ شیخ عبداللہ پر یہ باور کرایا گیا کہ واقعی اقبالؔ نے اُسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

آزاد کا کام ہو گیا اور انہیں جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کی سربراہی نصیب ہوئی۔

ایسا کرتے وقت ریاست جموں و کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے آزادؔ نوازی کے جنون میں اُن تمام قواعد و ضوابط کی دھجیاں اُڑانے کا ارتکاب کیا جن کے تحت کسی بھی یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کا سربراہ وہ شخص ہرگز نہیں بن سکتا جس نے آزادؔ کی طرح صرف فارسی میں ایم اے کیا ہو۔مزید یہ کہ یونیورسٹی کے شعبہ جات کی صدارت کے لئے نہ صرف ایم اے بلکہ پی ایچ ڈی ہونا بھی شرطِ اوّلین ہے۔عبداللہ نے آزادؔ کو یہ عہدۂ جلیلہ بخشنے کے ساتھ ساتھ اُسے جموں شہر میں ایک سرکاری بنگلہ بھی تا حیات مرحمت فرمایا اور پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم بھی اِس کے نام سالانہ خرچے کے طور پر منظور کر لی۔آزاد کی وفات کے بعد اَب اس بنگلے پر اُس کے اہلِ خانہ غیر قانونی طور پر قابض ہیں[1]۔

آزادؔ کے بعض دوستوں نے راقم الحروف کے سامنے بیان کیا ہے کہ شیخ صاحب نے آزادؔ کے حق میں سالانہ پچاس ہزار روپے کی مالی اعانت اس لئے منظور کر لی کہ آزادؔ علامہ اقبالؔ کی مستند اور جامع سوانح حیات لکھیں گے جسے بعد میں ریاستی سرکار کے اہتمام سے شائع کیا جائے گا۔۔ ان حضرات کے بقول آزادؔ یہ کارے دارد والا کام کرنے کی نیت ہی نہیں رکھتے تھے۔لہٰذا ایک بار جب

[1] یہ اشاعت خصوصی چھپتے چھپتے مذکورہ بنگلہ خالی کرالیا گیا تھا (ادارہ)

جموں میں زبردست بارشوں سے سیلاب آگیا تو آزاؔد نے دریدہ دہنی کے ساتھ یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالی کہ سیلاب میں اُس کی تحریر کردہ اقبالؔ کے سوانح حیات کا مُسوّدہ بھی ضائع ہوگیا۔

علامہ اقبالؔ کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد کے بے بنیاد مفروضے پر کشمیر میں تنقید وتردید کا جو سلسلہ چل پڑا اُس پر وہ کوئی خاطر خواہ ردِعمل ظاہر نہیں کر سکے۔ اِس سے قبل ۲۵/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو جب سرینگر میں آزاؔد نے اقبالؔ سمینار پر اِس ضمن میں ایک مقالہ پڑھا تھا تو علی سردار جعفری نے بھی بعض لوگوں کا حوالہ دیتے ہوئے اُن سے کہا تھا کہ ۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی اِسلئے اِس مقالے میں شیخ صاحب کا ذکر بے جوڑسی بات ہے۔[۲۴]

ہم نے بھی اُس وقت اقبالؔ کے تخلیق کردہ کرداروں ''جُوئے کہن'' اور ''نوجوان'' کو بالترتیب سرزمینِ کشمیر اور فرزندِ کشمیر سے تخیّلاتی طور پر مماثلت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بات کہی تھی کہ اِس قسم کا ایک اور کشمیری کردار اقبالؔ ''ارمغانِ حجاز'' میں ملّا زادہ ضیغم لولابی کی شکل میں بھی پیش کر چکے ہیں لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ اُن کے ہر کردار کو تاریخی رُوپ دے کر اُن کے خیالات کی ایک انوکھی توضیح کی جائے۔ آزاؔد کی مجوزہ تصنیف کے بارے میں ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ''آزاؔد صاحب نے جب 'اقبالؔ اور کشمیر' عنوان کی کتاب تحریر کرنے کا اعلان کیا تھا تو ہم نے اُن کے اِس قابلِ قدر خیال پر اپنی خیال آرائی کرتے ہوئے آج سے ایک دُو سال قبل اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ شاید وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں کیونکہ اِس پر قلم اُٹھانے والا تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور کشمیری زبان سے کماحقہٗ واقف نہ ہو تو اقبالؔ کو کشمیر کی جدوجہد آزادی

کے پس منظر میں ذہن نشین کرنا مشکل ہوگا[۲۵]۔

بہر حال قارئین کو جگن ناتھ آزاد کی اس کتاب کی اُفادیت پر تبصرہ کرتے وقت خود آزاؔد کے اِس اعترافِ گناہ کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ:

''دراصل یہ موضوع جس تحقیق کا مستحق ہے مجھے اُس کے لئے نہ وقت میسّر تھا نہ سہولت اور نہ ہی وہ اطمینان حاصل رہا۔''[۲۶]

حبیب کیفوؔی نے بھی کشمیر میں اُردو کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس میں کئی مضامین کے تحت غلطیاں دَرج کی گئی ہیں۔ اِس تصنیف میں سُلطان یوسف شاہ چک اور اُس کی ملکہ حبہ خاتون کے بارے میں حبیب نے لکھا ہے کہ:

''یوسف شاہ نہ صرف حبہ خاتون کے حُسن و جمال کا شیدائی تھا بلکہ اُس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی معترف تھا۔ شب و روز عیش وعشرت وظیفۂ زندگی بن گیا۔ چند سال یہی لیل ونہار رہے۔ آخر کار درباری سازشوں اور خود یوسف شاہ کی سرکاری کاموں سے عدم توجہی اُس کے زوال کا باعث بن گئی۔ آخر کار اُسے حکومت سے دستبردار ہونا پڑا اور ہندوستان میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں سے وہ پھر کشمیر نہ آسکا اور حبہ خاتون اُس کے فراق میں تڑپتی رہی''۔[۲۷]

اس عبارت کا آخری حصّہ مبنی برحقیقت نہیں ہے اور اس تاریخی واقعہ کی صحیح طریقے پر وضاحت اِسی مقالے میں اس سے پہلے کی جاچکی ہے۔ جس پر دوبارہ ایک نظر ڈال کر قاری حبیب کیفوی سے اختلاف کرنے پر مجبور ہوگا۔

کشمیری زبان کے ایک بُلند قامت اور برگزیدہ شاعر محمود گامی کے بارے میں اِس کتاب میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ:

"جرمن مستشرق بُہلر (برکہارڈ) نے محمود گامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کے انتخاب کا جرمنی (جرمن) میں ترجمہ کرکے انہیں مغربی دنیا سے روشناس کرایا"۔[28]

برکہارڈ نے گامی کی یوسف زلیخا کا ترجمہ تو کرلیا ہے جس کی ایک جلد ہمارے پاس موجود ہے جو ہم نے جرمنی سے خاص طور پر منگوائی تھی لیکن لیلیٰ مجنون کے جرمن ترجمے کا کہیں پر ذکر تک نہیں ملتا۔

حبیب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"انقلابی شاعری کے دور میں عبداللہ زرگر اور عارف بھی شامل ہیں اور جو روح اس دَور کے انقلابی شاعروں نے کشمیر کے نوجوان شاعروں میں پیدا کی اُس سے لکھنے والے بے حد متاثر ہوئے۔[29]

اس دور میں عبداللہ زرگر نام کا کوئی کشمیری شاعر نہیں گذرا ہے۔ اگر مصنف کی مراد اَحد زرگر سے ہے تو اُس کے ساتھ انقلاب کا تصوُّر جوڑنا ایک خلافِ واقعہ بیان ہے۔ اِسی طرح مرزا عارف بھی صرف چند روز تک ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھے رہے اور بعد میں انہوں نے دائیں بازو کی کشمیر بزمِ ادب کو تشکیل دے کر ترقی پسندی سے توبہ کرلی۔

حبیب کیفوی نے اُردو اور کشمیری کے مشترک الفاظ کے ذیلی عنوان کے تحت کشمیری زبان پر اَپنی دَسترس جتانے کی کوشش میں کئی کشمیری الفاظ کی ہیت اور شکل بگاڑ دی ہے جبکہ کشمیری میں اُردو کے ہزاروں الفاظ من وعن وارد ہوئے ہیں جنہیں ہو بہو نقل کرکے اس اشتراک کو صحیح طریقے پر واضح کیا جا سکتا تھا۔[30]

حبیب نے بھی سلیم خان گمی کی طرح مہجور کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"حکومتِ کشمیر نے مہجور کی آتش بیانی کے جرم میں انہیں قید و بند میں بھی ڈالا لیکن اُن کے مؤقف میں کوئی فرق نہ آیا۔[31]

مہجور صاحب کبھی جیل نہیں گئے بلکہ اِس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ کشمیری زبان کا واحد ہم عصر شاعر تھا جس نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کی مدح سرائی کی۔

ملک راج آنند نے مقبول شیروانی پر "شہید" کے عنوان سے ایک مختصر ناول لکھا جسے اُردو میں بھی چھاپا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ اِس ترجمے کا پہلا ہی جُملہ غلط ہے۔ انگریزی میں یہ جملہ یوں ہے:

The poplars whirred past him.

اور اس کا ترجمہ یوں ہے:

"چنار کے پیڑ سر سے گزر گئے"

Poplar کو سفیدہ کے برعکس چنار کہنا ایک لاعلم مترجم ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

ناول نگار کا ہیرو جب سرینگر سے بارہ مولہ لَوٹ رہا تھا تو غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں اُسے دائیں طرف گُلمرگ کے اُونچے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اُگے ہوئے دیودار کے جنگل، جنہیں سیاہ خوش آئند بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور دُور سے بھورے رنگ کی فولاد ایسی نظر آنے والی پہاڑ کی چوٹیاں، شام کے یہ مناظر اور آوازیں اُس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔[32]

اِسی طرح یہ عبارت بھی دیکھئے کہ:

"اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ

مشین گنوں کی آواز کس طرف سے آرہی ہے بڑے غور سے سُننے لگا یہ بارہ مولہ کی گندربل والی سمت سے آرہی تھی''۔[۳۳]

بارہ مولہ میں بیٹھ کر گاندربل سے آنے والی گولیوں کی آواز غالباً ملک راج آنند ہی سن سکتا تھا۔

اِسی طرح کشمیریوں کو سردار جیلانی، مراتب علی، وکیل احمد شاہ، سلیم بخش، امیر ہاتو جیسے غیر کشمیری اور غیر مانوس نام دیئے گئے ہیں جو کشمیر کی وادی کے برعکس پنجاب میں سُنے جا سکتے ہیں۔

ایک جگہ ناول نگار نے پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ: مذہب - ہمارے پیغمبر - خدا اُن کی مغفرت کرے''۔[۳۴]

جبکہ ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ آنحضورؐ کے تئیں مغفرت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اُن کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔

مسز عبدالقادر اُردو کی ایک جانی پہچانی پنجابی ادیبہ تھی جو بالخصوص اُردو زبان میں پُر اَسرار افسانے اور کہانیاں لکھنے کے لئے مشہور تھی۔

اُپنے افسانے ''معلم کا راز'' میں جو جموں کے موضع اکھنور سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں جنم لیتا ہے، مُصنفہ زعفران اور دھان کے کھیتوں کا ذکر کرتی ہے۔[۳۵]

پاکستان کے مقبولِ عام ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' نے ستمبر ۲۰۰۰ء میں یومِ دفاع نمبر شائع کیا جس میں ریٹائرڈ کرنل غلام جیلانی خان کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔ اس طویل مضمون میں یہ مضحکہ خیز بیان بازی کی گئی ہے۔

''وادیٔ کشمیر اور جموں کے درمیان ایک بلند سلسلۂ کوہ حائل تھا اور آج بھی ہے۔ جموں سے کشمیر میں داخل ہونے کے لئے صرف ایک درّہ ہے جسے زوجیلا پاس کہتے ہیں۔ سردیوں کے اَیّام میں ایک سرنگ کے ذریعہ آمد ورفت ممکن ہے جو اتنی تنگ ہے کہ صرف یک طرفہ ٹریفک ہی چل سکتی ہے۔ اگر کشمیر کا الحاق پاکستان سے اور جمّوں کا بھارت سے کر دیا جاتا تو یہ ایک فطری بات تھی۔ جموں میں زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی اور کشمیر میں تو سارے کے سارے لوگ مُسلمان تھے''۔[۳۶]

جموں اور سرینگر کے درمیان زوجیلا درّہ کا موجود ہونا مقالہ نگار کی لاعلمی کی دلالت کرتا ہے اور یہ کہ ''کشمیر میں سارے کے سارے لوگ مسلمان تھے'' بھی اُن کی نام نہاد کشمیر شناسی کا مُنہ چڑاتا نظر آتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب پاکستان کے اُردو اَدیبوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا لیکن حیرت ہے کہ جموں کے ساتھ اُس کا آبائی رشتہ ہونے کے باوجود اُس نے بھی کشمیر کے حوالے سے غیر حقیقی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُپنی مشہور تصنیف ''شہاب نامہ'' میں وہ لکھتا ہے کہ ''کشمیری مزدوروں کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں تو اَپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بُنتی تھیں یا شال اور غالیچے کاڑھتی تھیں''۔[۳۷]

کشمیری عورتوں کے ہاتھوں آج سے سالہا سال قبل قالین بُننا، نمدے بنانا اور اخروٹ کی لکڑی پر نقش ونگار کھودنا غالباً پہلی بار سُنا ہے۔

اِسی طرح مصنف نے للہ عارفہ سے یہ فرضی گیت منسوب کیا ہے جو ہرگز لل دید کا نہیں ہے:

صبر! بیٹا صبر!

یہ اِتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کو یارا نہیں

صبر، بیٹا صبر

صبر تو نمک، مرچ اور زیرہ کا تیز مرکب ہے

یہ اِتنا تلخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں[۳۸]۔ اِسی صفحے پر حبہ خاتون کو ہبہ خاتون لکھا گیا ہے۔

''تحریکِ آزادیٔ کشمیر اُردو ادب کے آئینے میں'' پاکستان کے ایک بزرگ کالم نویس فتح محمد ملک کی نہایت عرق ریزی سے تیار کردہ کتاب ہے لیکن اِس میں بھی ایسی اغلاط موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اس کتاب میں قرۃ العین حیدر نے اپنے مضمون ''خواجہ خضر ہمراہ'' میں لکھا ہے کہ ڈل جھیل جس کے لئے اقبالؔ نے کہا تھا:

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب

من خدا را دیدم ایں جا بے حجاب[۳۹]

حالانکہ اقبالؔ نے یہ شعر ڈل کے بارے میں نہیں بلکہ جھیلِ ڈل پر لکھا ہے۔ اسی طرح ''گلمرگ میں ڈرائنگ رُوم کے دریچے میں سے نانگا پربت کی چوٹی اور ہرمکھ کا سلسلۂ کوہ نظر آرہا ہے اور پڑوس کا وہ سبز رنگ کا بنگلہ بھی جہاں سے ۱۹۵۲ء میں ایک روز شیخ عبداللہ اچانک گرفتار کرلئے گئے تھے[۴۰]۔

شیخ صاحب ۱۹۵۲ء میں نہیں بلکہ ۹/اگست ۱۹۵۳ء کو حراست میں لئے گئے تھے۔

قرۃ العین حیدر نے مختلف کشمیری ناموں کو بھی بگاڑ کر درج کیا ہے مثلاً کھن مرگ (کھلن مرگ) بخشی غلام محمد (شمس الدین) بھدرا (بھدرواہ)

نینی ٹوپ (چتنی ٹاپ) وعلیٰ ہذالقیاس۔

اِسی کتاب میں شامل راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''تعطل'' کا بھی یہی حال ہے جس میں حمد یا غلام ہمدانی، غلام قادرے، غلام یزدانی، غلام رضا جیسے غیر کشمیری نام کشمیریوں کے ساتھ منسوب کئے گئے تھے۔ اِس افسانے میں ہمیں یہ مہمل جُملہ بھی نظر آتا ہے کہ ''پٹن کے پنڈت لوگ اِس وقت بھی مٹن کھارہے ہیں''۔[۴۱]

فروری ۱۹۶۰ء میں پاکستان کے ایک معتبر جریدے ''نصرت'' لاہور کا ایک ضخیم کشمیر نمبر شائع ہوا جس میں شاعرِ کشمیر غلام احمد مہجورؔ پر بھی سعادت حسن منٹو کا ایک مختصر سا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کی تحریک منٹو کے بقول اُسے کسی کشمیری ہم عصر نصیر انور سے ملی تھی جس نے اُردو نثر میں مہجورؔ کی چند کشمیری منظومات کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔

تاہم اِن تراجم کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوسکا کہ یہ مہجورؔ کی کون سی نظمیں ہیں؟

جہاں تک ہمارے مطالعے کا تعلق ہے مہجورؔ کے سارے کلام میں یہ نظمیں کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔ امکانِ غالب یہی ہے کہ مترجم نے غلام کشمیر کے معاشی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ اُس دورِ ابتلاؔ کے سیاسی پس منظر میں یہ نثری تخلیقات خود ہی قلم بند کرکے انہیں وقار اور مرتبہ بخشنے کی غرض سے مہجورؔ کے مشہور نام سے وابستہ کیا ہو۔

زہر خند، کشتی، شرابی، برف اور اشرف المخلوقات کے عنوانات کے تحت اگرچہ اِن نظموں میں اُس وقت کے کشمیر کو ایک مخصوص تناظر میں ایمانداری اور

جذبات کی صحیح ترجمانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن منٹو کا یہ دعویٰ بہر حال قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ یہ مضامین مہجور نے اپنے کلام بالخصوص اپنی نظموں میں باندھے ہیں۔

مہجور پر تحقیق و تنقید کی گرہیں کھولنے کی غرض سے منٹو کا یہ مضمون اور ان نظموں کے اقتباسات یہاں پر اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں تا کہ دورِ جدید کے اس کشمیری نقیبِ سخن کے فن اور تخیل کو جانچنے کی خاطر اِن منظومات کے ماخذ الاصل کا بھی پتہ لگایا جاسکے۔

سعادت حسن منٹو خود بھی ایک کشمیری تھا اور تقسیم ہند کے بعد جو کشمیر نژاد اہلِ دانش پاکستان منتقل ہوئے یا جن کے کشمیری آباء واجداد پہلے ہی دورِ غلامی کے استبداد سے مجبور ہو کر ہندوستان کی طرف ہجرت کر چکے تھے ان میں چراغ حسن حسرت، شورش کشمیری، محمد دین فوق، ظہیر کشمیری، قدرت اللہ شہاب، میرا جی، محمود ہاشمی، اثر صہبائی، خلیفہ عبدالحکیم، طاؤس بانہالی، قیس شیروانی، احمد شمیم، مولانا انور شاہ لولابی اور رفیق خاور کے ساتھ ساتھ دیگر لاتعداد قلم کاروں میں سعادت حسن منٹو کا نام بھی زبان پر آجاتا ہے۔ علامہ اقبال تو اس قبیل کے مطلع کشمیر سے طلوع ہونے والا وہ خورشیدِ منور ہے جس کے فکر و فن کی آب و تاب سے آج بھی برِصغیر کے کروڑوں لوگوں کے اذہان و افکار روشنی اور فیضان حاصل کرتے رہتے ہیں۔

منٹو نے نصیر انور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن میں بھی تضاد بیانی موجود ہے۔ منٹو لکھتا ہے کہ ''نصیر انور خد و خال سے تبت کا رہنے والا لگتا ہے لیکن وہ کشمیری زبان سمجھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے''۔[۴۲] اس بیان پر

شبہ کرنے کی تاریخی گنجائش موجود ہے۔ ثانیاً یہ کہ نصیر انور مقامی طور پر کشمیری الاصل نام نہیں ہے۔ منٹو کے دور میں جو عام کشمیری نام ہوا کرتے تھے وہ خاص الفاظ کی بندش کے ساتھ مخصوص مذہبی نقطہ نگاہ سے رکھے جاتے تھے۔

منٹو کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصیر انور نے مہجور کی اِن مفروضہ نظموں کا ترجمہ کر کے انہیں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا جس کا پیشِ لفظ منٹو نے تحریر کیا ہے۔[۴۳]

اَب مہجور کی اِن پانچوں نظموں کو اِختصار کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے:

(۱) زہر خندہ

کشمیر کی حسین وادی تیرے دامن میں
زعفران کی مہک ہے بہار کی رنگینی ہے
تو اِترا رہی ہے کہ دُور سے آنے والے
تیری رعنائی پر مرتے ہیں تیرے شیدائی ہیں
تو شیدائیوں کے ہجوم میں بھُول گئی ہے
وہ اِنسان جس نے تمہیں زندگی عطا کی
خود زندگی سے محروم ہوا جاتا ہے
دیکھ میری آنکھوں سے دیکھ!
تیری جھولی رنگین پھولوں سے لبریز ہے
ان پھولوں کو سونگھ اِن میں زندگی کا خون ہے
جو ہر ورقِ گُل کو رنگین بنا چکا ہے

دیکھ اپنی خمار آلودہ آنکھوں سے
اِن مہیب ڈھانچوں کو دیکھ!
جنہوں نے اپنے خون سے تمہیں رنگینی بخشی
دیکھ اِن زرد چہروں کو دیکھ!
جن پر ہر لمحہ یاس و حسرت کی بدلیاں چھائی رہتی ہیں
اے حسین وادی!
شاید تو مسکرانا چھوڑ دے
یہ مصنوعی ہنسی اب تمہیں زیب نہیں دیتی

﴿۲﴾ برف

اے برف!
میں افلاس زدہ تجھے بلند چوٹیوں پر سے لایا ہوں
تو نے وہاں سیاہ پہاڑیوں کی ہیبت کو اپنے سیمیں آنچل سے چھپا رکھا تھا
لیکن میں غربت کا مارا تمہیں اُٹھا لایا
اور سبزہ زار کی ہری ہری گھاس میں
چھپا کر بازار چل پڑا
تا کہ تمہیں بیچوں
لیکن تو اِتنی باحیا ہے
کہ سورج کی کرنیں پہاڑوں کی اوٹ سے
تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں
تو تُو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے

﴿۳﴾ کشتی

میں کشتی میں سوار ہو چکا تھا
ہانجی ایک سوار کے انتظار میں
ابھی کشتی کنارے لگائے بیٹھا تھا
یکا یک ایک صاحب کا خود پسند چہرہ نمودار ہوا
اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا
''چلو چشمۂ شاہی چلو!''
وہ طمطراق سے کشتی میں سوار ہوا
ہم ایک کشتی میں سوار تھے
صاحب، ہانجی اور میں
ہانجی چپو چلانے میں مصروف تھا
اس کی دونوں کہنیاں بار بار
اس کے پیٹ سے ٹکراتیں
جیسے اشاروں ہی اشاروں میں سمجھا رہی ہوں
ذرا صبر کر......بس تھوڑی ہی دیر ہے
تمہارے سامنے چاولوں کا تھال ہوگا
شلغم کا کٹورا ہوگا

﴿۴﴾ شرابی

میں گنگناتا ہُوا چلا جا رہا تھا
اچانک ہی لڑکھڑا کر نالی کے قریب گرا

راہ گیروں نے یہی جانا
میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوں
اُنہوں نے اَپنے ہوش وحواس کا اظہار کرتے ہوئے کہا
''ارے یہ تو شرابی ہے''
لڑکوں نے سُنا تو آواز بلند کی ''شرابی ہے شرابی ہے''
اور مجھ پر کنکر پھینکے
کاش یہ کنکر اِس طرح معصومانہ انداز میں
مجھ پر برستے رہیں
اور میں یونہی تماشا بن سکوں
ان لڑکوں کو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے

﴿۵﴾ اشرف المخلوقات

پہاڑوں کے اُس پار مجھے زندگی نے آواز دی
مست ہواؤں نے مجھے گیت سُنائے
میں والہانہ انداز میں آگے بڑھتا گیا
یکا یک ایک پہرہ دار نے مجھے روک لیا
''تم اس سرحد کو پار نہیں کر سکتے
پروانہ راہداری دکھاؤ''
''میں جہاں چاہوں جاسکتا ہوں
میں اس زمین کا وارث ہوں
میں دھرتی کا فرزند ہوں

مجھے ہواؤں نے زندگی کا پیغام سُنایا ہے
مجھے آگے بڑھنے دو''
پہرہ دار نے اپنے ایک ساتھی سے کہا
اس پاگل سے کہو دور ہٹ جائے
ورنہ کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے گا
نہیں نہیں۔ میں آگے بڑھوں گا
مجھے روکو مت
چلے جاؤ یہاں سے۔ اُس نے غصہ میں کہا
میں سوچتا ہی رہ گیا۔ کیوں؟
اتنے میں ایک خوبصورت پرندہ
اپنے چمکیلے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہوا
زور زور سے تالیاں بجاتا
ہمارے سروں پر سے گذر گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرحد کے اُس پار
نگاہوں سے اوجھل ہو گیا

''کشتی'' اور ''شرابی'' طویل نظمیں ہیں جنہیں من وعن نقل کرنا تضیع اَوقات کے سوا کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ جیسا کہ ہم پہلے ہی وثوق کے ساتھ کہہ چکے ہیں اِن نظموں کا کلام مہجور میں کہیں نام ونشان نہیں ملتا لہٰذا انہیں اصل صورت میں نقل کرنے میں ہمیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ریاست جموں و کشمیر سے تعلّق رکھنے والے ایک معروف دانش ور اور صحافی مرحوم کلیم اختر نے بھی اپنے ایک مضمون ''مہجور- اقبال کا کشمیری ترجمان'' میں مہجورؔ کے ساتھ فرضی طور پر منسوب نظم ''اشرف المخلوقات'' کا ترجمہ شامل کرلیا ہے۔[۴۵]

اس نظم کی ہیئت اور اس کا نفسِ مضمون بجائے خود اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اِس مفروضہ کے پسِ پردہ دراصل وہ سیاست گری کارفرما ہے جس کی رُو سے کشمیر کو غلامی اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دکھانا مقصود تھا۔

ایک اور پاکستانی ادیب اے حمید اگرچہ اپنے آبائی رشتے کے توسط سے کشمیری ہی ہیں لیکن انہوں نے بھی اُپنی کشمیریات میں اِسی نوع کی غلطیاں کی ہیں اور وہ حقائق کو پرکھنے کی مطلوبہ تحقیق کی ضرورت کو غالباً محسوس نہیں کر سکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے کشمیری قہوہ بنانا اپنی والدہ سے سیکھا ہے۔ وہ سب سے پہلے پتیلی میں اندازے کا پانی ڈال کر اُس میں دو تین الائچیوں کے مُنہ کھول کر ڈالتیں۔ اور پانی کے دو تین اُبال آجانے اور الائچیوں کی خوشبو پانی میں شامل ہوجاتی تو پھر اندازے سے دارچینی اور بادیاں خطائی ڈال دی جاتی۔''[۴۶]

بادیاں خطائی کیا چیز ہے اور کشمیری قہوہ میں کس طرح سے ڈالی جاتی ہے۔ اے حمید خود اِس کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔ ہم تو اس دریافت کے بارے میں لاعلم اور لاجواب ہیں۔ اگر یہاں مُراد بادیانہ (سونف) سے ہے تو بھی یہ صحیح نہیں کیونکہ قہوہ میں کبھی بادیانہ نہیں ڈالا جاتا ہے۔

غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اُردو کے برگزیدہ ادیبوں کرشن چندر، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، سُہیل عظیم آبادی، کنول نین پرؔواز، پرکاش پنڈت، اظہارؔ اثر اور کئی اور مُصنّفوں نے بھی اُپنی تخلیقات میں جہاں کشمیر کے موضوع کو چھیڑا ہے وہاں اُن سے بھی واقعاتی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتدا ہی میں کہا تھا اِس مضمون میں اس لامتناہی سلسلے کے نتیجے کے طور پر منظرِ عام پر آنے والی کتابوں کا احاطہ کرکے اُن میں موجود اغلاط پر سیرِ حاصل تبصرہ کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کوئی اور محبِ کشمیر اِس اہم اور قابلِ توجہ موضوع پر قلم اُٹھا کر اس تجزیاتی سلسلے کو آگے بڑھانے یا مکمل کرنے کی طرف اُپنی توجہ سنجیدگی کے ساتھ مبذول کرے۔

☆

حوالہ جات:

۱۔ حبہ خاتون۔ پروفیسر مجیب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار۔ دہلی، اپریل ۱۹۵۲ء۔ ص ۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۸

۳۔ اقبالؔ اور تحریک آزادی کشمیر۔ غلام نبی خیالؔ کشمیری رائیٹرس کانفرنس سرینگر ۱۹۹۷ء۔ ص ۱۵

۴۔ دیا بجھ گیا۔ کرتار سنگھ دُگل۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، دسمبر ۱۹۵۲ء۔ ص ۳۳

۵۔ کشمیر۔ اَدب اور ثقافت، سلیم خان گمی۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی، ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۷

۶۔ ایضاً۔ ص ۴۶

۷۔ ایضاً۔ ص ۶۷

۸۔ ایضاً۔ ص ۴۳

۹۔ ایضاً۔ ص ۱۹۱

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۶۷

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۲۷۔ ۴۴۔ ۴۵

۱۲۔ شیرازہ کشمیری، مہجورؔ نمبر۔ کلچرل اکادمی سرینگر۔ ستمبر دسمبر ۱۹۸۷ء۔ ۶۱۳، ۶۱۲، ۶۱۱، ۶۱۵، ۶۱۴

۱۳۔ ہمارا اَدب، شخصیات نمبر ۲۔ کلچرل اکادمی سرینگر۔ ص ۱۹۵، ۱۹۴

۱۴۔ کشمیر۔ اَدب اور ثقافت۔ ص ۳۹

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۴۴

۱۶۔ کچھ عرصہ بعد آزاد نے سرکاری طور پر جو "اقبالؔ نمائش" سرینگر میں منعقد کرائی اُسے بھی ڈاکٹر اکبر حیدری نے ایک "اَدَبی فراڈ" قرار دے کر یہ الزام عائد کیا کہ اس میں بیشتر تصاویر "روزگارِ فقیر" نامی کتاب سے بغیر اجازت کے سرقہ کی شکل میں نقل کر کے دکھائی گئیں۔ آئینہ سرینگر۔ ۱۷ مئی ۱۹۸۱ء

۱۷۔ اقبال اور کشمیر۔ صابرؔ آفاقی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۲

۱۸۔ اقبال اور کشمیر۔ علی محمد اینڈ سنز سرینگر۔ ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۸۶

۱۹۔ ایضاً۔ ص ۱۸۷

۲۰۔ آزاد کی طرف سے علامہ اقبالؔ کے اشعار کی وضع کردہ تشریح کے سلسلے میں تفصیلاً رائے زنی کرنا اِس لئے بھی مناسب اور برمحل تصور کیا گیا کہ آزادؔ کے اس مفروضے کو محققین کی طرف سے نادانستہ طور پر تاریخی لحاظ سے قبول کرنے کا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا جس کے نتیجے کے طور پر کشمیر کے بارے میں اقبالؔ کے سیاسی موقف اور اُمتِ مسلمہ کے اتحاد و یک جہتی کے لئے ان کے نظریہ کی تردید ہونے کا احتمال تھا۔

۲۱۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبالؔ۔ مرتبہ سید مظفر حسین برنیؔ۔ اردو اکادمی دہلی، جلد سوم۔ ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۲

۲۲۔ ایضاً۔ ص ۴۵۳

۲۳۔ روزنامہ نوائے صبح سرینگر۔ ۵ مارچ ۱۹۷۸ء

۲۴۔ اقبال اور کشمیر۔ آزاد۔ ص ۱۹۳

۲۵۔ کشمیر۔ اقبال اور جگن ناتھ آزاد۔ از غلام نبی خیالؔ۔ روزنامہ اقبال سرینگر، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۲۶۔ اقبال اور کشمیر۔ آزاد۔ ص ۱۱

۲۷۔ کشمیر میں اُردو۔ حبیب کیفوی۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ اپریل ۱۹۷۹ء۔ ص ۶

۲۸۔ ایضاً۔ ص ۷

۲۹۔ ایضاً۔ ص ۱۰

۳۰۔ ایضاً۔ ص ۲۹۔ ۲۸

۳۱۔ ایضاً۔ ص ۹

۳۲۔ شہید۔ ملک راج آنند۔ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۵ء۔ ص ۹

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۲۶

۳۴۔ ایضاً۔ ص ۲۰

۳۵۔ قومی ڈائجسٹ لاہور۔ جون ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۳۱، ۱۳۲

۳۶۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور۔ یوم دفاع نمبر۔ ستمبر ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۷

۳۷۔ شہاب نامہ۔ قدرت اللہ شہابؔ۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۸۹ء۔ ص ۱۷۵

۳۸۔ ایضاً۔ ص ۱۷۵

۳۹۔ تحریک آزادیٔ کشمیر اُردو ادب کے آئینے میں۔ فتح محمد ملک۔ سنگِ میل پبلشرز لاہور ۲۰۰۱۔ ص ۱۶۱

۴۰۔ ایضاً۔ ص ۱۶۳

۴۱۔ ایضاً۔ ص ۲۲۹، ۲۲۷، ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۱۹

۴۲۔ ہفت روزہ نصرت لاہور۔ کشمیر نمبر۔ ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء۔ ص ۳۶۸

۴۳۔ ایضاً۔ ص ۳۶۸، ۳۶۷

۴۴۔ ایضاً۔ ص ۳۷۵، ۳۶۷

۴۵۔ شیرازہ اردو۔ مہجور نمبر کلچرل اکادمی سرینگر۔ اگست نومبر ۱۹۸۴ء۔ ص ۱۰۶، ۱۰۴

۴۶۔ نوائے وقت لاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۴ء۔ سنڈے میگزین۔ ص ۱۴

☆☆☆

پریمی رومانی☆

سَر جارج ابراہیم گریرسن

وادیٔ کشمیر صدیوں سے دُنیا بھر کے لوگوں کو دعوت نظارہ دیتی رہی ہے۔ یہ وادی اپنے لازوال حُسن کے لئے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کے صحت مند اقدار سے نہ صرف مُلکی بلکہ بیرونِ ممالک سے تعلّق رکھنے والے سیلانی، مُہم باز، اَدیب، دانشور، زبان دان اور مورّخ بھی شدّت سے.... مرعوب ہوتے رہے۔ ان اَدیبوں، سیاحوں اور مُہم بازوں نے اُپنی خُداداد صلاحیت سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دُنیا حیران ہوگئی ہے۔ برنیر، ہیون سانگ، رابرٹ تھروپ، ولیم مورکرافٹ، سرالیگز انڈر کننگھم، رچرڈ ٹمپل، بیرن چارلس ہوگل، فرانسس ینگ ہسبنڈ، سروالٹر لارنس، ٹینڈل بسکو، مارکو پولو، اُوکانگ، ولیم ویکفیلڈ......بس چند نام ہیں جنہوں نے سرزمینِ کشمیر میں نہ صرف سیر و تفریح کو ہی اُپنی توجہ کا مرکز بنایا بلکہ وہ یہاں کے کلچر، تہذیب، تمدن، اَدب اور یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ سے بھی کافی دلچسپی لینے لگے اور اپنی بھرپور محنت، صلاحیت اور لگن سے اپنے خلوص اور جذبۂ عقیدت کا اظہار کر کے کشمیر کے حُسن کو اور بھی دوبالا کرنے لگے۔ گریرسن کا نام غیر ملکی دانشوروں، زباں دانوں اور ماہرین

☆ اِم نصیب نگر جانی پور جموں ۱۸۰۰۱

لسانیات کی اِسی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کے گوناگوں پہلوؤں پر کام کر کے تحقیق کے نئے دَروازے کھول دیئے ہیں۔

گریرسن ۷؍جنوری ۱۸۵۱ء[1] کو انگلستان کی ایک بندرگاہ اَیرلینڈ کے نزدیک ڈبلن علاقے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والدِ بزرگوار کا نام بھی جارج ابراہیم گریرسن ہی بتایا جاتا ہے۔ وہ ایک سیدھے سادھے اور باوقار شخص تھے۔ گریرسن بچپن سے ہی سنجیدہ مختی اور مختلف النواع دِلچسپیوں کے مالک تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے معاملوں پر غور و فکر کرنا اور اُن کی تہہ تک جانا گریرسن کا بچپن سے ہی نصب العین رہا ہے۔ خود گریرسن کے والد نے بھی اُپنے بچے کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ وہ شروع سے ہی اُپنے اِس بچے میں جذبۂ شوق اور تجسس دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ اُنہوں نے گریرسن کو سینٹ بیز شر بوز بری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں انہوں نے اُپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اُپنے اُساتذہ کا دل جیت لیا اور سکول میں وہ ہر دلعزیز طالب علم بن گئے۔ اسکول کی تعلیم کے بعد گریرسن ڈبلن کے ٹینٹی کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ اِسی دَور میں انہیں سنسکرت زبان سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور یہ دلچسپی آگے جا کر سُودمند ثابت ہوگئی۔ گریرسن کو شروع سے ہی تحقیق سے دلچسپی تھی۔ سنسکرت زبان سے گہرا شغف ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں اور بولیوں کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اُن کا اصل ماخذ تلاش کرنے لگے۔ وہ جگہ جگہ گھومے اور اِن زبانوں کے صحیح

[1] بحوالہ ''انہار'' شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔

طور پر تعین کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

گریرسن بچپن سے ہی ذہین تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ اُنہوں نے اپنی ۲۲ سالہ عمر ۱۸۷۳ء میں انڈین سول سروس کا مُشکل ترین امتحان اِمتیاز سے کامیاب کیا۔ اسی عمر میں وہ دُنیا کی متعدد بولیوں اور زبانوں سے آشنا ہو گئے۔ وہ بقولِ سینتی کمار چٹرجی ۱۸۷۳ء سے ہی چھوٹی بڑی اَن گنت زبانوں کو اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرتے رہے۔ اِن زبانوں کے عشق نے ہی انہیں ۴۵ سال تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کی لِسانی سیاحت کرنے پر مجبور کیا۔

گریرسن اعلیٰ ڈگری یافتہ تھے۔ اُنہوں نے ڈی لٹ کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی اور ایل ایل بی کی ڈگریاں بھی حاصل کی تھیں۔ وہ Asiatic Society of Bengal کے اعزازی رُکن بھی تھے۔ انہوں نے ناگری پرچارنی سبھا کی اعزازی رُکنیت بھی حاصل کی تھی اور وہ اُس زمانے کی متعدد ادبی انجمنوں سے وابستہ ہو چکے تھے۔ American Oriental Society نے بھی انہیں اپنا رُکن نامزد کیا تھا اور Royal Danish Academy of Science سے بھی وہ وابستہ تھے۔ اِن دونوں سوسائٹیوں کے ساتھ ساتھ جن اِداروں کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ تھے اُن میں • Intenational Bihar Society • Orrisa Research Society • Bombay Branch of the Royal Asiatic Society • MOdern Language Association[1] جیسے علمی اور تہذیبی اِدارے قابلِ

[1] بحوالہ ''انہار'' شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔

ذکر ہیں۔ اِن اِداروں کے علاوہ گریرسن فرانس کی ایک ادبی تنظیم کے ایک سرگرم رُکن تھے۔ اِن تمام چیزوں سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی سنجیدہ، ادبی اور علمی طبیعت کے مالک تھے۔ اُن کا ذہن تحقیق کی طرف مائل تھا۔ وہ ایک بڑے عالم اور ادب شناس تھے۔

جارج گریرسن نے ہندوستان میں زبان کی تحقیق و تحفظ میں ایک مثال قائم کی۔ اُن کا جو بھی تحقیقی کام ہمارے سامنے ہے، وہ لِسانیات کے طالب علموں اور کشمیری زبان کے شائقین کے لئے سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا نام کی کتاب جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے، سے گریرسن نے لِسانیاتی دُنیا میں انقلاب لایا۔ اِن جلدوں کے مطالعے سے اِس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے بنیادی مواد فراہم ہوتا ہے۔ گریرسن ہندوستانی زبانوں کے دیوانے تھے۔ اُنہوں نے مختلف لوگوں سے گفتگو بھی کی اور پُرانے مخطوطات کا جائزہ بھی لیا، قدیم مسوّدات کا سُراغ بھی لگایا اور مختلف حرکات و سکنات کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش بھی کی۔ زبانوں کا صحیح تعیّن کرنے اور سنجیدگی سے اُن کا موازنہ کرنے کے لئے اُنہیں وقتاً فوقتاً گراں قدر اعزازات سے نوازا گیا۔ دورانِ تعلیم ہی اُن کی ملاقات مشہور مستشرق روبرٹ اٹکنسن (Robert Atkinson) سے ہوئی۔ یہ ملاقات اُن کے لئے سُود مند ثابت ہوئی اور عنقریب ہی استاد اور شاگرد کے رشتے میں تبدیل ہوگئی۔ گریرسن نے اُن کی رہنمائی سے ہی اُپنے مشن کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے نہ صرف علمِ لسانیات کے اہم اور مستور پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے عمل سے اپنا رِشتہ جوڑا بلکہ اٹکنسن (Atkinson) نے اُنہیں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے

بارے میں بھی روشناس کیا۔

۱۸۷۳ء میں گریرسن نے پہلی بار ہندوستان کا رُخ کیا اور سب سے پہلے اُنہوں نے سرزمینِ بنگال کو اپنا اوّلین پڑاؤ بنایا۔ انہوں نے اُپنے اُستاد کے بتائے ہوئے راستے کا ازسرِنو جائزہ لیا اور اپنی علمی مہم کا سرِ آغاز کیا۔ یہاں وہ ۲۳ سال تک سِول سروس میں اُپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اِسی دوران انہوں نے اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں بے پناہ مہارت حاصل کی۔ اَپنے تجربے کی وُسعت، جذبے کی صداقت اور اَپنے تحصیلِ علم سے بے پناہ لگاؤ نے اُنہیں کڑی سے کڑی مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور کیا۔ اسی لئے وہ اپنے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور آج اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اُن کا نام احترام سے لیا جاتا ہے اور اُن کے تحقیقی کام کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

گریرسن ۱۸۸۶ء میں ملک سے باہر چلے گئے جہاں انہوں نے مستشرقین کی کانفرنس میں حِصّہ لیا اور ہندوستان کی نمائندگی کی۔ یہاں اُنہوں نے ہندوستانی زبانوں سے متعلق چند تجاویز پیش کیں جن پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور حکومت سے سفارش کی گئی کہ وہ گریرسن کی حوصلہ افزائی کرے۔ چنانچہ اس تمام پروگرام کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا۔ گریرسن کی تجاویز کا اَزسرِنو جائزہ لیا گیا اور آخرکار اُن کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ حکومت نے اُن کے مرتّب کردہ خاکے کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان میں لِسانی سروے Linguistic Survey of India کا محکمہ شملہ میں اُن کی نگرانی میں قائم کیا گیا۔ اِس طرح سے گریرسن کی زندگی کا سب سے بڑا خواب پورا ہوگیا۔ اُول اُول اس محکمے کے کام کی رفتار دیکھ کر اِس کو وسعت دی۔ گریرسن مسلسل کئی

سال تک اس منصوبے پر کام کرتے رہے۔ اِس اَن تھک محنت نے اُن کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا۔ انہیں ۱۹۰۳ء میں انگلستان واپس جانا پڑا۔ یہاں بھی اُن کا ذہن اَپنے اِسی منصوبے کی تشکیل واِشاعت کے لئے کاربند رہا اور آخر وہ ۱۹۲۸ء میں اَپنے کام کو پایۂ تکمیل تک لانے میں کامیاب ہوگئے۔

گریرسن خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اَپنے مشن کو بے پناہ مشکلات کے باوجود جاری رکھا اور ایک نڈر سپاہی کی طرح اُن سنگلاخ پہاڑوں کو سَر کرتے گئے جو اُن کی راہ میں حائل تھے۔ وہ عمر بھر جدید ہند آریائی اور دُوسری قدیم زبانوں کی خونِ جگر سے آبیاری کرتے رہے۔ اُن کا ذہن زبانوں کی بھٹی میں تپ کر کُندن بن گیا تھا۔ اسی لئے وہ نہایت ہی دَردمندی کے ساتھ لسانیات کے علم کی گردشِ سفر میں نئے نئے تجربات کرتے رہے، اُپنے تحقیق کے ہر پڑاؤ پر نئے نئے گل بوٹے کھلاتے رہے اور ایک زمانہ ایسا آگیا جب اُن کا کام وقعت کی نظر سے دیکھا گیا۔ اُنہیں ۱۸۹۴ میں .O.I.E مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں گریرسن کو .K.C.I.E کا اعزاز عطا کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں آرڈر آف میرٹ (Merit) سے سرفراز کیا گیا۔ اَپنے کام کے پیشِ نظر ڈبلن، اوکسفورڈ، کیمبرج اور بہار کی یونیورسٹیوں نے جارج گریرسن کو اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں۔ وہ برس ہا برس تک کئی اکادمیوں کے فیلو بھی رہے۔ اس طرح سے اُنہیں نہ صرف ہندوستانی مطالیاتی شعبہ جات ہی جاننے اور پہچاننے لگے بلکہ بیرون ممالک میں بھی وہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ دُنیا کے ۵۲ عالموں اور دانشوروں کی ترتیب دی گئی کتاب ''ہندوستانی اور ایرانی مطالعہ جات'' بھی اُنہیں اُسی دَور میں بڑے اعزاز سے پیش کی گئی۔ گریرسن

۱۹۰۳ء میں واپس انگلستان چلے گئے جہاں وہ خاموشی سے مطالعہ اور مشاہدہ کرکے اُپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے گئے۔ اُنہوں نے اُپنی کئی تصانیف ناروے کے ایک محقق Sten Konow کے تعاون سے شائع کیں۔ افسوس کہ علمِ لسانیات کے دلدادہ مشرقی زبانوں اور علم کے سچّے عاشق اور اُدب کے حقیقی متوالے کی زندگی کا چراغ ۱۹۴۱ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجُھ گیا۔ لیکن اُنہوں نے اُپنے پیچھے جو اَدبی، علمی اور تحقیقی سرمایہ چھوڑا وہ تحقیق و تجرباتی دُنیا کے شیدائیوں کے لئے ہمیشہ سرمۂ بصیرت کا کام دیتا رہے گا۔

گریرسن ہندوستانی زبانوں کے شیدائی تھے۔ اِن زبانوں میں اُنہیں لِسانیاتی نقطۂ نظر سے گہرا تحقیقی شعور نظر آنے لگا۔ اُنہوں نے ہندوستان میں وارد ہونے کے چار سال بعد مقالات کو شائع کرنا شروع کیا اور اُپنے تحقیق کو مرحلہ وار طریقے پر منظرِ عام پر لانے کا پروگرام بنایا۔ وہ مسلسل اور متواتر ہندوستانی زبانوں پر تحقیق کرتے رہے اور اِس طرح نہ صرف اُپنے ذوق کو تسکین فراہم کرتے رہے بلکہ عوام میں قدیم زبانوں کی اہمیت کی افہام و تفہیم اور ان کی افادیت پر زور دیتے رہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہیں اُپنے مشن کو آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ تقریباً نصف صدی تک ہندوستانی زبانوں اور ان کے الفاظ کے دُروبست کو اُپنے خونِ جگر سے آبیاری کرتے رہے۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا کی جِلد سوم حصہ دوم میں جو عبارت درج ہے اِس کا جائزہ لینے کے بعد بھی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ گریرسن کو ہندوستانی زبانوں، ویدک لٹریچر اور کلاسیکی شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ عبارت کا یہ حصہ قابلِ مطالعہ ہے:

"In India George Grierson has seen a vision on magnificiet literature enshrining the thoughts of great men from generation to generation through 3000 yerars. He has been able to stroll through enchanted gardens of poesy, begining with the holy Vedas through great epics, through the majic of Indian dramas consummated in word-writing of Kalidas, through the lyric poetry of the Indian reformation, through the heart of Tulsidasa down to the distiches of Biharilala"[1].

گریرسن کو بِہاری زبان بھی عزیز تھی۔ انہوں نے اِس زبان کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ بِہاری زبان اور دوسری بولیوں سے اِس کا رشتہ بھی گریرسن کا موضوع رہا ہے۔ اِن بولیوں کے ساتھ قواعد کی بھی انہوں نے نشاندہی کی ہے اور یہ تحقیقی کام بھی انہوں نے بطورِ احسن انجام دیا۔ اُنہوں نے ۱۸۸۵ء میں بِہار کے کسانوں کی زندگی کے بارے میں تصنیف شائع کی جو بہت ہی مقبول ہوگئی۔

گریرسن نے طویل عمر پائی۔ وہ ۹۰ سال کی عمر میں اس دُنیائے فانی سے کوچ کرگئے۔ یہ تمام عمر اُن کے لئے تحقیق و تجسس کی عمر تھی۔ اِس میں انہوں نے علمِ لِسانیات کے شعبے میں مختلف تجربے کئے جن کو آج تک مشعلِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ نیرّ اقبال نے اُپنے مقالے میں بڑے پتے کی بات کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

1 Lingusitic Survey of India by G.A.Grierson, Vol.iii, part ii (Flap)

"گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کے سلسلے میں اتنا ہمہ جہت اور پُر اَز معلومات کام کیا ہے کہ اِن زبانوں کے کسی بھی طالب علم یا محقق کو اِس سے استفادہ کئے بغیر مفر بھی نہیں .... اس کی تصانیف اور تالیفات، خاص طور سے ہندوستان کے لِسانی جائزے کی ابتدائی اور بنیادی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اِس کی تصانیف و تالیفات کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا ہے۔ اِن تصانیف کی تعداد، ضخامت اور دائرۂ عمل کی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے ذوق و شوق اور اولوالعزمی کی داد دینی لازمی ہو جاتی ہے۔"

اِس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ گریرسن کا تحقیقی کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ اُن کی کتاب لنگوسٹک سروے آف انڈیا کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

Volumes of the Linguistic Survey of India

Vol. I. Part I Introductory
- Part II Comparative vocabulary

Vol.II. MON-KHMER & Siamese -Chinese
- (Family Including Khassi & Tal)

Vol. III. Tibeto-Burman Family
- Prart I General introduction, Tibetan Dialects Himalayan Dialects & North Assam Groups.
- Part II BODO-NAGA & KACHIN Groups
- Part III Kuki-chain & Burma Groups

Vol. IV. Munda and Dravidian Languages

Vol. V. Indo-Aryan Family (Eastern Group)
- Prat I. Bangali & Assamiese
- Part II. Bihari & Oriya.

Vol. VI. Indo-Aryan Family, Mediate Group (Eastern Hindi)

Vol. VII. Indo-Aryan Family, Southern Group

Vol. VIII. Indo-Aryan Family:North-Western Group
- Part I. Sindhi & Lahnda
- Part II. Dardic and Pisacha Languages. (Including Kashmiri)

Vol. IX. Indo-Aryan Family Group.
- Part I. Western Hindi and Panjabi.
- Part II. Rajisthani and Gujrati.
- Part III. Bhil Languages including Khandesi, Banjari or Labhani, Bahrupla etc.
- Part IV. Pahari Languages and Gujuri.

Vol. X. ERANIAN Family

Vol. GIPSY Language.

کشمیری زبان کی ترقی و فروغ میں جو کام گریرسن نے کیا اُس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ کشمیری زبان کے تئیں اُن کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے کشمیری اور سنسکرت زبان کے ایک بہت بڑے عالم اور فاضل ایشر کول کی سنسکرت زبان میں تصنیف (گرائمر) "کشمیر شبدامرتم" ۱۸۸۹ء میں ایڈٹ کر کے ۱۸۹۸ء میں شائع کی۔ گریرسن کو یہ مسودہ حاصل کرنے کے لئے کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑے۔ آخر وہ بابو نیلامبر مکرجی سے یہ مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جو اُس دَور میں جموں و کشمیر کے پرائم منسٹر تھے۔ یہ گرائمر ایشور کول نے ہرشی پانِنی کے طرز پر لکھی تھی جنہیں سنسکرت زبان کا اوّلین گرائمر شناس تصور کیا جاتا ہے۔ اور گریرسن نے اس گرائمر کا مطالعہ کشمیری زبان کے

ایک عالم اور فاضل پنڈت مکندرام شاستری کی مدد سے بڑی گہرائی اور بینی سے کیا۔ انہوں نے گریرسن کو گرائمر کے قواعد وضوابط، الفاظ کی دروبست، اور اس میں ترتیب دیئے گئے تراکیب کے مقامی رنگ سے آشنا کیا اور گریرسن اپنے طریقے سے اپنی ڈائری پر ان تمام باتوں کا اندراج کرتے گئے۔ ایشر کول کے کام کی داد دیتے ہوئے گریرسن ایک جگہ لکھتے ہیں:

"Ishwar Koul's work is a Grammar of the Kashmiri Language, written in Sanskrit on the model of Ordinary Vyakarana. It is model of Ordinary Vyakarana. It is an excellent work and might have been composed by Hema Chandra himself. Kashmiri is a Language which is very little known, but which is of great importance for the purpose of comperative philology. Existing grammars of it have been made by foriegners and are imperfect. The all suffer from at least one great fault viz, that they are based on the representation of the Language which is quite unable to express the many spoken vowel sounds in the Language. Ishera Koul adopted that the Devanagri charector, ingeniously modified to suit his purpose."[1]

[1] بحوالہ "انہار" گریرسن نمبر، شعبہ کشمیری، کشمیری یونیورسٹی، کشمیر جلد ۱۰، شمارہ ۱۳، سنہ اشاعت ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۸۔

پنڈت ایشر کول کی ڈکشنری کی تدوین بھی گریرسن کے اہم کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔ سنسکرت اُشلوکوں میں رکھی گئی یہ ڈکشنری کشمیری زبان کے مشکل الفاظ کو سمجھانے میں بڑا اہم رول اُدا کرتی ہے اور فارسی، عربی، انگریزی، کشمیری، پشتو، لامی اور بلتی زبانوں الفاظ کا مفہوم پیش کرتی ہے۔ اس طرح سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ پنڈت ایشر کول سنسکرت اور کشمیری زبانوں کے ساتھ ساتھ کئی دوسری زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ ڈکشنری بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر نامکمل رہ گئی تھی جس کو بعد میں گریرسن نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مکمل کرلیا۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کشمیری اور سنسکرت زبانوں کے ایک عالم پنڈت گوبند کول کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ پنڈت گوبند کول، پنڈت ایشر کول کے ہم عصر اور دوست تھے لہٰذا اُنہوں نے اس تحقیقی مہم کی تکمیل میں گریرسن جیسے انگریزی عالم کا ہاتھ بٹانا اپنا فرضِ اَوّلین سمجھا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اِس زمانہ میں سر جارج گریرسن نے کشمیری زبان سے متعلق لِسانی تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ اس میں ایک دُوسرے عالم پنڈت ایشر کول کے کارناموں کا خاص دخل رہا ہے۔ پنڈت ایشر کول، گوبند کول کے گہرے دوست تھے۔ اُنہوں نے کشمیری زبان کی ڈکشنری مرتب کی تھی جو مکمل نہیں ہوسکی تھی۔ سر جارج گریرسن کے کارناموں میں اِس ڈکشنری کی تکمیل بھی ہے۔ جس کے نامکمل حصے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے گوبند کول کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا"[1]۔

[1] ڈاکٹر برج پریمی: کشمیر کے مضامین، ص ۶۸

کشمیری زبان و ادب کے تئیں گریرسن کی عقیدت کا انکشاف نہ صرف اُن کے تحقیقی کارناموں، کشمیری ڈکشنری اور کشمیری گرائمر سے ہی ہوتا ہے بلکہ اُنھوں نے کشمیری زبان اور اس کی دُوسری بولیوں سے جو گہری دلچسپی لی اس کو کسی بھی صورت میں صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ گریرسن نے کشمیری زبان کے مختلف ماخذوں کی بازیافت میں جو رول اُدا کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔ گریرسن نے کشتواڑی، سراجی، پوگلی، رام بنی، بولیوں میں بھی گہری دلچسپی لی اور نئے نئے انکشافات سامنے لائے۔ انھوں نے کشمیری لسانی ماخذوں کی بھی تحقیق کی اور کشمیری انگریزی ڈکشنری بھی مرتب کی۔ کشمیری زبان اور بولیوں کی شناخت کرتے ہوئے گریرسن اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Kahmiri has one true dialect- Kashtiwari spoken in the valley of Kishtwar (Commonly known as KASHTIWAR), Lying to the South East of the valley of Kashmir, Kashmiri has also over frowed the Pir Panchal Range in to the Jammu Provice of the state, and in the valley between the Southern Hills of the Range, between the water shed and the valley of chinar. There are a number of mixed Dialects, such as POGLI, SIRAGI of DODA and RAMBANI. The first two of these represents Kashmiri merging into Dogri Farther East, over the greatest part of Riasi District of the state. There are more of these mixed

Dialects about which nothing certain is known, except that the mixture is between Kashmiri and the Chibhali form of Lahanda[1]".

جارج گریرسن اگرچہ غیر ملکی باشندے تھے لیکن انھوں نے ہندوستان میں علمِ لسانیات میں نئے دروازے وا کئے۔ خاص طور پر کشمیر سے اُن کا لگاؤ اور کشمیری زبان اور بولیوں سے اُن کی بے پناہ محبت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے تحقیقی کام کو ہمیشہ وقعت نظر سے دیکھا جائے گا۔

☆

۱۔ بحوالہ ''انہار'' شعبہ کشمیری۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر، ص ۵۲

منظور احمد دایک☆

جموں وکشمیر

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

مثنوی ''ظفر نامہ'' بہ نسبت مہاراجہ رنجیت سنگھ

از رائے بہادر کنہیا لال ہندی

''ظفر نامہ رنجیت سنگھ'' معروف بہ ''رنجیت نامہ'' ایک جنگ نامہ کی صورت میں پنجاب کے ایک نامور فارسی گو شاعر رائے بہادر کنہیا لال نے مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے دَورِ اقتدار میں رنجیت سنگھ کی فتوحات اور طرزِ حکومت پر مبنی ایک مسلسل مثنوی بشمولِ تاریخی حوالہ جات کے تحریر کی ہے۔ اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ خود اَن پڑھ تھا، وہ عالموں، شاعروں اور فنکاروں کا انتہائی قدردان تھا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں دفتری و درباری زبان فارسی تھی بلکہ انگریز حکومت کے ساتھ اس کی خط وکتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ یہاں اِس اُمر کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرزمینِ پنجاب نے فارسی کے بعض سرکردہ تاریخ گویاں پیدا کئے جن میں خاص طور سے یہ نام قابلِ ذکر ہیں: ''چہار چمن'' چندر بھان برہمن، ''خلاصۃ التواریخ'' سجان رائے بٹالوی، ''فتوحاتِ عالمگیری'' ایشر

☆ معرفت، کشمیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، برین سرینگر-۱۹۱۱۲۱

داس ناگر، ''منتخب التواریخ'' جگ جیون داس، ''تاریخ مبارک شاہی'' یحییٰ بن احمد سرہندی، ''تاریخِ لاہور و سیالکوٹ'' محمد مقیم، ''جاندار نامہ'' نورالدین فاروقی، ''فتوحات نامہ'' غلام محی الدین، ''عمدۃ التواریخ'' موہن لال لاہوری، ''تاریخ سکھاں'' خوش بخت رائے، ''خلاصۃ التواریخ'' سجان رائے بھنڈاری، ''تاریخ پنجاب'' غلام محی الدین بوٹے شاہ، ''خالصہ نامہ'' بخت مل، ''عبرت نامہ'' علی الدین، ''ظفر نامہ'' دیوان امر ناتھ، ''ظفر نامۂ رنجیت سنگھ'' تاریخِ پنجاب، کنہیا ہندی، ''ظفر نامہ'' گرو گوبند سنگھ جی، ''چار باغ پنجاب'' گنیش داس وڈیرہ، ''رسالہ نانک شاہ'' بدھ شاہ آروڑہ، ''منتخب اللباب'' خفی خان، ''وقائع سکھاں'' ایودھیا پرشاد، ''شاہنامہ رنجیت سنگھ'' احمد یار، ''جنگ نامہ'' قاضی نور محمد، ''اوراقِ پریشاں تاریخ پنجاب'' گنڈا سنگھ، ''ظفر نامہ اکبری'' امر ناتھ اکبری، ''تاریخ پُرسرور'' محمد مقیم سیالکوٹی، ''بادشاہ نامہ'' عبدالمجید لاہوری، ''بدائع ووقائع'' آنند رام مخلص۔ ان کے علاوہ تاریخِ کشمیر سے متعلق کئی ایک فارسی کتب پنجاب میں شائع ہوئی ہیں جن میں ''تاریخِ کبیر'' از محی الدین مسکین بھی قابلِ ذکر ہے۔

درج بالا کتب کی اِنفرادی اہمیت تو ہے لیکن ہمارے لئے یہ اس وجہ سے بھی اہم ہیں یہ ان میں سے بعض تواریخ کتب میں کشمیر سے متعلق بعض مفید حوالے ہیں جن سے ہماری بہت سی تواریخی گتھیوں کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔ ان میں سے ''ظفر نامہ'' یا ''رنجیت نامہ'' کو خاص طور سے اہمیت ہے گو کہ ہمارے ہاں اس ماخذ سے نامعلوم وجوہات کی بناء پر بہت کم استفادہ کیا گیا ہے۔ رائے بہادر کنہیا لال کی مذکورہ مثنوی کو فارسی اَدب اور تاریخ میں ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ کنہیا لال ایک زبان داں، وسیع القلب اور وسیع مشرب فارسی

شاعر تھا اور اپنی زندگی ہی میں درباری اور عوامی مقبولیت حاصل کی۔ اُسے فنِ تاریخ گوئی کے علاوہ فلسفۂ مذاہب بشمول تاریخ وفلسفۂ اسلام سے گہری دلچسپی تھی۔ رائے بہادر کنہیالال نے ''ظفرنامہ'' میں علاوہ ازتاریخی موضوعات کے حمدِ باری تعالیٰ، مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات، نعت شریف اور مدح گورونانک بھی تحریر کی ہے۔ ظفرنامہ کے سرورق پر ''ذکر الاخیار عبادة اللعباد'' تحریر کیا ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے مثنوی یوں شروع کی ہے۔

خدایا ظہور خدای زیست	بہر کار مشکل کشای زیست
ز نام تو روشن نگینِ جہاں	ز نقشِ تو منقوش نقشِ زماں
ز بود تو موجود شُد بود بود	عیاں از و جودت وجود وجود
ز فیض تو یک قطرہ بحر پُر آب	ز علم تو یک نکتہ اُم الکتاب[1]
تو از قطرہ آب گوہر کُنی	تو از ذرّہ خاک اختر کُنی
تو دولت بدریوزہ گر میدہی	بفرق گدا تاج زری نہی
زمین زیرِ فرمان تو سرنگون	بُلند آسمان پیش حکمت زبون
توئی رافع رفعت آسمان	توئی واسع وسعتِ دو جہان
توئی عالم علم عین الیقین	توئی واقف راز دُنیا و دین
توئی ابتدائی ہمہ ابتدا	توئی انتہائی ہمہ انتہا
ز وحدت بکثرت عیاں آمدی	بہ شکل جہاں دو جہان آمدی
ہماں بہ کہ از راہِ عجز و نیاز	کند دست خواہش بہ پیشت دراز

بدین عجز شرحش عیاں چوں کند
بدیں بے زبانی بیان چوں کند

---

[1] ام الکتاب نام لوح محفوظ است

اس کے بعد مناجات بجناب خداوند جہاں آفریں باظہار عجز و نیاز از صاحبِ مصنف۔

الٰہی خدا وند عالم توی	بہر حال واقف ز حالم توی
مرا آفریدی تو از مشتِ خاک	بخاکم تو بخشندہ جان پاک

بتاج شرف کردہ سر بلند
بہ علم و ادب ساختی بہرہ مند
بفرقم نہاری ز عزت کلاہ
زماندی بہ اوجِ شرف مثل ماہ

توی مالک و خالق ای کردگار	منم بندہ است ہندتی خاکسار
بجز ذاتِ پاک ندارم پناہ	کرم کُن خدایا بریں عذر خواہ

ظفرنامہ میں رائے بہادر کنہیالال ہندی نے عاشق رسول محترمؐ اور خادم کی حیثیت سے نعت شریف ''درنعتِ خاتم المرسلین، رسولِ ربّ العالمین، محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے یوں رقم کی ہے۔

چو کردم ثنائے کنہیا رقم	ز لطفش بہ مقصد فائز شُدم
بآئین مرد داں اہل سخن	بہ سم ہمہ شاعراں و فن
بہ نعتِ محمد کشادم زبان	ثناخواں شُدم چوں زباں آوراں
محمد شہنشاہ ملک کمال	محمد شہ کشور جاہ و مال
محمد رسول خدا وند گار	بدنیا دین صاحب اختیار
محمد گل باغ پیغمبری	مہ سروِ بُتاں دیں پروری
محمد مددگارِ ارباب غم	محمد فرح بخش اہل الم

محمد براہ خدا رہنما　　محمد بمرداں حق پیشوا
محمد شفاعت کُن عاصیاں　　محمد ہدایت کُن گمرہاں
محمد بعلم لدنی علیم　　بحکمت حکیم و بعظمت عظیم
محمد شہنشاہ پیغمبراں　　محمد مددگار دین پروراں
بہ پیغمبراں سرورِ انبیاء　　شاہاں شہنشاہ اہل نوا
زِ بحر نبوت شدہ آشکار　　چنین بے بہا گوہر آبدار
فروزندہ نورِ شریعت از دست　　ظہورطریق طریقست از دست
بحلق خدا دائما مہربان　　بدیں خلق بروئے خدا مہربان
بداں صاحبِ عزت ومنزلت
خدا داد گنجینۂ معرفت

اس طویل نعتِ شریف کے آخر میں کچھ یوں استدعا ہے ۔

باَوصاف او کاغذ مدح خوان　　چو انجم زر فشاں بروی جہاں
چو اُوصاف آن قصہ اے حمید　　خدا گشت خود درکلام مجید
کجا طاقت ہندتی کم زبان　　کہ از وصف اوشمہ ساز و بیان

''ظفرنامہ'' کے مطابق مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کشمیر سے بے انتہا دلچسپی تھی، اُس نے لاہور دربار میں راجہ دیناناتھ کشمیری کو ۱۸۱۵ء میں مالیات کے محکمے کا سربراہ بنایا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۲ء میں وزیر فتح محمد خان کی فوجوں سے مل کر کشمیر پر فوج کشی کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور پھر اسی اِرادے سے ۱۸۱۹ء میں پھر ایک بار فوج کشی کی۔ اس بار پٹھانوں کی فوج ہار گئی اور ۴ جولائی ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کی فوجوں نے سرینگر پر قبضہ کرلیا۔ یوں کشمیر سکھ حکومت یا

سکھ شاہی قائم ہوگئی۔ ان کے فوجی کمانڈر دیوان محکم چند کو ظفر جنگ بہادر اور فتح جنگ کا خطاب ملا۔ رائے بہادر کنہیالال ہندی نے اس تمام صورتِ حال کو ظفرنامہ میں یوں بیان کیا ہے:

''شکر کشیدن مہاراجہ رنجیت سنگھ بہ کشمیر بامداد فتح خان وزیر کابل و گرفتن جواہر کوہ از شاہ شجاع وقلعہ اٹک از عطا محمد خان و جنگ کردن بافواج کابل بر قلعہ اٹک مظفر یافتن ۔

خدا وند عالم خدای کریم　　رحیم و قدیم و حلیم و علیم
دہد چارہ در بیچارگان　　کند رحم بر حال آوارگان
باہل خطا مہرباں اوست　　نوازندہ عاجزان ذات اوست

اور آگے چل کر کشمیر کے تواریخی حوالہ جات یوں بیان کرتا ہے ۔

کہ رفت است کشمیر از دست او　　بہ بد عہدی ناظم جنگجو
چہ کشمیر گلزار خلدِ بریں　　چہ کشمیر جنت بروی زمین
رخ خود براہ بغاوت نہاد　　تہی جسم و جاں کرد از اتحاد
نہ تحریر ناظم بہ کشمیر رفت　　بہ مسند گہہ نمرود توقیر رفت
شُد آزاد از بند رنج و بلا　　بمند گرائمنی یافت صبا
الٰہی توی شاہ بندہ نواز　　خبر گیر احوال اہل نیاز
بچشم کرم سوی ہندی بہ بین　　دلش کُن منور بنورِ یقین

اس کے بعد کنہیالال یوں رقمطراز ہے:

''یورش کردن مہاراجہ رنجیت سنگھ بہ ملک کشمیر ومراجعت کردن بی نیل مقصود وفساد کردن زمینداران علاقہ مکھڈ وسزا یافتن ایشان''

چو میداشت آن شاہ اہل کمال   ز کشمیر در خاطر خود خیال
کند کرم با فخرِ آب دار   دراں زمہریر آتش کار زار
کند عصہ ظاہر بہ کشمیریان   بروں آر و از سینہ رنج بناں
کند جنگ با او چو تیران جنگ   کشاید بر پنجہ زور جنگ
جو محکم درین کار تدبیر کرد   ارادہ بہ تسخیر کشمیر کرد
رہولی ہنر مند مردِ فہیم   فرستاد سوئے محمد عظیم
ہمی خواست آنشاہ گیتی پناہ   کر دشمن ز گمراہی آید براہ
کند رحم بر حالت زار خویش   نگردد ز زخم جگر سینہ ریش

شاعر موصوف اپنی اس طویل مثنوی میں رنجیت سنگھ کی فوج کشی اور کشمیریوں کی زبوں حالی بیاں کرتے ہوئے اپنے لئے نجات کا طالب ہوتا ہے۔

الٰہی توی قادرِ ذوالجلال   فرح بخش ولہائے اہلِ ملال
ہندی مسکین چناں کن کرم   کر گردد نہ پابند رنجم و الم

مثنوی میں ایک جگہ کنہیالال "لشکر کشیدن مہاراجہ رنجیت سنگھ بسمتِ ملک کشمیر و بدست آوردن آن ہردو خط" کے عنوان سے کشمیر کی سیاسی، فوجی اور اقتصادی صورت حال آشکارا کرتا ہے۔

چہ ذات است ذات کمال الصفات   کہ داد دہانش تعلق بذات
بری ذاتش از طاعتِ بندگان   غنی حکمش از ملکِ ہردو جہاں
چو دو خاطرش ملکِ کشمیر بود   ہمیشہ درین عزم و تدبیر بود
کز جبار خان ناظم اہلِ زور   کہ میداشت در ملک کشمیر بود
من آن بندہ ام بندۂ خاکسار   کہ بودم بہ کشمیر اہلِ وقار

رئیسانِ کشمیر ہر چار سو   کہ ہستند در پردۂ جنگجو
رئیسانِ اقلیم کشمیر را   ہمہ بہردم اہل توقیر را
جو فائز شدہ آن نامۂ دلپذیر   بحکام کشمیر جنت نظیر

الٰہی توئی شاہِ ملکِ کرم
رہای غم از خاطرِ اہل غم
کن از لطف خود دورائے کردگار
غم از خاطر ہندیؑ خاکسار

رائے بہادر کنہیالال ہندی کی مثنوی ظفر نامہ دراصل کشمیر اور متعلقہ علاقہ جات کی ایک مکمل سیاسی تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ بعض ایسے حالات و واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جس کا ذکر ہم عصر تواریخوں میں نہیں ملتا۔ اسکے علاوہ یہ کشمیر میں فارسی ادب میں اسلامی اثرات پر ایک مکمل دستاویز ہے۔ یہ مثنوی ۴۰۶ صفحات پر بقلم عبدالرحمان لاہوری ۱۸۷۶ء کتابت شدہ ہے۔

★

مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اِس بات کا امتیاز حاصل ہے کہ اس کے عہد میں ریاست جموں و کشمیر میں ٹیلی گراف کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ قبل ازیں مہاراجہ نے ریاست کے تمام گاؤں، شہروں اور دیگر اہم مقامات پر ڈاک خانے قائم کرائے اور اِس نظام کو بہتر طور چلانے کے لئے انگریز سرکار کی خدمات بھی حاصل کیں۔ چنانچہ ڈاک کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا گیا جیسے ضروری ڈاک، عام ڈاک، فوری ڈاک اور مختلف زمروں کی ڈاک کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے

بعون صناع بیچون مکان و بفضل خلاق

سری ہست کاشی گرنباری پرمہنس عاشق حقانی نے بنائی اور اسمین لاونی

جدید بھی جو کبھی طبع نہین ہوئی تھی شامل کی ہے

مثنوی در صفت کلشمیر

موسوم بہ

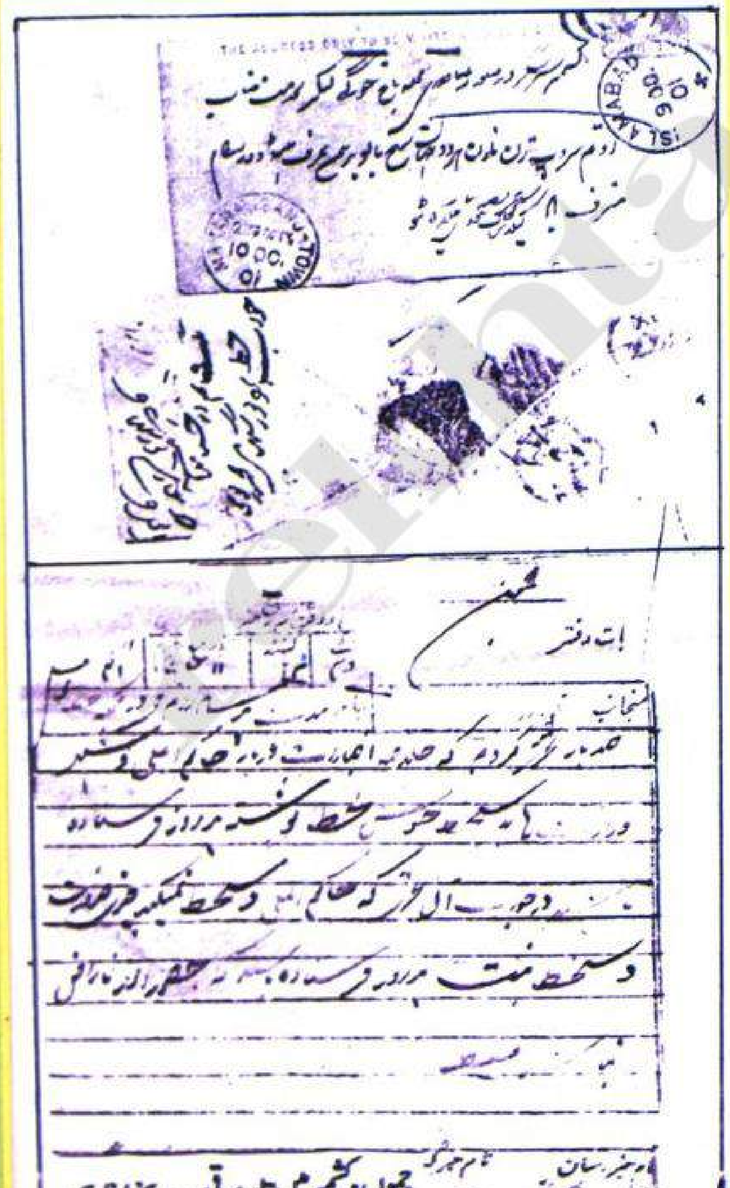
جنت بے نظیر سنہ ۱۳۰۲ھ

لاونی جدید معرفت و توحید سنہ ۱۳۰۴ھ

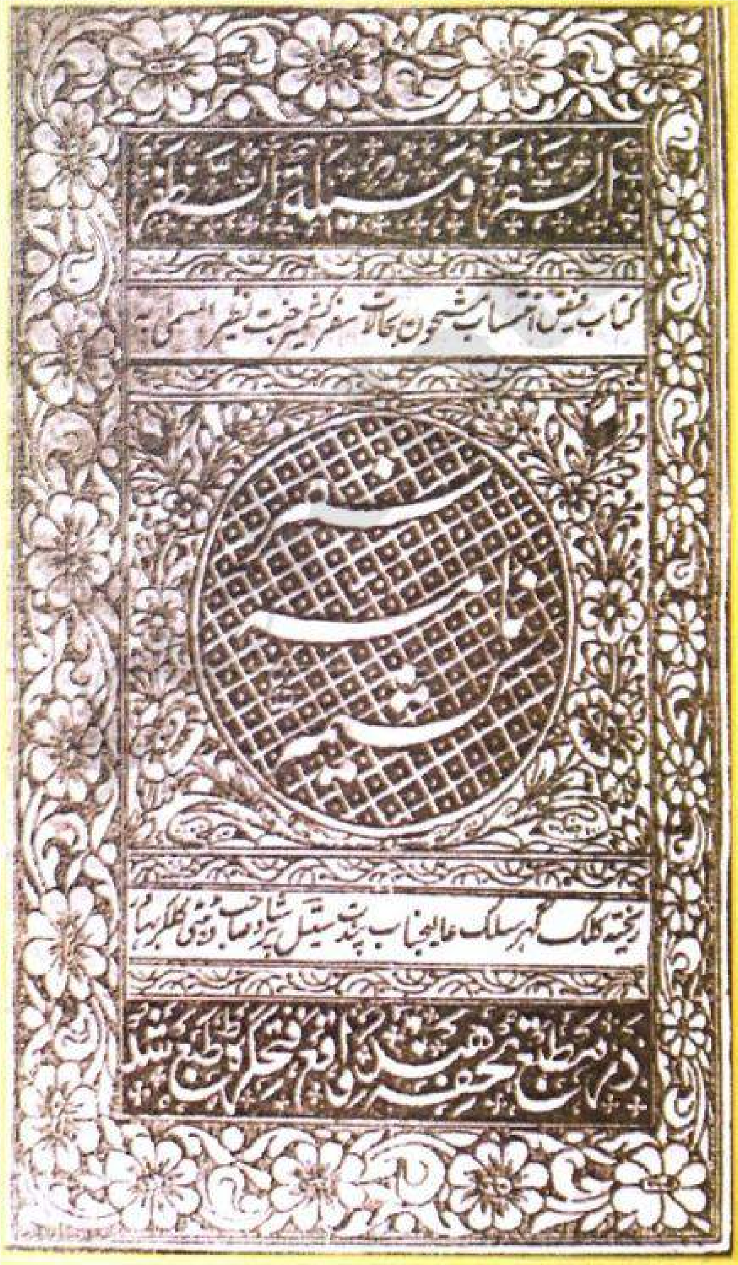
اس کا حق تصنیف کتاب محفوظ ہے سوائے مصنف کے کوئی شخص اسکے چھاپنے کا مجاز نہین اور اسکی رجسٹری بھی ہو گئی جس کتاب پر مہر نہ ہو وہ مال مسروقہ ہے

در مطبع گلزار محمدی باہتمام محمد نور طبع شد

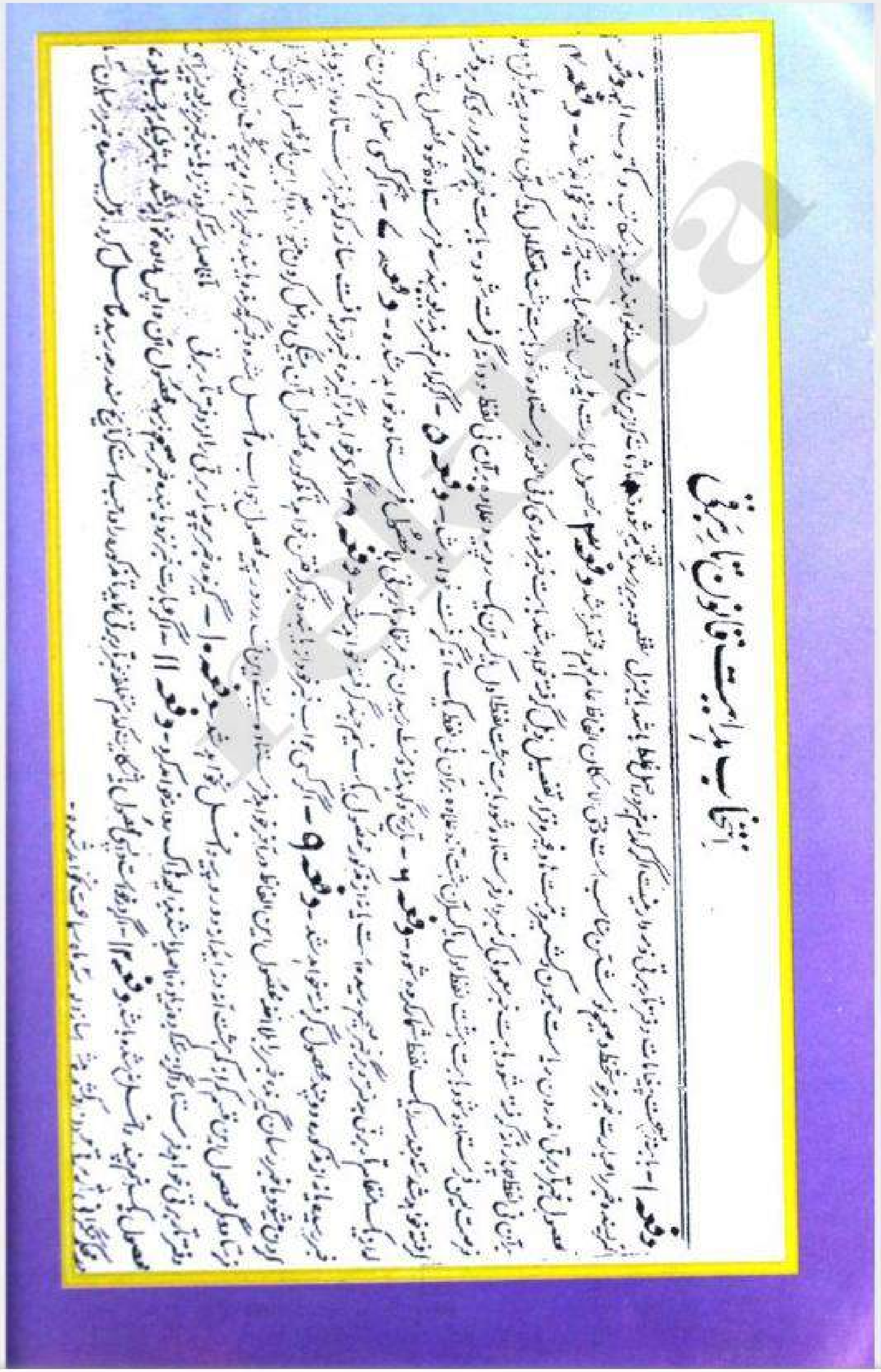


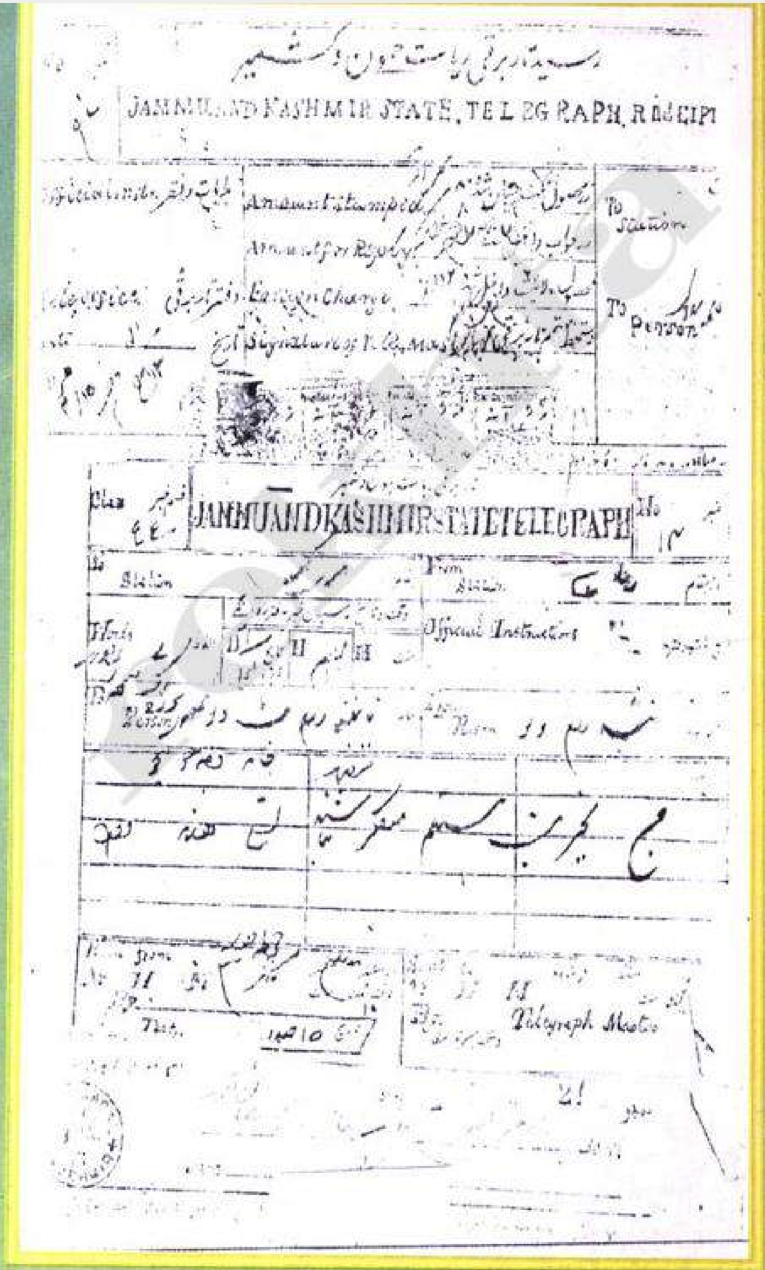


جموں وکشمیر میں تار برقی ...... بخط فارسی



سفرنامۂ کشمیر از پنڈت شیتل پرشاد صاحب ۱۸۸۵ء





تار برقی کی رسید

مصروفِ عمل نظر آتے تھے۔اس غرض کے لئے ۱۸۶۰ء میں مہاراجہ نے پہلی ڈاک ٹکٹ جاری کی اور بعد ازاں پوسٹ کارڈ بھی منظرِ عام پر آیا۔ ان ٹکٹوں پر فارسی اور ڈوگری میں قیمت لکھی ہوئی تھی۔ اگرچہ ڈاک خانے ۱۸۶۰ء میں قائم کئے جا چکے تھے تاہم برٹش انڈیا کی ایماء پر ۱۸۷۸ء محکمہ ٹیلی گراف قائم کیا گیا اور اس مقصد کے لئے مرّوجہ برٹش انڈیا کی انگریزی طرزِ تحریر کے لئے ایک ماہرِ زبان فارسی و اُردو پنڈت کیشو رام رینہ نے کوڈ تیار کیا۔ ٹیلی گراف نظام کو قائم کرنے کے لئے ڈوگرہ مہاراجہ اور برٹش انڈیا سرکار کے درمیان جو معاہدے ہوئے ان کے متن یوں ہیں:۔

No: CLXVIII

Agreement entered into between the British Govt. and the Cashmere State in regard to the construction of telegraph lines from Jammu to Srinagar and from Srinagar to Gilgit

..........1878..........

Signed by P.D HEDERSON
Major Officer on special duty to Cashmere.
NILUMBER MOORERJEE
Judge of the Cashmere

The 9th Mrach 1878

..........☆..........

No: CLXXI

Agreement between the British Govt. and tha state Couna???l of Jammu and Kashmir for the construction of main terarce and the line of Telegraph between the Suchhetgrah and

پلا مجھ کو وحدت کی ساقی شراب — کہ جس سے یہ دل ہو مرا آفتاب
رہوں سرخرو جس کے آگے مدام — لبالب تو پھر وہی مرا آ کے جام
وہ پیتے ہی ہو دل میں جوشِ جنوں — کر آئینِ نظر رنگ بس گونا گوں
غمِ دین و دنیا فراموش ہو — جو دیکھے مجھے مست مدہوش ہو
ہو جب پھول سے دل میرا لالہ گوں — تو یہ شعر اپنا رقم میں کروں
بنایا خدا نے عجب کاشمیر — بہشت بریں ہے نہ جس کی نظیر

﴿رواں﴾

مثنوی نگار تعریف کشمیر میں یوں جھوم رہے ہیں:

میں نشے میں جس کے چھکتا رہوں — برنگ گلستاں مہکتا رہوں
بناؤں گلوں کو پھر لالہ زار — میں کشمیر کے بوستاں کی بہار
جب ہر فصل گرمی کی واں ابتدا — عیاں ابرِ باراں ہو بے انتہا
گھر آئے فلک پر گھٹا چار سو — برسنے لگی مینہ اسی ماہ رو
زمیں پر بچھے پھول آئیں نظر — پڑی بلبلوں کی نظر بس جدھر

''داستانِ حسنِ کشمیر'' ﴿رواں﴾

پلا ساقیا بھر کے وہ جام نور — کہ قدرت کا آوے نظر بس ظہور
گیا جیسے میں جانبِ کشمیر — لگا دل پہ میرے اک الفت کا تیر
وہ میلے سے کپڑوں میں ادھ جلا ساتن — گویا ابر میں ماہ چرخ کہن
پھٹے پیرہن ہیں میں کیا دوں مثال — چھپا جس طرح ہووے گدڑی میں لعل

﴿کشمیر کے میووں کی تعریف میں﴾

پلا ساقیا ے اُس طور کی — کہ دکھلائی دے شکل اوس نور کی

زمانے میں جس کا ہے ہر جا ظہور اوسی کی تجلی سے روشن سی طور
رہوں جس سے مسرور اور شد کام نیا آئے مضمون دل میں مدام
سنو تم وہاں کے درختوں کا حال کہ ؟ ہو ہر نخل دل اور نہال

مثنوی نگار نے مثنوی ہذا میں سرزمین کاشمیر کے مختلف مناظر قدرت، باغات، ڈل جھیل، میوہ جات اور حسن و جمال کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کی پوشاک کی علیحدہ تعریف کی ہے اور ہر موضوع کی ابتداء روحانی مستی، جام معرفت کے علامتی اظہار کے طور "پلا ساقیا" کے الفاظ سے کی ہے۔

مثنوی کے آخر پر مثنوی نگار لکھتا ہے:

ہوئی ہے ختم یاں سے ہی سب داستاں شگفتہ ہے یہ کاشی کا گریباں
میرے دل کے اندر بسا کاشمیر وہاں ہیں امیروں سے بہتر فقیر
دُعا ہے یہی اب تو لیل و نہار رکھے اوسکو آباد پروردگار
سب احباب میرے رہیں شاد کام ملے آرزوئے ولی صبح و شام

مثنوی نگار نے کہیں بھی اپنے نام کو ظاہر نہیں کیا ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ نام کو ظاہر نہیں کیا ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ نام و نمود کا خواہش مند نہیں تھا۔

البتہ مثنوی میں ایک جگہ حاکم وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نسبت حوالہ ہے ۔

پلا ساقیا بادۂ ہوشمند کہ بامِ فلک پر میں پھینکوں کمند
ذرا جلد دے بھر کے تو جام بیر کہ یاد آئے روداد خم غدیر
تنزلزل ہوا کم دلوں کا یہاں لکھواں کا زمانہ کجا داستاں
کہ رنجیت سنگھ ہاں جو شاہِ جہاں زمانے میں مشہور تھا شیرواں

﴿رواں﴾

اِس تاریخی مثنوی کے پردۂ اخفا میں رہنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید یہ مثنوی عام محققین کی دسترس میں نہیں تھی۔

''سفرنامۂ کشمیر'' از پنڈت شیتل پرشاد کچلو شیو پوری عجائباتِ فرنگ از یوسف خان کمبل پوش اُردو کا پہلا باضابطہ سفرنامہ خیال کیا جاتا ہے جو ۱۸۴۷ء میں پہلی بار پنڈت دھرم نارائن کے زیرِ اہتمام دہلی کالج کے مطبع العلوم سے ''تاریخِ یوسفی'' کے نام سے شائع ہوا۔ ۲۹۷ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ اس کے مصنف کے نام کی مناسبت سے ''تاریخِ یوسفی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بہر حال اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پنڈت شیتل پرشاد کچلو شیو پوری کا سفرنامہ دراصل مصنف نے اپنے وطنِ مالوف سرزمینِ کشمیر کے متعلق لکھا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۸۹۵ء کو سفرنامۂ کشمیر کے نام سے درمطبع تحفۂ ہند واقع فتح گڈھ (یو پی) سے شائع ہوا ہے۔ اِس کے ساتھ کشمیر سے متعلق اور بھی کئی اُردو سفرنامے منظرِ عام پر آئے مثلاً سوامی سنت رام تیرتھ ۱۸۹۹ء کا سفرنامہ جو ''سیرِ کشمیر'' کے نام سے رام تیرتھ کیندر سہارنپور سے شائع ہوا۔ ''خطۂ بے نظیر کشمیر'' از سرداری لال سنگھ صاحب میر منشی محکمہ کشمیر ریذیڈنسی مطبع ہندوستان سٹیم پریس لاہور میں ایک ناول کی صورت میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا اور پنڈت ینا ناتھ وار یکو شاہد کا ''رہنمائے یاترا شری اُمرناتھ جی'' پنڈت پچھی نارائن کول نے مشہورِ عالم پریس لاہور سے شائع کرائے۔

کسی ایسے شخص کا لکھا ہُوا سفرنامہ جو دراصل اِسی سرزمین کا فرزند ہے، جذباتی اور نفسیاتی طور از خود متاثر کُن ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے اِس میں مصنف کے علاوہ اُس کے بعض صاحب نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار

کیا ہے مثلاً سیّد محمد طاہر علی اہلمد عدالتِ منصف سفرنامہ ہذا......

سفرنامہ کشمیر کا کیوں نہ چھپتا — کہ مشتاق تھے لوگ ویزات اسکے
کہو عیسوی سالِ تاریخ ظاہر — عجائب ہیں حالات اِس کے

۱۸۹۵ء

منشی حیات بخش تخلص رسؔا اہلمد فوجداری عدالت منصّف سفرنامۂ ہذا:

میرے آقا کو ہُوا شوقِ سفر — جائیں کشمیر ارادہ تھا یہی
شکر اُوس خالقِ کونین کا ہے — جس نے جانیکی وَھان ہمت دی
اے رسؔا کردے پھر تاریخ رقم
"باغِ کشمیر نرالا ہے یہی"

۱۸۹۵عیسوی

اِس سفرنامہ کی زبان قدیم اُردو یعنی فارسی وعربی آمیز ہے۔ کہیں کہیں اُردو لپی میں سنسکرت بھی اِستعمال ہُوتی ہے اور کئی پڑھنے والوں کو اِس کے موضوعات پر اِختلاف بھی ہوسکتا ہے جیسے کشمیر میں زبردستی تبدیلیٔ مذہب وغیرہ۔ پنڈت شیتل پرشاد کچلو شیوپوری کا اصلی وطن یا اُن کے بزرگوں کی جائے پیدائش شیوپور متصل شادی پور رہا ہے اور بوقتِ سفر کشمیر ۱۸۹۵ء بطور ڈپٹی کلکٹر جنَ پوری (اُتر پردیش) تھے مگر بقولِ خود اُن کے، دل میں جذبۂ حبُّ الوطنی کا جوش، دیدِ سرزمینِ کشمیر مدّت سے موجود تھا۔ انہوں نے یہ سفر بوجہ اعلیٰ عہدہ داری کے اس وقت کے سرکار عالیہ سے رخصت ملنے پر شروع کیا اس طور یہ سفر انہوں نے دوسری جون ۱۸۹۵ء کو شکوہ آباد سے جانب کشمیر بذریعہ ریلوے شروع کیا۔ اِس سفر میں اُنکی مددان کے برادر پنڈت کاکھا پرشاد کچلو رئیسِ دہلی و پنڈت نرائن بی

گرٹوکان پورنے کی۔ اِس سفرنامے میں مصنّف نے دَورانِ سفر کِن کِن اَشخاص سے ملاقات کی اور کہاں کہاں پھرے اِس کا تفصیلی ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ دہلی سے وہ بذریعۂ ٹرین لاہور گئے جہاں اُن کی ملاقات کئی معزز کشمیری پنڈتوں سے ہوئی۔ وہیں پر اُنہوں نے ۹ جون ۱۸۹۵ء کو کشمیری پنڈتان کمیٹی کے اِجلاس میں شرکت بھی کی، بعدازاں راولپنڈی سے بارہ مولہ آتے ہیں۔ کشمیر پہنچنے پر اُنہوں نے یہاں کے مختلف مذہبی مقامات وقدرتی مناظر کی سیر کی اور خاص طور کشمیر کے پنڈتوں کے حالات کو قریب سے دیکھا۔ علاوہ اِس کے کشمیر میں رواں مہاراجہ حکومت کے نظام کا بغور مشاہدہ کیا۔ لکھتے ہیں:

جس قدر میں نے کشمیر کی نواح کی سیر کی کشمیر جنتِ نظیر، عجائبات روزگار ومخزن ظہورِ قدرت رہا ہے۔ آب وہوا خوشگوار، چشمہ شیرین، قدرتی پہاڑوں کے مثل آب حیات نظارہ، سبزار ودرختان کوہستان و گلہائے گوناگوں عجیب قسم کے جابجا موجود ہے، جس کے دیکھنے سے اِنسان کو سرور وفرحت تازہ وقوتِ رُوحانی حاصل ہوتی ہے۔ درختانِ چنار و صنوبر جس کو سفیدہ کہتے ہیں بادام وخوبانی وشہتوت سفید وسیاہ اِسی جگہ دیکھے گئے جو کسی جگہ ہندوستان ودیگر ممالک میں نہیں ہیں"۔

اور لکھتے ہیں:

"فقیر وسنیاسی، مہاتما عابد لوگ یہاں مخفی طور سے کوہستان میں اَب بھی ضرور رہتے ہیں اور ریاضت کرتے ہیں"۔

کچلو نے اَپنے سفرنامہ میں بحوالہ مُردم شماری ۱۸۹۱ء ضروری فہرست ذات ہائے وگوت کشمیری پنڈتان کے ذکر پر بھی ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے، جس میں ذکر گو؟؟؟ یعنی عزت افزائی یا تخلیق بن ماس یا ملماس، فرقہ جکوال خواہ

عرف Alies وغیرہ بھی۔ علاوہ اِس کے کشمیر کے شیعہ سُنّی مذہبی روایات اور کشمیری زبان میں مرثیہ خوانی وغیرہ اور اِن دُو فرقوں کے درمیان اختلاف کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور اِس کے ساتھ ساتھ کشمیر کی مختلف زیارت گاہوں حضرت غوث الاعظم دستگیر خانیار، حضرت مخدوم صاحب، حضرت میشا واقع رینواری یعنی رعنا واری سری نگر، زیارت حضرت بل وغیرہ۔ اور بقولِ کچلو کے ۱۳۴۰ء تک کشمیر میں کوئی مُسلمان نہ تھا، ۱۳۴۱ء میں بلبل شاہ یعنی حضرت عبدالرحمان باشندۂ ترکستان براستہ لداخ واردِ کشمیر ہو کر تبلیغ اِسلام ہوئی اور اُن کے مطابق کشمیر کے اصلی مسلمان کا حسب ونسب یہ ہے:

کانتہ، گندرو، بچہ، باندی، گنی، گانی، ڈار، بکسی وال، وکیل، اساسی، شال گزو، اشلو، دیوانی۔

کشمیر کے مُسلمان شال بافوں کی غربت و افلاس کی زندگی کے علاوہ سفرنامے میں بحوالۂ مردم شماری ۱۸۹۱ء تفصیلات یوں ہیں:

قلمرو جموں:	۱۴۳۹۵۴۳	ہندو	مرد:	۳۷۴۳۹۹
قلمرو سرینگر:	۹۴۹۰۴۱		عورت:	۳۱۷۴۰۱
				۶۹۱۸۰۰
لداخ:	۲۸۳۷۴			
گلگت:	۱۶۷۶۹	مسلمان	مرد:	۱۰۰۵۵۶۸
اسکردون:	۱۱۰۳۲۰		عورت:	۸۴۶۵۸۴
	۲۵۴۳۹۵۲			۱۸۵۲۱۵۲

اِس سفرنامے میں نظامِ حکومت دَر کشمیر بہ سربراہی کرنل پرتاب سنگھ

صاحب جموں وکشمیر کے وزیر وزارت سرینگر کے پنڈت سُورج رام، انت ناگ کے دیوان پنڈت ارجن ناتھ مدن کامراج کے پنڈت شیو کاک در، مظفر آباد کے رائے شب رام، گلگت کے لالہ بشن داس بہادر، جموں کے لالہ امر یک رائے صاحب بہادر، بھمبر کے پنڈت گنگا رام بہادر اودھم پور کے وزیر جگت رام، کہوٹا کے محمد غلام جیلانی شاہ اور لداخ کے پنڈت پرکاش رام جی زتشی کی مختصر تفصیلات بھی ہیں۔

سفرنامہ میں کشمیری مُسلمانوں کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈتوں کی مذہبی روایات طور طریقہ وغیرہ بھی تفصیلی طور بیان کی گئی ہیں مگر باوجود اِس کے مُصنّف سفرنامہ نے جذباتیت کے ساتھ ساتھ کئی جگہ تنگ نظری سے کام لیا ہے۔ البتہ کشمیر پر اُردو میں لکھانے والا پہلا سفرنامہ ہے اور آخر پر پنڈت شیتل پرشاد کچلو شیو پوری ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ درجہ اوّل میں پوری اُتر پردیش اعلانِ عام میں یوں لکھتے ہیں:

''بموجب قانون بستم ۱۸۴۷ متعلق رجسٹری مؤلف نے اِس سفرنامۂ کشمیر کے حقوقِ تالیف اُپنے قبضہ میں رکھے ہیں لہٰذا کوئی صاحب بلا اجازتِ مؤلف کے اِس کی طبع کرانے کا قصد نہ فرماویں''۔

☆

”جموں-کشمیر-لداخ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کی رَوشنی میں I “

ایک جائزہ

(یہ مقالہ ”شیرازہ“ کی خصوصی اشاعت کی تقریب رونمائی
پر ڈاکٹر اَیاز رسول نازکی صاحب نے پڑھا تھا)

سرزمینِ کشمیر جہاں فطرت نے اپنی پوری فیاضی اور دَریادِلی سے حُسن و جمال کے تمام خزانے لٹادیئے، اِس لحاظ سے بھی خوش قسمت رہی ہے کہ یہ ہر دَور میں قدردانوں، مداحوں اور عاشقوں کی توجّہ کا مرکز بنی رہی۔ کشمیر اپنے چاہنے والوں کی آنکھ کا تارا بھی ہے اور چشمِ حسود کی آنکھ کا خار بھی۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ کشمیر کو کسی طرح بھی اور کسی دَور میں بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکا۔ اس کے تذکرے اس کے آس پاس ہی نہیں ہزاروں میل کی دُوریوں پر بَرپا ہونے والی محفلوں میں بھی ہوتے رہے، بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے دَرباروں میں بھی ہوتے رہے اور علم وادب، فکروآگہی کے پرستاروں اور شناساؤں کی مجلسوں میں بھی ہوتے رہے۔ فطرت کی دیوی کی انگوٹھی میں سجے اِس نگینے کی طرف ملک گیروں، فاتحوں اور جنگ جُوؤں کے روندتے قدم بھی بڑھے اور فطرت کے پرَستاروں، علم وآگہی اور اَسرار ورَموز کے مُتلاشیوں نے بھی اِس دھرتی کی

زیارت کو زندگی کا ماحصل سمجھا۔ کشمیر اِس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہی ایک خطّہ ایسا ہے کہ جس کی لگ بھگ ڈھائی ہزار سال کی تحریری تاریخ دستیاب ہے۔

کشمیر میں آنے والے ہر شخص نے اپنی ذہنی اِستعداد اور حسبِ مقدور اِس سرزمین کے لازوال حُسن و جمال، فطرت کے نظاروں، یہاں کی جھیلوں، آبشاروں سرسبز سیرگاہوں، پھلوں، پھُولوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی گہرافشانیوں کیں، توصیف و تعریف ہی نہیں تکذیب کے کلمات بھی فراخدلی سے اَدا کئے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ عام اِنسان بھی جب اِس سرزمین میں وارد ہوجاتا ہے تو کچھ دیر کے لئے ہی سہی شاعر ہوجاتا ہے اور شاعری کرنے لگتا ہے۔ یہ اِسی جگہ کے حُسن کا اعجاز ہے کہ دیکھنے اور پرکھنے والی آنکھ کو یہاں خدا کی ذاتِ والاصفات اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب (اقبالؔ)

”اور خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے“۔ کشمیر میں وارد ہونے والا ہر سوختہ جاں مرغِ کباب بال و پر نکالتا ہے اور نیلگوں آسمان کی وُسعتوں میں اُڑنے لگتا ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر دَر آید
گر مرغِ کباب اَست با بال و پر آید (عرفیؔ)

کشمیر میں سیاحوں کی آمد کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اِس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے مگر یہ بات واضح ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی برف پوش



''شیرازہ'' کی اشاعتِ خصوصی...... ''جموں، کشمیر، لداخ قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں'' - جلد I کی تقریب رونمائی۔



اسی تقریب سے لی گئی اور تصویر

چوٹیوں کے حصار میں پوشیدہ اِس وادی میں رہنے والے عوام کے باہری دنیا کے ساتھ بہت پہلے سے رَوابط تھے اور دشوار گذار راستوں کے باوجود کشمیر اور باہری دُنیا کے درمیان نہ صرف سیاحت کا ہی رِشتہ تھا بلکہ تجارتی تعلقات بھی اُستوار تھے۔ کشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت اُس کی اپنی ڈھائی ہزار سال پُرانی تحریری تاریخ کی مرہونِ منّت ہے مگر سماجی زندگی کے رَسوم و رواج کے موجودہ خدوخال، آثار قدیمہ کی موجودگی، دستاویزی شواہد، زبان، لوک اَدب اور دیگر فنون لطیفہ کی Antiquity ایسے دیگر شعبے ہیں جس کسی بھی قوم کی تواریخی شناخت کے خدوخال، تہذیبی وَجود کی قدوقامت طے کرتے ہیں۔ کشمیر کے معاملے میں یہ سارے ماخذ ہماری دسترس میں ہیں مگر زمانے کی سردمہری، سیاسی اَفراتفری اور بے یقینی اور خود کشمیری عوام کی لاتعلقی کے باعث اِن میں سے بیشتر شواہد سے پوری طرح پرَدہ کشائی نہیں کی جا سکی ہے اور اِس طرح کشمیر کے صحیح Contribution کا تعیّن بھی نہیں ہو پایا ہے۔

کشمیر کے معاملے میں ایک اہم ماخذ اُن سیاحوں کے سفرنامے ہیں جو کشمیر کی تاریخ کے مختلف اَدوار میں واردِ کشمیر ہوئے۔ اور جو سفرنامے حوادث زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہے اور ہم تک پہنچ پائے' اِن سفرناموں میں یہاں کی زندگی کے خدوخال اُبھرتے ہیں اور پڑھنے والے کے سامنے ایک مخصوص زمانے کے حوالے سے کشمیر سے شناسائی ہو جاتی ہے۔

شیرازہ' کا یہ خصوصی شمارہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ اِس موضوع پر دستیاب مختلف تذکرے، سفرنامے عام قاری کی دسترس سے دوَر ہیں۔ کئی ایک تو ایسے ہیں جو اَب نایاب ہیں۔ اکادمی نے ان

دستاویزات کے مطالعے پر مبنی مضامین کا یہ مجموعہ شائع کرا کے ایک قابلِ ستائش کارنامہ اَنجام دیا ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں کشمیر، جموں اور لداخ کی تاریخ، تہذیب، تمدّن، اَدب اور ثقافت سے جُڑی کئی نامور شخصیات ہیں اور اُن کی بدولت یہ مجموعہ اور زیادہ معتبر اور مستند ہو گیا ہے۔ مجموعے میں شیرازہ کے مدیر محمد اَشرف ٹاک صاحب کا تحریر کردہ حرفِ آغاز مجموعے کے بارے میں مفصّل اور مدلّل تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ حرف آغاز کے علاوہ شمارے میں کُل ۱۷ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

مضامین کو کم و بیش تاریخی تواتر کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے اور اِس طرح پیدا پہلا مقالہ محترم محمد یوسف ٹینگ صاحب کا "ہیون سانگ اور کشمیر" سرفہرست ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران ہیون سانگ پورے دو سال کشمیر میں قیام پذیر رہا۔ اُس نے اپنے رَگ بھگ ۱۶ سال پر پھیلے سفر کی جو داستان قلمبند کی اُس میں پندرہ صفحات پر کشمیر کی سیاحت کا حال بیان کیا اور بقولِ ٹینگ صاحب "یہ بیان بہت حد تک دیومالائی اور خرافاتی قصوں سے الگ ہے"۔ راجہ کنشک کی بودھ کونسل کا ترتیب دیا ہوا "تری پٹکا" ہے اور جب اس راز سے پردہ اُٹھے گا تو بقولِ ٹینگ صاحب کشمیر سے تہذیب کا نیا سورج طلوع ہوگا اور پورے عالم کو منور کرے گا۔ ٹینگ صاحب کا یہ مقالہ جہاں ہیون سانگ کے سفرِ کشمیر کے بارے میں بڑی دلچسپ توجیہات اور تاویلات سامنے لاتا ہے وہیں ٹینگ صاحب اس مقالے کے ذریعے اپنی اس اُمید کا اظہار کرتے ہیں کہ کشمیر میں بودھ مت کے حوالے سے جو کارنامے انجام دیئے گئے تھے اور جن کی شہادتیں ابھی ہماری دسترس میں نہیں، کبھی نہ کبھی ہاتھ آئیں گی اور کشمیر

اپنی تہذیبی اور تمدنی شناخت کی کئی گُم شدہ کڑیاں ملانے میں کامیاب ہوگا۔

دوسرا مقالہ ''کشمیر-اوکانگ کی نظر میں'' سیدرسول پونپر نے تحریر کیا ہے۔ اوکانگ دوسرا معتبر چینی سیاح ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں بارہمولہ کے راستے ہی واردِ کشمیر ہوا۔ مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اُوکانگ علمی تبحر، قوتِ مشاہدہ اور فکرونظر میں ہیون سانگ سے مقابلہ نہیں کرسکتا پھر بھی اُس نے اس خطۂ ارضی کے بارے میں قابلِ قدر اطلاعات فراہم کی ہیں۔ وہ لگ بھگ چار سال کشمیر میں رہا۔ اُس کے تذکرے میں اہم بودھ وہاروں او رزیارت گاہوں کی تفصیلات ہیں جن میں سے کئی ایک نام جیسے کہ کیرتی آشرم کڑ ہوم، مونگتی وہار یعنی وشکر بارہمولہ اور اُمرتا بھون یعنی وونتہ بھون آج بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔ ہیون سانگ نے ساتویں صدی کے دوران یہاں صرف ایک سو بودھ وہاروں کی موجودگی جتلائی تھی لیکن جب اوکانگ لگ بھگ ایک سو بیس برس بعد آٹھویں صدی میں ان کی تعداد تین سو سے زائد درج کرتا ہے تو صاحبِ مضمون یہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہے کہ درمیانی مدت میں بُدھ مت کی مقبولیت میں اضافہ ہوا، کیونکہ راجہ میگھواہن اور للتہ دتیہ مکتا پیڈا نے بُدھ مت کے پھیلاؤ کے لئے بہت کوشش کی۔

شمارے میں شامل تیسرا مضمون ''مارکوپولو- وسط ایشیا اور کشمیر کے عنوان سے ارجن دیو مجبور صاحب نے لکھا ہے، تیرہویں صدی عیسوی میں مارکوپولو کے وسطِ ایشیا کے سفر کے تذکرے میں وسط ایشیا کے بیشتر علاقوں کے عوام کے رہن سہن، رسوم ورواج، مذہب، شادی بیاہ، تجارت، صنعت وحرفت جیسے موضوعات کے بارے میں تفصیلات فراہم ہوتی ہیں۔ ''کشمیر'' یا کشمیر کے بارے میں درج

معلومات اگرچہ محدود ہیں اور بقول صاحب مضمون یہ بیانات مارکوپولو کے ذاتی مشاہدے پر مبنی نہیں ہیں بلکہ سُنی ہوئی باتوں پر مرتب کئے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ معلومات کافی دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''کشمیر کے لوگ بُت پرست ہیں اور اُن کی اپنی ایک مخصوص زبان ہے۔ وہ جادوگری سے موسم کو بدل سکتے ہیں اور گہرا اندھیرا پیدا کرسکتے ہیں...... کہ وہ لوگ کسی سے نہیں ڈرتے...... وہ آزاد ہیں اور ان کا اپنا راجہ اُن پر انصاف سے حکومت کرتا ہے۔ کشمیر کے ریشی بھرپور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ کھانے پینے میں وہ پرہیز برتتے ہیں اور قانوناً جس کام کو گناہ سمجھا گیا ہو اُس سے وہ انتہائی طور پر الگ رہتے ہیں''۔

جناب مرغوب بانہالی کے ''البیرونی اور کشمیر'' مقالے میں دسویں صدی عیسوی میں البیرونی کے کشمیر میں مشاہدات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ خطۂ کشمیر کی جغرافیائی حدبندیاں، دریائی اور آبی وسائل سے متعلق معلومات، سیاسی اور سماجی حالات کا تذکرہ، کشمیر کا شہر ''اُدشٹان''، موسموں کا احوال، اور ان سب سے بڑھ کر کشمیریوں کے علمی کمالات کا اعتراف، یہ سب موضوعات دسویں صدی عیسوی میں موجود کشمیری سماج کے خدوخال نمایاں کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا حیدر جو خود گیارہ سال تک کشمیر پر حکمران رہا، جہاں شاعر اور دانشور تھا وہیں وہ تاریخ نویسی میں بھی ممتاز ہوا۔ تاریخِ رشیدی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کشمیر کی جغرافیائی، ماحولیاتی، سیاسی، مذہبی اور مسلکی تاریخ کا بیان اس کے دوسرے حصے میں آیا ہے۔ غلام رسول جان صاحب کے مقالے میں تاریخِ رشیدی کے حوالے سے جو کہ سولہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ نصف میں لکھی

گئی تھی، کشمیر کے جغرافیائی کوائف، موسمیاتی حالات، شہرۂ آفاق میوؤں اور پھلوں سے متعلق مشاہدات کا تذکرہ موجود ہے۔ اِسی طرح کشمیر کے فنِ تعمیر سے متعلق مرزا حیدر کا تجزیہ، مندروں کی تعمیر کا بیان جن کو وہ بے مثال قرار دیتا ہے، کشمیر کے عجائبات میں شمار کرتا ہے۔ یہاں کے چشموں، تالابوں، جھیلوں اور محلات کا ذکر، برنگ کے مقام پر عجیب وغریب تالاب، ناگام کے مقام پر تھرتھر کانپنے والا بلند قامت درخت جیسے عجائبات تاریخِ رشیدی کی زینت بھی ہیں اور سولہویں صدی کے کشمیر کی ایک جھلک بھی۔

اگلے دو مضامین کشمیر اور مغلوں کے تعلق کی داستان بیان کرتے ہیں۔ کشمیر پر مغلوں کا تسلط اکبر کے دور میں قائم ہوا۔ ابوالفضلؔ اکبر کا خاص وزیر تھا اور دربار کے تمام حالات وواقعات سے جانکاری رکھتا تھا اور انہیں ضبطِ تحریر میں لاتا تھا۔ کشمیر کے تعلق سے ابوالفضلؔ اپنی دو تصنیفات میں تفصیلات تحریر کرتا ہے...... آئینِ اکبری اور اکبرنامہ۔ جناب مشعلؔ سلطان پوری نے بڑی باریک بینی سے اِن دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اگرچہ انہیں اِس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں انگریزی تراجم پر ہی گزارا کرنا پڑا۔ کشمیر کے بارے میں ابوالفضلؔ کے مشاہدات پر مغلیہ سرکار کی سیاسی مصلحتوں اور سرکاری پالیسیوں کی چھاپ ہونا واقعی ممکن بھی ہے کیوں کہ ابوالفضلؔ آج کے دور کی .... کے تحت کام کرنے والا کسی Free Press کا نمائندہ نہیں تھا۔ وہ اکبر کا نمک خوار تھا اور اُس کا اکبر کی اچھی بُری تمام صلاحیتوں کے قصیدے پڑھنا واجب بھی ہے۔ مگر اس پیشِ منظر میں پسِ منظر میں دھکیلے گئے واقعات اور مشاہدات کشمیر کی صحیح صورت حال کی چغلی کھاتے ہیں اور صاحبِ مضمون نے اُن کی بڑی خوبصورتی سے

نشاندہی کی ہے۔ مغلوں کو کشمیر کا اقتدارِ اعلیٰ منتقل ہونا کشمیر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ ایک مکتبۂ فکر کے مطابق یہ کشمیر کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے۔ ابوالفضلؔ کی یادداشتیں کشمیر کی تاریخ کے اس اہم موڑ کے بارے میں ایک خاص نکتۂ نظر سے دیکھے گئے حالات وواقعات کا جائزہ پیش کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کشمیر سٹیڈیز کے طالب علم ابوالفضلؔ سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔

اکبر کے کشمیر پر قبضے سے متعلق حالات واقعات کے علاوہ کہ جن کے بیان کرنے میں ابوالفضلؔ سے پوری غیر جانبداری کی اُمید نہیں کی جاسکتی، ابوالفضلؔ کے تذکرے میں اُس دور کی سماجی زندگی، زبان، مذہب، سلطنت کے انتظامی امور، ٹیکس، دریا، پُل، کشتیاں، آمدورفت، دست کاریاں، خانقاہیں اور دیگر عبادت گاہیں، مذہبی تہوار حتیٰ کہ جوئیں، مچھر، پسو اور مکھیاں بھی موجود ہیں۔

سید رسول پونپرؔ صاحب نے جہانگیر اور کشمیر کے عنوان سے جہانگیر جیسے عاشقِ کشمیر کی تزکِ جہانگیری میں موجود رُوداد کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ جہانگیر لگ بھگ ہر سال کشمیر آتا رہا اور مشیتِ ایزدی کو یہ بھی منظور تھا کہ کشمیر سے واپسی کے دورانِ سفر ہی اُس کی رُوح پرواز کر گئی۔ مضمون نگار نے خاص طور سے جہانگیر کے پہلے سات ماہ کے قیام کا تذکرہ کیا ہے جب وہ مارچ سے اکتوبر تک کشمیر میں قیام پذیر رہا۔ لیکن ایسا ۱۶۲۰ عیسوی میں ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ جہانگیر کا انتقال ۱۶۲۷ء، اکتوبر میں ہو چکا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ ۱۶۲۰ء کا تذکرہ ہے۔ اِس قیام کے دوران جہانگیر نے کشمیر کے حُسن وجمال کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ پھولوں، پھلوں، سبزہ زاروں، کوہساروں، آبشاروں غرض چہار سُو پھیلی فطرت کی نیرنگیاں جہانگیر کو فریفتہ کئے جا رہی تھیں اور وہ بڑے

خوبصورت پیرائے میں اِن کا تذکرہ کرتا ہے۔ کشمیر کے بیشتر مقامات اُچھ بل، ویری ناگ، صفاپور، مانسبل، اہرہ بل، پانپور، کی تعریف وتوصیف میں جہانگیر نے صفحات روشن کیے ہیں۔ کھانے پینے، گھوڑوں کی اَقسام، کنول کے پھول، شہر سرینگر کے پُل، کشتیاں، پھولوں کی اَقسام غرض ہر ایک موضوع پر اَپنے مشاہدات قلمبند کرتا ہے۔

اَگلے تمام مضامین یورپی سیاحوں کے سفرناموں کے مطالعے پر مبنی ہیں۔ اِن میں اَورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ ۱۶۶۵ عیسوی میں کشمیر میں آئے شاہی معالج برنیئر کا سفرنامہ سرِفہرست ہے، جس پر جناب ڈاکٹر برج پریمی کا بصیرت اَفروز مقالہ برنیئر کے مشاہدات کا نچوڑ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ برنیئر شاید پہلا شخص ہے جو مغرب کے معیار مدِنظر رکھتے ہوئے کشمیر کی روایات اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اور بقولِ برج پریمی "بعض مقامات پر ہمارے اعتقادات کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ کشمیریوں کی سادگی کو ہدفِ ملامت بناتا ہے، ہمیں ضعیف الاعتقاد کہتا ہے لیکن اِس کے باوجود اِس مختصر سے سفرنامے کی افادیت کو صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

سید رسول پونپر نے ایک اور مقالے میں "ولیم موُرکرافٹ اور کشمیر" کے عنوان سے موُرکرافٹ جو پہلا یورپ نژاد معالجِ حیوانات ہے، جس نے ۱۸۱۹ء میں رختِ سفر باندھ کر ۱۸۲۵ء تک لداخ، کشمیر، پشاور، کابل اور بخارا کا دورہ کیا، کی یادداشتوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ صاحب مضمون یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مورکرافٹ دوسرے یورپی سیاحوں اور حکومت برطانیہ کے وفادار اور تابعدار ارکان کی طرح شاعری نہیں کرتا بلکہ نئے ماحول یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں،

جنگلوں، جانوروں، پرندوں، سبزیوں، پھلوں، مرغزاروں، دَرّوں، آنے جانے کے راستوں، لوگوں کے رہن سہن کو دیکھ کر حیرت کا پیکر نہیں ہو جاتا بلکہ اِن سب کے ساتھ ایک ہو کر باریک سے باریک تفصیل بیان کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی اَپنی جگہ دُرست ہے کہ موُرکرافٹ تفصیلات دیتے وقت کئی بار چُوکتا ہے۔

وہ کشمیری شالبافی، سوزن کاری، پیپر ماشی، بندوق یا محدود اسلحہ سازی دیگر دستکاریوں کے حوالے سے کشمیریوں کی ہنرمندی وتردِماغی کے بڑے گُن گاتا ہے اور اِن کو برطانیہ منتقل کرنے اور وہاں رائج کرنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

منظور فاضلی "کشمیر۔ ہیوگل کی نظر میں" کے عنوان کے تحت جرمن نژاد، بیرن سی، ہیوگل کے نکتۂ نظر سے اُنیسوی صدی کی تیسری اور چوتھی دَہائیوں میں کشمیر اور کشمیریوں کے حال احوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہیوگل کشمیر میں اُپنے قیام کے دوران شاندار مناظر پر اِسقدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کا شکر اَدا کرتا ہے کہ اِس خطۂ اَرضی میں، جو رُوئے زمین کا حسین ترین مقام مانا جاتا ہے اور جِسے اکثر لوگ جنتِ اَرضی سمجھتے ہیں، پہنچ پایا۔ مگر یہ بات بھی دُرست ہے کہ جہاں وہ کشمیر کے حُسن وجمال پر اَپنی خوشی اور مسرّت کا اظہار کرتا ہے وہاں وہ کشمیریوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ لکھتا ہے کہ کہ ملک اِتنا محکوم ہے کہ شالوں کا کاروبار کرنے والے چند اَفراد کو چھوڑ کر عام لوگوں کا حال بھکاریوں سے بہتر نہیں تھا۔

غلام نبی آتش نے "ولیم ویکفیلڈ کا سفرنامہ کشمیر" کے عنوان سے جو مقالہ قلمبند کیا ہے اس میں "دی ہیپی ویلی۔ سکیچز آف کشمیر اینڈ دی کشمیریز" نامی کتاب

جو جون ۱۸۷۹ء کو شائع ہوئی تھی' پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ولیم ویکفیلڈ نے کشمیر کی جغرافیہ، تواریخ، ثقافت، راستوں، قابلِ دید مقامات رُسوم ورواج، رہن سہن کی جانکاری بنیادی طور پر کشمیر کی سیاحت پر جانے والوں کے لئے کتابی صورت میں فراہم کرنے کا قصد کیا تھا۔ وہ خود ۱۸۷۵ء کے موسم گرما میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دَورِ حکومت میں کشمیر آیا۔ تین سو صفحات پر مشتمل اُپنے سفرنامے میں وہ کشمیر کی خوبصورتی کی تعریفیں تو کرتا ہے مگر کشمیر کے باشندوں کے بارے میں کئی ہتک آمیز اور مبنی بَر دروغ باتیں بھی لکھتا جاتا ہے۔ کشمیریوں کی پوشاک بدنُما ہے۔ پہناوے کی طرح کشمیریوں کی زبان بھی عجب ہے۔ کشمیریوں کے پاس فخر کرنے کے لائق بہت کم اَدبی اور تواریخی سرمایہ ہے۔

۱۸۸۷ء میں ینگ ہسبنڈ نے کشمیر کا دَورہ کیا۔ وہ اکیس برس تک مختلف عہدوں پر کشمیر میں فائز رہا۔ کشمیر کے عنوان سے اُنہوں نے خوبصورت کتاب رقم کی اور اس کا جائزہ اَرجن دیو مجبور نے لیا ہے۔ ینگ ہسبنڈ نے اَپنے سفر کی روئیداد بیان کرتے راولپنڈی راستے کے مختلف پڑاوَ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ تفریح کے مقامات میں اَچھ بل، ویری ناگ، لدرویلی، پہلگام، کولہائی گلیشر، اَمرناتھ، اننت ناگ، بجبہاڑہ، وانگت کے کھنڈرات، سونہ مرگ، وُلر، بانڈی پور، تراگ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اِسی طرح شہرِ سرینگر کے سات پُل، شاہ ہمدان، یورپی بستی یعنی نیڈوز، ریذیڈنسی، ڈاکٹر نیلو ہاسپٹل، منشی باغ کا تذکرہ۔ ڈل جھیل اور اس کے اِردگرد موجود خوبصورت پرندے، مغل باغات۔ ینگ ہسبنڈ کی کتاب میں یہ سب موجود ہیں، اور وہ جہاں کشمیریوں کو باہمت نہیں مانتے لیکن اَن کے اچھے اوصاف بھی گنواتے ہیں۔ جیسے یہ کہ وہ عقلمند ہیں اور اُپنے ہاتھوں

سے کئی اَشیاء تخلیق کرتے ہیں۔ بہترین کاشتکار ہیں، خاص کر اُس وقت جب وہ اَپنے لئے کام کر رہے ہوں۔ ینگ ہسبنڈ کشمیر کی تاریخ، آثارِ قدیمہ دونوں کا جائزہ لیتا ہے۔ سرکار کی آرگنائزیشن، دَرآمدات اور بَرآمدات کی تفصیلات اِس کے تذکرے کو جامع بناتے ہیں۔

سرالیکزینڈر کننگھم جنہوں نے ۱۸۴۵-۴۶ء میں کمیشن آف لداخ کے چیف کی حیثیت سے شمال مشرقی سرحدی علاقوں کا دَورہ کیا تھا اور جس کے دَوران اُسے کشمیر کے مَنادر کے آثار دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اور یہی مشاہدات اس کی دو تصانیف ''آریائی طرزِ تعمیر۔ کشمیر کے منادر کی روشنی میں'' اور ''لداخ کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر'' کے لئے بُنیاد فراہم کرتے ہیں۔ سیدرسول پونپر نے کننگھم کی زندگی، اس کے عظیم کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ کننگھم ہی وہ شخص ہے جس کے سَر ہندوستانی آثارِ قدیمہ کے بابا آدم ہونے کا سہرا بندھا ہُوا ہے، کننگھم کے سامنے ایک عظیم آدرش تھا وہ یہ کہ دُنیا کے سامنے یہ بات صراحت و وضاحت سے رکھے کہ ہندوستان کا ماضی کتنا شاندار تھا۔ اِسی طرح پریمی رَومانی نے سر آرل سٹائن اور کشمیر کے موضوع پر اَپنا مقالہ قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آرل سٹائن ہی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے کشمیر کی تاریخ و ثقافت، تہذیب وتمدّن اور زبان وادب کے گوناگوں پہلوؤں پر کام کر کے کشمیریات کے شعبے میں نئے دَر وا کئے ہیں۔ ان کا ایک اہم کارنامہ کلہن کی راج ترنگنی کی تدوین ہے۔ یہاں کی تہذیب وتمدن، کلچر اور زبان سے اُن کی گہری دلچسپی تھی۔ وہ سالہا سال تک مہند مرگ کی تنہائیوں میں کشمیریات کی کھوج میں لگے رہے اور واقعتاً ایک عاشقِ کشمیر تھے۔ صاحبِ مضمون نے ان

کے کئی خطوط کا بھی حوالہ دیا ہے جو............کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب کا مقالہ ''لارنس آف کشمیر۔کل بھی اور آج بھی'' شیرازہ کے اِس خصوصی نمبر کی زینت ہے۔ کشمیر کے موضوع پر لکھنے والے یورپی دانشوروں میں لارنس اپنی مثال آپ ہیں اور ٹینگ صاحب لارنس کی ''ویلی آف کشمیر'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب کشمیر سے متعلق اِتنے اہم، مستند، معتبر اور بے مثال معلومات اور تجزیات پر مشتمل ہے کہ اِسے ایک سوسال کے بعد بھی شاید کشمیر کا سب سے مستند، مختصر انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے''۔اور جب یہ رائے جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب جیسے کشمیر شناس محقق، ادیب اور دانشور کی ہو تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ٹینگ صاحب خود اپنی ذات میں کشمیر کے حوالے سے ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں اور کشمیر کو لارنس ہی کی طرح اپنے اس عاشقِ نامدار پر بھی ناز ہونا چاہئے۔ ٹینگ صاحب کا یہ مقالہ پڑھنے کی چیز ہے اور اس پر بے جا تبصرہ کر کے میں اپنی لاعلمی کا جواز پیش نہیں کرنا چاہتا۔

پریمی رومانی کا دوسرا مضمون کشمیر میں ماڈرن تعلیم کے حوالے سے مشہور ہستی ٹینڈل بسکو کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ بسکو نے کشمیر میں مغربی طرز تعلیم رائج کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔اور کشمیریوں میں تعلیم عام کرنے میں کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے بسکو صاحب کی کتاب ''کشمیر ان سن لائٹ اینڈ شیڈ'' میں بسکو صاحب نے بڑے دل چسپ پیرائے میں اپنے مشاہدات اور تجربات درج کئے ہیں۔ پریمی رومانی نے اِس موضوع کا بخوبی

جائزہ لیا ہے۔

شیرازہ کے خصوصی شمارے کا آخری مضمون جناب عبدالغنی شیخ کا تحریر کردہ ''لداخ۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' ہے۔ شیخ صاحب نے بڑی تفصیل سے دُنیا کے بہت سارے ممالک سے لداخ وادر ہوئے سیاحوں کے سفرناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے مرزا حیدر کی تاریخ رشیدی اور ان سے قبل چینی سیاح فاہیان، ہیون سانگ، اوکونگ، ایک کوریائی یاتری ہوئی چاؤ، رابرٹ شا، مؤرکرافٹ، کننگھم، لارنس، فریڈرک ڈریو وغیرہ وغیرہ درجنوں نام ہیں کہ جن کے سفرناموں کی تفصیل اِس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ لداخ کے موضوع پر اِتنا تفصیلی کام شاید اِس سے پہلے اِس پیمانے پر نہیں کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ مقالہ ایک سودس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور درجنوں کتابوں اور دیگر تصانیف کا حوالہ مقالے میں موجود ہے۔

آخر میں یہ بات کہنے میں مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کشمیر اور کشمیریات کے طالب علموں کے لئے شیرازہ کا یہ خصوصی شمارہ واقعی بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ اِتنے ماخذ ایک تین چار سو صفحات کی کتاب میں جمع کرنا اور صدیوں کا احاطہ کرتے ہوئے سفرناموں اور تذکروں سے پردے ہٹانا اور ان میں موجود معلومات، مشاہدات اور تجربات کو نظروں کے سامنے لانا واقعی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ کشمیر کے موضوع پر صرف اِتنا ہی نہیں لکھا گیا۔ کئی اور سفرنامے اور تذکرے بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اِس شمارے میں شامل نہیں ہو پائے ہیں۔ لیکن جتنا شامل ہُوا ہے وہ بھی سمندر کو کوزے میں بھرنے کے مترادف ہے۔

(☆ایاز رسول نازکی)

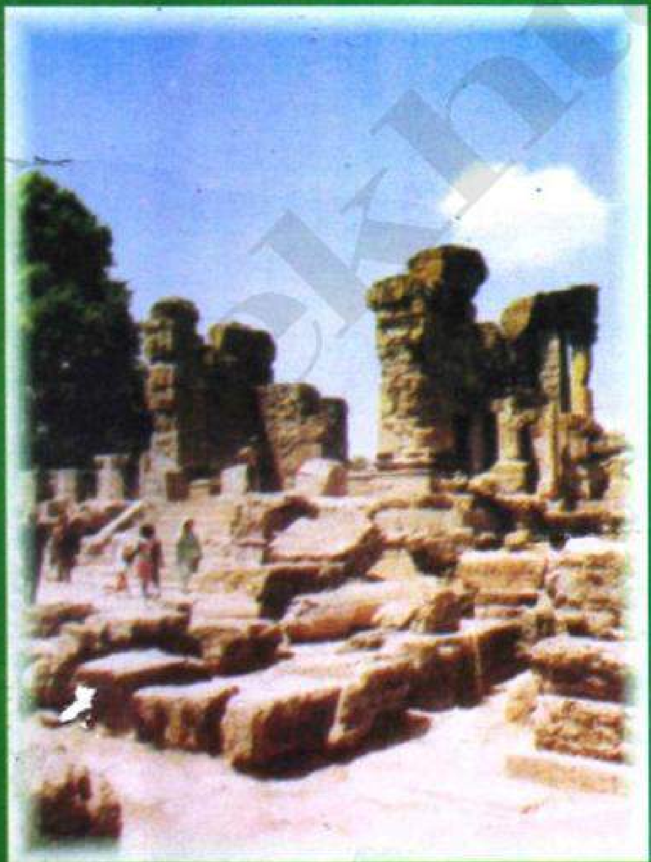
☆

SHEERAZA (URDU)

JAMMU-KASHMIR-LADAKH

IN ANCIENT TRAVELOGUES (II)

Volume: 43 No:6-10



Published by

J & K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES

SRINAGAR / JAMMU

جائزہ لیا ہے۔

شیرازہ کے خصوصی شمارے کا آخری مضمون جناب عبدالغنی شیخ کا تحریر کردہ ''لداخ - غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' ہے۔ شیخ صاحب نے بڑی تفصیل سے دُنیا کے بہت سارے ممالک سے لداخ وارد ہوئے سیاحوں کے سفرناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے مرزا حیدر کی تاریخ رشیدی اور ان سے قبل چینی سیاح فاہیان، ہیون سانگ، اوکونگ، ایک کوریائی یاتری ہوئی چاؤ، رابرٹ شا، مؤر کرافٹ، کننگھم، لارنس، فریڈرک ڈریو وغیرہ وغیرہ درجنوں نام ہیں کہ جن کے سفرناموں کی تفصیل اِس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ لداخ کے موضوع پر اِتنا تفصیلی کام شاید اِس سے پہلے اِس پیمانے پر نہیں کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقالہ ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور درجنوں کتابوں اور دیگر تصانیف کا حوالہ مقالے میں موجود ہے۔

آخر میں یہ بات کہنے میں مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کشمیر اور کشمیریات کے طالب علموں کے لئے شیرازہ کا یہ خصوصی شمارہ واقعی بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ اِتنے ماخذ ایک تین چار سو صفحات کی کتاب میں جمع کرنا اور صدیوں کا احاطہ کرتے ہوئے سفرناموں اور تذکروں سے پَردے ہٹانا اور ان میں موجود معلومات، مشاہدات اور تجربات کو نظروں کے سامنے لانا واقعی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ کشمیر کے موضوع پر صرف اِتنا ہی نہیں لکھا گیا۔ کئی اور سفرنامے اور تذکرے بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اِس شمارے میں شامل نہیں ہو پائے ہیں۔ لیکن جتنا شامل ہُوا ہے وہ بھی سمندر کو کوزے میں بھرنے کے مترادف ہے۔

(☆ایاز رسُول نازکی)

☆